قاضی عبدالودود

کا

۱۹۳۶ء کا معیار

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

قاضی عبدالودود کا ۱۹۳۶ء کا 'معیار'

- تعارف مع اشاریہ : عابد رضا بیدار
- سن اشاعت : ۱۹۸۱ء
- تعداد : ۵۰۰
- ناشر : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
- قیمت : ۳۰ روپے
- مطبع : برقی آرٹ پریس، دریا گنج، دہلی

قاضی عبدالودود

کا

معیار پٹنہ

مکمل فائل کی عکسی اشاعت مع

ایک تعارفی اشاریہ کے ساتھ

خدا بخش لائبریری پٹنہ

۱۹۸۱ء

خدابخش لائبریری کی طرف سے شائع کردہ ادیب دالتابلیغ صبح امید
(لکھنؤ)، کے انتخابات کی پیشکش کی مانند معیار کے مکمل فائل کی
یکجا اشاعت بھی اپنے اصل سائز ۳۰×۲۰/۸ کے بجائے کمتر سائز
۲۰×۲۶/۸ ۱۸ میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس فرق کے ساتھ، بقیہ تمام د
کمال مواد من وعن شائع ہو رہا ہے۔

پیش گفتار

یہ ماہنامہ 'معیار' (پٹنہ) کے مکمل فائل کی عکسی نقل پیش خدمت ہے جو قاضی عبدالودود صاحب نے ۱۹۳۶ء میں ۴۰ سال کی عمر میں نکالا اور جو جنوری سے جولائی، اگست تک چھ ماہ میں ۵/۶ پرچے نکل کے اسی سال بند ہو گیا۔ اس کے بند ہونے میں خریداروں کی کمی کو اتنا دخل نہ رہا ہوگا، جتنا قاضی صاحب کی مسلسل علالت کو جس کا سلسلہ ۱۹۳۲ء قیام یورپ' سے شروع ہو گیا تھا۔ جب ڈاکٹروں نے ان کے پھیپھڑے میں خرابی تشخیص کی تو اسی سبب انہیں کچھ مہینے سوئٹزرلینڈ میں مونٹانا کے سینی ٹوریم میں علاج کے لیے قیام پذیر ہونا پڑا اور ہندوستان واپس پر بھی ڈاکٹر انھیں یہی بتاتے رہے جس کے سبب وہ ۱۹۴۷ء تک دلجمعی سے کوئی کام نہ کر سکے اور بھوالی (نینی تال)، ڈکی اور پونا کے سینی ٹوریم میں صحت کی جستجو کرتے رہے۔ تاآنکہ ایک ماہر ڈاکٹر نے ۱۹۴۸ء میں پورے جسم کو چیک اپ کرنے کے بعد وثوق سے بتایا کہ ان کو پھیپھڑے میں خرابی تھا نہیں اور تشخیص غلط ہوتی رہی یا بالآخر کم از کم اِس وقت تک وہ مرض قطعی طور سے ختم ہو چکا تھا۔

'معیار' نے اپنے لیے جو حدود متعین کیے تھے ان میں رہ کر ۱۹۳۶ء میں اس نے ایک ادبی اور تحقیقی جریدے کا وہ معیار پیش کیا جو یورپ کے اعلیٰ ادبی مجلات کے پیش نظر رہتا تھا۔ اسی معیار کو قائم رکھنے کے لیے بیشتر یہ ہے کہ ایڈیٹر کو خود ہی لکھنا پڑتا تھا جس کے لیے تنوع کی خاطر مختلف قلمی نام بھی اختیار کرنے پڑتے تھے۔

اس وقت قاضی صاحب کی دلچسپیاں صرف تحقیق تک محدود نہ تھیں اگرچہ خصوصی مرکز اس وقت بھی 'تحقیق' ہی تھا۔ غالب[1] اور دیگر اساتذہ کی بات 'معیار' میں بار بار اور متعدد عنوانات سے

۱۔ "مرزا غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں کتب ذیل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں" الخ

۲۔ "دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار — گلچینِ نگاہ تو ز داماں گلہ دارد
در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا — نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد"

یہ اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کیے تھے ... ذرا بعد انشاء کی ایک تحریر میں یہ اشعار 'عرفی' کے نام سے ظاہر کیے ہیں ... یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ بعض بعد کے معاصر نے ۱۹۵۱ء میں اس کی جستجو کی تھی ... مل سکے ... پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

چھوڑ دی ہیں۔ مخطوطات کے مطالعے سے حاصل شدہ نوادر سامنے لائے جاتے ہیں۔ قدیم شعرا کے سوانح کے سلسلے میں یا تاریخ پیدائش و وفات کے بارے میں، یا تاریخ تصنیف کے تعین کے مسئلے پر تحقیق و جستجو ہوتی رہی، ترتیب متن اور صحت متن کی بات بھی بار بار آتی رہی۔ کتابوں پر تفصیلی تنقید کے مواقع پیدا ہوتے رہے۔ خالص ادبی ذخیرہ تنقید کے گوشے نکلتے گئے ——— لیکن تنقید میں طنز کے ساتھ دو ٹوک رویہ برقرار رکھا جاتا رہا۔ اگرچہ اپنی بات اور اپنے نظریات بڑی شدت کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں

'معیار' کے بعد جب قاضی صاحب 'ندیم' کے ادب کے میدان میں آئے، تو صرف تحقیق کے ہو رہے۔ 'معیار' کے دور میں ایسا نہ تھا۔ ڈراما اور افسانوی ادب سے ان کی دلچسپی کے ثبوت میں 'معیار' میں چھپنے والے دوسروں کے ہی نہیں ان کے اپنے ترجمہ اور طبع زاد دونوں قسم کے افسانے پیش کیے جا سکتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز ہی ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے کیا جب ان کا پہلا افسانہ 'آگرہ اخبار' میں شائع ہوا۔ 'معیار' میں ان کا طبع زاد افسانہ 'ہونہار نوجوان' اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس کا ماڈل کیمبرج کے ایک پنجابی ساتھی طالب علم (خورشید احمد) ہیں ——— افسانہ کا حاصل یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ 'ترقی' کرتے ہیں جو دوسروں کا استعمال اور استحصال کا گر جانتے ہیں۔

جاسوسی ادب (جس سے ان کی دلچسپی آج بھی جاری ہے۔ گرچہ یہ تعجب خیز امر ہے کہ وہ 'مجرم' کو جاسوسی دنیا پر ترجیح دیتے ہیں) کے سلسلے میں 'معیار' میں ایک بار لکھا تھا: "سر کونن ڈائل کے بہت سے افسانے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ مترجمین کو اب فرمیسن کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔" (ص ۳۳)۔ 'غزل'، اس کی ہیئت، اس کے مشمولات، اس کی زبان اور طرز ادا، ان سب میں گہری دلچسپی تھی جو 'معیار' کے صفحات میں بھی جھلکی پڑتی تھی، اس کے باوصف کہ انہوں نے پابندی لگا دی تھی کہ 'شعرائے حال کی غزلیں مطلق شائع نہ ہوں گی۔' غزل کی زبان میں ہندیت مرجح ہو یا فارسیت، اس بارے میں لکھتے ہیں ——— "آج کل کے اکثر مشہور غزل گو فارسیت کو ہندیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ غالب و مومن کے بعد داغ نے دہلی میں اور شاگردان آتش و ناسخ نے لکھنؤ میں فارسیت کے سیلاب کو

* ندیم ایم کے سلسلہ کے شعری حصے پر تنقید کا انداز وہی ہے جو بعد میں انداز تنقید ملا اور 'ماہر القادری' نے اپنایا۔

روکنا چاہا تھا طرزِ جدید میں حالیؔ بلاشبہ لوگوں کے بجھا دیتے لیکن بیسویں صدی میں کلامِ غالب کو وہ مقبولیت نصیب ہوئی کہ فارسیت کا بول بالا رہا اور اس کے آگے "ہندیت" کا چراغ نہ جل سکا۔"

غزل کے الفاظ کیسے ہوں اس کے بارے میں قاضیؔ صاحب کی رائے یہ تھی کہ :

"غزل میں ایسے الفاظ کا استعمال جو اخبار نویس بے تامل استعمال کر سکتے ہیں، غزل کی نزاکت انکی متحمل نہیں ہو سکتی ..... ہمارا روہ الفاظ جو بجائے خود صحیح ہیں اور نثر تو نثر قصیدہ و مثنوی میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں، غزل میں نہیں کھپ سکتے اور ہماری رائے میں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم غزل کو اسکی خصوصیت سے محروم کر دیں۔" (اتنا لکھ کر مثالیں دی ہیں کہ "حقیقۃً" "بنسبتہ" ، "خلقۃً" ، رسماً وغیرہ ہماری رائے میں غزل میں ان سے احتراز لازم ہے۔ مزید الفاظ کی جو مثالیں دی ہیں وہ یہ ہیں : نکماپن ، جمودِ دل، تنقید، تبلیغ ، مادیت، تنظیم، سطح ، لغت ، تاریخ)۔

اور غزل کے مشتملات کے بارے میں ایک غزل گو کو سامنے رکھ کر لکھا ہے کہ :

______ " (یہ) غزلیں رکیک اور مبتذل مضامین سے بالکل پاک ہیں۔ (ان کے اشعار میں چند ہی ایسے ہیں جو ایک حیادار نوجوان اپنے والدین کے سامنے نہ پڑھ سکتا ہو، یا تیرھویں (کذا) صدی کا باپ اپنی دوشیزہ لڑکی کے سامنے نہ سنا سکتا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اشعار کا یہ معیار کہاں تک صحیح ہے؟

______ " مادیت کو غزل سے بالکل خارج نہیں کیا جا سکتا۔ غالبؔ کہتا ہے : " لطافت بے کثافت جلوہ ..."

کیمرج کے تعلیم یافتہ "معیار" کے ایڈیٹر کے قلم سے غزل کے بارے میں مندرجہ بالا " بیانات " اور معیار کی پالیسی کے طور سے یہ اعلان کہ " شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے " اگر اگلی دہائی میں کیمرج ہی سے نکلنے والے اردو غزل کے مشہور ناقد کے لیے انسپریشن کے متعدد اسباب میں سے ایک سبب بن گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ۱۹۴۰ء میں قاضی صاحب سے پہلی ملاقات کے ذکر میں کلیم صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ : ______ " یوں تو میں ان کے نام سے واقف تھا، 'معیار' جو وہ نکالا کرتے تھے اس کے دو تین شمارے میں نے دیکھے تھے، ان کی قابلیت کی شہرت تھی لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا " (معاصر، دو دو نمبر)

طنز، جو قاضی صاحب کی تحریر میں اب بھی چپکے سے در آتا ہو (اگرچہ وقت اور جگہ بچانے کے لیے اب وہ اس کے استعمال میں اسراف نہیں کرتے) مگر یوں کہا جائے کہ جب ناگزیر ہو تب اسی وقت

اس سے کام لیتے ہیں (معیار) میں جا بجا مناسب و برمحل مواقع میں اس کا استعمال خاصا پر اثر اور بڑا لطیف طنز ہوتا ہے ۔

ایک قدیم دیوان کے ایڈیشن کی ترتیب و تدوین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "دیوان کی کثرتِ طبع و اشاعت کی طرح یہ کتاب بھی حسنِ ظاہر سے بہرہ وافر رکھتی ہے ... دیباچہ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ متن کی تصحیح کن اصول کی بنا پر کی گئی ہے ... یہ نسخہ جتنا چاہیے اتنا صحیح نہیں لیکن دوسرے اداروں سے جو نسخے نکلتے رہتے ہیں ان کے مقابلے میں زیادہ غلط بھی نہیں ... الحاقی کلام کم داخل ہے ۔"

ایک نئے رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"(اس) کے مقاصد مسلمانوں میں اصلاحیں لانا ہے ۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزلوں کی اشاعت کس طرح مسلمانوں کی اصلاح میں معاون ثابت ہو سکتی ہے ۔"

ایک مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں :

"مضمون نگار کو اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے مخاطب اس مضمون سے برا نہ مان جائیں ۔ برخلاف اس کے ہمارا خیال ہے کہ سید صاحب کی ہر دلعزیزی میں اس مضمون کی اشاعت سے معتدبہ اضافہ ہو جانے کی توقع ہے ۔"

ایک رسالے کے افسانہ نمبر میں شامل ایک افسانہ کے بارے میں جو طبع زاد کے طور پر پیش کیا گیا جبکہ واقعتاً وہ ایک انگریزی افسانے سے ماخوذ تھا جو چند سطریں لکھی ہیں ان میں تو طنز و لطافت کی اس سطح پر پہنچ گیا ہے کہ مجھے اس امر کی توثیق کرانی پڑی کہ واقعتاً یہ طنزیہ عبارت ہے ۔ لکھتے ہیں :

"افسانوں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ طبع زاد ہیں ۔ ان میں کم سے کم ایک انگریزی سے ماخوذ ہے ۔ مسلم صاحب نے تمہید اپنی طرف سے بڑھا دی ہے، کچھ نام بدل دیے ہیں اور ایسی باتیں جو خاص انگریزی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں حذف کر دی ہیں ۔ لوگ اسے سرقہ کہیں گے ۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی کو مسلم صاحب پر اعتراض کا حق نہیں ! کیا ہمارے یہاں ابتدا ہی سے یہ رسم جاری نہیں ؟ کیا سعد اللہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ ریختے میں فارسی کے مضامین باندھو ؟ اور کیا ہمارے شعرا کا آج تک اس ہدایت پر عمل نہیں ہے ؟ افسانہ نگاروں کے لئے ایک دوسرا معیار کیوں قائم کیا جائے ؟"

ایک رسالے پر، جس میں اغلاط بکثرت تھے، تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر اوسط فی صفحہ دو بھی رکھا جائے تو اغلاط کی تعداد ۲۲۴ ہوتی ہے۔ رسالے کا صحیح چھپوانا
ر ممکن نہیں تو غلط نامہ ہی شامل کر دیا ہوتا۔ پڑھنے میں اتنی اُلجھن تو نہ ہوتی ۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ
گ ایسے بھی ہیں جو غلط نامے کی صورت دیکھتے ہی بھڑک اُٹھتے ہیں لیکن سننے میں آیا ہے کہ اب
ں کا علاج بآسانی ہو جاتا ہے۔" (صفحہ ۲۷)

———— ایک شاعر پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اشعار کا 'پوسٹ مارٹم' کیا
ہے، اس میں بجا بے رنگ لگے گا، جس کا نمونہ مندرجہ ذیل شعر پر تبصرے میں موجود ہے:

"ایک ہی سا ہے نظامِ عشق کا فنی حال ÷ میری تجویز وفا ناکام تھی، ناکام ہے
پلشن کا ذکر ہے یا کسی انجمن میں کسی تحریک کے نامنظور ہو نے کا؟"

جس محنت سے یہ ماہنامہ مرتب ہوتا تھا، جب تک اس کے مشمولات، خصوصاً مستقل
نوانات تفصیلاً نہ پڑھے جائیں، اس کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ مقالات، نظموں، افسانوں، تمثیلوں
(ڈراموں)، مراسلات اور استفسارات کے علاوہ جن میں دوسرے بھی حصہ لیا کرتے تھے، معروضات'
رف، تصحیح الفاظ، آثارِ ادبیہ (= نوادر)، غالب (= غالبیات)، مطبوعات جدیدہ (تبصرے)،
قتباسات (اہم مضامین، خطبات وغیرہ کے)، فکر و دانش (سندرات)، اوراقِ پارینہ (= نوادر)،
ورِ رفتگاں (= تعزیتی نوٹ)، صوبہ بہار (یا بہار و بنگال) ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین ————
عالم ادب اس رسالے کے وہ مستقل عنوانات تھے، جن کے لیے ایڈیٹر کو اچھی خاصی محنت
نا پڑتی تھی ۔ مخطوطات، تازہ مطبوعات اور رسائل کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر کے
کے ضروری نوٹ بنانے ہوتے تھے۔ اکثر ان پر رائے بھی دینی ہوتی تھی؛ اور یہ سب کچھ سلیقہ اور
ذوق کے ساتھ ہوتا تھا ۔ معاصرین پر جائز تنقید بھی ہوتی تھی ۔ ان کے کام، محنت، صلاحیت اور
بیت کا جس قدر مستحق ہوتا اعتراف بھی کیا جاتا ۔ ایسے معاصرین جن کی تحریروں کا 'معیاد'
، بطور خاص نوٹس لیا گیا، ان کی تعداد خاصی ہے۔ ایسے تمام نام اشاریہ میں اشخاص
عنوان سے جمع کر دیے گئے ہیں۔

معاصروں کا کھلے دل سے اعتراف، ان کی تعریف و توصیف (ہر اچھے کام کی تحسین اللہ

ادبیت تحقیقی مقالہ بھی کہیں کہیں مگر تحقیق میں ایسی چیزیں کم ہوتی ہیں۔ فقط نظر یہ ہے کہ یہ پہلو تو سب کے سامنے ہے ہی، وہ پہلو جو عام طور سے نظر نہیں آ سکتا اس پر روشنی ڈالنا زیادہ ضروری ہے) و زبان و بیان میں (لٹریچر) زیادہ شگفتگی ، نسبتاً کم ہو رہی ، جا بجا لطیف طنز کا استعمال ؛ تحقیق کے ساتھ ساتھ ادب کی دوسری اصناف سے غیر معمولی دلچسپی ان کا مطالعہ اوراق پر رائے زنی : تازہ کتابوں پر جن میں ہر صنف شامل تھی تفصیلی ، تخلیقی تجربے ، اُردو کے تقریباً تمام اہم رسائل کے منتخب مشمولات کا علم اور جا بجا تبصرہ ہو ، تنقید یا تحسین ، ——— اور سب سے بڑھ کر اُردو میں تحقیق کا ایک نیا معیار سامنے لانا ، ان سب امور نے 'معیار' کو (ان کی قائم کردہ حدود کے اندر) اُردو کا ایک بہترین پرچہ بنا دیا تھا۔ جس کے صرف چھ پرچے شائع ہوئے لیکن اس کے باوجود وہ ایک ایسا معیار قائم کر گیا جسے ۱۹۳۶ء کے ۴۴ سال گزرنے کے بعد بھی نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔

یہ 'معیار' کی سرسری سرگزشت ہوئی۔ اس سے آگے کی تفصیلی بات اشاریہ میں ملے گی جہاں سب سے پہلے تو 'معیار' میں شامل قاضی صاحب کی تحریروں کا تجزیاتی انڈکس بنانے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ وہ بھی ہمہ جہتی اور ہر پہلو پر حاوی نہیں کہی جا سکتی ——— کر اس کے نئے مزید مطالعہ کے واسطے خود 'معیار' کے مکمل فائل کا عکس ہی آپ کی خدمت میں پیش ہے) اس کے بعد بقیہ مضمون نگاروں کے ناموں کے ساتھ ان کی تحریروں کا انڈکس ہے امید ہے اس اشاریہ سے اس پیشکش کے استعمال میں سہولت ہو گی اور ایک نظر میں 'معیار' کے متعدد پہلو سامنے آجائیں گے۔

اشاریہ کے بعد 'معیار' کے لکھنے والوں کا دو ایک سطری مختصر تعارف بھی دیا جا رہا ہے۔

عابد رضا بیدار



قاضی عبدالودود، کیمرج میں
——— 'معیار' کی اشاعت سے دس سال قبل



قاضی عبدالودود ۱۹۳۰ء میں

-- 'معیار' کی اشاعت سے ایک سال بعد



قاضی عبدالودود ۱۹۷۶ء میں
— رسالہ معاصر کے ودود نمبر کی اشاعت سے قبل



قاضی عبد الودود خدا بخش لائبریری میں ۱۹۷۰ء

—— مسز جگناتھ کوشل چیئرمین خدا بخش لائبریری و گورنر بہار کے ساتھ



قاضی عبدالودود، راج بھون میں، ۱۹۸۱ء
ـــــ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی چیرمین خدا بخش لائبریری و گورنر بہار کے ساتھ



قاضی عبدالودود، گھر پر، ۱۹۸۱ء

انجمن ترقی اردو (شاخ پٹنہ) کا رسالہ

معیار

مرتبہ

قاضی عبدالودود

بانکی پور

مارچ ۱۹۳۶ء

انجمن ترقی اردو شاخ پٹنہ کا ادبی رسالہ

معیار

مرتب۔ قاضی عبدالودود   معاون۔ محمد اشرف عالم آرزو جلیلی

ضروری گزارش

کسی رسالے کی ادبی حیثیت کے پیچیدہ عناصر کا اشتراکِ عمل اور ان عناصر میں بعض خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔ اول چھاپنے والے یعنی وہ لوگ جن سے رسالے کے انتظامی معاملات و مالیات کا تعلق ہے ان میں شوق فضول [illegible] کے ساتھ ساتھ صلاحیت بھی ہونی چاہیے تاکہ کوئی سرمایہ جمع کرسکیں ورنہ اس کی بنیاد متزلزل رہے گی۔ دوسرے مرتبین [illegible] میں [illegible] ورنہ ان کی حیثیت محض ڈاک کے کارکنوں کی ہوگی جو بلاتمیز رطب و یابس جو کچھ ان کے پاس [illegible] دوسروں تک پہنچا دیں گے [illegible] قانون ہو جائے تو انہیں بحث نہیں۔ اور غلط معلومات کی اشاعت ہو تو [illegible] ایک رسالے نے بھی چند سال ہوئے [illegible] کی آبادی [illegible] بتائی تھی یہ مثال مستثنیات میں [illegible] تیسرا [illegible] رسالے کے قلمی معاونین [illegible] کوئی رسالہ محض مرتب کے زور قلم سے نہیں چل سکتا۔ اگر [illegible] رسالے [illegible] مضامین سے بھرا رہے جب بھی ایک قطرہ تنوع نہیں پیدا کرسکتا [illegible] سال کے [illegible] جو [illegible] صفحہ جو اہمیت میں کسی سے کم نہیں خریدار رہیں ہر رسالہ قدردانوں [illegible] معیار اپنے خریداروں میں ایک ادبی صفت کا طالب ہے اور صحت ذوق ہے کسی رسالے کا معیار [illegible] اسے پستی پر پہنچانا خریداروں کا کام ہے۔

خریداروں سے (۱) معیار ماہوار رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال میں سہ وقت صرف چار پرچے نکلا کریں گے۔ یہ پرچے جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر، نومبر میں کم از کم ۱۱۲ صفحوں پر شائع ہوا کریں گے بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہوں گے ۴۸ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، دسمبر میں شائع ہوا کریں گے۔ سال بھر میں معیار تعداد و سرورق کے علاوہ کم از کم ۱۰۱۶ صفحات پیش کیا کریگا۔

(۲) سالانہ قیمت للعہ فی پرچہ ۲ار۔ نمونے کا پرچہ ۱۳ر کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔ کچھ پرچے معمولی کاغذ پر خاص طور سے چھپوائے گئے ہیں قیمت فی پرچہ [illegible] اگر ترسیل مطلوب ہو تو [illegible] کے ٹکٹ بھیجئے۔ جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ بھیجنا چاہئیں۔

مضمون نگاروں سے (۱) معیار خالص ادبی رسالہ ہے جو اصحاب اس کی قلمی اعانت کا ارادہ رکھتے

سالانہ چندہ
للعہ

معیار
بانکی پور

فی پرچہ ۱۲/
ایجنسی ایڈیشن (معمولی کاغذ) فی پرچہ ۸/

جلد ۱ | مندرجات بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

نمبر شمار	تفصیل مندرجات	صفحہ	نمبر شمار	تفصیل مندرجات	صفحہ
۱	معروضات از قاضی عبدالودود	۳	۱۵	میترلنک کے خاموش ڈرامے از آرزو جلیلی	۵۹
۲	تعارف از قاضی عبدالودود	۴	۱۶	مثنوی بہار - گیارہویں صدی کی ڈراما از ق ع و	۶۳
	آثار ادبیہ :-			مطبوعات جدیدہ :-	
۳	محسن سخن	۹	۱۷	دیوان معروف از قاضی عبدالودود	۷۸
۴	غزل تحفۃ الدولہ جواب شمس النساء بیگم	۱۱	۱۸	دریائے لطافت از ق ع و	۷۹
۵	مثنوی میر حسن غیر مطبوعہ	۱۲	۱۹	سحر بنگال از ؟	۸۳
۶	غالب :- میرزا غالب کے غیر مطبوعہ خطوط	۱۵	۲۰	بزم بہار نمبر از ؟	۸۶
	افسانے :-		۲۱	مثنوی مادر ہند از آرزو جلیلی	۸۸
۷	گوتی - از بونین (مترجمہ منصور احمد صاحب)	۱۶	۲۲	افکار مصریہ از متعلم	۹۰
۸	سانپ - از ہیبرو ژیرس (مترجمہ تساہلی)	۱۹	۲۳	مشرق اور اطالیہ از ؟	۹۱
۹	مکدہ - از مسقولی (مترجمہ وصیح قادری)	۲۵	۲۴	نکات الشعرا از ق ع و	۹۲
۱۰	ستیش - سکوں از میترلنک (مترجمہ آرزو جلیلی)	۳۰		اقتباسات :-	
۱۱	نظم - شکستہ پندار از پریم کماری	۴۲	۲۵	غزل میرزا غالب معہ اردو دیوان معروف	۹۵
	مقالات :-		۲۶	میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس	۹۵
۱۲	سن وفات آبرو از قاضی عبدالودود	۴۴	۲۷	سنہ ۳۶ء کے ادبی مضامین از ادارہ	۹۷
۱۳	دیوان جوشش از قاضی عبدالودود	۴۸	۲۸	محاکمہ :- از ق ع و	۱۰۴
۱۴	حیلۂ لطافت از قاضی عبدالودود	۵۳	۲۹	عالم ادب :- از ادارہ	۱۰۵

غلط نامہ

[illegible] کے مطابق [illegible] کریں اس کے بعد [illegible] جیسے [illegible] پڑھیے [illegible] جگہ ذکر ہونا چاہیے۔ سطر ۱۵ [illegible] سطر [illegible] اور صحت ذوق [illegible] وہ صحت ذوق۔

[illegible] کے مطابق [illegible] جان [illegible] کیجیے [illegible] منزل [illegible] آنے جانے [illegible] آنے گے [illegible] کسی کی [illegible] یہاں = وہاں [illegible] مقامات [illegible] ان = اس [illegible] پڑھنا کوئی [illegible] کسی عورت سے [illegible] پڑھوایا [illegible] کسی عورت [illegible] چاہے = چاہتے [illegible] تنقیدی = تقلیدی [illegible] اسباب = ان اسباب [illegible] شاعری [illegible] سلطان = سلیمان [illegible] حمیدیہ = محمدیہ [illegible] شمس [illegible] خاتم = حاتم [illegible] کرم [illegible] انتقال [illegible] جب [illegible] فنون لطیفہ [illegible] انسان = ایمان [illegible] وقت = وقت تک [illegible]

[illegible]

معروضات

از قاضی عبدالودود

ادب قومی خصوصیات کا آئینہ دار ہے، ایک نسل سے دوسری نسل میں انہیں منتقل کرتا ہے، اور قوم میں اتحاد خیال پیدا کرتا ہے۔ قومی سیرت پر ادب کا جو گہرا اثر پڑتا ہے اس کا اعتراف وہ جماعت بھی کرتی ہے جو دل کی طرح ادب کو فن تعمیر سے شمار کرتی ہے، اور وہ جماعت بھی جو والٹر پیٹر کی طرح ادب کا منتہائے کمال اسے قرار دیتی ہے کہ موسیقی میں ضم ہو جائے۔ قومی زندگی میں ادب کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اقتضا تھا کہ ہندوستانی زبانوں میں بکثرت رسالے ادب کو اپنا موضوع خاص بنا لیتے، لیکن اردو، باوجود اس کے کہ جہاں تک رسائل کی تعداد کا تعلق ہے ہندوستان کی ترقی یافتہ زبانوں سے بہت پیچھے نہیں ہے، اس زبان میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے سہ ماہی رسالہ اردو کے علاوہ کوئی قابل ذکر رسالہ ایسا نہیں جو ادب کے سوا کسی اور موضوع سے سروکار نہ رکھتا ہو۔ اردو نے ہندوستانی زبان اور ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف کرنا ہر وہ شخص اپنا فرض سمجھتا ہے جو بصیرت کا ادعا کرتا ہے۔ اس کے محققانہ مضامین اور عالمانہ تبصرے ہماری زبان میں آپ اپنی نظیر ہیں لیکن نظم کے سوا تخلیقی ادب کے اور اصناف کے نمونے اگر اس نے پیش کیے ہیں تو وہ انشاء کا معدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ اس لیے انجمن ترقی اردو (شاخ پٹنہ) کو ایک ایسا رسالہ نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو صرف ادب و زبان سے متعلق تحقیقی مضامین اور مطبوعات جدیدہ کے تبصرے شائع کرنے پر قناعت نہ کرے بلکہ تخلیقی ادب کے نمونے بھی بالالتزام پیش کرتا رہے۔ معیار اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ معیار نے بظاہر اپنا دائرہ عمل بہت تنگ کر لیا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو ادب کی سرحد اتنی وسیع ہے جس قدر انسانی زندگی ہے، اور رومی شاعر کے الفاظ میں ادب کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ میں انسان ہوں اور کسی شے سے جس کا تعلق انسانوں سے ہے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ خالص ادبی رسالے میں بھی تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے اور کسی خاص موضوع پر اگر دس رسالے بھی بیک وقت نکلیں تو ہر رسالہ اپنی انفرادی شان قائم رکھ سکتا ہے۔ معیار کے افتتاحی مضمون میں یہ بتانا تھا کہ ہم کس قسم کے ادب کی ترویج کے خواہاں ہیں لیکن افسوس ہے کہ دوسرے مضامین نے اتنی جگہ گھیر لی کہ اب تفصیل اظہار خیال کی بالکل گنجائش نہیں اور ہم مجبوراً اسے کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ہم صرف اسی قدر عرض کریں گے کہ معیار اختراع کو تقلید پر ترجیح دیتا ہے، وہ حدود فن کو منزل من السماء نہیں سمجھتا اور ان میں تبدیلی و تغیرات کا حامی ہے۔ غلط یا صحیح مگر ہم چاہتے ہیں کہ ادب کو اپنی راہیں آپ نکالنے کی کوشش کرتا رہے۔ صنعت کار کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی کا طلبگار ہے۔ ادب میں یہ کسی عقیدہ کا پابند نہیں بلکہ اس اصول کا ہے کہ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے۔ ذوقیات و معنویات میں نزاکت نقش و نگار کا اعلان معیار کرتا ہے لیکن اسی قدر ضروری سمجھتا ہے کہ اصل پرورش کی لے میں تخلیق کے لیے تنقید سے زیادہ مقدم ہے۔ اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو خیالات کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں، صنعت کار اس میں تمام نہیں ہو سکتا۔

تعارف

از قاضی عبدالودود

اس عنوان کی بھی غرض مندرجات معیار کے متعلق ضروری معلومات کی فراہمی اور لکھنے والوں کے نقطۂ نظر کی توضیح ہے اس مرتبہ عنوانات رسالہ کی تشریح بھی اسی عنوان کے تحت کر دی گئی ہے۔

۱ معروضات ۲ اقتباسات و ۳ استفسارات۔ یہ عنوانات تشریح کے محتاج نہیں، استفسارات کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اگر جواب موصول ہوئے تو وہ بھی شائع کر دئے جائیں گے، اور ایسے سوالات جن کے جواب تھوڑی سی محنت سے متداول کتابوں میں مل سکتے ہیں درج نہ ہوں گے۔ مرزا غالب کی غزل دیوان معروف میں اس وجہ سے لی گئی کہ معروف نے اس کو مخمس کیا ہے۔ یہ غزل اشعار کے ایک قدیم مجموعے "چمن بے نظیر" میں بھی پائی جاتی ہے۔

۴ آثار ادبیہ۔ یہ عنوان اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ قدیم نظم و نثر کا وہ حصہ جو ادبی، تاریخی یا لسانی نقطۂ نظر سے قابل قدر اور عام ناظرین کی رسائی سے باہر ہے منظر عام پر لایا جا سکے۔

مخمس مصحفی کی شان نزول یہ ہے کہ مصحفی اور انشا میں جب بگاڑ ہوا، اور طرفین سے ہجو بازی کی نوبت آئی تو سلیمان شکوہ نے انشا کا ساتھ دیا۔ سچ یا جھوٹ کسی نے شہزادے کے کان میں پھونک دیا کہ مصحفی نے آپ کی ہجو لکھی ہے اسی الزام سے اپنی بریت میں مصحفی نے اپنا مشہور قصیدہ رائیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

خراج شاہ ہو یوں صرف تو مجھ کو بھی ‌ ‌ ‌ یہ چاہیے کہ کروں شکوہ اس کا پیش وزیر

آصف الدولہ سے استغاثہ کرنے کا ارادہ قوت سے فعل میں آیا، اور مصحفی نے یہ مخمس اور اس کے ساتھ ایک قصیدہ آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مخمس کا ایک مصرع مشکوک رہ گیا ہے، دیوان چہارم کے کسی صحیح نسخے تک کسی صاحب کی رسائی ہو تو وہ توجہ فرمائیں۔

آصف الدولہ کی غزل اور اس کا جواب دونوں دیوان جہان مصنفہ بینی نرائن (نسخہ قلمی عجائب خانہ برطانیہ لندن) سے ماخوذ ہیں۔ شمس النسا بیگم دلہن بیگم کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کے باپ انتظام الدولہ، دادا قمرالدین خاں اور نانا (غالباً) صمصام الدولہ خان دوراں تھے، آصف الدولہ کے ساتھ ان کی شادی فیض آباد میں بڑی دھوم

دلہن کے ساتھ ۱۱۸۳ھ میں ہوئی۔ شجاع الدولہ کی زندگی میں چونکہ آصف الدولہ کی کسی اور شادی کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا، قیاس ہے کہ میر حسن نے اپنی مثنوی میں جو معیار میں شائع ہو رہی ہے اسی شادی کی کیفیت بیان کی ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو مثنوی کا سالِ تصنیف بھی ۱۱۸۳ھ ہے اور اس حساب سے یہ مثنوی رموز العارفین اور گلزارِ ارم سے پرانی ہے۔ کلیاتِ حسن کے جس نسخے سے یہ ماخوذ ہے وہ انجمن ترقی اردو کے لیے ابھی حال میں نقل ہوا ہے اور غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔ قیاسی تصحیح کے متعلق ہم ان اصحاب سے اظہارِ رائے کی درخواست کرتے ہیں جن کی نظر سے کلیات کے دوسرے نسخے گزر چکے ہیں۔

✚ **غالب:** یہ عنوان مرزا غالب کے لیے مخصوص ہے۔ یا تو ان کی غیر مطبوعہ نظم و نثر اس کے تحت شائع ہوگی یا ان کی زندگی اور شاعری کے کسی نہ کسی پہلو سے بحث کی جائے گی۔ تین خطوط جو اس بار ہم شائع کر رہے ہیں ہمیں جناب عرشی ناظم کتب خانۂ ریاست رام پور سے ملے ہیں اور ہم اس عنایت کے لیے ان کے نہایت ممنون ہیں۔

✚ **افسانے:** افسانوں کے لیے طبع زاد یا ترجمے کی قید نہیں لیکن ترجمے کے لیے کسی مسلّم الثبوت مصنف کا افسانہ منتخب کرنا چاہیے۔ واقعات میں کسی ترمیم سے بچنا چاہیے۔ اور مقامات و اشخاصِ افسانہ کے نام وہی رہنے چاہییں جو اصل میں ہیں۔ مترجم کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ افسانے کا اصل عنوان کیا ہے، کس زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے، اور مصنف کا کیا نام ہے۔ مختصر کہانیوں کے علاوہ طویل افسانوں کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ گوگول کا "سانپ" اور "غم کدہ گل" بالترتیب گوگول کی "دی مین اینڈ دی اسنیک" اور "غرفۃ الاحزان" کے تراجم ہیں۔

✚ **تمثیل:** "شرح صدر" "سکوت" لال تیرتھ کا ترجمہ ہے۔

✚ **نظم:** شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں بھی جدت لازمی ہے۔ اس قید کی وجہ سے بخوبی ممکن ہے کہ ہم کبھی کبھی نظمیں بالکل نہ شائع کر سکیں۔ اگر کوئی پرچہ خالی رہا تو ہم اس کی جگہ کسی دوسرے عنوان کے تحت غیر زبان کے مستند شعرا کے کلام کا ترجمہ شائع کیا کریں گے۔
شکستِ پندار کے مصنف پریم بہاری صاحب شاعری پیشہ نہیں لیکن عروض و قافیہ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نظم میں بعض قوافی ان اصحاب کو کھٹکیں گے جو اب تک قدیم قواعد کی خود بھی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کرانا چاہتے ہیں۔ پریم بہاری کا مسلک ان اصحاب سے جداگانہ ہے اور وہ قدیم قواعد میں ترمیم کے حق میں ہیں۔ ان کا ایک خط ہمارے پاس موجود ہے جس میں بعض مشکوک قوافی کے جواز کی دلیل پیش کی ہے اور اپنے مسلک کی توضیح کی ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم اسے شائع کر دیں گے۔

✚ **مقالات:** ادب کے مادہ یا علیہ سے بحث کی جائے تو فلسفے کی حدود میں قدم رکھنا ناگزیر ہے۔ مسئلِ تخلیق یا ادب کی اثراندازی کا ذکر آئے تو نفسیات سے دوچار ہونا لازمی ہے۔ اور اگر یہ بیان کیا جائے کہ کن حالات

جب کسی خاص زبان کے ادب نے نشو و نما پائی یا اُن اسباب سے اس کی ترقی یا زوال کا باعث ہوئے تو تاریخ سے واسطہ پڑنا یقینی ہے۔ معیار خالص ادبی رسالہ ہے لیکن علم تاریخ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور اگر ہوتا تو ہم ان کی [illegible] تو ہمیں دشمن سمجھا جائے گا [illegible] یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ گو معیار کا موضوع خاص ادب ہے لیکن دوسری زبانوں کے ادب سے متعلق مضامین بھی اس میں شائع ہوا کریں گے۔ ہم ان ذوقی و معنوی تحریکات سے جو ہندوستان اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کو متاثر کر رہی ہیں یا آئندہ متاثر کریں گی اپنے ناظرین کو باخبر رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ مصنفین اردو کے حالات بالالتزام معیار میں درج ہوا کریں گے۔

اردو کے ایسے مستند مصنفین کا دنیائے اردو سے تعارف کرانا بھی ہم اپنے فرض میں داخل سمجھتے ہیں۔ وفات آبرو [illegible] نسخے کا [illegible] گیا ہے وہ طبع اول ہے طبع ثانی نہیں۔ تذکرہ بیگم کا ذکر فہرست میں [illegible] کے تحت ص [illegible] پر ہے۔

اس کوشش کا پہلا نمونہ [illegible] رشید صاحب خلف شوق مرحوم نے ہمیں چھپوانے کے لیے مستعار دیا ہے۔ اس عنایت کے لیے ہم ان کے نہایت ممنون ہیں۔

دریائے لطافت کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ یہی کتاب ہے جو قواعد اردو میں کسی ہندوستانی نے لکھی ہے لیکن یہ خیال ضرور ہے [illegible] کی تردید ہو سکے گی ہم اس پرانے جھگڑے کو زندہ کرتے لیکن ابھی حال میں لکھنؤ کے ایک رسالے میں [illegible] صاحب مولف [illegible] اللغات کا ایک مضمون ہماری نظر سے گزرا جس میں انہوں نے بھی دعویٰ [illegible] تقدم [illegible] کیا ہے دریائے لطافت انشا نے اصلاح [illegible] سے مستفید ہو کر لکھی ہے۔ [illegible] سب سے [illegible] ہم نے اس کا مفصل ذکر اس مقالے میں کیا تھا جو چند سال قبل ہم نے ادبی کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ ہم اس مقالے کا وہ حصہ جو تاریخ اور مصحفی کے تعلقات سے متعلق ہے اسی سال شائع کریں گے

++ ہمارے [illegible] سے متعلق ادبی تاریخی مضامین اس عنوان کے تحت درج ہوا کریں گے۔

یہ حادثہ کاتب [illegible] لکھنے کے لیے [illegible] دیا گیا تھا کہ مصنف کے سال ولادت کا علم ہوا [illegible] نسخۂ اول کا تب نے دو بار لکھ دیا گیا ہے، کتاب کا سال تصنیف [illegible] ھ بتایا گیا ہے، اگر مصنف کا سال ولادت [illegible] ھ ہے جیسا کہ مصنف تذکرۃ الصالحین نے لکھا ہے تو [illegible] ھ میں مصنف کی عمر [illegible] سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتی، اور یہ بالکل قرین قیاس نہیں کہ [illegible] اس عمر کا کوئی شخص تصنیف کے لیے اردو کو منتخب کرتا جو اس عہد کی تصنیفی زبان نہ تھی اور صرف نثر ہی نہیں بلکہ نظم بھی اس زبان میں لکھتا۔ کتاب کے خاتمے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تاہل کی زندگی اختیار کرنے کے بعد یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ حالانکہ مصنف کے حالات جو تذکرۃ الصالحین میں درج ہیں ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ تاہل کا زمانہ [illegible] ھ کے بہت بعد ہوگا۔ ہم نے جناب تمنا کو اس خدشے سے آگاہ کر دیا ہے لیکن ابھی

تک ان کا جواب وصول نہیں ہوا ہے۔ اس رسالے کے متعلق تنقیح طلب سوالات حسب ذیل ہیں (۱) مصنف کی وفات کب ہوئی؟ (۲) یہ رسالہ کب لکھا گیا؟ (۳) کیا یہ واقعی انہیں بزرگ کی تصنیف ہے جن کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے؟ (۴) اگر نہیں تو اصلی مصنف کون ہے، اور غلط انتساب کی کیا وجہ ہے؟ رسالے کی مذہبی حیثیت سے اہمیت ہو یا نہ ہو ادبی حیثیت سے اس بات کا فیصلہ ہو جانا ضروری ہے کہ یہ کب لکھا گیا ہے۔ اگر یہ واقعی گیارہویں صدی کا لکھا ہوا ہو تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس صوبے میں نثر و نظم اردو کا اس سے قدیم تر نمونہ اس وقت تک دستیاب نہیں ہوا ہم چاہتے ہیں کہ وہ اصحاب جو متاخرین صوفیہ کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں بالخصوص متوسلین خانقاہ عمادیہ و خانقاہ مجیبیہ اس رسالے کے متعلق اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔

+ اوراق پارینہ: یہ عنوان اشاعت زیر نظر میں نہیں ملے گا اس لیے کہ جو مضامین اس عنوان کے تحت شائع ہو سکتے تھے وہ مقالات کے اندر آ گئے۔ اس عنوان کی غرض کیاب مطبوعات و مخطوطات کا تفصیلی بیان ہے۔ آئندہ سے اس قسم کے مضامین کے لیے ایک خاص باب ہوا کرے گا۔

+ ہماری زبان: اس عنوان کے لیے اشاعت زیر نظر میں جگہ نہ نکل سکی۔ ماہ مئی سے اس کا آغاز ہوگا۔ اس عنوان کے تحت زبان اردو کے متعلق ہر قسم کے تحقیقی مضامین شائع ہوا کریں گے۔ اردو میں بکثرت الفاظ ایسے ہیں جن کا املا مختلف فیہ ہے۔ یا ان کا املا باعموم غلط لکھا جاتا ہے، سیکڑوں محاورات اور الفاظ ہیں جن کے متعلق ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا کہ اصل کیا ہے؟ بریں بنا صرف و نحو کے بہت سے قواعد بھی ابھی تک طے نہیں ہوئے۔ غرض یہ کہ بکثرت مسائل ایسے ہیں جو بحث طلب ہیں، اور یہ باب قائم کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ بالالتزام ان باتوں کے متعلق بحث ہوتی رہے۔

++ مطبوعات جدیدہ: کتابوں کے تبصروں میں ہم اور ہمارے معاون حق الوسع انصاف اور دیانت سے کام لیتے ہیں لیکن نہ ہم ہی معیار منزہ عن الخطا ہیں، اور نہ معیار کے معاونین، اس لیے بخوبی ممکن ہے کہ بغیر اس کے کہ ہمارے ارادے کو اس میں دخل ہو، انصاف کے خلاف کچھ باتیں قلم سے نکل جائیں، واقعات کی غلطیاں ہو جائیں یا یہ کہ مصنف کے نقطۂ نظر کو صحیح طور پر سمجھنے سے ہم قاصر رہیں۔ اس لیے ہم یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم بخوشی مصنفین یا دوسرے ذمہ دار اصحاب کو اس کا موقع دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے تبصروں سے اختلاف ظاہر کریں۔

اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کی اہم مطبوعات پر اس عنوان کے تحت نظر ڈالی جائے گی، لیکن ابھی ہمارے انتظامات مکمل نہیں ہوئے ہیں۔

دیوان معروف کی تصحیح زیادہ تر قیاس پر مبنی ہے، اس میں جو مدد ہمیں جناب سید حسن خاں صاحب کے خیال سے ملی ہے اس کا ہم شکر گزاری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں۔ اس دیوان میں ابھی اور غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی طرف توجہ نہ کی جا سکی۔

+ محاکمہ: ادبی معیار یا معاونِ معیار کو نہ یہ منصب کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں اور نہ یہ وہم کہ ان سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ یہ عنوان صرف اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ دوسروں کو یا خود نگاروں کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ مطبوعاتِ معیار پر مواخذہ کریں یا ان کی غلطیوں کی اصلاح کر سکیں۔ محاکمہ در اصل کا ترجمہ ہے۔ شعرا نے یہ لفظ اس مفہوم میں بکثرت استعمال کیا ہے۔

++ مقالات و مضامین کے ادبی مضامین: مختلف رسائل میں ادب اردو کے متعلق جو مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ان کا علم صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو کل رسائل کا التزام سے مطالعہ کرتا ہے۔ اور چونکہ ہر شخص کو اس کا موقع نہیں ملتا اور کثرت سے مضامین نکلتے رہتے ہیں جن سے عام طور پر لوگ بے خبر رہتے ہیں۔ یہ باب اس خیال سے قائم کیا ہے کہ صرف اس کے مطالعے سے ہمارے ناظرین کو دوسرے رسائل کے تحقیقی مضامین کی واقفیت ہوتی ہے اور وہ بشرطِ ضرورت ان کی طرف رجوع کریں۔ بعض صورتوں میں مضامین کے عنوانات صرف مجلوں کے نام اور ان مضامین کے متعلق مختصر اظہارِ رائے پر قناعت کی جا سکتی لیکن بعض مضامین کے ہم خلاصے بھی پیش کریں گے۔ مسلسل اصل بحث سے جس بات نہیں یعنی واقعات کی کوئی غلطی اگر نظر آئی تو اس کی طرف ہم اپنے ناظرین کی توجہ منعطف کرانا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی غرض دوسرے رسائل کی تحقیر نہیں بلکہ محض تحقیقِ حق ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم نے صرف اختلاف ظاہر کر دینے پر قناعت کی ہے۔ بشرطِ ضرورت ہم وہ اختلاف پیش کرنے اور ایسے دعووں کا ثبوت دینے کے لیے بھی آمادہ ہیں۔

++ عالمِ ادب: کتابوں اور مصنفوں کے متعلق ہر قسم کی اطلاعات اس عنوان کے تحت درج ہوا کریں گی۔ اس باب کی کامیابی مصنفین اور ناشرین کے اشتراکِ عمل کے بغیر ناممکن ہے۔ اور ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی سرگرمیوں سے ہمیں باخبر رکھا کریں۔

± تصویر: عبدالحق صاحب کی تصویر دوسرے رسائل میں پہلے بھی شائع ہو چکی ہے لیکن یہ تصویر ابھی حال میں لی گئی ہے اور حال میں کسی دوسرے رسالے میں نہیں نکلی۔ موصوف کی تصویر ہندوستانی اکاڈمی کی کانفرنس (منعقدہ جنوری) کے شعبۂ اردو کے صدر، ناظم انجمن ترقی اردو اور مسلم الثبوت انشاپرداز کی حیثیت سے شائع کی جا رہی ہے۔ ان کے مختصر حالاتِ زندگی اگر گنجائش نکل سکی تو اسی پرچے میں ورنہ آئندہ شائع ہوں گے

++ اس سے مراد ہے کہ یہ ابواب بلا استثنا کل پرچوں میں ہوں گے + اس سے مراد ہے کہ ضمیموں کے علاوہ یہ ابواب کل پرچوں میں ہوں گے۔ ± اس سے مراد ہے کہ ہر پرچے میں ان ابواب کا پایا جانا لازمی نہیں گو یہ کوشش کی جائے گی کہ کوئی پرچہ (بعض صورتوں میں بشمول ضمیمہ اور بعض میں باستثنائے ضمیمہ) اس سے خالی نہ رہے۔

آثارِ ادبیہ۔

(۱) مخمس مصحفی۔ (۲) غزل آصف الدولہ وجواب شمس النسا بیگم۔ (۳) مثنوی میر حسن۔

مخمس مصحفی در استغاثہ بجناب آصف الدولہ

۱ اول تو مدح گوئے پیمبر ہے مصحفی ۲ پھر نغمہ سنج مدحت حیدر ہے مصحفی
۳ مسکین فقیر ہے تونگر ہے مصحفی ۴ ملک سخن کا صاحب افسر ہے مصحفی
۵ سب جانتے ہیں اس کو کہ بے شر ہے مصحفی
۶ اس کا دہن ہے یہ کہ کرے شاہ کی ہجا ۷ ہے سب یہ اس غریب پر انشا کا افترا
۸ بغض اپنا وہ نکالے ہے لے خوش کا ارتلا ۹ کس واسطے کہ اس کا سخن اس پہ ہے رسا
۱۰ فکر غزل میں لاکھوں سے بہتر ہے مصحفی
۱۱ واقف ہیں میر سوز بھی خوب اس کے حال سے ۱۲ کچھ مطلع ہیں میر بھی اس کے کمال سے
۱۳ نفرت ہے اس کو ایسے تو قال و مقال سے ۱۴ لیکن عجب نہیں یہ زمانے کی چال سے
۱۵ گر سب کہیں کہ تیغ کے درخور ہے مصحفی
۱۶ ہے جائے عدل آصف دوراں تری جناب ۱۷ رکھتا ہے عرض تجھ سے یہ مداح بوتراب
۱۸ پہنچے یہ اپنی داد کو اور ہووے کامیاب ۱۹ تا سب کہیں کہ نہ جی ہے یہ باتیں بے حساب
۲۰ ابھی نہیں کسی کا ثنا گر ہے مصحفی
۲۱ آیا تھا لکھنؤ کو سمجھ کر یہ جائے امن ۲۲ گوشے میں پا شکستہ پڑا تھا برائے امن
۲۳ اخبار میں لکھا ہی کیا ماجرائے امن ۲۴ بگڑی نظر تھے ہے اب اس کو بجائے امن
۲۵ جو حکم ہو سو کیجے کہ مضطر ہے مصحفی
۲۶ اس کا نہ کوئی یار دیاور ہے اس جگہ ۲۷ نہ خویش و اقربا نہ برادر ہے اس جگہ
۲۸ پر کیا کہے جو حادثہ اس پہ ہے اس جگہ ۲۹ ہر روز اسی کی ہجو کا دفتر ہے اس جگہ
۳۰ ناحق مغلظات کا مصدر ہے مصحفی
۳۱ ایسی ہی بھتیں ہوئیں گر شہر میں عیاں ۳۲ اہل کمال کاہے کو کوئی رہے گا یاں
۳۳ کیا والے گا شعر و سخن میں کوئی زباں ۳۴ ہوویں گی شاعروں کی یہ سوائیاں جناب

۳۵ اس ہجو سے مت کہ نہ ہے مصحفی

۳۶ شاعر ہو آپ اس سے کہ ماتھے لے ہجو ۳۷ گو اس کے بیچ شعر و غزل از بر ہے ہجو

۳۸ کیا مدح پر جواب میں لکھے بجائے ہجو ۳۹ اس کی نے نہ بخیر اس کو سنائے ہجو

۴۰ کیا شاعری میں اتنا مکرر ہے مصحفی

۴۱ پوچھو تو یاں جواب ہے بہرک سوال کا ۴۲ پر تب جو حکم ہو کہیں فیصل قتال کا

۴۳ جب حرف رہ جائیں آیا قتال کا ۴۴ پھر کیا گمان نظم قصیدہ کمال کا

۴۵ حاصل کہ ہم فنون میں سرمایہ ہے مصحفی

---

[1] مخمس کا متن دو نسخوں کی مدد سے درست کیا گیا ہے۔ نسخہ کتب خانہ مشرقیہ۔ غ اور نسخہ ملوکہ فضل علی خاں صاحب۔ ف۔ غ میں عنوان اس طرح ہے: مخمس و خطاب نواب وزیر الممالک آصف الدولہ مرحوم بہ نام ہجو و جبلہا از انشا در حالت قلق گفتہ و بیان خوش شدن ہم گفتن شعرہ: او عالیجاہان مرزا سلیمان شکوہ بہادر و انکار آں و استغاثہ نمودن بجناب نواب آصف الدولہ بہادر مغفور۔ [2] شہ یا شاہ سے مراد سلیمان شکوہ ہیں، حالانکہ شاہ عالم زندہ تھے اور سلیمان ولی عہد بھی نہ تھے۔ [3] میر سوز آصف الدولہ کے استاد مشہور ہیں، مصحفی کے حسن کلام کے معترف تھے۔ تذکرہ ہندی ص ۱۱۱۔ [4] میر آصف کے درباری شاعروں میں تھے۔ "بر فقیر بسیار مہربانی می فرماید" تذکرہ ہندی ترجمہ میر ص ۲۴ مصحفی جو بھی میر کے مداح تھے، لیکن کبھی کبھی چوٹ بھی کر جاتے تھے۔ ایک قصیدے کا شعر ہے: آئیں نہ کریں مجھ سے فن شعر میں ہمسر ہم ۔ سودا نہیں جیتے کوئی سودا کی جگہ میر ۔ کلیات سودا نو لکشوری ص ۱۱۔ [5] ف: بحساب کی جگہ انتخاب، دونوں صورتوں میں مصرع غلط معلوم ہوتا ہے۔ [6] غ: لکھے اب بجائے ابا [7] تذکرہ خلاصۃ الشعرا، مصنفہ محمد میر جان محمدی الہ آبادی۔ سید راجی تخلص ہیں جس کی تاریخ اختتام ۱۲۰۰ سید انشا کا یہ ترجمہ مرتبہ رسالہ اردو مسلم گڑھ بابت ۱۹۳۳ء میں نقل کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ نے انشا کو لکھنؤ سے نکال دیا تھا، لیکن پھر واپس بلا لیا، کسی دوسرے تذکرے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ [8] انشا سے جھگڑا کہ مصحفی کی ذاتی شکست رسوائی ہوئی تھی، ایک معاصر تذکرہ نگار، صاحب مخزن الغرائب احوال علی ترجمہ انشا) کا قول ہے کہ صرف گدھے پر چڑھا کر تشہیر کرانا باقی رہ گیا تھا۔ [9] ف: اہل کمال کا ہے کہ رہنے کا یا [10] مصحفی لکھتے ہیں کہ انشا نے ابتدا کی، لیکن انشا بھی یہی کہتے ہیں: "قسم بخدا مرا الکنون کہ مرا پیچ ز ہجو تو سرد بود و ہست۔ ورنہ از طرفت گشت شروع ایں ہمہ اقوال مزخرف" آب حیات طبع نہم ص ۳۱۹۔

غزل آصف الدولہ

تری تیغ جب ہم علم دیکھتے ہیں
وہیں سر کو اپنے قلم دیکھتے ہیں

جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

شتابی سے آؤ دیے ہے سیما
کوئی دن کو راہ عدم دیکھتے ہیں

لے تم جو پیسے رقیبوں سے جا کر
ہمیں ہیں کہ سو سو ستم دیکھتے ہیں

بہت جھوٹے وعدے کیے تم نے ہیں
بھلا ہم تو تیری قسم دیکھتے ہیں

تو آنے دو کہنے یہاں ہم تو ہر شب
پڑے راستہ صبح دم دیکھتے ہیں

جنوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

جواب شمس النسا بیگم

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں

نہ قطرہ کوئی خون کا باقی ہے دل میں
دو آنکھوں میں ہم اپنی نم دیکھتے ہیں

تو آنے دو آنے یہاں ہم تو ہر شب
پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں

نگاہ کرم جس جگہ پر کرے تو
ہم اشہا باغ ارم دیکھتے ہیں

کرم سے ترے شاد و خرم ہیں یہ سب
مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں

زیادہ ہو یعقوب سے غم ہمارا
جو ہم تجھ کو یوسف کم دیکھتے ہیں

تبسم بلب ہیں خاصی ہے مردم
ہم اپنی ہی آنکھوں میں نم دیکھتے ہیں

تمہیں کیا غرض ہے جو آؤ یہاں تک
ہمیں آن کر آپ قدم دیکھتے ہیں

کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے کی
اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں

کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ
نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

مثنوی میر حسن غیر مطبوعہ

شام کو میں تھا کہیں بیٹھا ملول
یعنی تھی میرے تئیں فکر فضول
یک بیک اٹھ بیٹھنے کی دی ہوس
آ گئے دن فکر میں بیٹھا ہوں بس
گھر سے باہر نکلتے نکلا بے خبر
چل دیا تھا، صنعت خدا کی سیر کر
فکر پھر آ گیا تو سب سے بعید
شام میں ظاہر ہوا صبح امید
سن کے یہ مژدہ ہوا شاد میں یک بیک
سیر کرتا یوں گیا بازار تک
دیکھا بستوں میں اک انبوہ ہجوم
تب کہا میں نے کہ یہ کیسی ہے دھوم
اک لگا کہنے کہ یہ چل ہے خبر
چل کے جائے ساتھ تو بھی سیر کر
ساتھ ساتھ اس کے گیا میں بھی وہاں
جس جگہ تھا جشن عشرت کا سماں
دیکھتا کیا ہوں کہ ہے صحرا قیاس
روشنی کا خانہ ہے دریا کے پاس
لے زمیں سے آسماں تک ہے بسہ
سب سے روشن دیپ ہے اس کا چمن
آتشیں گل روشن تھا اس پر اک چراغ
ہر طرف جس کا جھلکتا تھا داغ

تھا شعاعِ روشنی کا بس وفور
شام سے لے صبح تک تھا وقتِ نور
بیچ دریا پر جلے تھے جھلمل چراغ
تھا عدو کو داغ جوں لالے کے داغ
دود اس کا ہوتا تھا جوں سمند
آتشِ حسرت پہ تھا دشمن سپند
کیا بیاں اس کا کروں میں سر بسر
طائرِ تقریر کے جلتے ہیں پر
روشنی اس دھج کی ہوتی ہے کد
اک سرا جس کا ازل ہو اک ابد
روشنی کیا آگ تھی اس جا عیاں
اس میں آتش بازی کا بھی تھا سماں
اک چراغاں کا نہ تھا تنہا ظہور
موج زن دریا میں تھا دریائے نور
کاسۂ مہتاب تھا اس کا حباب
نور سے پر تھا مثلِ آفتاب
حلقۂ دودِ چراغاں تھا بھنور
لہر اٹھنے کی سی اس میں ہے سحر
چلمنیں دونوں طرف مثلِ کنار
زیب بخشِ موجِ دریا وار پار
روشنی کے جھاڑ تھے اس میں یوں
نخلِ مرجاں نکلے ہے دریا سے جوں

دیکھ روشن اس میں کاغذ کے کنول
جل گئے غیرت سے پانی میں کنول
جنبشِ ہر شعلۂ شمع و چراغ
موجِ دریا کے تئیں کرتی ہے داغ
بیچ میں جب اس کے چھٹتے تھے انار
نور کی سی لہر تھی فوارہ وار
اٹھتی آتشبازیوں کے چھٹنے جب
نور کو وہ طور تھا نظروں میں تب
ہو رہے اس میں چھوٹے اس نمط
چھوٹتی ہیں جس طرح دریا میں بط
جس کو کہتے چکر ہیں وہ نہ تھا
وجد میں آتش کا دل تھا برملا
بس کہ چھٹتے تھے ستارے بے شمار
آسماں کی سی زمیں پر تھی بہار
پھلجھڑی، چھچھوندر، گلریز و انار
کرتے جاتے تھے طبقِ گل کے نثار
یہ بھی گل اس واسطے در کار تھے
اس میں بھی روشن ہوا پر بار تھے
تھیں دو روشن مورتوں کی ٹٹیاں
مردمِ ناری تھے یہ جلوہ کناں
متصل چھٹتی تھی از بس پھلجھڑی
نور کی بارش کی گویا تھی جھڑی

جگمگاتی تھی ... ق ہیں جگمگانے سے گل میں روغن تھا وہاں ہر اک چراغ سے تھی لہر کوئی کی سی ۱۱

نہ زمیں تھی اور نہ تھا وہ آسماں
وہی روشن ہو رہا تھا اک جہاں
ایسی آتشبازی چھٹتی ہے کہیں
آسماں ہو جس کے آگے گل زمیں
آتشیں گل دیکھ یہ اور یہ چراغ
آسماں کا دل ہوا تھا باغ باغ
جس طرف جاتی تھی واں تک نگاہ
ہوتی گلبازی سے پاتی تھی نہ راہ
دیکھ کر اس وقت یہ سوجھی دلیل
ایسی ہی ہونے کی گلزار خلیل
سیکڑوں لاکھوں تماشائی ہزار
روشنی کے گرد تھے پروانہ وار
بس کہ تھی سیر ہوائی کی ہوا
شوق میں دیدہ ہوائی سب کا تھا
نور کے دریا کو یوں ثابت کیا
اور سنے اس کا مجھ سے ماجرا
تھے شناور اس کے تو اس میں جہاں
بھر رہے تھے چنڈول و بجرے بلوباں
مور پنکھی پالکی اور اسپ ناؤ
فیل زریں پر تھا یوں بناؤ
تو کہے دریا میں تھا کوہ طلا
یا کہ بادل تھا سنہری شام کا
فیلوں پہ زریں دکھیں جھلیاں
ابر میں تھے جو کے جھمکیاں

یا مگر اس روشنی ہی کے سبب
سیر کو آئے تھے مل کر روز و شب
برق کے مانند سب زریں لباس
پہنے پھرتے تھے خوشی سے آس پاس
پھرتے تھے سب بادلہ اور پہنے تاش
کیا سپاہی کیا غنی کیا خواجہ تاش
بادلے میں غرق سب اسباب تھا
پانی اس دریا کا جوں سیماب تھا
کہکشاں سی چوکی جب آئی نظر
یوں ہی ٹھہری دل پہ اپنے سر بسر
نور کے دریا سے بھر بھر کر گھڑے
سر اپر لے لے فرشتے ہیں کھڑے
دیکھنا ان مشکیوں کی آب و تاب
لو میں دریا کے ہوا تھا آب آب
کشتیاں یوں تھیں جواہر کی رواں
جس طرح دریا میں تیریں کشتیاں
سبز فانوسوں کی اس میں تھی جھلک
جس طرح پانی پہ سبزے کی لہک
رنگ کے شیشے تھے اس میں ہر طرح
دل بھرے تھے دیکھ فرحت سے جو بھر
دیکھ آرائش کے تختے مرد واں
کہتے تھے یہ دیکھ کر باغ رواں
باغ اس خوبی کو پہنچے ہے کہیں
یہ تماشا ہم نے دیکھا بس کہیں

کیتکی جوہی چنبیلی موگرا
سیوتی شبو گلاب اور موتیا
جعفری صد برگ عباسی بشکل
اشرفی گل لالہ نرگس ہوں تمام
چشم گیتی نے نہ دیکھا زینہار
موسم ہر گل کی ہوئے اک بہار
گرچہ تھے وہ دیر میں کاغذ کے گل
پر مفصل بہرے تھی اس بزم کا گل
رنگ کو کب گل کے ہوتے ہے قرار
یہ وہ گل ہیں جن کی دائم ہو بہار
تھے وہ ان تختوں پہ ارباب نشاط
عیش کی ہر طرف بچھتی تھی بساط
دیکھ کر وہ ناچ ان کا راگ رنگ
مشتری تھی دنگ اور زہرہ دنگ
نوبت نقارخانہ کی صدا
چھا گئی تھی ارض سے لے تا سما
بجتے تھے نفیر سرا استاد سے
سب ہنر نوک زباں پر یاد تھے
اس قدر شہنائی والے خوش نوا
بس کہ کچھ تھے لحن داؤدی ادا
مشعلوں کے ہر طرف روشن تھے جھاڑ
تو کہے وہ تھے تجلی کے پہاڑ
اس میں نوشہ کا کروں میں کیا بیاں
نور حق تھا اس تجلی میں عیاں

[illegible] تی ہیں ۔ [illegible] تی ہیں کھن چکر کی جگہ سرخ کھنچ ہے ۔ بنا پ تپال کی [illegible] ہے کہ کھن چکر [illegible]

جھلکی سمجھو یہ ہیں وہ شاں
ہے سنے جو جا بجا ایک کہا جو بیاں
کس کی ہو شادی یہ جو کس کی ہو فرح
جو فرح ملے کسی سے بیاں یہ ہے
جب کہا اک شخص نے تو اس قدر
عالم سے ہو کیا جہاں کے بے خبر
پوچھ تو اب اک نجیل ... نام
مالک ... چھپ کی ... شام
... تو ... ثانی ہے وہ
عدل اور انصاف کا بانی ہے وہ
صاحب شمشیر اور باب کرم
جعفر ... جس کے ... کر
منزلت ... عقل ہو ش
چشم ... چراغ ہوش گوش
... افضل کا
... عالی ... از
... نکتہ ... اس
ماہ خوبی ... افزائے جہاں

تیغ میدان شجاعت روز رزم
ابر نیسان سخاوت روز بزم
دشمنوں کے واسطے برق غضب
دوستوں کو مایۂ عیش و طرب
عادل ایسا ہے کہ جس کے عہد میں
شمع سے بچ کر چلے باد صبا
دست و بازو میں یہ قوت ہو اگر
تیغ علم کو پردہ کھینچ کر
دو کرے اس کوہ کو ... کی عماد
تیر جائے ... صاف ... تار
اور سخاوت میں تو ہو وہ یکہ تاز
جس کو چاہے دم میں کر دے بے نیاز
کیا کروں میں اس کا وصف بار بار
بند ہوتی کب قلم ہے ...
ہو سلیماں جاہ اور دارا حشم
جس کا ہے افلاک اک ادنیٰ خدم
شان و شوکت کا کروں میں کیا بیاں
قیصر و خاقاں سے ہوں خادم جہاں

قائم اس کا حق رکھے جاہ و جلال
اس کے دشمن کو رکھے نت پائمال
اس کا ہے فرزند اک عالی جناب
آصف الدولہ بہادر بے خطاب
نیک طینت اور پاکیزہ صفات
اس کی شادی ہو یہ اور اس کی برات
عیش و عشرت کا ہر اک جا ذکر ہے
آج فکر ... کو اپنی فکر ہے
سن کے بولا یوں دعا نیر حسن
نت رہے روشن وہ شمع انجمن
حق رکھے روشن چراغ اس کا سدا
جس نے اک عالم کو روشن کر دیا
شعر کا بھی غرض طرفہ ہے یہ فن
تا ابد جس کا ہے روشن یہ سخن
ذرہ کی کچھ اس سے نہیں مجھ کو طرف
گر قبول افتد زہے عز و شرف

... ق میں ... ہے ... ق میں ... ہے ... ق میں ...
ہے ... ق میں ... جناب خیال کی رائے میں ... ہونا چاہیے۔
... ق میں ... جناب خیال کی رائے ہے کہ لفظ ... ابتدا میں
پڑھنا چاہیے۔ ... لیکن ... اور ... بھی ہو سکتا ہے ... ق جعفر
... دونوں مصرعوں میں ... غلط ہے، ایک میں ... ق ...
... ق ... صاحب شمشیر اور باب کرم ...
... جناب خیال کی رائے کے مطابق ہے ... ق تا ابد جس کا رہے روشن یہ فن۔
... سن چاسی ... ہے

غالب

میرزا غالب کے غیر مطبوعہ خطوط

(۱)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان عزیز از جان منشی سیل چند کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ کیوں صاحب ہم تو تم کو اپنا فرزند سمجھیں اور تمہارا یہ حال کہ مراسم فرزندی بجا نہیں لاتے۔ خط لکھنا تم نے یک قلم موقوف کر دیا اور بھائی بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں ہے۔ نہ طاقت باقی ہے نہ حواس درست ہیں۔ آج کے نواب صاحب کے خط میں دو جگہ غلطیاں ہوئیں مجھ سے لکھا کچھ چاہتا ہوں لکھ کچھ جاتا ہوں۔ بھیا اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا۔ کل بچا پرسوں مرا۔

اس خط کا جواب مجھ کو جلد لکھو اور اس میں یہ لکھو کہ احسان حسین خاں اور ان کے بھائی مظفر حسین خاں جو لکھنؤ سے آئے ہیں نواب صاحب کی سرکار سے ان کا کیا درماہہ مقرر ہوا ہے اور تعظیم و توقیر کا کیا رنگ ہے۔ دربار میں جو آتے ہیں تو بیٹھتے کہاں ہیں۔ اس خط کے جواب کا طالب غالب ۱۱ جون

۲

برخوردار نور چشم منشی سیل چند میر منشی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ اگلے مہینے میں اگست سنہ [illegible] تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی اس کا روپیہ ابتک نہیں پہنچا۔ میں تو جس دن ہنڈوی آتی ہے اسی دن یا دوسرے دن اپنے مختار کار کے ہاتھ کر وہ بھی مہاجن سے بیچ ڈالتا ہوں مگر اس مختار کار کو جس کے ہاں ہنڈوی آتی ہے اس نے روپیہ اب تک نہیں دیا۔ ستمبر کو وہ ہنڈوی بیچ کر روپیہ میں نے لے لیا تھا ۱۱ آج اٹھارہ ہے۔ مختار کار کو روپیہ اس نے اب تک نہیں دیا جس سے تم نے ہنڈوی لکھوائی ہے اس کو تم تاکید کرو کہ یہاں کے مہاجن کو روپیہ دینے کی تاکید لکھے تاکہ مختار کار کا روپیہ پٹ جائے۔ غالب

۳

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی سیل چند صاحب میر منشی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے دوام صحت و ترقی درجات معلوم فرمائیں۔ اگرچہ از روئے خطوط حضور صحت و عافیت حضور معلوم ہوئی ہے لیکن یہ کہیں سے نہیں سنا کہ غسل صحت کیا یا کس دن کریں گے۔ آپ سے فقیر کا سوال ہے کہ مجھ کو لکھیے کہ حضرت غسل کس دن فرمائیں گے۔ اور اگر موافق میری آرزو کے نہا چکے ہوں تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔ خیر و عافیت کا طالب غالب۔

۲۵ دسمبر سنہ ۶۳ء

افسانے

(۱) گوتمی مصنفہ [illegible] مترجمہ منصور احمد صاحب [illegible]

(۲) بیانچ مصنفہ [illegible] (مترجمہ [illegible])

(۳) مکدہ مصنفہ [illegible] (مترجمہ [illegible] صاحب [illegible])

گوتمی

مصنفہ ایوان بونین (مترجمہ منصور احمد صاحب)

ہمالیہ کے دامن میں ایک مرتبہ [illegible] بادشاہ اپنے محل کے دیوان [illegible] ایک آیا۔ گاؤں خاص کے [illegible] بہت غریب لیکن شریف خاندان میں گوتمی پیدا ہوئی۔

یہ لڑکی [illegible] تھی اور [illegible] نظر میں وہ کسی قدر [illegible] معصوم سی نظر آتی تھی۔ اس کے [illegible] ہمیشہ جیسے [illegible] اس کی [illegible] جبر حقیقت نے اس کے [illegible] [illegible] [illegible] اس کے [illegible] ساتھ [illegible] [illegible] لقب کا [illegible] گوتمی [illegible] کرتے تھے۔ لیکن گوتمی [illegible] ہوتی تھی۔ ہر حکم وہ خندہ پیشانی سے بجا لاتی تھی اور ہر حکم کو وہ ایسے اطاعت کے ساتھ قبول کرتی تھی۔ جیسے:۔

بہت اچھا بہن آقا۔ میں ابھی یہ کام کرتی ہوں!

بہت اچھا بیگم صاحبہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گی۔

گوتمی بہت دانشمند لڑکیوں میں سے تھی۔ لیکن اس نے کبھی کوئی بے دانشی کی بات نہیں کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت باتیں نہ کرتی تھی اور صبح سے شام تک اپنے کام میں مصروف رہتی تھی۔ اس کا لباس غریبانہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ہی قسم کا۔ لیکن ہمیشہ صاف ستھرا

ایک دن ایک نوجوان نے جو خوبصورت اور امیر تھا اور اس علاقہ کے بادشاہ کا بیٹا تھا اسے ایک دریا کے کنارے پر دیکھا وہ اس وقت اپنی بہنوں اور بھائیوں کے کپڑے دھو رہی تھی۔ شاہزادے کے دل میں خیال آیا کہ یہ لڑکی بڑی عاقل اور فرمانبردار ہے۔ لیکن کوئی اس کا ہاتھ مانگنے والا نہیں۔ ماں باپ بھی نہیں

اس نے خیال کیا۔

اس کے ماں باپ کہتے ہوں گے" اس کا کیا علاج۔ گوتمی ہمارے بچوں میں سب سے زیادہ ہوشمند ہے۔ وہ حسین ہے۔ وہ ہماری لڑکی معلوم ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک دائی ہے۔ اس سے کون شادی کرے گا؟ جلد یا بدیر جو شخص بھی اس سے شادی کرنا چاہے گا یہ اُسے قبول کر بیٹھے گی۔ کیونکہ وہ انکار کرنا نہیں جانتی۔ کاش یہ آدمی بدصورت نہ ہو! اور اس بچے کو جو اس لڑکی سے پیدا ہو بہترین تربیت دے

بادشاہ کا بیٹا یہ باتیں سوچ رہا تھا اور گوتمی کپڑے دھو کر سورج کی کرنوں سے چمکتے ہوئے پانی میں بیٹھی نہا رہی تھی۔

اپنے تمام کپڑے اتار کر اس نے چھاتی سے گھٹنوں تک ایک چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اپنے سیاہ بال پھیلائے وہ دانتوں سے اپنے دانت صاف کر رہی تھی اور اپنے سانولے پنڈے پر پانی ڈال رہی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ شاہزادہ درختوں کی جھلملیوں میں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے گوتمی کو آواز دی، اور اس کے پاس جا کر مسکراتے ہوئے ملاحت لطف آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

تم کتنی دل آویز ہو گوتمی، اور دلی بالکل جیسی صیاد لوگ تمہیں کہتے ہیں۔ سیدھا سادا صاحب سی جیسے والی مد قامت لڑکیوں کو لوگ ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔ گوتمی میرے ساتھ تم مدت فرما مرداری ہو۔ آؤ چپ چاپ میری آغوش میں آ جاؤ۔ اس وقت دریا کی تنہائی میں ہماری ہم آغوشی کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔

گوتمی شاہزادے کے الفاظ سن کر شرما گئی اور آہستہ آواز میں کہنے لگی:

ہاں میرے پیارے آقا، میرا سر تسلیم آپ کی مرضی کے آگے خم ہے!

شاہزادہ جب گوتمی کے حسن سے محظوظ ہو چکا تو اس نے دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی ہے اور اس کی آنکھیں، اگرچہ ان میں فکر و خیال کی کوئی نئی جھلک پیدا نہیں ہوئی پھر بھی پہلے سے زیادہ سحر آگیں نظر آ رہی ہیں۔ اس کے بعد وہ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں اکثر ملا کرتے، اور جب کبھی شاہزادہ حکم دیتا گوتمی وہاں موجود ہوتی۔ اس نے کبھی سرتابی نہیں کی۔ اور نہ بہت زیادہ ملنے جلنے سے اس کی فروتنی اور فرمانبرداری میں فرق آیا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ گوتمی کو اپنا جسم ایک بچے کے وجود سے بوجھل معلوم ہونے لگا۔

اس وقت شاہزادے نے اسے اپنی کنیزوں میں داخل کر لیا۔ گوتمی اپنے غریبانہ ساز و سامان سمیت محل میں داخل ہو گئی، اور زمانہ گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ ولادت کا دن آ پہنچا۔ اس دن محل کی مہتمہ نے اسے کہا۔

گوتمی دستور کے مطابق جب کسی بیگم کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے تو وہ اپنے باپ کے گھر چلی جاتی ہے لیکن تم بیگم نہیں ہو بلکہ کنیز ہو۔ اس لیے اپنے ماں باپ کے گھر نہ جاؤ اور اس حد سے تجاوز نہ کرو جو موزوں اور مناسب ہے

گوتمی نے اسے سلام کیا، اٹھی اور محل کے بڑے دروازے سے باہر نکل گئی۔

پاس ہی ایک نہر بہتی تھی۔ اس کے چوبی پل پر سے گزر کر اس نے دیکھا کہ ایک بڈھا ایک کھوکھلے درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ یہ ایک اندھا فقیر تھا جس نے ایک میلے چیتھڑے سے اپنا ستر چھپا رکھا تھا، اور جس کے بازو، ٹانگیں، سینہ اور چمکتی ہوئی پیشانی پر ہمیشہ تپتی ہوئی دھوپ اور سنسناتی ہوئی ہواؤں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

فقیر نے اسے ٹھہرایا اور تجربہ کار بلیوں کی طرح اپنی بے نور آنکھیں اوپر اٹھا کر اس طرح مسکرایا کہ اس کی مسکراہٹ میں رمز و التفات دونوں موجود تھیں۔

اس نے کہا،

گوتمی میں تجھے دیکھ نہیں سکتا۔ مگر میں تیرے آنے کو محسوس کر رہا ہوں۔ گوتمی، جس راہ پر تو جا رہی ہے

ضامنہ بچے سے بے مھک کرے :

گوتمی نے جھک کر شہزادے کے قدموں کو چھوا اور اپنے راستے پر آگے بڑھ گئی۔ اسی راستے میں دو چار سے ننھے ہوئے جگنو ہیں۔ اس کے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا خیر مقدم اس نے خوشی کے آنسوؤں سے کیا بچے کو آغوش میں لئے وہ شاہزادے کے محل میں واپس آگئی وہ اس ننھی سی جان کو جو روز بروز نشوونما حاصل کر رہی تھی اور جو حسن و شعور میں ترقی کر رہی تھی دیکھتی چومتی، مس کرتی۔ سینے سے لگاتی اور فرط مسرت میں آپے سے باہر ہو جاتی۔ ◆

اگرچہ گوتمی شاہزادے کو بہت عزیز تھی۔ اور اگرچہ آنکھوں میں سرمہ اور چہرے پر غازہ ملکر اس کے بالوں کو سونے کے تاروں میں گوندھ کر، ریشموں کا سا نازک ململ لباس پہنا کر، پھولوں کی بارش میں باجے گاجے کے ساتھ اسے شاہی محل میں لے جایا گیا اور وہ شاہزادے سے وابستہ ہو گئی۔ لیکن یہ الفاظ اس سے کسی نے نہ کہے "گوتمی! میرا جذب دل تجھے پھر کھینچ لایا ہے"

بچے کی پیدائش کے بعد گوتمی نے نہایت صبر کے ساتھ نوجوان شہزادے کی سرد مہری کو برداشت کیا۔ وہ ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل، بچے کی پرورش کرنے لگی۔ جو کہ مشتاق وہ تھی کہ شاہزادے کو تکلیف یا جسم کو احساس نہ ہو۔ ◆

وہ محل کے احاطے کے اندر حوض کے کنارے ایک کٹیا میں رہا کرتی۔ اور ان ہنسوں کی پرورش میں اپنے دن گزارتی جو حوض میں کنول کے پھولوں اور اودے سبزے کے درمیان تیرتے رہتے تھے۔

اسی طرح وہ کچھ مدت تک نہایت خوش رہی، اور خوشی کے معین لمحات کے بعد غم کی مشکل گھڑیاں گزرنے کے لیے۔ اور گیروے کپڑے پہننے والوں میں شامل ہو کر اس تنہا بچے راستے پر چلنے کے لئے نامعلوم طور پر تیار ہوتی رہی جو قسمت کے پردے کے پیچھے اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ ◆

مبارک ہیں وہ جن کے دلوں میں عجز و انکسار ہے
اور جو دنیاوی بندھنوں کو توڑ چکے ہیں
جنھیں کائنات کی کسی چیز سے الفت نہیں کیونکہ
ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں بے پایاں مسرت کا راج
ہے اور وہ ایک پرندے کی طرح ہیں جس کے کندھوں
پر اپنے پروں کے سوا اور کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ ◆

سانپ

مصنفہ ایمبروز بیرس
مترجمہ ثنائی

"یہ تحقیق شدہ امر ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس سے کوئی صاحب عقل اب انکار نہیں کرتا کہ سانپ کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے، اتنی زبردست کہ باوجود اپنی خواہش کے انسان اس کے زیر اثر آ جاتا ہے اور اس کی جانب کھنچ کر اس کا شکار ہو جاتا ہے۔"

ہارکر ڈریسنگ گاؤن اور سلیپر پہنے آرام دہ کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ بیشرلی کی کتاب "سائنس کے عجائبات" میں سے مندرجہ بالا سطور پڑھ کر وہ مسکرایا۔ "اس میں عجیب بات صرف یہی ہے" اُس نے اپنے دل میں کہا "کہ موبیسٹر کے زمانہ کے صاحب عقل ایسی واہیات باتوں پر یقین رکھتے تھے جنھیں آج کل کے جاہل بھی جھوٹ سمجھتے ہیں۔"

خیالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیونکہ برٹن غور و خوض کرنے کا عادی تھا۔ اور بغیر اپنی آنکھوں کا رخ بدلے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر کتاب نیچے کر دی۔ جیسے ہی کہ کتاب اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی کمرے کے ایک ایک گوشے میں کسی چیز نے اس کی توجہ ماحول کی طرف منعطف کر دی۔ اُس کی مسہری کے نیچے اندھیرے میں روشنی کے دو نقطے تھے۔ ایک دوسرے سے تقریباً ایک انچ ....

ممکن ہے کہ یہ نقطے اس گیس کے لیمپ کا عکس ہوں جو اس کے اوپر دیوار کی کانس سے آویزاں تھا۔ اس نے یہ خیال کیا۔ اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کسی چیز نے۔ کسی احساس نے، جس کا تجزیہ کرنے کا خیال اسے نہیں ہوا۔ اس کو مجبور کیا کہ کتاب نیچی کر کے اس چیز کو دیکھے جسے اس نے پہلے دیکھا تھا۔ روشنی کے نقطے اب بھی وہیں تھے۔ ان کی روشنی پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔ ان میں ایک ہلکی سبزی مائل چمک تھی جسے وہ پہلے نہ دیکھ سکا تھا۔ اس نے سوچا کہ ان نقطوں نے حرکت کی تھی۔ اس سے قریب تر ہو گئے تھے۔ وہ اب بھی اتنے اندھیرے میں تھے کہ معمولی توجہ سے ان کی حقیقت نہیں ظاہر ہو سکتی تھی۔ وہ پھر مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔ یکایک کتاب کی ایک عبارت نے کسی خاص خیال کو ابھارا جس سے وہ چونکا اور تیسری مرتبہ اس نے کتاب اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹائی۔ اور اس کا ہاتھ صفحے کے کنارے سے کھسک گیا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر الٹی ہوئی زمین پر جا گری اور اس کی پشت اوپر تھی۔

برٹن جھک کر فرش سے مسہری کے نیچے تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ جہاں نقطے تیز روشنی سے چمک رہے تھے جیسے وہ چمکیا تھا۔ اس کی نگاہیں بے جنبش تھیں۔ مسہری کے

سیدھے ایک بڑا سا سانپ نظر آیا۔ وحشی کے نقطے اُس کی آنکھیں تھیں۔ اس کا کرّہ سرکنڈے کی مانند والے حلقے سے گول کیا ہوا نکلتے ہیں۔ لگا ہوا۔ اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے چہرے سے مقناطیسی جذبہ ہے اور اس کی پیشانی اس کی نظروں کے مرکز پر جو ان کا مرکز ہی تھیں۔ آنکھیں اب صرف وحشی نقطے دکھائی دیتیں وہ اس کی آنکھوں سے ایسے سحر انداز سے دیکھ رہی تھیں جیسے کچھ کہہ رہا ہو رہا تھا۔

۲

کسی جدید شہر کی خواب گاہ میں سانپ کی موجودگی کوئی عام واقعہ نہیں کہ اس کی توجیہ بیکار ہو۔ ہارکر برٹن جو ۳۵ سال کا کنوارا، عالم، بیکار اور ہنرمند، دولت مند، تندرست، مقبول اور دور دراز کے غیر مانوس ملکوں کے سفر سے حال ہی میں سان فرانسسکو واپس آیا تھا۔ ہوٹلوں میں ٹھہرنے سے اسے طبعی نفرت تھی اور اسی لیے اس نے اپنے دوست اور مشہور سائنس دان ڈاکٹر ڈرورنگ کی دعوت بخوشی قبول کر لی۔ ڈاکٹر ڈرورنگ کا بڑا قدیم وضع کا مکان شہر کے غیر معروف حصے میں تھا۔ اس کی ساخت سے نمایاں سنجیدگی پیدا تھی۔ یہ اپنے بدلے ہوئے ماحول سے التفات کرنے پر آمادہ نہ تھا اور اس بیگانگی کی وجہ سے جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی اس میں موجود تھی۔ خصوصاً ایک بازو جو نمایاں طور پر بے جوڑ اور مقصد کے لحاظ سے بھی ویسا ہی باغی تھا کیونکہ یہ ڈاکٹر ڈرورنگ کا عجائب خانہ اور وحوش خانے کا مجموعہ تھا۔ یہیں وہ اپنی فطرت کی علمی افتاد کو ان مخلوقات کے مطالعہ حیات سے آسودہ کرتا جن سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اور اس کی یہ دلچسپی

"نیچے نیچے" تک ہی محدود تھی کہ "ادنیٰ طبقے" والوں اس کے وحوش خانے میں پہنچنے کے لیے اپنے آپ کو ادنیٰ سانپ کی خاصیت سے موصوف کرنا پڑتا تھا۔ علمی مشاغل کا میلان کیڑے مکوڑے اور رینگنے والے جانوروں کی طرف تھا۔ اسے فطرت کے ان گونا گوں سے الفت تھی اور وہ اپنے آپ کو علم حیوانات کا زولا[1] سمجھتا تھا۔ اس کی بی بی اور بیٹیاں چونکہ اس کے اس عالی ذوق میں شریک نہ تھیں اس لئے وہ "سانپ گھر" کی دلچسپیوں سے بالکل محروم تھیں۔ اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ اگرچہ ڈاکٹر نے انہیں اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کی دولت کے ذریعے اپنے ماحول کی عظمت و شوکت اور اپنی آرائش و زیبائش میں سانپوں سے بڑھ جائیں۔

آرائش کے لحاظ سے "سانپ گھر" میں ایسی سخت سادگی تھی جو اس کے رہنے والوں کے خیال کے موافق تھی۔ ان میں سے بہتوں کے لیے وہ آزادی سود مند نہیں ہوتی جو زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں یہ تکلیف دہ خصوصیت تھی کہ وہ زندہ تھے۔ لیکن اپنے کمروں میں انہیں صرف اس قدر ذاتی آزادی حاصل تھی کہ وہ ایک دوسرے کو کھا نہ جا سکیں۔ اور برٹن کو ہوشیار کر دیا گیا تھا کہ

[1] زولا فرانسیسی ادیب۔ اُس کے ناول زیادہ تر ادنیٰ طبقے کے لوگوں سے متعلق ہوتے تھے۔ (مترجم)

حقیقت و روایت کی حد سے بڑھ چکی تھی کہ ان میں سے بعض بسا اوقات مکان کے ایسے حصے میں پائے گئے جہاں ان کے لیے اپنی موجودگی کی وجہ بتانی مشکل ہو جاتی۔ "سانپ گھر" کی کراہیت انگیز موجودگی کے باوجود بھی — اور سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ ہی روز بعد اسے بالکل ہی بھول چکا تھا — "زرد رنگ والے" کی سکونت اس کی طبیعت کے موافق تھی۔

۳

تعجب اور حقارت کے سوا مسٹر بریشن نے اور کچھ محسوس نہ کیا۔ اس کا پہلا خیال فقط بھاگ کر نوکر بلانے کا ہوا۔ لیکن باوجود اس کے کہ گھنٹی کا فیتا بالکل نزدیک ہی لٹک رہا تھا اس نے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اسے یہ شک ہوا کہ اس کی اس حرکت سے ڈر جانے کا شبہ ہو سکتا تھا حالانکہ وہ مطلقاً خوف زدہ نہ تھا۔ بہ نسبت خطرے کے اسے اس موقع کے بھونڈے پن کا زیادہ احساس تھا۔ جو قابل نفرت مگر مہمل تھا۔

یہ سانپ اس جنس سے تھا جس سے بریشن ناآشنا تھا۔ اس کے طول کا وہ صرف قیاس ہی کر سکتا تھا۔ اس کا سب سے نمایاں حصۂ جسم اس کے بازو جتنا موٹا تھا۔ اگر یہ خطرناک تھا تو کیونکر؟ کیا زہریلا تھا؟ یا گلا گھونٹنے والا؟ خطرات فطرت سے ہشیار کرنے والی علامتوں کا علم بھی اس وقت اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے کبھی یہ معمہ حل نہیں کیا تھا۔

اگر خطرناک نہیں تو کم از کم اس کی موجودگی ناگوار خاطر ضرور تھی۔ وہ ان اس کی ضرورت نہ تھی بے تکی ...

تھی۔ گنجینہ انگوٹھی کے لائق نہ تھا! ہمارے زمانے اور ہمارے ملک کے وحشیانہ ذوق نے بھی اس جگہ کو، جنگل کی اس وحشی ہستی کے لیے موزوں نہ بنایا تھا اگرچہ اس ذوق نے کمرے کی دیواروں کو تصویروں سے اور کمرے کے فرش کو فرنیچر سے اور فرنیچر کو آرائش کے سامانوں سے بھر دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کیسا روح فرسا خیال تھا۔ اسی ہوا میں سانس لینا جس میں ایک سانپ سانس لے رہا ہو!

انہیں خیالات نے اسے کچھ کرنے پر آمادہ کیا۔ یہی وہ عمل ہے جسے ہم "فکر و فیصلہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم دانا یا نادان ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح خزاں کی پتیاں زمین یا جھیل کی سطح پر گر کر اپنی ہم جنسوں سے زیادہ یا کم ذہانت کا ثبوت دیتی ہیں۔ انسانی افعال کا راز بالکل کھلا ہوا ہے۔ کوئی چیز ہمارے اعصاب میں تشنج پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی مضائقہ ہے اگر اسی اعصابی تغیر کا نام "قوت ارادی" رکھ دیں۔؟

بریشن کھڑا ہو گیا۔ اور بغیر سانپ کو بھڑکائے پیچھے پیچھے ہٹتے دروازے سے باہر نکل جانے کے لیے تیار ہوا۔ لوگ اسی طرح بڑوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں کیونکہ بڑائی "طاقت" ہے اور طاقت "خطرہ" ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بغیر کسی رکاوٹ کے الٹے پاؤں چل کر وہ آسانی سے دروازے تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر سانپ اس کا تعاقب کرے تو اسی ذوق نے جس نے دیواروں کو نقش و نگار سے بھر دیا تھا، خونخوار مشرقی ہتھیاروں کو بھی دیواروں سے آویزاں کر دیا تھا اور وہ انہیں میں سے ایک ہتھیار کو

مرنے کی حالت کے لحاظ سے اُٹھنے لگا تھا۔۔۔۔
اس وقت میں سانپ کی آنکھیں دوبارہ پوری طاقت سے چمکیں۔!

برٹن نے [illegible] پنکھ کے دہنا پاؤں زمین پر سے اٹھایا۔ اس وقت اُسے اس فعل سے سخت نفرت تھی "میں بہادر کہلاتا ہوں!" اُس نے آپ ہی آپ کہا "تو بہادروں کی طرح اس مخلوق کے سوا اور کچھ نہیں! چونکہ کوئی میری بزدلی کا شاہد نہیں۔ اس لیے میں پیچھے ہٹ جاؤں؟"

(۳)

دہنا ہاتھ کرسی کی پشت پر رکھے وہ پاؤں اُٹھائے اور اپنا توازن قائم کر رہا تھا۔ "بہادر"! اس نے بلند آواز سے کہا۔ میں اتنا بڑا بزدل نہیں کہ خود اپنے نزدیک خوفزدہ معلوم ہونے لگوں۔ پھرتی سے گھٹنے کو موڑ کر اس نے اپنا پاؤں کچھ اور اوپر اُٹھایا اور اس کو زمین پر رکھ دیا۔ دوسرے پاؤں سے ایک انچ آگے وہ بچکر دھکا دیا سا کچھ کرتا۔ بائیں پاؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ پھر داہنے پاؤں کے آگے تھا۔ کرسی کی پشت پر جو ہاتھ تھا وہ کرسی کو کھینچے ہوئے تھا۔ بازو سیدھا تھا پیچھے کی طرف۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کرسی کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ سانپ ابھی تک پہلے کی طرح کنڈلی کے اندر والے حلقے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ سانپ نے حرکت نہ کی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں اب بجلی کے شعلے نہیں بلکہ بے شمار شعاعیں نکل رہی تھیں۔

برٹن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ پھر اُس نے ایک پاؤں آگے بڑھایا پھر دوسرا۔ کرسی کو گھسیٹتے ہوئے۔ جو آخر کار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر زور سے گری۔ وہ کراہا! سانپ نے نہ تو حرکت کی نہ اُس کی آواز ہی سنائی دی۔ لیکن اُس کی آنکھیں دو خیرہ کن سورج تھیں جنہوں نے خود اُس کو چھپا لیا تھا۔ ان آنکھوں سے تیز اور شوخ رنگوں کے دائرے نکل رہے تھے جو پھیل پھیل کر صابن کے بلبلوں کی طرح پھوٹ جاتے تھے۔ وہ برٹن کے چہرے تک پہنچتے معلوم ہوتے اور فضا انتشار ہی پر چلے جاتے۔ وہ کہیں دور کی مسلسل ڈھب ڈھب سن رہا تھا جس کے ساتھ دور سے موسیقی کا ایک جھونکا بھی آ جاتا۔ پہلے کے نغمے کی طرح حیرت انگیز شیریں ہی لیے ہوئے۔ اُس نے سمجھا کہ ممنون کے مجسمے کا "نغمہ سحر" ہے اور سوچا کہ وہ نیل کے ساحل پر کھڑا بڑے اشتیاق سے صدیوں کی خاموشی میں سے غیر فانی نغمہ سن رہا ہے۔ موسیقی بند ہو گئی۔ بلکہ رفتہ رفتہ کم ہو ہو کر گھٹتے ہوئے طوفان کے کڑاکوں کی گڑگڑاہٹ ہو کر رہ گئی۔ اس کے سامنے ایک منظر تھا۔ بارش اور آفتاب سے چمکتا ہوا اس پر قوس قزح کی محراب تھی۔ جس کے عظیم الشان خم میں سینکڑوں شہر معلوم ہو رہے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا سانپ تاج پہنے اپنا سر اُٹھائے ہوئے تھا اور اپنی مردہ ماں کی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ یکایک یہ پُر اسرار دلکش منظر تیزی اور آہستگی سے اوپر اُٹھتا معلوم ہوا۔ تھیٹر کے پردے کی طرح۔ اور خلا میں غائب ہو گیا۔ کوئی چیز بڑے زور سے اس کے چہرے اور سینے پر لگی۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ناک اور خراش

ہوئے ہونٹوں سے خون نکل رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے
ک سا ہو گیا اور آنکھیں بند کئے چہرہ زمین پر ٹیکے
را۔ چند لمحات میں اسے ہوش آگیا اور اسی وقت
ے محسوس کیا کہ گرنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ
ہو گئی تھیں اور اس طرح وہ طلسم ٹوٹ گیا تھا جو اُ
ر کئے ہوئے تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اپنی جگہ سے
ری طرف کے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ سکے گا۔ لیکن یہ
نہایت ہیبت ناک تھا۔ سانپ اس کے سر سے
چند فیٹ کے فاصلے پر ہے۔ شاید اچھل کر اس کی
ن میں پھنا کنڈلی لپیٹ دینے کی تیاری میں ہے۔ اور وہ
پ کو دیکھ نہیں رہا ہے۔ اس نے اپنا سر اُٹھایا اُن
جیسی آنکھوں کو دیکھا اور پھر اُن کی گرفت میں آگیا۔
پ اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ
س پر اب سانپ کا اثر کچھ کم ہو گیا تھا چند لمحے
عالیشان خیالی مناظر اب پیش نظر نہیں تھے اس کی
وں کے نیچے اس کی سیاہ گولیوں کی سی آنکھیں
چمک رہی تھیں جیسے پہلے۔ انتہائی متانت کے
کے ساتھ گویا کہ اس جانور نے اپنی کامیابی کا
کرتے ہوئے سحر کی فعال ترکیبوں کا استعمال
نے کا ارادہ کر لیا تھا۔

ب ایک خوفناک منظر شروع ہوا۔ بیرنٹ نے جو
جسم سے ایک گز دور زمین پر پڑا ہوا تھا۔ کہنی
جسم کے اوپر کا حصہ اُٹھایا۔ اس کا سر پیچھے کی
جھکا ہوا تھا۔ اور اس کے پاؤں پہلے جیسے تھے۔
ہو جس پر خوف کے دھبے تھے۔ بالکل منجمد
آنکھیں انتہائی حد تک کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر کف
تھا۔ اور آہستہ آہستہ زمین پر پکڑ رہا تھا۔ اس کے جسم
میں زور زور سے لرزش ہو رہی تھی۔ اُس کو لگا جیسے سانپ
پیچ و خم کھا رہا ہے۔ وہ کمر کے بل جھک گیا اور اپنے پاؤں
کو ادھر ادھر ہلانے لگا۔ ہر حرکت پر وہ سانپ کے
قریب ہوتا جاتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے
کہ اپنے کو پیچھے کی طرف دھکیلے۔ لیکن کہنیوں کے بل
آگے ہی بڑھتا گیا۔

۵

ڈاکٹر ڈروزنگ اور اُس کی بیوی ہوا دار مطالعہ
میں بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر کی طبیعت اس وقت بہت موزوں
تھی۔ "میں نے ابھی ایک شخص سے "ہائیو فاکس" کا
نمونہ حاصل کیا ہے۔" "اور یہ ہے کیا؟" اس کی بیوی نے
بے پروائی سے پوچھا!

"کیوں! خدا کی پناہ! کیسی جہالت! میری
پیاری جس آدمی کو شادی کے بعد اس کا یقین ہو جائے
کہ اس کی بیوی یونانی زبان نہیں جانتی تو اسے طلاق
دینے کا حق حاصل ہے۔ ہائیو فاکس ایک سانپ ہے
جو دوسرے سانپوں کو کھا جاتا ہے۔"

"میں اُمید کرتی ہوں کہ یہ تمہارے سب سانپوں
کو کھا جائے گا۔" وہ بیسکٹ ہلاتے ہوئے بے پروائی
کے لہجے میں بولی۔ "لیکن یہ دوسرے سانپوں کو پکڑتا
کس طرح ہے۔ غالباً ان کو مرعوب کر سکتے ہیں؟"

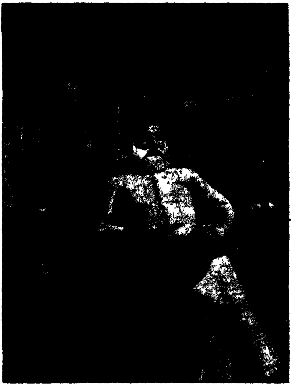
"یہ بالکل جداگانہ بات ہے پیاری۔" ڈاکٹر
نے کہا "تم جانتی ہو کہ سانپ کی مقناطیسی کشش کی طرف

اشارہ کیا۔ ابھی میرے نزدیک کتنا احمقانہ خیال ہے!
گھنٹہ ایک زبردست چیخ سے منقطع ہوگئی جو خاموش
مکان میں اس طرح گونجی جیسے شیطان قبر میں سے زرچ
رہا ہو۔ پھر ایک ہیبت ناک صفائی سے آواز آئی۔
وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر گھبرایا ہوا، اس کی
پلی پلی زرد اور خوف زدہ۔ قبل اس کے کہ آخری چیخ
کی گونج ختم ہوئی ہو۔ ڈاکٹر کمرے کے باہر تھا۔ وہ
سیڑھیوں کو تڑپتا ہوا دوڑ میں آیا۔ ہمسٹن کے
کمرے کے سامنے اُسے چند نوکر لے جو اوپری منزل
سے آ نکلے۔ سب مل کر بیہرو دا۔ کھٹکھٹانے
اندر گھس گئے۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ بریشن پیٹ
کے بل زمین پر وہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر اور بازوؤں
کا کچھ حصہ مسہری کی پٹی کے نیچے چھپا تھا۔ انہوں نے

جسم کو باہر کھینچا اور چت کر دیا۔ چہرہ خون آلودہ تھا
پیشانی پھٹی آنکھیں کھلی رہی تھیں۔ غشی کی حالت میں
مرگیا۔ خوف ناک نظارہ تھا۔ ڈاکٹر نے جھک کر اور دا
ہاتھ ملا کر کہا اور جھکنے پر اس کی نگاہ مسہری کے نیچے
گئی۔ "او خدا"، اس نے کہا۔ "یہ یہاں کیسے آگیا"
اُس نے مسہری کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور سانپ کو
کھینچ کر باہر پھینک دیا۔ اس کی کنڈلی ابھی تک بند
ہوئی تھی۔ یہ زمین پر کرخت کھنکتی آواز کے ساتھ
پھیلتا ہوا دیوار سے جا کر لگا۔ اور بے حس و حرکت ہو
پڑا رہا۔ یہ ایک مصنوعی سانپ تھا جو بھوسا بھر کر
بنایا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں سونے کے دو بٹن
بنی تھیں۔ ✦

سلہ "یہ لفظ جسے بھنے والوں سے" ... یہ ترجمہ اصل نقل ہے مفہوم یہ ہے کہ ارد گرد کے علاقات میں نئی وضع کے
تعمیر ہوگیا تھا لیکن یہ مکان اپنی پرانی وضع پر قائم رہا۔ وہ اپنی قدامت پسندی پر نازاں تھا۔ سلہ "یہ حقیقت روایت کی حد
تک پہنچ گئی تھی"... یعنی محض سنی سنائی بات نہ تھی بلکہ مشاہدے سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی۔ سلہ "اور اپنی مردہ ماں کی
نسبت دیکھ رہا تھا" یہ لفظی ترجمہ ہے — اور مفہوم صاف نہیں ہے۔ سلہ "کہ وہ پیچھے ہٹ سکے" اُردو میں غالباً وہ کی جگہ
[illegible] کی جگہ سکوں کا ہونا چاہئے۔ لیکن انگریزی کنسٹرکشن بھی اُردو میں رواج پا رہا ہے۔ سلہ "یہ اصل تمہاری جیب
یہ لفظی ترجمہ ہے۔ مفہوم ہے کہ یہ ایسی بات ہے جس کی توقع تمہیں سے کی جا سکتی ہے۔

مترجم



مولوی عبدالحق بی - اے (علیگ)

سکریٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد - مدیر رسالہ 'اُردو'

غمکدہ

مصنفہ مصطفیٰ لطفی منفلوطی

مترجمہ سید احمد صبا مرزا قادری

جمیل میرا دوست تھا، میں اس سے محبت کرتا تھا، میں اس پر فریفتہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ بڑا حسین یا بہت بڑا عالم تھا بلکہ اس کے تقدس مآب خیال دلکش سے کہیں زیادہ اس کے تلفظ انداز ادبی کمال نے مجھے اس کا شیدا بنا رکھا تھا۔ اس کی موجودگی میرے لیے باعث تسکین بن گئی تھی۔ میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا اور اس کی سحر بیانی سے محظوظ ہوتا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو میں گھبرا اٹھتا تھا۔ ایک عرصے تک میں اس کے ساتھ رہا۔ وہ مجھ سے خوش تھا اور میں اس سے! اچانک میں ایک شدید ضرورت کی وجہ سے قاہرہ سے باہر چلا گیا، ہم دونوں میں برابر مراسلات جاری رہے، کچھ دنوں بعد اس نے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب نہیں آیا۔ پھر تو طرح طرح کے خطروں نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ ناچار میں اسی حیرت و پریشانی میں قاہرہ واپس آنے پر مجبور ہو گیا، لیکن افسوس کہ میرا دوست مجھے نہ ملا۔ میں نے قاہرہ کی ان تمام گلیوں کی خاک چھانی جہاں اس کے دیدار کی امید تھی، لیکن سعی بیکار، اس کے محلے کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ عرصے سے مفقود الخبر ہے۔ میں نے اس کی تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن افسوس کہ بے سود! جب میں ناامید ہو گیا کہ وہ اب نہیں ملے گا تو میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اور میں رنج و غم اور حزن و الم کی سراپا تصویر بن کر رہ گیا۔ میرے اس رنج و اندوہ کی وہی شخص قدر کر سکتا ہے جس کا کوئی دوست بچھڑ گیا ہو اور جس کا دل آتش فراق سے جل چکا ہو۔

مہینے کی آخری تاریخ تھی، لیل شب کی تاریک زلفیں ہر طرف بکھر گئی تھیں۔ قاہرہ کے کسی محلے میں واپس جا رہا تھا کہ راستہ بھول گیا، بھٹکتا ہوا ایک ایسی جگہ پہنچا جو اس قدر غیر معروف اور خوفناک تھی کہ گویا میں حبشہ کی بستی میں آ گیا تھا۔ تیرگی اتنی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک ایسے سیاہ دریا میں غوطے کھا رہا ہوں جو دو پہاڑوں کے درمیان ہو جس نے ایک خوفناک موج کو سامنے گھیر رکھا تھا۔ میں گھبرا ہوا تھا، وہاں کی تدبیر سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک دھیمی سی آواز خفیف سنائی دی جیسے کسی کی صدا نے خوف بھرے کانوں سے گزرنے دی [illegible]۔ اس ہولناک اور ویران گلی میں کسی کی موجودگی تعجب خیز تھی مگر میں نے یہ سمجھا کہ کوئی حاجت مند اور مصیبت زدہ کی مدد کروں گا۔ اس لیے میں اس آواز کی طرف چلا اور اس دروازے پر پہنچ گیا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے کھٹکھٹایا لیکن صدا [illegible]۔ ناچار بڑی شدت سے کھٹکھٹایا۔ اب دروازہ کھلا۔ ایک دس برس کی لڑکی ہاتھ میں شمع لیے [illegible]

تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ وہ میلے ہوئے کپڑوں میں ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے چاند ابر کے منتشر ٹکڑوں میں نظر آتا ہے "کیا یہاں کوئی مریض ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس لڑکی نے زور سے ایک ٹھنڈی سانس لی، قریب تھا کہ دل کی کلیں پھٹ جائیں۔ پھر اس نے کہا "مہربان من آئیے! ادھر میرے قریب مرگ باپ کی مدد کیجئے" ہم لوگ جوں ہی آگے بڑھے، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلی، تھوڑی دیر میں وہ ایک اصطبل میں پہنچی میں اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہستی سے نیستی، زندگی سے موت کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ اصطبل میں ایک مریض بیٹھا ہوا مریض مردہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے جس میں سانس کی آمد و شد ضعیف ہے جیسے لوہار کی دھونکنی سے گلے میں ہوا آتی جاتی ہے۔ میں مریض سے قریب ہو گیا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور دیکھ کر کہا، اس کی آواز بہت آہستہ تھی "محمد تم نے اپنے دوست کو پا لیا؟" میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی معلوم ہوتا تھا کہ میرا کلیجہ منہ کو نکل آئے گا۔ میرا دل شدت الم سے پھٹ جائے گا۔ میرا دوست مل گیا تھا مگر افسوس کہ وہ دو گھڑی کا مہمان تھا۔ جمیل۔ نکہت صورت طائر زمزمہ سنج گلستاں کمال سکر ہو خاموش تھے۔ بالکل ماہ رخ جیسے بھی ماہ پھر سوکھ گیا ہو۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے کہا جمیل! جمیل! تمہاری یہ حالت! آہ! کس دل دوز بے رحم نے تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ کیا! بتاؤ تم اتنے دنوں کہاں رہے؟ اور یہ حالت کیوں ہے؟ ... وہ اٹھ نہ سکا لیکن اٹھ سکا۔ میں نے ہاتھوں کے سہارے اس کو اٹھا کر بٹھایا۔

جمیل نے ٹھنڈی سانس لی اور کہنا شروع کیا "آج سے سال کی طویل مدت گزری کہ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ جس مکان کے پہلو میں ایک اور مکان تھا جس میں ایک مختصر گروہ لطیف کمسن سا رہتا تھا۔ رکیاوٹ کی ایک بہار آفریں شام تھی۔ میں اپنے بالا خانہ پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے والے مکان کے دریچے پر پڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک پیکر جمال، مجسمہ حسن، دوشیزہ عالم محویت میں شام کا لطف اٹھا رہی ہے۔ میرے دوست یقین کرو کہ وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے آسمان سے کوئی حور اتر آئی ہو یا سنگ مرمر کے خوبصورت مجسمے میں خون دوڑا دیا گیا ہو۔ جب وہ چلی گئی تو میرے منہ سے ایک آہ آتشیں نکل گئی جس نے میرے دل و جگر کو جلا ڈالا۔ میں اس کا گرفتار محبت ہو گیا۔ اور بے قرار رہنے لگا۔ میں نے اس کو شیشہ میں اتارنے کی حتی الوسع کوششیں کیں۔ لیکن ہمیشہ وہ مجھ سے بچتی رہی۔ میرے ترکش کے تمام تیر ختم ہو چکے تھے صرف ایک باقی رہ گیا تھا۔ (آہ یہ وہی تیر تھا جس نے میری اور اس کی زندگی کو برباد کر دیا) میں نے اس سے کہا کہ گھبراؤ نہ میں تم سے نکاح کروں گا۔ آہ میرا یہ آخری حربہ تھا جس نے اس معصوم کو گھائل اور اس کی عفت کو برباد کر دیا۔ اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں اس کا گرفتار تھا اور وہ میری پرستار، غرض تھوڑے ہی دنوں میں میری ہوسناکیوں نے اس کی نسوانیت کے وہ تمام مخفی خزانے لوٹ لے جو ہر ایک عورت کو ناز ہو سکتا ہے اور وہ صحیح معنی میں دولت مند کہی جا سکتی ہے۔ ابھی

ایک ہی ماہ گزرا تھا کہ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ حاملہ ہو چکی ہے جانی میرے نفس بد ضمیر میں جنگ چھڑ گئی کہ وہ نکاح پھر ا کرنا چاہیے یا نہیں۔ میرے ضمیر کی شرافت یہ کہہ رہی تھی کہ زبان ہار جانے کے بعد غداری بدترین لعنت ہے۔ اور میرے نفس کی خباثت اس پر تلی ہوئی تھی کہ اس کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جانا چاہیے۔ آخر کار میرا بے وفا نفس دل کی آواز پر غالب آ گیا۔ اور میں اُس کو چھوڑ کر وہاں چلا گیا۔ جہاں تم مجھ سے ملا کرتے تھے۔ ایک طویل مدت تک مجھے اس دوشیزہ کی کوئی خبر معلوم ہوئی۔ ایک دن ڈاکیا مجھے یہ خط دے گیا۔ جمیل نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک زرد رنگ کا بیلا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

خط

.... "اگر میں اس خیال سے تم کو خط لکھنا چاہتی کہ ٹوٹے ہوئے عہد اور گزری ہوئی محبت کی تجدید کروں تو ہرگز ایک سطر ایک لفظ ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتی تھی۔ اس لئے کہ میں تمہارے جیسے پیمان شکن اور وفا ناشناس انسان کے عہد و پیمان، اور تم جیسے بوالہوس اور بندۂ نفس کی جھوٹی محبت کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ اس کا تذکرہ کیا جائے یا کسی تجدید و توثیق کی خواہش، یا اس پر حسرت و افسوس کا اظہار ہو — تم جانتے ہو کہ جس وقت مجھے چھوڑ کر تم چلے گئے میرے پہلو میں ایک آگ تھی جو سلگ رہی تھی، اور ایک بچہ تھا جو تڑپ رہا تھا لیکن تم نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور نہ چھپا کر بھاگ گئے۔ آہ تمہارے دل نے اتنی ہمت بھی گوارا نہ کی۔ کہ میری بدبختی پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے حالانکہ اس بدبختی کا باعث تمہیں تھے۔ اور تمہارے ہاتھوں نے اتنی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ سکیں حالانکہ اس اشک مسلسل کا دریا تمہارے ہی ہاتھوں رواں ہوا تھا پھر میں کیسے سمجھوں کہ تم شریف آدمی ہو۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ تم انسان نما حیوان ہو جس میں دنیا بھر کی خباثت، درندگی اور بہیمیت کا اجتماع ہے۔ اور تم حیوانیت مطلق کے غلام ہو۔ — تم اپنے دعویٔ محبت میں جھوٹے تھے۔ میری سادگی سے تم نے ناجائز و ناروا فائدہ اٹھایا۔ تم صرف اپنے خبیث نفس کے پجاری تھے۔ مصروف ہوس رانی کے لئے تم نے ایک معصوم پاک بازاور اکرو ہستی کو لوٹا۔ بگاڑا اور تباہ کیا تمہاری مثال اس رہزن کی ہے جو رہبر بن کر لوٹتا ہے اور اس لیڈر کی سی ہے جو بھولی بھالی قوم کو بہکا کر اپنا الو سیدھا کر لیتے ہیں۔ اگر تم بندۂ ہوس نہ ہوتے تو کبھی میرا چہرہ بھی نہ دیکھتے۔ — تم نے خیانت کی اور ہنسی کا سزاوار بنا کر چھوڑ دیا۔ شاید تمہارے نفس نے مجھ جیسی بدکردار عورت سے نکاح کرنا پسند نہ کیا۔ لیکن سوچو کہ میں بدکردار کس کی وجہ سے بنی۔ کیا یہ جرم تمہارا نہ تھا؟ ورنہ اگر تم نہ ہوتے تو میں کبھی بدکردار نہ بنتی۔ میں نے اپنے چھپانے کی ساری کوششیں صرف کر دیں تھیں لیکن میں کب تک کامیاب ہو سکتی تھی۔ عورت تھی، کمزور تھی۔ اور ناتجربہ کار۔ آخر بے نقاب ہو گئی۔ جس طرح چھپانا چاہا بد قسمتی سے لوگوں کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ آہ تم نے میری عصمت و عفت برباد کر دی۔ میں ذلیل ہو گئی۔ میرا ولی اللہ کی صحبتوں میں گم ہو گیا۔ میری ماں صیاد زندگی کا ایک ایک دن پہاڑ ہو گیا۔ اور موت کو سوں دور نظر آنے لگی۔ اس مدت کی بد قسمتی کا شکار

جو سکتا ہے جو کسی کی بیوی ہو چکی ہو۔ وہاں آج میں کسی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے منسلک ہو چکی ہوں۔ جو وقت میری گذران کا ہے وہ آ جاتا۔ جو گذرتا ہے اور جو میں یاد کرتی ہوں۔ اُس کے خوف اور اپنی رسوائی کے ڈر سے بستر پر کھا یا اٹھ نہ سکی۔ جو میں تنہائی میں سوچتا ہوں۔ پہنچیں کس کی ہوئی ہیں؟ تم نے میری امید پر لیکن اس حالت کے بعد میں تم سے نہ رہ سکی ہوں گی۔ مجھے اپنے بستر پر مل۔ وہ وقت منہ اور تازہ ہر دم اپنا حسرت ساتھ لے کے تمام سالہا کو پامال کیا ہوا ہے۔ اب کوئی خبر اپنی زندگی کے بقیہ دن کاٹنے کے لئے ایک جیسی کئی بھی آئے میں کر کوئی جانتا بھی نہیں۔ تنگ ہے ایک کوٹھری میں نت نئی مصیبتوں کے ساتھ بقیہ ایام حیات گذرتے ہیں۔ نہ کسی نے خبر لی کہ جب مہربان والدین کو میرے غم فراق نے ہلاک کر دیا۔ خدا را بتاؤ، کہ اس قتل کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ ۔ تم نے مجھے بھی مردوں اعداد سے کر ڈرایا۔ زندگی کے یہ تلخ گھونٹ جو تم نے اپنے ہاتھوں سے مجھے پلائے ہیں۔ اور وہ صباحت کے طویل آلام جو تم نے وقت کے مجھ پر مسلط کرائے ہیں۔ اور اپنی ہستی ختم ہو چکی ہے۔ میں بستر مرگ پر پڑا ہوں۔ اور میری مثال اس بچے کی ہے جو ہے خطے کی ہے جو چند منٹ میں خاک ہو جائیگا۔ میں نے میری دعا قبول کی ہے۔ چند ساعتوں کی مہمان ہوں اور تھوڑی دیر میں اپنی تمام خون شدہ تمناؤں کے ساتھ ختم ہو جاؤں گی ۔۔۔۔ میرے قاتل جمیل میں نے تم کو یہ خط اس لئے نہیں لکھا ہے کہ تجھ پر محبت کروں۔ یا اپنے حال پر رحم چاہوں۔ اور اب میرا کیا؟ چراغ سحری ہوں تھوڑی دیر میں ہمیشہ کے لئے گل ہو جاؤں گی۔

میں نے یہ خط اس لئے لکھا ہے کہ اپنی امانت لے جاؤ۔ تمہاری بچی دس سال کی ہو چکی ہے۔ زندگی بھر میں اس کی تاج پرورش کرتی رہی۔ اب اس کی بدنصیب ماں مر رہی ہے۔ دنیا میں تمہارے سوا اس کا کوئی پرسان نہیں۔ اگر میری محبت تمہارے دل میں ہے تو کوئی شکایت نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کم از کم تمہارا دل شفقت پدری سے خالی نہ ہوگا۔ اپنی لخت جگر کو لے جا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی اپنی ماں کی طرح بدبختی کا شکار ہو جائے۔ اچھا رخصت!

میں نے خط تمام بھی نہ کیا تھا کہ جمیل کو دیکھا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو رخسار پر بہہ رہے تھے۔ خط پڑھ چکنے کے بعد میں نے پوچھا میرے دوست پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ جمیل نے کہا کہ خط پڑھتے پڑھتے میرے بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی اور غم و اندوہ سے میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ میں دوڑا ہوا اس بدنصیب عورت کی منزل پر پہونچا اور یہ وہی مکان ہے جس میں اس وقت تم نے دیکھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اسی پلنگ پر وہ پڑی ہے اور روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ یہ لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے اور زار زار رو رہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ غشی کی حالت میں مجھے نظر آیا کہ میرے جرائم بیناک تصویروں کی خوفناک شکلوں میں مبدل ہو کر میرے سامنے کھڑے ہیں۔ بیہوشی میں دیکھا کہ میری جیب میں سے کوئی تم کو پرانا تیز کیا ہوا ہو کوئی نیچے تان رہا ہے۔ ہوش آنے کے بعد

ہے۔ میں نے قسم کھائی کہ اب ہمیشہ اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں رہوں گا۔ اور اسی طرح کی مصیبتیں جمیل کی طرح میں بھی اسی طرح
مروں گا۔ جس طرح وہ بدنصیب عورت مری تھی۔ میرے دوست! اب میری سمجھ میں آیا کہ خدا کی اس نعمت لیکن نازک
مخلوق، عورت کو ستانا کس قدر ہولناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ یہ کہتے کہتے جمیل کی زبان بند ہوگئی۔ اس کا چہرہ زرد
پڑ گیا۔ اور اپنے بستر پر گر پڑا۔ آہ اس کی روح نکل چکی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے بھی ہوش نہ رہا۔ پھر میں نے اس کے
دوستوں اور ملنے والوں کو بلا بھیجا اور سب لوگوں نے مل کر جمیل کو سپرد خاک کر دیا۔ اس دل سے زیادہ تو میں بھی
رویا اور نہ وہ لڑکی۔ ✦

خدا جانتا ہے کہ میں یہ داستان ختم کر رہا ہوں اور رو رہا ہوں۔ میں عمر بھر جمیل کا وہ جملہ کبھی نہ بھولوں گا۔
جو مرنے کے وقت اس کی زبان سے نکلا تھا (ابنتی یاصدیقی) "میری بچی، اے میرے دوست"

تمثیل ۔

سکون

مصنفہ موریس میٹرلنک

مترجمہ ارز د جلیلی

افراد تمثیل

باغ میں
بوڑھا آدمی
اجنبی
مارتھا } بوڑھے کی پوتیاں
میری }
ایک کسان
لوگوں کا مجمع

مکان میں
باپ }
ماں }
دو لڑکیاں } خاموش ہستیاں
بچہ }

ایک پرانا باغ جس میں شاہ بلوط کے درخت نصب ہیں۔ اس کے پیچھے ایک مکان جس کی منزل کے نیچے تین دریچے روشن ہیں۔ ان دریچوں سے ایک خاندان کے افراد صاف نظر آ رہے ہیں جو لیمپ کے گرد بیٹھے ہیں باپ انگیٹھی کے قریب بیٹھا ہے۔ ماں بازو کو میز پر ٹیکے ہوئی، فضا پر اپنی نظر جمائے ہے۔ دو کم سن لڑکیاں سفید لباس پہنے، بیٹھی ہوئی کشیدہ کاڑھ رہی ہیں، کمرے کی پرسکون فضا میں وہ محو خیال ہیں اور مسکرا رہی ہیں۔ ایک بچہ اس طرح سویا ہوا ہے کہ اس کا سر ماں کے بائیں بازو پر ہے۔ جب ان میں سے کوئی اٹھتا، چلتا، یا اشارہ کرتا ہے تو یہ حرکت سنجیدہ اور سست معلوم ہوتی ہے گویا فاصلے یا دریچے کے صاف شیشوں کی وجہ سے اس حرکت میں روحانیت پیدا ہو گئی ہو ۔

(بوڑھا آدمی اور اجنبی باغ میں ہوشیاری سے داخل ہوتے ہیں)

بوڑھا آدمی۔ ہم لوگ باغ کے اس حصے میں ہیں جو مکان کے پیچھے ہے۔ وہ کبھی یہاں نہیں آتے ہیں دروازے دوسری طرف ہیں۔ جو بند ہیں اور دریچے بھی بند ہیں۔ اگر مکان کے اس طرف دریچے نہیں ہیں اور میں نے روشنی دیکھی
۲ ہاں وہ اب تک لیمپ کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ یہ اچھا ہے ۔

کہ انھوں نے ہماری آواز نہیں سُنی۔ ماں یا لڑکیاں
اگر باہر آ گئی ہوتیں۔ تو ہم کیا کرتے۔؟

اجنبی۔ اب ہم کیا کریں گے۔؟

بوڑھا آدمی۔ پہلے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ سب
مکان کے اندر ہیں یا نہیں۔ ہاں میں باپ کو
آتش دان کے قریب بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں
وہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ اس کے
گھٹنے پر پڑے ہوئے ہیں۔ ماں اپنے بازو
میز پر ٹیکے ہوئے ہے۔

اجنبی۔ وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔

بوڑھا آدمی۔ نہیں وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ رہی ہے
اس کی آنکھیں جامد ہیں۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ
سکتی۔ ہم بڑے بڑے درختوں کے سائے
میں ہیں۔ لیکن قریب جاؤ اور پھر مردہ لڑکی
کی دو بہنیں بھی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ کشیدہ
کاڑھ رہی ہیں۔ اور ننھا بچہ سو گیا ہے۔ گوشے
میں جو گھڑی ہے اس میں نو بج گئے ہیں
انھیں اس کا وہم بھی نہیں کہ بُری خبر آنے والی ہے
اور وہ بالکل خاموش ہیں۔

اجنبی۔ اگر ہم باپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کریں۔
اور اس کو اشارہ کریں؟ اس نے اپنا سر اس
طرف پھیرا ہے۔ میں کسی دریچے پر دستک دوں؟
ان میں سے کسی ایک کو اوروں کے پہلے یہ خبر
سننی ہی پڑے گی۔

بوڑھا آدمی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں کسے انتخاب کروں۔
ہمیں بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔ باپ بوڑھا اور
مریض ہے۔ ماں بھی۔ اور بہنیں بہت کم سن ہیں
اور سب اس سے ایسی محبت کرتے تھے جیسی
محبت وہ پھر کبھی نہیں کر سکیں گے۔ ...
میں نے اس سے زیادہ خوش و خرم گھرانا نہیں
دیکھا۔۔۔ نہیں نہیں دریچے کے قریب نہ جاؤ۔
اس سے زیادہ بُرا کام ہم نہیں کر سکتے۔ بہتر ہو
کہ ان کو ہم یہ خبر بہت سنجیدگی سے سُنائیں۔
اس طرح کہ گویا یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ اور ہمیں
بہت غمگیں نہیں نظر آنا چاہیے۔ ورنہ اُنھیں
احساس ہوگا۔ کہ ان کے غم کو ہمارے غم سے
بڑھ کر ہونا چاہیے۔ اور پھر وہ نہیں سمجھ سکیں گے
کہ وہ کیا کریں۔۔۔۔۔۔ چلو ہم باغ کی دوسری طرف
چلیں ہم دروازے پر دستک دیں گے۔ اور اس طرح
اندر چلے جائیں گے کہ گویا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔
پہلے میں اندر جاؤں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر متعجب
نہیں ہوں گے۔ میں اکثر شام کو ان کو دیکھنے جایا
کرتا ہوں۔ کبھی پھول اور پھل لیکر اور کبھی ایک دو
گھنٹا اُن کے ساتھ گزارنے کے لیے۔

اجنبی تم مجھے کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ تنہا
جاؤ۔ میں اس وقت تک انتظار کروں گا جب
تم مجھے پکارو۔ انھوں نے مجھے کبھی نہیں دیکھا ہے
میں تو محض ایک راہی۔ ایک اجنبی ہوں۔

بوڑھا آدمی۔ بہتر ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ ایسی بدقسمتی
جس کا اعلان ایک ہی آدمی کرتا ہے۔ بہت شدید

اُن کی بات سے تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ میں شروع سے
یہ سوچتا تھا کہ اگر میں پہلے اندر جاؤں تو مجھے
زور زور سے بولنا پڑے گا۔ وہ سب کچھ چند الفاظ
میں کہہ جائیں گے۔ پھر ہم سے کہنے کے لیے کوئی
بات باقی نہیں رہے گی۔ اور میں اس خاموشی سے
گھبراتا ہوں جو ان آخری الفاظ کے بعد طاری
ہوتی ہے جو کسی مصیبت کا اعلان کرتے ہیں جب
اس وقت کلیجا پھٹنے لگتا ہے۔ اگر ہم دونوں ساتھ
جائیں تو میں پیچیدہ طریقے سے کام شروع کروں گا۔
شاید پہلے سے کہوں گا۔ لوگوں نے اُسے
ایسے پایا۔ ویسے پایا۔ وہ پتے کے دھارے پر
بہہ رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ یوں بندھے ہوئے تھے:

اجنبی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے بازو
اس کے دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔

بوڑھا آدمی۔ دیکھو! باوجود کوشش کے ہم گفتگو کرنے
لگے ہیں۔ اور اصل مصیبت کی طرف سے
دھیان ہٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر میں تنہا اندر جاؤں
تو میں اُن سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اور میں
سمجھتا ہوں کہ پہلے ہی الفاظ کا بڑا خوفناک اثر
ہوگا۔ اور پھر خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہوگا۔
لیکن اگر ہم باری باری اُن سے بولیں تو وہ
ہماری باتیں سنیں گے۔ اور تجربے سے مقابل ہونا
بھول جائیں گے۔ یہ نہ بھول جاؤ کہ وہاں پر ماں
بھی ہوگی۔ اور یہ کہ اُس کی زندگی محض ایک
دھاگے سے لٹک رہی ہے۔ بہتر ہے کہ غم کی

پہلی موج اپنی طاقت غیر ضروری الفاظ پر صرف کر دے۔
بہترین طریقہ یہ ہے کہ بدنصیبوں کے گرد لوگوں کو اپنی
مزاجوں کے مطابق جمع ہونے دیا جائے۔ بہت سے
غیر متعلق لوگ بھی غم کے کچھ حصے کو بغیر محسوس کیے ہوئے
اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ بغیر کوشش، بغیر شور و غوغا
کے، روشنی یا ہوا کی طرح غم، رفع ہو جاتا ہے۔

اجنبی۔ تمہارے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں اور پتھر پر اُن
میں سے پانی ٹپک رہا ہے۔

بوڑھا آدمی۔ صرف میرے لبادے کا دامن پانی سے
بھیگ گیا تھا۔ تمہیں سردی محسوس ہو رہی ہوگی
تمہارا کوٹ کیچڑ سے لت پت ہے۔ اس قدر اندھیرا
تھا کہ میں راستہ میں غور نہیں کر سکا تھا۔

اجنبی۔ میں اپنی کمر تک پانی میں گیا تھا۔

بوڑھا آدمی۔ میرے آنے کے بہت پہلے ہی تم اُس کو
نکال چکے تھے؟

اجنبی۔ میں نے اُس کو تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے
نکالا تھا۔ میں دیہات کی طرف جا رہا تھا۔ اپنی نظریں
دریا پر جمائے چلا جا رہا تھا یوں کہ سڑک کے مقابلے
میں دریا زیادہ روشن تھا۔ اتنے میں میں نے کسی
عجیب چیز کو آبی پودوں کے قریب دیکھا۔ ... ...
میں اُس کے نزدیک گیا اور میں نے اُس کے بال
دیکھے جو پانی پر تیر رہے تھے۔ اُس کے سر کے گرد
گول حلقہ بنائے ہوئے تھے اور پانی کی روانی کے
ساتھ ادھر ادھر رُخ بدلتے رہتے تھے۔
(کمرے کے اندر دونوں لڑکیاں اپنے منہ

دریچے کی طرف پھیرتی ہیں)

بوڑھا آدمی۔ تم نے "اُس" کی دونوں بہنوں کے بال کو اُن کے شانوں پر لہراتے دیکھا؟

اجنبی۔ اُنھوں نے اپنے سر ادھر پھیرے تھے۔ اُنھوں نے اس طرف صرف اپنے سر پھیرے تھے۔ شاید میں بہت بلند آواز سے بول رہا تھا۔

(دونوں لڑکیاں پھر اُسی طرح بیٹھ جاتی ہیں جیسے وہ پہلے بیٹھی تھیں۔)

وہ پھر اُس طرف پھر گئی۔ ہیں۔ میں کمر بھر پانی میں گیا اور جب میں نے کسی طرح اُس کا ہاتھ پکڑا اور آسانی سے اُس کو کنارے کھینچ لایا۔ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی اُس کی بہنیں۔

بوڑھا آدمی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اُن سے زیادہ خوبصورت تھی ...... میں نہیں جانتا کہ میں نے کیوں ہمت ہار دی ......

اجنبی۔ "ہمت" سے تمہارا کیا مطلب؟ ہم نے سب کچھ کیا۔ جو انسان کر سکتا تھا۔ وہ ایک گھنٹہ پہلے ہی مر چکی تھی ....

بوڑھا آدمی۔ آج صبح وہ زندہ تھی۔ میں نے گرجا سے باہر آتے وقت اُس سے ملاقات کی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں جا رہی ہوں۔ اپنی دادی اماں کو دیکھنے دریا کے اُس پار جا رہی تھی۔ جس دریا کے کنارے تم نے اُسے پایا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اُسے پھر کب دیکھ سکوں گا ...... وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اور یکایک وہ مجھ سے جدا ہو گئی۔ مگر اب میں غور کرتا ہوں اور میں نے اُس وقت نہیں غور کیا۔ کہ وہ اس طرح مسکرائی تھی جس طرح وہ لوگ مسکراتے ہیں جو خاموش رہنا چاہتے ہیں یا وہ لوگ جو ڈرتے ہیں کہ کوئی ان کی بات نہیں سمجھے گا ...... امید بھی اُسے تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پوشیدہ تھیں۔ وہ شاذ و نادر ہی میری طرف دیکھتی تھی۔

اجنبی۔ بعض کسانوں نے مجھ سے کہا کہ اُنھوں نے اُسے سہ پہر کے وقت دریا کے کنارے سرگرداں دیکھا تھا۔ اُنھوں نے سمجھا کہ وہ پھولوں کی تلاش میں تھی ...... ممکن ہے کہ اس کی موت ....

بوڑھا آدمی۔ کوئی کہہ نہیں سکتا ...... کوئی جان ہی کیا سکتا ہے؟ وہ غالباً اُن لوگوں میں سے تھی۔ جو گفتگو کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہر شخص کے سینے میں اپنے زندہ رہنے کی ایک سے زیادہ دلیلیں پوشیدہ رہتی ہیں ...... تم روح کی گہرائیوں کو اُس طرح نہیں دیکھ سکتے جس طرح تم اس کمرے کے اندر کی چیزوں کو دیکھ سکتے ہو۔ وہ سب یکساں ہیں۔ وہ صرف معمولی باتیں کرتے ہیں اور کوئی خواب بھی نہیں دیکھتا کہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہوا ہے تم مہینوں تک ایسے شخص کے ساتھ رہتے ہو جسے اب دنیا سے تعلق نہیں باقی رہا۔ اور جس کی روح اس طرف مائل نہیں ہو سکتی۔ تم اُس کو بغیر سوچے ہوئے جواب دیتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کیا ہو گیا ہے۔

سب بہت خاموش کی طرح معلوم ہوتے ہیں ہم ان
کی راہوں میں بہت سے خیالات گزرنے دیتے ہیں
وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں؟ وہ اُسی طرح
دیکھتی تھی جس طرح دوسرے۔ ہنستے ہیں وہ اپنے
ہونٹ کے دور کر سکتی تھی: "آج صبح پانی برسے گا"
یا ہم کھانا کھانے جا رہے ہیں۔ بیٹھ پر تیرہ آدمی
ہوں گے: یا "ابھی پھل نہیں پکا ہے": وہ مسکرا کر
اُن پھولوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جو مرجھا
چکے ہیں۔ اور اندھیرے میں روتے ہیں۔ آسمانی فرشتہ
بھی نہ دیکھ سکتا تھا جو دیکھا جا سکتا تھا۔ اور انسان
کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ جب تک معاملہ ہی ختم ہو جائے
کل شام کے وقت وہ روشنی میں اپنی
بہنوں کی طرح بیٹھی تھی۔ اور تم ان بہنوں کو اس طرح
نہ دیکھ سکتے اگر یہ واقعہ نہ ہوا ہوتا۔
میں تو گویا اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں قبل
اس کے ہم اس کو دیکھ سکیں ہماری معمولی زندگی میں
کوئی نیا واقعہ ہونا چاہیے۔ وہ دن رات تمہارے
ساتھ رہتے ہیں اور تم انھیں حقیقت میں اُس وقت
تک نہیں دیکھ سکتے جب تک کہ وہ اس دنیا کو
ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیں۔ پھر بھی اُس کی
کیسی ننھی اور عجیب و غریب روح ہوگی۔
کیسی ننھی، بے لوث اور گہری روح جو کچھ کہہ سکتی
ہوگی۔ جو اُس نے کہا ہوگا اور جو کچھ کر سکی ہوگی۔
وہ اُس نے کیا ہوگا۔
اجنبی۔ دیکھو وہ کمرے کی خاموشی میں مسکرا رہے ہیں۔۔۔

بوڑھا آدمی۔ وہ مطلقاً پریشان نہیں ہیں۔ وہ آج
اُس کی واپسی کے منتظر نہیں ہیں ۔۔۔۔۔
اجنبی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ مگر
دیکھو باپ اپنی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتا ہے۔۔
بوڑھا آدمی۔ وہ اُس بچے کی طرف اشارہ کر رہا ہے
جو اپنی ماں کے سینے پر سویا ہوا ہے۔
بوڑھا آدمی۔ وہ اب کپڑے نہیں سی رہی ہیں۔ گہری
خاموشی ہے ۔۔۔۔۔۔
اجنبی۔ اُنھوں نے سفید ریشم کے رومال کو گرا
دیا ہے۔
بوڑھا آدمی۔ وہ بچے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔
اجنبی۔ وہ نہیں جانتے کہ دوسرے اُنھیں دیکھ
رہے ہیں۔
بوڑھا آدمی۔ ہم پر بھی اُن کی نگاہ ہے۔
اجنبی۔ اُنھوں نے اپنی نظروں کا رخ اوپر کی طرف
کیا ہے۔
بوڑھا آدمی۔ پھر بھی وہ نہیں دیکھ سکتے ہیں۔
اجنبی۔ وہ بظاہر خوش نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی کوئی
بات ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا۔۔
بوڑھا آدمی۔ وہ اپنے کو خطرے کی زد سے باہر سمجھتے
اُنھوں نے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اور جنگلوں
میں لوہے کی چھڑیں ہیں۔ اُنھوں نے پرانے مکان
کی دیواروں کی مرمت کرائی ہے۔ اور شاد
بلوط کے تینوں دروازوں میں کنڈیاں لگوا دی ہیں
اُنھوں نے پیش ہونے والی بات کو محسوس کر لیا ہے

جو محسوس کی جا سکتی ہے۔

اجنبی۔ ابھی یا تھوڑی دیر کے بعد ہم اُن سے ضرور کہہ دیں گے۔ شاید کوئی آجائے اور یکایک کہہ دے۔ جس وقت ہم اُس مردہ لڑکی کے پاس سے چلے تھے تو وہاں پر کسانوں کا مجمع تھا۔ اگر اُن میں سے کوئی آئے اور دروازے پر دستک دے ... ..

بوڑھا آدمی۔ مار تھا۔ اور میری لاش کی حفاظت کر رہی ہیں۔ کسان درختوں کی شاخوں سے ایک پلنگ تیار کر رہے تھے۔ اور میں نے اپنی بڑی پوتی سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ روانہ ہوں تو وہ جلدی سے آکر مجھے خبر کر دے۔ اُس کے آنے تک انتظار کرو۔ وہ میرے ساتھ جائے گی! کاش ہم ان لوگوں کو اس طریقہ سے نہ دیکھ سکے ہوتے! میں نے سمجھا تھا کہ دروازے پر دستک دینے۔ سادگی سے مکان کے اندر داخل ہو جانے اور چند فقروں میں انھیں کہہ دینے کے سوا اور بات ہی کیا ہے؟ مگر میں بہت دیر سے انھیں دیکھ رہا ہوں۔ لیمپ کی روشنی میں وہ . .

(میری داخل ہوتی ہے)

میری۔ وہ آرہے ہیں۔ دادا جان۔

بوڑھا آدمی۔ تم ہو! وہ کہاں ہیں؟

میری۔ وہ آخری سڑک کے کنارے ہیں۔

بوڑھا آدمی۔ وہ چپ چاپ آرہے ہیں۔

میری۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ وہ دھیمی آواز میں کلام کریں۔ ... تھا اُن لوگوں کے ساتھ ہے۔

بوڑھا آدمی۔ بہت لوگ ہیں، کیا؟

میری۔ ساری بستی کے لوگ جنازے کے پاس ہیں۔ وہ شعلیں لے کر آئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ شعلیں گل کر دیں۔

بوڑھا آدمی۔ وہ کس راستے سے آرہے ہیں؟

میری۔ وہ چھوٹے راستوں سے آرہے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں۔

بوڑھا آدمی۔ اب وقت ہو گیا کہ ....

میری۔ آپ نے اُن سے کہہ دیا، دادا جان؟

بوڑھا آدمی۔ تمھیں سمجھنا چاہیے کہ ہم نے اُن سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ وہ ابھی تک لیمپ کی روشنی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیکھو میری بچی دیکھو! تم دیکھو گی کہ زندگی کیا چیز ہے۔

میری۔ آہ! وہ کس قدر مطمئن نظر آتے ہیں! مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں انھیں خواب میں دیکھ رہی ہوں۔

اجنبی۔ دیکھو! میں نے دونوں بہنوں کو چونکتے ہوئے دیکھا۔

بوڑھا آدمی۔ وہ اُٹھ رہی ہیں ....

اجنبی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دریچوں کے قریب آرہی ہیں۔

(اس وقت ایک بہن پہلے دریچے کے پاس اور دوسری بہن تیسرے دریچے کے پاس جا رہی ہے۔ اپنے ہاتھوں کو شیشوں پر رکھ کر وہ تاریکی پر نظریں جما رہی ہیں۔)

بوڑھا آدمی۔ درمیانی دریچے کے قریب کوئی نہیں آتی ہے۔

میری۔ وہ باہر کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ ... سن رہی ہیں۔

بڈھا آدمی۔ بڑی بہن کیوں نہیں مسکرا رہی ہے۔
اجنبی۔ وہ میری بہن کی آنکھوں سے غائب ہو گئی ہے
بڈھا آدمی۔ یہ مشیت ہے جو کوئی نہیں جانتا کہ انسان
کے اردگرد کتنی دور تک روح حلقے کے ہوتے ہیں
(طویل خاموشی۔ میری۔ بڑی بہن کے
سینے سے چمٹ جاتی ہے جو اس کا ہو سکتی ہے)
میری۔ دادا جان۔
بڈھا آدمی۔ آؤ دیکھو، میری بچی۔ ہماری باری
بھی آئے گی۔
(وقفہ)
اجنبی۔ وہ نظروں سے جاتے رہے ہیں ۔۔۔۔
بڈھا آدمی۔ قریب بہت سے انسان اور بچوں کی زندگیاں کھیل
اگر وہ سو برس سال تک بھی دیکھتی رہیں۔ رات
بہت اندھیری ہے۔ وہ ادھر دیکھ رہی ہیں اور
مصیبت ادھر آ رہی ہے۔
اجنبی۔ یہ اچھا ہے کہ وہ اس طرف دیکھ رہی ہیں۔
کوئی چیز پیچھے سے چھپا نہیں۔ میدان کی طرف
سے ادھر آ رہی ہے۔
میری۔ یہ لوگوں کا گروہ ہے۔ وہ سب بہت دور ہیں
اس لئے ہم انہیں صاف نہیں دیکھ سکتے۔
اجنبی۔ وہ راستے کے پیچ و خم پر قدم بقدم چل رہے
ہیں۔ چاندنی میں پھر وہ نظر کے سامنے آگئے۔
میری۔ وہ کتنی کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ جب میں
آئی تھی اُسی وقت شہر کے اطراف سے لوگ
آ رہے تھے ۔۔۔۔۔ وہ بہت ہی پیچ

راستے سے آ رہے ہیں۔
بڈھا آدمی۔ پھر بھی آخرکار، وہ پہنچ ہی جائیں گے۔
میں بھی انہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ میدان سے
گزر رہے ہیں۔ وہ اس قدر چھوٹے نظر آتے ہیں کہ
سبزہ زار میں اور ان میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ تم
یہ تصور کر سکتی ہو کہ وہ بچے ہیں جو چاندنی رات میں
کھیل رہے ہیں۔ اگر وہ لڑکیاں انہیں دیکھیں تو
وہ کچھ بھی نہیں سمجھیں۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے
وہ بے خبر ہیں۔ مگر مصیبت قدم بقدم قریب
آ رہی ہے۔ اور گزشتہ دو گھنٹوں میں بڑھتی ہی گئی
ہے۔ وہ اسے ٹھہر جانے کا حکم نہیں دے سکتیں۔ اور جو
اُسے لا رہے ہیں، اُس کو روکنے سے قاصر ہیں۔
مصیبت نے اُن پر بھی قابو پا لیا ہے۔ اور اب
انہیں اُس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ وہ اپنی منزل
سے واقف ہے اور اسی طرف گامزن ہے
مصیبت ان تھک ہے اور اس کا ایک ہی مقصد ہے
انہیں اپنی پوری طاقت سے اس کی مدد کرنی ہوگی۔
وہ مغموم ہیں مگر وہ قریب تر آ رہے ہیں۔ ان کے
دلوں میں رحم ہے۔ مگر انہیں مجبوراً آگے بڑھنا
ہی پڑتا ہے۔
میری۔ بڑی بہن نے اب مسکرانا ختم کر دیا ہے۔
دادا جان!
اجنبی۔ وہ دریچے کے پاس سے ہٹ رہی ہے۔
میری۔ وہ اپنی ماں کے بوسے لے رہی ہے۔
اجنبی۔ بڑی بہن بچے کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی ہے

ہاتھ پھیر رہی ہے۔

میری۔ آہ! آپ بھی جانتا ہے کہ وہ اس کا بوسہ لیں۔

اجنبی۔ اب خاموشی ہے ....

میری۔ وہ اپنی ماں کے پہلو میں واپس آگئی ہیں۔

اجنبی۔ اور باپ اپنی نظریں گھڑی کے رقاص پر جمائے ہوئے ہے۔

میری۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغیر سمجھے ہوئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، عبادت میں مشغول ہیں۔

اجنبی۔ غالباً وہ اپنی روحوں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

(وقفہ)

میری۔ ان سے آج رات کو نہ کہیے دادا جان!

بوڑھا آدمی۔ دیکھو اب تم بھی ہمت ہار رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ تمہیں اُن کی طرف نہ دیکھنا چاہیے تھا۔ میرا سن تراسی سال کا ہے۔ مگر یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے زندگی کی حقیقت کو سمجھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں مجھے عجیب و غریب کیوں معلوم ہوتا ہے۔ وہ روشنی میں بیٹھے ہوئے کس سادگی سے رات کا انتظار کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم اپنے گردوں کے اندر انتظار کرتے ہیں۔ اور پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں انھیں دوسری دنیا کی بلندی سے دیکھ رہا ہوں، کیونکہ میں ایک بات جانتا ہوں جو وہ ابھی تک نہیں جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے میری بچی۔ چاہو کہ تم بھی ... سنو کیوں ہو گئی شاید کوئی بات ایسی ہے جسے ہم الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتے اور جو ہمیں رُلا دیتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ زندگی میں کوئی چیز اس قدر غمگین بھی ہوتی ہے۔ یا یہ کہ وہ اُن لوگوں کو خوف زدہ کر سکتی ہے۔ جو اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر کچھ دکھی ہوا تھا۔ جب بھی میں انھیں اس قدر سکوت کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ کر گذر جاتا۔ انھیں اس دنیا پر بہت زیادہ بھروسا ہے۔ وہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے اور دشمن کے درمیان صرف شیشے کے پٹ حائل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ چونکہ انھوں نے دروازے بند کر لئے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے روح کے اندر ہوتا ہے۔ اور اُن کے دروازے پر ہی دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہیں۔ اور وہ خواب میں بھی نہیں دیکھتے کہ بہت سے دوسرے لوگ زندگی سے اُن کی بہ نسبت زیادہ واقف ہیں۔ اور یہ کہ میں غریب بڈھا آدمی۔ اُن کے دروازے سے دو قدم پر کھڑا اُن کی خوشی کو اپنے ضعیف ہاتھوں کی ہتھیلی میں ایک بیمار چڑیا کی طرح دبائے ہوئے ہوں اور اپنی مٹھیوں کو کھولنے کی ہمت نہیں کر سکتا ......

میری۔ اُن پر رحم کیجیے، دادا جان!

بوڑھا آدمی۔ ہم اُن پر رحم کرتے ہیں۔ میری بچی۔ مگر ہم پر کوئی رحم نہیں کرتا۔

میری۔ اُن سے کل کہیے گا دادا جان! روشنی ہو جانے پر اُن سے کہیے گا تو وہ اس قدر غمزدہ نہ ہوں گے۔

بوڑھا آدمی۔ میری بچی! غالباً تمہارا خیال صحیح ہے
مات بھر اس معاملہ [illegible] مجھے بہت تجربہ
ہو گیا، دنیا مصیبت کا گھر ہے
مگر وہ کل ہم سے کیا کہیں گے؟ بدقسمتی لوگوں کو
ماسہ بنا دیتی ہے جن پر اس کا اثر ہوتا ہے۔
وہ اجنبیوں کی موجودگی میں اس کی واقفیت
حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے نامعلوم ہاتھوں
میں چھوڑ دینا نہیں چاہتے۔ بظاہر انہیں یہ محسوس
ہوگا کہ ہم نے ان سے کوئی چیز چھین لی ہے۔

اجنبی۔ اس کے علاوہ اب وقت گذر چکا ہے۔ میں جاؤں
کی آواز سن رہا ہوں۔

میری۔ وہ آ پہنچے۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے
گذر رہے ہیں۔

(مارتھا داخل ہوتی ہے)

مارتھا۔ میں گئی میں نے یہاں تک ان کی، میری کی
میں نے ان سے سڑک پر ٹھہرنے کے لیے کہا۔

(بچوں کا گروہ خاموش ہوتا ہے)

آہ بچے ابھی تک رو رہے ہیں۔ میں نے انہیں منع
کر دیا تھا کہ وہ نہ آئیں۔ مگر وہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں
اور ان کی مائیں میرا حکم نہیں مانتیں۔ میں جاؤں گی
اور انہیں کہہ دوں گی نہیں۔ اب انہوں نے
چیخنا چلانا شروع کر دیا ہے۔ سب کچھ تیار ہے؟ میں وہ
چھوٹی گھڑی بھی لائی ہوں جو اس کے پاس
تھی۔ بچے کے لیے پلنگ بھی لائی ہوں۔ میں نے
اسے آرام کرنے کے لیے گھڑی پر لٹا دیا۔ معصوم
مہتاب کی روشنی میں جب ماں کے بالوں نے مجھے
بہت پریشان کیا۔ میں انہیں سلجھا نہ سکی۔ میں نے
ان سے ماں گریتے کے پھول جمع کرنے کے لیے کہا۔
افسوس ہے کہ اس قسم کے پھول نہ مل سکے۔ آپ
یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ اس کے پاس کیوں نہیں
ہیں؟ (وہ دریچوں کی طرف دیکھتی ہے) وہ رو
نہیں رہے ہیں شاید۔ آپ نے ان سے نہیں
کہا۔ !

بوڑھا آدمی۔ مارتھا! تمہاری روح زندگی سے معمور ہے
تم نہیں سمجھ سکتیں۔

مارتھا۔ میں کیوں نہیں سمجھ سکتی (وقفے کے بعد سنجیدہ
شکایت کے لہجے میں) آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے
تھا دادا جان۔

بوڑھا آدمی۔ مارتھا تم نہیں جانتیں۔۔۔

مارتھا۔ میں جا کر ان سے کہہ دوں گی۔

بوڑھا آدمی۔ تھوڑی دیر کے لیے یہیں پر ٹھہر جاؤ۔
میری بچی۔

مارتھا۔ آہ مجھے ان پر کس قدر رحم آتا ہے۔ اب انہیں
بے خبر نہیں رکھنا چاہیے۔

بوڑھا آدمی۔ کیوں نہیں؟

مارتھا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کیوں نہیں۔ مگر اب یہ
ممکن نہیں!

بوڑھا آدمی۔ یہاں آؤ میری بچی ....

مارتھا۔ وہ کس قدر صابر ہیں!

بوڑھا آدمی۔ یہاں آؤ میری بچی

مارتھا۔ (اُس کی طرف مڑکر) آپ کہاں ہیں دادا جان؟
میں بہت افسردہ ہوں۔ میں آپ کو دیکھ نہیں سکتی ہوں
میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

بوڑھا آدمی۔ اُدھر نہ دیکھو جب تک کہ وہ سب کچھ جان نہ جائیں . . . .

مارتھا۔ میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔

بوڑھا آدمی۔ نہیں مارتھا۔ یہیں پر ٹھہرو۔ اپنی بہن کے ساتھ ٹھہر کے اس پرانے بنچ پر مکان کی دیوار سے ٹیک کر بیٹھو۔ اور اُدھر دیکھو نہیں تم بہت کم سن ہو۔ تم کبھی اس واقعے کو بھول نہ سکو گی۔ تم نہیں جانتیں کہ انسان کا چہرہ کیسا ہوتا ہے۔ جب اُس کی آنکھوں میں موت کا گزر ہوتا ہے۔ شائد وہ بھی رونے لگیں گے .... اُدھر مڑکر نہ دیکھو۔ شائد کوئی آواز ہی نہ ہو۔ اگر کوئی آواز نہ ہو تو اس کا لحاظ رکھو کہ تم اُدھر مڑکر نہ دیکھو۔ کسی کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی کہ غم کون سا راستہ اختیار کرے گا۔ روح کی گہرائیوں سے چند سسکیاں نکلیں گی۔ اور بس۔ میں خود نہیں جانتا کہ جب میں اُن کی آواز سنوں گا تو کیا کروں گا۔ وہ اس دنیا کی ہستیاں نہیں ہیں۔ میری بچی۔ میرے جانے کے قبل میرا بوسہ لے لو۔

(دعا کی آواز بہت نزدیک آگئی۔ مجمع کا ایک حصہ باغ میں آجاتا ہے۔ کانا پھوسی اور دبے پاؤں چلنے کی آواز آتی ہے۔)

اجنبی۔ (مجمع سے) یہیں ٹھہرو۔ دریچے کے قریب نہ جاؤ: وہ یہاں ہیں۔

ایک کسان۔ کون؟

اجنبی۔ اور لوگ۔ جنازہ اُٹھانے والے۔

کسان۔ وہ اس راستے سے آرہے ہیں۔ بوڑھا آدمی گھر میں گیا ہے۔

(بوڑھا آدمی چلا جاتا ہے۔ مارتھا اور میری اجنبی بیٹھے دریچوں کی طرف کرکے بنچ پر بیٹھ گئی ہیں۔ مجمع میں کانا پھوسی کی دھیمی آواز سنائی دیتی ہے)

اجنبی۔ ہش۔ بولو نہیں۔

(کمرے کے اندر دونوں بہنوں میں جو زیادہ بڑی ہے وہ دروازے تک جاتی ہے اور کھٹکا لگا دیتی ہے۔)

مارتھا۔ وہ دروازہ کھول رہی ہے۔

اجنبی۔ نہیں بلکہ اسے بند کر رہی ہے۔

(وقفہ)

مارتھا۔ دادا جان کمرے کے اندر داخل نہیں ہوئے ہیں۔

اجنبی۔ نہیں پھر وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہے۔ لوگ حرکت نہیں کر رہے ہیں۔ اور بچہ ابھی تک سویا ہوا ہے۔

(وقفہ)

مارتھا۔ میری ننھی بہن۔ ہاتھ میری طرف بڑھاؤ۔

میری۔ مارتھا!

(وہ ایک دوسرے کا پیار کرتی ہیں۔ اور بوسہ لیتی ہیں۔)

اجنبی۔ اُس نے دستک دینے سے پہلے ہی جھک نے
اپنا سر ہ کیے ہوئے جھکائے ہیں۔ وہ ایک
دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔

مارتھا۔ آہ۔ آہ میری ننھی بہن۔ میں بڑی مشکل سے
گریہ زاری کو روک سکتی ہوں۔

(وہ اپنی بہن کے شانے پر سر رکھ کر
سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔)

اجنبی۔ اس نے پھر دستک دی ہوگی۔ باپ گھڑی
دیکھ رہا ہے۔ وہ اٹھتا ہے ....

مارتھا۔ بس بس۔ مجھے کبھی نہ جانا چاہیے۔
انہیں اکیلے چھوڑ دینا چاہیے۔

میری۔ مارتھا۔ مارتھا۔

(مارتھا کو روک لیتی ہے)

اجنبی۔ باپ دروازے کے قریب ہے۔ وہ کھٹکے
کو اٹھاتا ہے۔ وہ اسے ہوشیاری سے کھول رہا ہے۔

مارتھا۔ اوہ۔ تم نہیں دیکھتے ....

اجنبی۔ کیا ؟

مارتھا۔ جانے والے ....

اجنبی۔ اُس نے دروازے کا صرف ایک حصہ کھولا
ہے۔ سوائے میدان کے ایک کونے اور چشمے
کے میں اور کچھ نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ وہ اپنا ہاتھ
دروازے سے باہر رکھتا ہے۔ وہ ایک قدم پیچھے
ہٹتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے "آہ یہ تم ہو"
وہ اپنے بازو اٹھاتا ہے۔ وہ پھر ہوشیاری سے
دروازہ بند کر دیتا ہے۔ جو اندر آیا ہے وہ کمرے کے اندر
داخل ہو گیا ہے۔

(مجمع دریچے کے قریب آگیا ہے
مارتھا اور میری اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتی ہیں۔ پھر
بیٹھ جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے قریب سمٹ جاتی
مجمع کے ساتھ دریچے کے قریب جاتی ہیں۔ بوڑھا آدمی
کمرے کے اندر آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دونوں
بہنیں اٹھتی ہیں۔ ماں بھی اٹھتی ہے اور بچے کو ہوشیاری
سے اس آرام کرسی پر لٹا دیتی ہے جس پر سے
وہ اٹھتی ہے۔ اس طرح کہ باہر سے بچہ کمرے کے بیچ
میں سویا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا سر ایک طرف کو
جھکا ہوا ہے۔ ماں بوڑھے آدمی سے ملنے کے لیے آگے
بڑھتی ہے اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی ہے مگر
قبل اس کے کہ وہ اس سے ہاتھ ملا سکے، اپنا ہاتھ
پیچھے کھینچ لیتی ہے۔ ایک لڑکی اس کا لبادہ اتارنا
چاہتی ہے۔ اور دوسری اس کو ایک آرام کرسی
پیش کرتی ہے۔ مگر بوڑھا آدمی اشارے سے انکار
کرتا ہے۔ باپ نہایت تعجب کے ساتھ مسکراتا ہے
بوڑھا آدمی دریچوں کی طرف دیکھتا ہے۔)

اجنبی۔ وہ ان سے کہنے کی ہمت نہیں کرتا ۔ وہ ہماری
طرف دیکھ رہا ہے۔

(مجمع میں دبی آوازیں)

اجنبی۔ ہش۔

(بوڑھا آدمی دریچے کے باہر لوگوں کو
دیکھ کر جلدی اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ چونکہ
لڑکی اب تک اس سے آرام کرسی پر بیٹھنے کی کوشش

کرتی ہے۔ وہ آخرکار بیٹھ جاتا ہے اور دونوں ہاتھ
چہرہ وضہ اپنی پیشانی پر گڑ دیتا ہے)

اجنبی۔ وہ بیٹھ رہا ہے .....

(کمرے کے اندر جو لوگ بیٹھے ہیں۔
وہ بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت باپ
بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتا ہوا معلوم ہوتا
ہے۔ آخرکار بوڑھا آدمی بولتا ہے اور اس کی
آواز ان لوگوں کو متوجہ کر دیتی ہے لیکن باپ
اس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے ۔
بوڑھا آدمی پھر بولنا شروع کرتا ہے ۔ اور بتدریج
سب لوگ احساس خوف سے پریشان
ہو جاتے ہیں۔ یکایک ماں چونکتی ہے اور تکرمی ہو جاتی ہے)

ماریا۔ اُف! ماں سسکنے لگی ہے!

(وہ اس طرف سے منہ پھیر لیتی ہے
اور اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔ مجمع میں
پھر بھنبھناہٹ شروع ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو
دھکا دیتے ہیں۔ بچے روتے ہیں کہ انھیں اوپر
اٹھا لیا جائے تاکہ وہ بھی دیکھ سکیں۔ بہت سی
مائیں ایسا ہی کرتی ہیں جیسا کہ پیچھے ہٹتے ہیں)

اجنبی۔ بس! اُس نے اُن سے ابھی نہیں کہا ہے ....

(ماں بوڑھے آدمی سے بیقراری
میں سوالات کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ
چند الفاظ اور کہتا ہے۔ تب یکایک سب کے سب
نکلتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
وہ سر کو آہستہ سے ہلا کر اثبات کا اشارہ کرتا ہے۔)

اجنبی۔ اُس نے اُن سے کہہ دیا ہے۔ اُس نے اُن سے یکایک کہہ دیا

مجمع کی آوازیں۔ اُس نے اُن سے کہہ دیا! اُس نے اُن سے کہہ دیا

اجنبی۔ میں کچھ بھی نہیں سن رہا ہوں۔

(بوڑھا آدمی بھی اُٹھتا ہے اور بغیر
اُس طرف دیکھے ہوئے دروازے کی طرف
اشارہ کرتا ہے۔ جو اس کے پیچھے ہے۔ ماں باپ
اور دونوں لڑکیاں دروازے کی طرف دوڑتی ہیں
دروازہ کھولنے میں باپ کو وقت محسوس ہوتی ہے
بوڑھا آدمی ماں کو باہر جانے سے روکنا چاہتا ہے)

مجمع کی آوازیں۔ وہ باہر نکل رہے ہیں! وہ باہر نکل رہے ہیں!

(باغ میں۔ مجمع کے اندر ہل چل۔
سوائے اجنبی کے، جو دریچوں کے قریب کھڑا
رہتا ہے، سب لوگ مکان کی دوسری جانب
جاتے ہیں۔ اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔
کمرے کے اندر مرکزی والا دروازہ آخرکار کھل
کھل جاتا ہے۔ سب لوگ ایک ساتھ باہر نکل
جاتے ہیں۔ ستاروں بھرا آسمان، سبزہ
اور چشمہ دیکھا جا سکتا ہے۔ بچہ جو کمرے میں
چھوڑ دیا گیا ہے۔ آرام کرسی پر بیٹھے سوتا
رہتا ہے۔ تھوڑا وقفہ)

اجنبی۔ بچہ نہیں جاگا۔!

(وہ بھی چلا جاتا ہے)

نظم
شکستِ پندار

از پریم پجاری

پھر فصلِ برشگال — نشاطِ جہاں ہے
طاری مسرت — ہر شے پہ چھا رہی ہے
ذوقِ نظر کو دعوت — دیتے ہیں سبزہ و گل
ہر گوشۂ چمن ہے — قوسِ قزح کا دامن
رنگینیاں فضا میں — تحلیل ہو گئی ہیں
دل کو گدا رہا ہے — یہ رنگ و بو کا عالم
کالی سی گھٹا ہے — دن اسقدر سہانا
پھولوں کی انجمن میں — اک گل سا کھلا ہے
جھولے میں جلوہ فرما — اک حسن کی جوانی
یہ نازنیں تمنا — لیتی ہے جب کہ جھونکا
یا جنبشِ نسیم میں — گہوارہ حسن کا ہے
فطرت نے جیسے چاہا — اک معجزہ دکھانا
انوارِ صبح لے کر — کچھ بجلیاں ملائیں
موسیقیِ حزیں میں — شامل کیا تبسم
جب یہ تمام ہوا — باہم ہوئے مرکب
کس کی مجال دیکھے — اس کو نگاہ بھر کے
بیباک عاشقانِ وحشی — سجدہ گہِ نظر ہے
ماتھے پہ سُرخ بندی — گردن میں سبز مالا
جلتے ہیں جو دلے میں — اس طرح گوشوارے
یہ انکھڑیاں غضب کی — کس قدر حسیں ہیں
آفاق کی نظر میں — تسخیر ہیں یہ آنکھیں

پھر پیکرِ جمال — یہ تیرہ خاکداں ہے
رعنا عروسِ فطرت — پھر مسکرا رہی ہے
صد نیاز و الفت — پہنے ہیں سبزہ و گل
ہر تختۂ سمن ہے — صد ماہتاب خرمن
مخموریاں ہوا میں — تبدیل ہو گئی ہیں
آنکھوں میں چھا رہا ہے — جام و سبو کا عالم
نیرنگ سے کسی نے — روکی ہے صبح گویا
اک گوشۂ چمن میں — جھولا پڑا ہوا ہے
نظارہ سوز جلوہ — برہانِ 'لن ترانی'
اڑتی ہوئی پری کا — ہوتا ہے اس پہ دھوکا
پرواز اولیں میں — طیارہ حسن کا ہے
اچھی طرح ٹٹولا — اپنا بھرا خزانا
پھر نکہتوں میں یکسر — رنگینیاں بسائیں
شعرِ حزیں میں — داخل کیا ترنم
تب یہ حسین فتنہ — ان سے ہوا مرتب
گر بے حیا دیکھے — رہ جائے آہ بھر کے
سادہ بیاضِ گردن — اک خندۂ سحر ہے
وہ زہرۂ فلک سی — گردِ قمر یہ ہالا
جس طرح جھلملائیں — وقتِ سحر ستارے
کاجل نہیں لگایا — ویسے ہی سرمگیں ہیں
عشاق کی نظر میں — تقدیر ہیں یہ آنکھیں

٦ بس کہر بائیت کی | تفسیر ہیں یہ آنکھیں | روحِ نسائیت کی | تصویر ہیں یہ آنکھیں
جادو ہے نام ان کا | کہتے ہیں موہنی بھی | فتنہ مدام ان کا | افسوں بھی رہزنی بھی
بیتاب دلولوں کے | طوفاں سے بھر گیا ہے | شاید اسی سبب سے | سینہ ابھر گیا ہے
یا یہ غرورِ سینہ | نازِ شباب سمجھو | نازِ شباب کیسا | رازِ شباب سمجھو
یا حسنِ شرگیں تھا | خواہانِ خود نمائی | پس یہ اٹھان گویا | ہے غایتِ خود نمائی
الفاظ و حرفِ سینہ | شکست و آبگینہ | ایں ہست علم سینہ | گنجد نہ در سفینہ
یہ ولولہ نہیں ہے | جو گیت گا رہی ہے | غم بھولتا نہیں ہے | غم کو بھلا رہی ہے
ہلکی سی اک اداسی | چہرے سے آشکارا | ہے دل کی ترجمانی | یہ وہ گداز نغمہ

"نغمہ"

بھیگی ہوئی ہوائیں | چھریاں سی چل رہی ہیں | فریاد کی صدائیں | دل سے نکل رہی ہیں
اک دل نشیں ادا سے | کوئل کا کوک اٹھنا | اس نشتریں صدا سے | یاں دل میں ہوک اٹھنا
شبہائے تار و تنہا | یا کار کر رہی ہوں | اک موتیوں کی مالا | تیار کر رہی ہوں
تم آؤ گے تو کچھ بھی | تم سے نہیں کہوں گی | یہ ہار ہیں تمہارے | گردن میں ڈال دوں گی
اللہ کیا کہوں میں | الفت کی چیرہ دستی | غائب پرست ہوں میں | غائب ہے خود پرستی
تنہائیوں نے لوٹا | سامانِ دلنوازی | مدت ہوئی کہ ٹوٹا | پندار بے نیازی
بدلا ہے عاجزی سے | آئینِ خود پسندی | اس وقت کوئی دیکھے | میری نیاز مندی
اب میں خفا نہیں ہوں | او روٹھ جانے والے | آ میں تجھے منا لوں | آ تو مجھے منا لے

مقالات

(۱) سال وفات آبرو۔ از قاضی عبدالودود
(۲) دیوان جوشش۔ از قاضی عبدالودود
(۳) [illegible]۔ از قاضی عبدالودود
(۴) [illegible]۔ از [illegible] جمیل

سال وفات آبرو

از قاضی عبدالودود

آبرو کے معاصرین اور [illegible] مستشرقین کے لکھے ہوئے شعرائے اردو کے جو تذکرے اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں [illegible] سال وفات کی [illegible] ان میں سے [illegible] تذکروں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آبرو محمد شاہ کے شاعر تھے [illegible] عہد محمد شاہ کے ختم ہونے سے قبل ہی سفر آخرت اختیار کر چکے تھے، یہی وجہ تھی کہ اشپرنگر نے آبرو کے سال وفات کی [illegible] میں [illegible] کی [illegible] کی اختتامی حد مقرر کرنے پر قناعت کی۔ [illegible] کو بھی اس سے زیادہ [illegible] لیکن [illegible] سے [illegible] نو قسمتی [illegible] بیان کی جا سکتی تھی، وہ ایک انگریز قاموس نگار بیل نے [illegible] کر اشپرنگر کے تذکرے [illegible] کی اختتامی حد سے زیادہ نہ تھا، آبرو کا سال وفات

[illegible] محمد شاہ [illegible] عالمگیر [illegible] شاہ عالم کے مصنفین [illegible] کتابوں کے ساتھ اگر کتب خانے کا نام درج ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ کتب [illegible] کی ملکیت ہیں۔ [illegible] نکات الشعرا میر ص ۹ "[illegible] مستغنی وقت خود بود کہ عہد محمد شاہ [illegible] [illegible] ابراہیم [illegible] بعد محمد شاہ [illegible] ملت نمود [illegible] فہرست ص ۱۹۶ اشپرنگر نے اپنی فہرست کتب [illegible] کے ساتھ [illegible] تذکروں [illegible] شامل کیا ہے۔ وہ تذکرے حسب ذیل ہیں۔ مخزن نکات قائم، نکات الشعرا میر، تذکرہ گردیزی، تذکرہ [illegible]، [illegible] ابراہیم خلیل، تذکرہ [illegible]، تذکرہ عشقی، تذکرہ [illegible]

قرار دے دیا۔ بیل کے ماخذوں کا ہمیں صحیح علم نہیں، لیکن اتنا یقینی ہے کہ نکات الشعراء اور ذکر میر کے مطالعے کا اسے اتفاق نہیں ہوا تھا، ورنہ اسے یہ معلوم ہوتا کہ آبرو میر کے دہلی آنے سے قبل وفات پا چکے تھے، اور میر ۱۱۵۳ھ اور ۱۱۵۵ھ کے درمیان دہلی آئے ہیں، بیل کی غلطی پر تو چنداں تعجب نہیں، بعید از امکان ہے کہ محض سہواً ۱۱۶۰ھ کے قبل لکھنے کی جگہ ۱۱۶۰ھ لکھ گیا ہو، لیکن حیرت یہ ہے کہ ہمارے عہد کے مصنفین شیفتہ، نظامی اور بیلی نے بلا تامل بیل کے قول کو قبول کر لیا۔ اشپرنگر اور بیل کے بیانات میں جو اختلاف ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی، بیل کے قول کو غلط ثابت کر دینے اور آبرو کے زمانۂ حیات کی آخری حد کو ۱۱۵۵ھ تک پہنچا دینے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس سے آگے بڑھ کر آبرو کے سال وفات کی تعیین کر سکتے ہیں یا نہیں، حسن اتفاق سے یہ بہ آسانی ممکن ہے، اور شعرائے اردو کے تذکروں میں جو بات نہ مل سکی تھی وہ شعرائے فارسی کے تذکروں میں مل سکتی ہے۔ ان تذکروں میں سب سے پہلے تذکرۂ خوشگو کا نام لینا چاہیے، اس کا مصنف آبرو کا دوست اور خواجہ تاش تھا، اور اس کا بیان ذاتی علم پر مبنی ہے، ذیل میں ہم بجنسہ آبرو کا ترجمہ تذکرۂ خوشگو سے لے کر درج کرتے ہیں اس سے صحیح تاریخ وفات معلوم ہونے کے علاوہ آبرو کے متعلق اور قیمتی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ خوشگو کے بعد لچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرۂ گل رعنا میں، اور علی ابراہیم نے صحف ابراہیم میں آبرو کا سال وفات درج کیا ہے، یہ باور کرنے کی قوی وجہ موجود ہے کہ ان دونوں کا بیان خوشگو سے ماخوذ ہے۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ آبرو کے معاصر اور قریب العہد مصنفین نے شعرائے اردو کے جو تذکرے لکھے ہیں، وہ آبرو کے سال وفات کی تعیین نہیں کرتے، اور یہ صحیح بھی ہے، لیکن عہد اکبر ثانی کے

گلشن ہند لطف، تذکرۂ عشق میرٹھی، مجموعۂ نغز قاسم، عیار الشعراء خوب چند ذکا، گلشن بیخار شیفتہ، گلشن بےخزاں باطن،

۵ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی طبع دوم، جلد اول ص ۱۰۰ متعدد قدیم تذکرے جن کے حوالے دتاسی نے دیے ہیں، وہ ان کے لیے اشپرنگر کا ممنون ہے، لیکن اس سے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا ماخذ صرف اشپرنگر ہی ہے۔ بہت سی کتابیں، سرکاری رپورٹیں کتب خانوں کی فہرستیں جو فہرست اشپرنگر کے بعد شائع ہوئی ہیں دتاسی کے پیش نظر تھیں، اور بعض قدیم تذکروں تک بھی جن کے مطالعے سے اشپرنگر محروم رہا تھا، اس کی رسائی تھی، مثلاً، مسرت افزا، مجمع الانتخاب اور دیوان جہان

۶ اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری طبع ۱۸۹۴ ص ۱۵ ۷ نکات الشعراء ص ۹، ”میر گویند کہ شوق شعر داشت“ اگر میر کو خود آبرو سے ملنے کا موقع ملا ہوتا تو کبھی ”گویند“ سے شروع نہ کرتے۔ آرزو، آبرو کے قریبی رشتہ دار اور استاد تھے، میر صاحب آرزو کے گھر میں مقیم اور ان کی بہن کے سوتیلے بیٹے تھے۔ اگر آبرو بقید حیات ہوتے تو میر کو ان سے ملنے کا موقع ضرور ملتا۔

۸ ذکر میر ص ۹۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امیر الامراء صمصام الدولہ خان دوران کے ہمراہ جنگ میں مقتول ہو جانے کے بعد دہلی آئے ہیں، صمصام الدولہ نادر شاہ سے لڑتے ہوئے ۱۱۵۱ھ میں مارے گئے ہیں، نکات الشعراء ص ۱۰۲، ۱۰۳ ترجمہ عارف علی خان عاجز ”وہ دوازدہ سال شدہ باشد کہ در شاہجہان آباد تشریف داشت، بندہ فقیر از مخلصیہ ہیچ

ایک چھوٹا سا تذکرہ گار ... بیگم ... گل ... سے آبرو کا سال وفات دیا ہے اور اپنی طرف سے قطعہ تاریخ کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ... تاریخ ... شیک ... لکھتے ہیں۔ ... منقول از تذکرہ خوشگو ...

... نجم الدین علی خاں صاحب آبرو ... پایۂ سخن رسیدہ ... طبع بلند داشت ... ریختہ گوئی ... چنانچہ مرحوم ... ریختہ ... و تتبع

... می خواند ... تعریف ... و لیکن ...

... ریختہ ... شعر ریختہ معتبر بسیار ... اکثر ... و شبہا

... شعر فارسی ہم زبان ... سال ہزار و صد و چہل و ششم ... حق

... سن ... بیت ... حظ ...

... سینہ فقیر نوشتہ بود

گرچہ ... آبرو ... تا کے ...	... کم ... جام ... دل
جائے ... فقیر ...	... سواری ... دل
ساختم ... تراب	چوں ... بوئے تراب

وفات الشعراء کا سال ... ۱۱۵۵ھ ... ۱۱۵۳ھ ہوگا۔ ... بصورت ... یہ ثابت ہو گیا کہ ... آبرو کا سال وفات نہیں ہو سکتا۔ ... تاریخ ادبیات اردو ... ہجری ... ۱۱۴۰ کے مطابق ہیں۔ ... قاموس المشاہیر جلد ...

... اردو کا ... تذکرہ ... صدی کے ... قلمی نسخہ کتب خانہ مشرقیہ ... قلمی ... ایک ہی نسخے کا پتا چلا ہے ... فہرست ... مخطوطات اردو ... ہند کے ... اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تذکرے کو ... مصنف کا نام نہ معلوم ہو سکا۔ اس تذکرے کے ... تذکرہ ہندی ... تذکرہ گل رعنا، نشتر عشق، اور تذکرہ عشق میرٹھی۔

... اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں سال وفات ... لکھا ہے جو ۱۱۶۰ کے مطابق ہے۔

دیوان جوشش

از: قاضی عبدالودود

مصنف تذکروں میں[1] جوشش تخلص کے دو شاعروں کا ذکر ہے، ایک کا نام محمد روشن لکھا ہے اور دوسرے کا محمد عابد یہ تذکرہ نگاروں کی غلطی ہے، محمد عابد جوشش کے برادر اعیانی کا نام تھا، یہ بھی اچھے شاعر تھے، اور دل تخلص کرتے تھے، محمد روشن جوشش کے بعض شعر بھی ارباب[2] تذکرہ نے دل کی طرف منسوب کر دیے ہیں، اور وہ دیوان جوشش میں موجود ہیں، کاتب دیوان نے کتاب کے ایک سادہ صفحے میں مصنف کا نام روشن علی بھی لکھا ہے، اس کی سند اس وقت تک تذکرہ حسن کے سوا کسی اور تذکرے میں نہیں ملی۔ علی ابراہیم خلیل، محمد وجیہ الدین عشقی نے محمد روشن کے علاوہ کوئی اور نام نہیں بتایا، میر حسن نے بھی جوشش کے ترجمے میں محمد روشن ہی نام لکھا ہے، محمد عابد دل کے ترجمے میں ضمناً جوشش کا ذکر آیا ہے تو البتہ اس کا نام میاں روشن علی بتایا ہے۔ دیوان سے مصنف کے حالات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے، ایک قطعہ تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم ۱۲۱۶ھ تک ضرور زندہ تھے، یہ بھی حال کھلتا ہے کہ بہت آسودہ حال نہ تھے اور اہل دول کے سامنے دست طلب دراز کرنے میں انھیں کوئی تامل نہ ہوتا تھا، ایک بار شکاری جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ معاصرین میں ثروت، بسمل، اور فدوی (غالباً مفتی غلام مخدوم پھلواروی، حبا، علی ساکن چناز، اور محمد علی دہلوی) کے مصرعوں کو غزل کے مقطعوں میں اخل کیا ہے

مصرع ثروت نے جوشش مست و دیوانہ کیا	دشت دشت و بیشہ بیشہ شیشہ شیشہ ہے شراب
مصرع بسمل پہ جوشش ایک مرتے ہیں ہمیں	ورنہ یاں کس کو نہیں ہے اپنی اپنی جاں عزیز
نقش دل پر مصرع فدوی ہے جوشش یوں نگیں	اب نکلنا خوش نہیں آتا کہیں گھر سے مجھے

کاتب اور زمانۂ کتابت۔ خاتمے کی عبارت یہ ہے "تمام شد بتاریخ چہاردہم شہر شعبان سنہ ۱۲۳۰ فصلی بمکان شیخ قمر علی صاحب بمحلہ گوگھ پور من محلات شہر پٹنہ، بوقت گزشت یک پاس شب تحریر یافت۔ جملہ اوراق این کتاب از نگار یک صد و پنجاہ و یک، اند شمار غزل کلام جوشش بخط نجلی ختم شد از بندہ سبحان علی — من نوشتم صرف کردم روزگار، چوں من نمانم این بماند یادگار، من سبحان علی ولد شیخ دوست من، ساکن موضع نیمی پرگنہ غیاث پور ضلع پٹنہ ۱۲۳۸ھ"

کاتب کا حال جو ان کے خلف الرشید مولوی ظہیر احسن شوق نیموی مرحوم نے اپنی کتاب یادگار وطن میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۲ھ میں بمقام نیمی پیدا ہوئے اور ۱۲۹۶ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ کاتب نے کتاب صحیح

[1] گلشن بیخار، شیفتہ مطبوعہ نولکشور طبع دوم ص ۵۱۔ [2] سخن شعرا، نساخ، ص ۱۹۱ و ۱۹۲۔ [illegible] ص ۲۹ تا ۳۵

متن میں بھی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ املا کی بھی غلطیاں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ املا زمانے کے لحاظ سے مختلف بھی ہے۔ اس سے متصل صفحہ مقدمہ دیوان میں کی جائے گی۔ کتاب کی ضخامت کا تب نے خاتمے میں لکھا ہے کہ اوراق کی تعداد ۱۵۲ ہے۔ معلوم یہاں ہوتا ہے کہ کاتب نے قصائد کو دیوان سے الگ لکھا تھا۔ اور قصائد کے اوراق اس کے علاوہ ہیں۔ شوق مرحوم نے کتاب کی ضخامت انہیں چند بتائی ہے۔ جس کے ۱۵۱ ورق ہوتے ہیں۔ آج کل اس کتاب کے اوراق کی تعداد قصائد ۱۰ دیوان ۱۴۳ = ۱۵۳ ہے۔ یعنی سامنے ہیں قصائد کے جو اوراق غائب ہیں۔ ان سے قطع نظر کرکے دیوان کے ۲ ورق ضائع ہوگئے ہیں۔

قصائد چار مکمل ہیں۔ اور پانچویں کے کچھ شعر ہیں۔ پہلا قصیدہ جس ورق سے شروع ہوا ہے اس کا اوپر اور نیچے کا حصہ ضائع ہو گیا تھا۔ شوق مرحوم نے کاغذ چسپاں کر دیا ہے اور بسم اللہ، قصیدے کا عنوان مطلع کے بعض الفاظ اور دیوان سے چند شعر خود لکھے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ پہلا ورق نہ ہو اور شوق مرحوم نے اسے پہلا ورق بنا دیا۔ پانچویں قصیدے کے صرف ۵ شعر ہیں۔ اشارہ کاتب سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اور اشعار تھے۔ اس قصیدے کے کتنے اشعار ضائع ہوئے۔ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی بھی خبر نہیں کہ اس کے بعد اور بھی قصائد تھے یا نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ امام حسنؑ کے بعد کم از کم امام حسینؑ کی شان میں تو ضرور قصیدہ لکھا ہوگا۔ اہل دول کی شان میں بھی لکھا ہو تو عجب نہیں۔

قصیدہ اول نعت۔ اشعار ۳۵۔ دوم حضرت علیؑ کی شان میں اشعار ۴۶۔ سوم ایضاً ۷۶۔ چہارم امام حسنؑ کی شان میں ۵۵۔ پنجم ؟

قصیدۂ اول — جو کوئی در گہ رسالتمآب پہ جاوے — لے چمک سے پلک اس کی پھر آئینہ وار

ہر ایک زینہ و سہو کہ فلک پایۂ عرش — امکان مقرب کا وہاں نہیں ہے گزار

دوم — صاف طینت دکھایا ہے گرداں کہ خیال — عکس کھنچتا ہے ہر ایک کے آئینہ مثال

ناتواں بیہودہ کہ چشم ترقی اس سے — پست ہمت ہے نہ کر اس کی بندگی کا خیال

سوم — نقش کا غیر کے تو صفحۂ دل سے کر حک — دیکھ لے جلوۂ حق ارض سے لے تا بہ فلک

چہارم — صفائے جہاں کو حق نے دو دل روشن — کہ رشک شمع حرم ہے میانِ ظلمت تن

دیا دو دیدہ مشتاق حسن و الفاظ — کہ روشنی اس کی بدولت چھا سوادِ سخن

عنایت ایسی بھی کی زبانِ تیز بیاں ؟ — کہ تیغ قاطع ہر اہل ہے درمیانِ سخن

ہوئے ادو سر شوریدہ و مرحمت مجھ کو — کہ میرا دشت و بیابانِ عشق ہے مسکن

پنجم — یہ جو کہتا ہے اس طبع کا صاف ضمیر — کہ مثل آئینہ ہو کہیں ہے عکس پذیر

مطلع — غرض کسی کی ترقی سے نے تنزل سے — وزیر بادشہ ہو یا ہو بادشاہ وزیر

دیوان[۱] قصاید کے بعد ایک صفحہ سادہ ہے جس پر دیوانِ جوشش لکھا ہے۔ دوسرے صفحے سے غزلیات شروع ہوتی ہیں، یہ ورق شوق مرحوم کا لگایا ہوا اور لکھا ہوا ہے، اس کے بعد کے پانچ اوراق کے اوپر کے ٹکڑے ضائع ہو گئے تھے۔ شوق مرحوم نے انھیں بھی درست کیا ہے اور کسی صفحے میں ۲ کسی میں ۳ شعر خود لکھ کر لگائے ہیں، دسویں ورق پر ۱۲ کا ہندسہ دیا ہوا ہے اور اس کے بعد دور تک اسی حساب سے چلا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ ابتدا کے دو ورق غائب ہو گئے ہیں، اور اصل میں اس دیوان کا افتتاحی شعر ہے ؎ جو دل کہ جلوہ گاہ ہوا اُس کے نور کا مشتاق وہ نہیں ہے تجلّیِ طور کا ۔ نہیں بلکہ یہ ہے ؎ کس طرح سے اوصاف ہو خلاقِ جہاں کا قدرت[۲] قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا

---

۱ شوق مرحوم نے دیوان کے اوراق ضائع ہونے کے متعلق یادگار وطن میں کچھ نہیں لکھا۔ اس دیوان کے متعلق ان کی طویل تحریر کے اقتباسات درج ذیل ہیں ص ۳۰ تا ۳۱۔ "اس دیوان کو جناب والد مرحوم نے .... نقل کیا ہے، ہر صفحے میں ۱۷ شعر ہیں، ۱۹ جزو میں تمام کیا ہے، اس دیوان میں قصاید بھی ہیں، آخر میں ایک آدھ تاریخ بھی ہے جس سے ثابت ہے کہ میر و میرزا کے ہمعصر تھے ... افسوس کہ دیوان کی نایابی سے عظیم آباد کے شعرا بھی جوشش سے واقف نہیں۔ جناب شاد عظیم آبادی نے نوائے وطن میں جوشش کا ذکر تک نہیں کیا، سبب کیا وہی گم نامی اور اس دیوان کی نایابی۔ ورنہ ضرور جوشش کو راسخ مرحوم کے پہلو بہ پہلو جگہ دیتے، بہرکیف یہ دیوان ہر چند پرانا ہے مگر کلام پاکیزہ، اور اُستادانہ ہے، میں نے اس دیوان کو بہت قدر کے ساتھ اپنے کتب خانے میں جگہ دی ہے۔" شوق مرحوم کا یہ قول صحیح نہیں کہ ہر صفحے میں ۱۷ شعر ہیں، کسی صفحے میں ۱۶، کسی میں ۱۵، کسی میں اس سے بھی کم، کم ہی صفحے ہوں گے جن میں ۱۷ شعر ہیں، شوق مرحوم نے کتاب پر کہیں کہیں حاشیے بھی لکھے ہیں، اور کہیں کہیں کاتب کی غلطی کی اصلاح بھی کر دی ہے، جوشش نے ایک غزل میں طور کا قافیہ شور، باندھا ہے اس پر لکھتے ہیں، حور، وطور، وغیرہ کے ساتھ شور ایسے قوافی اساتذہ کے کلام میں جا بجا موجود ہیں۔ البتہ اکثر فصحائے حال احتیاط رکھتے ہیں۔[۳] جوشش نے علی ابراہیم خاں کو اپنے دیوان کا جو انتخاب بھیجا تھا وہ انھوں نے غالباً بجنسہٖ شائع کر دیا تھا۔ گلزار ابراہیم نسخۂ قلمی کے الفاظ یہ ہیں۔ "ہنگام تدوین این تذکرہ ابیات منتخبہ دیوان خود در سنہ ۱۱۹۳ھ براقم آثم فرستاد کہ ثبت تذکرہ نماید" یہ اشعار اسی مطلع سے شروع ہوتے ہیں، اور اس غزل کے اور اشعار بھی ہیں، از انجملہ یہ شعر ہے ؎ عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت، وہ مہتاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا ۔ دیوان میں یہ غزل تو موجود نہیں، لیکن کتاں کے قافیے کا شعر بہ تغیر [illegible] ہے اور [illegible] اشعار میں ہے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ شعر مطلع سر دیوان ہوگا۔ گلزار ابراہیم میں ردیف الف کی دو غزلوں کے منتخب شعر اور بھی ہیں۔ یہ غزلیں بھی دیوان میں نہیں ہیں۔ یہاں پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نسخۂ قلمی دیوان اور گلزار ابراہیم دونوں میں ہیں، لیکن گلزار کے بعض شعر دیوان میں نہیں، مثلاً ایک عالم کی جہاں نعش ہے یہ آج ہے یا قم تراشی ہے یہ یا جوشش مت، وہ دل بگڑا وہ کس کا کس کا تو خم کرے گا۔ گلزار ابراہیم مطبوعہ ص

ورق ۲۲۲۔ آپ کے علاوہ میری ۔۔۔ میں ۲۱۱، ۱۱ اوراق بہ حسب تفصیل ذیل غائب ہیں ۱۰ ورق ۲۰، ۲۳، ۲۲، ۲۶۔ ورق ۵۱
کتاب پر تمام ہوتا ہے ۔۔۔ گئے ہیں بستان شبنم، بیاض میں کاتب کا اشارہ ہے کہ جب کا ورق نہ ہو اس کی
وجہ سے شروع ہوتا ہے لیکن وہ اس مقطع سے شروع ہوتا ہے سو اس ۔۔۔ سوال سے اشارے خاکساری کو وہ
خدا افتادہ جو مخمس کی تو خود جان ہے ۲ ورق ۹۵ مصرع اور ورق ۱۰۰ سے ۔۔۔ مہرباں ہمارا ہر یہ بھلا ٹھہرا ہوا
خلاف اشارہ کاتب بعد کا ورق دوسری زمین کے مقطع سے شروع ہوتا ہے، پہلا مصرع ٹھیک پڑھا نہیں جاتا دوسرا
یہ ہے جو گل اپنے فعل سے پانی ۔۔۔ ۲۰، ۳۰ ورق ۱۰۰ مصرع آخر ورق ۔۔۔ سے عرصہ جاتا ہے ہوتا ہے +
بعد کا ورق اشارہ کاتب کے خلاف شعر ذیل سے شروع ہوتا ہے، پہلا مصرع پڑھا نہیں جاتا دوسرا مصرع کا
تعجب نہیں جینا ہی عجب ہے ۔ ۳۰ ۱۱، ورق ۱۱۹ تا ۱۲۳ مصرع آخر ورق ۱۱۰ سے ۔۔۔ کوشش
ہم سفر ہو ۔۔۔ بعد کا ورق کاتب کے اشارے کے خلاف یوں شروع ہوتا ہے پہلا مصرع ٹھیک نہیں پڑھا جاتا،
دوسرا مصرع کس کی مجال ہے جو ۔۔۔ ورق ۱۵، ورق ۱۳۰، ورق ۱۳۲ آخری صفحہ سے مد اجانے یہ
اطاعت کیا ۔۔۔ بعد کا ورق خلاف اشارہ کاتب مصرع ہذا سے شروع ہوتا ہے کس کو میں مصحف بروں تک آپ ہی
۔۔۔ سے ۔۔۔ کے کل اشعار ۔۔۔ ہیں ان کے علاوہ ۔۔۔ اشعار ہیں جنھیں لکھ کر کاتب نے قلم زد کر دیا ہے ممکن ہے
منسوخ ہوں یا ان کے متعلق اس کی روایت صحیح ہو ان اشعار میں سے چند درج ذیل ہیں:

کس طرح حسن اپنی رخ یار پہ ٹھہرے | خورشید کو دیکھے ہیں مقید وہ کتاں کا
کیا مسجد و میخانہ میں کیا دیر و حرم میں | تھا مد نظر تو ہی اگر مد نظر تھا
بتانِ سنگدل کی بزم میں تو قہر ہوئی پیدا | ہماری آہ بے تاثیر میں تاثیر ہوئی پیدا
لگے سنگ ملامت چلنے عاشق ہونے ہی اس پر | یہ کیا تقصیر تھی جو ساتھ ہی تعزیر ہوئی پیدا

غزلیات کے بعد ۴۰ متفرق اشعار ہیں، پہلے شعر کا مصرع اول یہ ہے: دیکھی ہے جو سے یار تری زلف خواب میں

۲۰ رباعیاں ہیں یعنی، باعث ہے ساری خدائی کی جزو کل + انعام یتیمی ہیں کرے وہ یتیم
حمد ہے بلا نعمت میرا [illegible] ذات اس کی بلا شبہ شک ذات کریم

اے دل جو تجھے ہوس ہے خواری + ہر بزم میں اتنی ہی ہے بسیاری
ہر چند کوئی پلائے تھوڑی سی ۔۔۔ + تا ہو نہ خطا جام خط بیزاری
اے واقف سر و جہر لے خبری میری + سن دکھ میں گرفتار ہے میری
بیماری عصب نے ستایا ہے مجھے + یا حیدر کرار خبر لے میری

۵ بند مخمس بر رواے زاہد و محتسب گرم ہوئے بہشت ۵ بند مخمس غزل ۔۔۔ لے بادشہ خوباں داد از غم تنہائی۔

۷، بند مخمس سے نہ امّہ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے۔ ۶۲، اشعار مثنوی ہجو نگاری سے ہے یہ چرخ کینہ دوں پرور + دشمن خاندانِ اہلِ ہنر + اتفاقاً نگاری جاتا ہوا جگہ پسند نہ آئی، ہجو کبھی کسی خاص شخص کا ذکر نہیں آیا،

۷۱، اشعار مثنوی ہزل نقل کبوتر باز سے اک محلے میں تھے کبوتر باز + اپنے فن میں سبھوں سے تھے ممتاز +

۱۹، اشعار مثنوی ہزل نقل افیونی سے اک افیمی کی نقل کرتا ہوں + نقل کرتے بھی اس کی ڈرتا ہوں +

۱۷، اشعار مثنوی در وصف مغنیہ نورتن سے اے صاحبِ حسن و خلق تجھ سا + پیدا نہ کوئی ہوا نہ ہوگا +

۷، اشعار قطعہ تاریخ وفات میر وارث علی نالاں۔ مادہ تاریخ میر وارث علی نالاں ۱۱۹۹ھ

۱۰، اشعار قطعہ تاریخ وفات محمد علی خاں مشتاق، مادۂ تاریخ سے اب گیا مشتاق ارم میں۔ ۱۲۱۰ھ

ذیل میں دیوان کی چند غزلیں اور منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں سے

جن دنوں سینہ ہمارا جلوہ گاہِ طور تھا
یہ تجلی خیزِ دل خجلت دہ صد طور تھا

کیوں نہ شاکی ہو نیازِ عشق نازِ حسن سے
لے کے دل کو پھیر دینا کون سا دستور تھا

اٹکھیلیوں سے چلنے کا تجھ کو مزا ملا
تیری بلا سے خاک میں کوئی ملا ملا

منت تاثیرِ اے آہِ سحر گاہی نہ کر
پر جو تجھ سے ہو سکے اس میں تو کوتاہی نہ کر

منزلِ اول ہی میں رہ جائیگی تھک کر کہیں
رہروانِ عشق کی اے عقل ہمراہی نہ کر

گاہ گاہے تجھ بھی جایا کر ہو راحت نصیب
آتش دل رات دن پہلو میں سلگاہی نہ کر

اے چرخ بے کسی پہ ہماری نظر نہ کر
جو کچھ کہ تجھ سے ہو سکے تو درگزر نہ کر

اس حسنِ صندلی کی ثنا اور تیرا منھ
دیوانہ کیوں ہوا ہے تو یہ دردِ سر نہ کر

غیرت یہ مقتضی ہے کہ اے غنچہ باغ میں
مرجھا ہی جا پہ منت بادِ سحر نہ کر

راغب نہ ہو طبیعت کو حور و بر دو ہو
اپنی یہ آرزو ہے دنیا ہو اور تو ہو

گر آرزو ہے دل میں اتنی ہی آرزو ہے
تاراجِ بے نیازی اقلیمِ آرزو ہو

راہِ طلب میں اس کی واماندگی کہاں تک
اے پائے سعی کامل سرگرمِ جستجو ہو

بے رشتۂ نگہ ہے بے سوزنِ مژہ ہے
چاکِ جگر ہمارا کس طرح سے رفو ہو

شمعِ حرم کا طالب اے بت میں کس طرح ہوں
میری کنشتِ دل میں جب جلوہ ساز تو ہو

عریانی پر ہماری مت طعنہ زن ہو زاہد
یہ دلق وہ نہیں جو محتاجِ شست و شو ہو

جو کشش بہار ہستی ہاک آن میں خزاں ہے
جوں گل نہ اس چمن میں پابندِ رنگ و بو ہو

آشنا جب کاکلِ شکیں سے دستِ شانہ ہو
یہ دلِ صد چاک دیوانہ جلا ہو یا نہ ہو

نسیم بہار کچھ اس انداز گل کو | یہاں سے لے چلی وحشت کہیں کو
[illegible] | پھر آتے ہو یہاں سے نظر آتا ہے
الم کیا کیا دہم پہ گردش ایام سے گزرے | تعلق دل سے اُٹھ جانے تو کیا آرام سے گزرے
وہ قاتل نظر آتا نہیں جس کے لیے ہمنے | دل و دین سے اُٹھایا ہاتھ ننگ و نام سے گزرے
دکھو اس کا نظر آیا کبھی [illegible] | ہر ایسی صبح سے باز آئے ایسی شام سے گزرے
وہ [illegible] قابل [illegible] آہ کرنے کے | ہے نالے ہم بے ضعف اب سب کام سے گزرے
[illegible] شیخ صاحب کو | یہی اسلام ہے جوشش تو اس اسلام سے گزرے
[illegible] ہاتھ دل آزار کر چلے | کیا خوب تم حیات بیمار کر چلے
[illegible] کی سننے پائے داد اپنی سنا چلے | کیا آئے اس جہان میں ہم اور کیا چلے
یوں ہی تو لطف ہے ترا [illegible] کرم بھی | یار اک نظر لطف کے مشتاق ہیں ہم بھی
جوں نقش قدم تو ہے پامال خلائق | دیکھیں گے ان آنکھوں سے کبھی اس کے قدم بھی
اس دل سے تو جانے کی نہیں [illegible] | بالفرض اگر ہم نے کیا طوف حرم بھی
[illegible] ادھر [illegible] گریاں | شادی ہے زمانے میں تو ہے ساتھ ہی غم بھی
اُس کے لب لعلوں کا [illegible] جوشش | لغزش ہی میں آ جائے ابھی پائے قلم بھی
سحر کا وقت ہے [illegible] چکا ہر جام کوئی | ابھی نہ گھر سے نکل ہیں خدا کے کام کوئی
گل و لالہ و سرو و صنوبر و شمشاد | ترے غلاموں میں نامی ہیں یہ غلام کوئی
میں کیا کہوں تری تیغ نگہ کی خونریزی | کئی سسکتے ہیں اور ہو گئے تمام کوئی
ادھر ہے عشوہ و غمزہ ادھر ہے ناز و ادا | کھڑے ہیں آگے ترے بہر اہتمام کوئی
چلا وہ ایک ہی جیتا گلی سے قاتل کی | گئے ہیں لے کے مرا نامہ و پیام کوئی
یہ کہتے [illegible] ہم کو تم یاد کرو گے | میرے دل ناشاد کو کب شاد کرو گے
چشم خوں بار کو اپنے وہ تراوش نہ رہی | ابرو مژگاں کو کسی نوع کی کاوش نہ رہی
خلق ہم سے جب سے لگے [illegible] عالم سے کام ہے | یہ سمجھے ہی نہیں آرام کس کا نام ہے
[illegible] کیجے | ولیکن جی نہیں لگتا ہمارا اس کو کیا کیجے
کیا بہار حسن پہ موقوف میرا عشق ہے | جب تلک جیتا ہوں میں ہوں عاشق ترا عشق ہے

دریائے لطافت

از ق ع و

آزادؔ[۱] یہ اعتراف کرنے کے بعد کہ گلکرسٹ نے قواعد اردو ۱۸۱۰ء کے لگ بھگ لکھی، آگے چل کر اسی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ "اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۲۲ھ میں قواعد اردو لکھ کر ایجاد کی شاخ میں ظرافت کے پھول کھلائے"۔ یہ تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ کہ گلکرسٹ کی کتاب کو تقدمِ زمانی حاصل ہے، دریائے لطافت کو قواعد اردو کی پہلی کتاب قرار دینا آزاد ہی کا حصہ تھا۔ شاید انھیں خود ہی اس کا احساس ہوا کہ دونوں بیان صحیح نہیں ہو سکتے، چنانچہ جب انشا کا حال لکھنے لگے تو انھوں نے اس دعوے میں ترمیم کر دی اور صرف یہ کہنے پر قناعت کی کہ "یہ پہلی کتاب قواعد اردو کی ہے جو ہمارے اہلِ زبان نے اردو میں لکھی ہے"[۲]۔ میر فرزند احمد صفیر بلگرامی جو اپنے عہد کے باخبر شاعر اور قابلِ قدر مصنف تھے، آزاد کے دعوے کو نہ اس کی اصلی شکل میں تسلیم کرتے ہیں نہ ترمیم شدہ شکل میں۔ ان کا اعتراض ہے کہ صرف[۳] قواعد گلکرسٹ ہی نہیں بلکہ شمس البیان مصنفہ طپش دہلوی بھی دریائے لطافت سے پہلے شائع ہو چکی ہے، اور چونکہ طپش کو اہلِ زبان کے زمرے میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، آزاد کا دعوے غلط ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ صفیر مرحوم نے اپنا زورِ قلم بیکار صرف کیا ہے۔ گلکرسٹ کے تقدم کا اقرار خود آزاد کو ہے، اور ایک گلکرسٹ پر کیا موقوف ہے قواعدِ اردو کے متعلق بکثرت کتابیں اہلِ فرنگ نے د۔ ل سے پہلے لکھی تھیں۔ ان کا ذکر گریرسن نے اپنے ایک مضمون میں کیا تھا، جو پہلے رسالۂ ایشیاٹک سوسائٹی میں چھپا تھا، اور اب گریرسن کی یادگار زمانہ تصنیف لسانی جائزۂ ہند کی جلد دس میں شامل ہے۔ رہی شمس البیان، اس میں شک نہیں کہ سنہ کے لحاظ سے وہ بھی مقدم ہے، لیکن وہ سرے سے قواعد کی کتاب ہی نہیں، اس کا موضوع محاورات و مصطلحات ہیں، اور اس کا علم خود صفیر مرحوم کو بھی تھا۔ پھر یہ ثابت کر دینے سے کہ شمس البیان د۔ ل سے پہلے شائع ہو گئی تھی، آزاد کا قول کیونکر باطل ہو گیا۔ اور انشا کی طرف سے نقارۂ فخر پر جو چوب انھوں نے لگائی تھی اس کی آواز کیونکر دب گئی؟

اصل یہ ہے کہ صفیر مرحوم کی غرض یہ دکھانا تھی کہ گلکرسٹ اور طپش کے جائز حقوق غاصب انشا سے واپس دلوا دیے جائیں بلکہ اپنے اُستاذ الاستاذ ناسخ کی طرف سے یہ اعلان کرنا تھا کہ اُن کو ناسخ کا مقابلہ منظور تھا، اور اس میں کسی دوسرے کی مداخلت گوارا نہ ہوگی۔ ناسخ نے اگر اتحاد وغیرہ کا دعوے کیا ہو تو اس کی ہمیں خبر نہیں۔

۱؎ آبِ حیات طبع ہفتم ص ۲۱۹۔ ۲؎ آبِ حیات ص ۲۰۲۔ ۳؎ جلوۂ خضر جلد ۱، ص ۲۲۱، ۲۲۲۔

کیونکہ کسی معاصر تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن صفیر مرحوم جہاں تک اصلاح زبان اردو و انضباط قواعد اردو کا تعلق تھا، ناسخ کے علاوہ کسی کا نام بھی اس سلسلے میں سننا پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ وہ یہ لکھنے سے اپنے کو باز نہ رکھ سکے کہ گو انشا کو اصلاح ناسخ کے مطابق اپنے کلام کی درستی کا موقع نہ ملا، لیکن ان کا مادّہ ناسخ کے طرز صحبت سے حاصل ہوا اور انشا کی کہی جس قدر آیا اس قدر قواعد پر ان کو عبور ہوا، اور جو کچھ جی میں آیا اول جلول طرح سے لکھ دیا۔ ؎۱

صفیر مرحوم نے اپنے دعوے کی بنیاد مصحفی کے دیوان ہشتم کے دیباچے اور ایک قطعے پر رکھی ہے۔ دیباچے میں ناسخ کا نام موجود ہے۔ اور قطعہ میں ایک بے سر شخص کی طرف اشارہ ہے جس سے اہل اردو نے فیض پایا ہے۔ دیباچے کے الفاظ یہ ہیں: "معہذا صحت الوان ایں خوان بہ تشخیص ناسخ منقح گشت۔ تخلص خود را اسم بامسمیٰ انگاشتہ، ہر طرز بلند گویان سادہ کلام و دیرینہ منزلہ را منسوخ گشتہ۔" ظاہر ہے کہ اس قول کا تعلق تجدید زبان سے نہیں بلکہ تجدید طرز سخن سے ہے۔ اور قطعہ میں صرف ناسخ کی طرف اشارہ ہی نہیں۔ مفصل طور پر اس کے متعلق آیندہ لکھا جائیگا۔ یہاں پر ہم صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہماری نظر سے مصحفی کے کل دواوین اور اکثر تصانیف گزری ہیں، لیکن ایک لفظ بھی ایسا نظر سے نہیں گزرا جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ مصحفی ناسخ کو زبان اردو کا مصلح و مجدد سمجھتے تھے، ہاں یہ اعتراف مصحفی نے کئی جگہ کیا ہے کہ ناسخ نے سادہ گوئی ترک کرکے معنی بندی اختیار کی تھی، اور اس طرز کو مقبول عام بنا دیا تھا، یہاں تک کہ خود مصحفی بھی جو معنی بندی کو سخت ناپسند کرتے تھے، بادل ناخواستہ ناسخ کے تتبع پر مجبور ہو گئے تھے۔ راقم کا خیال ہے کہ ناسخ کی اصلاح زبان کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ناسخ کو صحت الفاظ کا اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ خیال تھا، اور وہ اردو ادبی جو نظم میں دوسرے شعرا اپنا حق سمجھتے تھے اس سے انھوں نے اپنے کو بطیب خاطر محروم کر لیا تھا۔ لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ اردو کوئی مصنوعی زبان نہیں، جسے ایک یا چند آدمیوں نے طلڑا ایجاد کیا ہو اور اس کے قواعد و ضوابط جب جی چاہے وضع کرتے رہتے ہوں۔ اردو زندہ زبان ہے اور دوسری زندہ زبانوں کی طرح ہمیشہ معرض تغیر میں رہتی ہے، جس طرح سودا و میر کے عہد میں آبرو و مضمون کی زبان ایک حد تک بدل گئی تھی، اسی طرح انشا کے زمانے میں سودا و میر کی زبان بدل چلی تھی۔ مزید برآں یہ کہ دہلی کے سیاسی زوال کی وجہ سے زبان کا مرکز لکھنؤ ہو چلا تھا، اور پچاس برس کے عرصے میں ایسے محاورات اور روزمرے یہاں پیدا ہو گئے تھے جن کی دہلی والوں کو خبر بھی نہ تھی، لیکن انشا کے وقت تک لکھنؤ نے دہلی کے خلاف علانیہ علم بغاوت بلند نہیں کیا تھا، اور دہلی و لکھنؤ کی زبان کا اختلاف اس قدر نمایاں نہ تھا، جتنا ان کے بعد ہوا۔ دریائے لطافت کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے ہمیں زبان کے میلان اور تغیر پذیری کا اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے، اگر عشرۂ سوم کے اوائل کے بجائے یہ کتاب

؎۱ جلوۂ خضر جلد ۲ ص ۳۰۲، ۴۰۳، ۵۷ جلوۂ خضر ص ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۴۳، ۳۴۵۔

عشرۂ چہارم کے اواخر میں لکھی جاتی تو باوجود اس کے کہ اس کے قواعد زبان حال سے قریب تر ہوتے، لیکن، اس کی اہمیت کم ہو جاتی۔ جو سودا و ناسخ کے درمیانی دور کی تصنیف کی حیثیت سے اسے حاصل ہے، رہا یہ سوال کہ ناسخ کا انضباط قواعد اردو سے کیا تعلق ہے، اس کا جواب ہم کسی دوسرے موقع پر دینے کی کوشش کریں گے، یہاں پر انشا کو تقلید ناسخ کے الزام سے بچانے کے لیے صرف اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ جن لوگوں کی نظر سے دیوان ناسخ کے قدیم نسخے گزرے[1] ہیں، ان کی رائے ہے کہ ۱۲۳۲ھ تک ناسخ کی زبان وہی تھی جو مصحفی اور انشا کی تھی، سید انشا کی کتاب ۱۲۲۲ھ میں لکھی گئی ہے، ناسخ سے استفادہ بالکل خارج از بحث ہے۔

:بان سے متعلق قدما کی تصانیف میں جو غیر معمولی اہمیت د کو حاصل ہے، اس کا اندازہ کر کے آج سے کچھ کم سو سال ہوئے کاکوری کے ایک بزرگ مولوی مسیح الدین علی خاں بہادر نے جو اس زمانے میں مرشد آباد میں مقیم تھے، وہیں کے مطبع آفتاب عالمتاب میں اس کتاب کو طبع کرایا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خود لکھنؤ نے جو عہد ناسخ میں شعر کی معنوی خوبیوں کے مقابلے میں زبان کی درستی کی طرف زیادہ مائل تھا، اس کتاب کو قابل اعتنا نہ سمجھا، اس کا سبب سوا اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اہل لکھنؤ کا حاسۂ تاریخی (ہسٹوریکل سنس) بہت کمزور تھا، اپنے عہد کی زبان سے انھیں ضرور دلچسپی تھی، لیکن یہ سوال کہ زبان اردو نے کن ارتقائی منازل سے گزر کر موجودہ صورت اختیار کی ہے، ان کے لیے بے معنی تھا، مولوی مسیح الدین علی خاں کی ژرف نگاہی کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے کسی حد تک سہی، کتاب کی اہمیت کو سمجھا، اور اس کی ترتیب و تہذیب کا بھی معقول انتظام کیا،

انجمن ترقی اردو کی عنان انتظام جب ہمارے فاضل دوست عبدالحق صاحب کے ہاتھ میں آئی، تو ان کی نظر انتخاب پر بھی پڑی، اور انھوں نے ۱۹۱۶ء میں اسے انجمن کی طرف سے شائع کیا، لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ شاید انجمن کا ابتدائی زمانہ تھا، اور کچھ اس وجہ سے کہ جو مطبوعہ نسخہ انجمن میں تھا، اس میں وہ غلط نامہ جو مرتبین نسخہ مرشد آباد نے شامل کیا تھا، نہ تھا، نسخۂ مطبوعہ انجمن میں بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ نسخہ مرشد آباد م، اور نسخہ انجمن ن کا مقابلہ کرنے سے حسب ذیل اختلافات کا پتا چلتا ہے۔

۱۔ احمد علی گوپاموی کی تمہید، ن میں نہیں ہے،

۲۔ انشا کا خطبہ ن میں نہیں ہے۔

۳۔ دروازۂ اول کے ابتدا کی عبارت بقدر ۱/۲ ص ن میں نہیں ہے۔

۴۔ متعلق عروض و قوافی کا بیان جو قتیل کا لکھا ہوا ہے ن میں نہیں ہے۔

۵۔ م میں جو اغلاط رہ گئی تھیں، ان کی تصحیح کے لیے ۴ صفحات کا غلط نامہ شامل کتاب کیا گیا تھا، ن میں اس

[1] مقدمۂ مثنوی ناسخ شائع کردہ کتابستان الٰہ آباد۔

بالکل غائب ہیں جنھیں گھٹا دیا، ہر م کی مثالیں اپنی جگہ پر رہی ہیں۔

۳۔ جا بجا الفاظ و عبارات کے فصل یا منتقل ہونے کی وجہ سے متن میں خلل کی گنجائش ہے، اس میں تو چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن بعض مقامات سے الفاظ خارج کر گئے ہیں وہاں اس عمل کا کوئی نشان نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے یہ کہ کاتب کی غلطی کی وجہ سے بعض مقامات پر غیر ضروری الفاظ داخل ہو گئے ہیں، جس سے مصنف کے منشا کے خلاف مطلب پیدا ہو گیا ہے۔ ان اغلاط کو دیکھ کر، اور کتاب کی اہمیت کا احساس کر کے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ کتاب پر با تفصیل نظر ڈالی جائے اور جو اغلاط اس میں رہ گئی ہیں، ان کی تصحیح بھی ضمناً کر دی جائے، لیکن ایک مضمون کی وسعت اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ پہلے مضمون میں ہم کتاب کی تقسیم و تبویب، احمد علی کی تمہید، انشا کے خطبے، دروازۂ اول کی ابتدائی عبارت اور کتاب کی ظاہری حالت سے بحث کریں گے۔

۴۔ نسخے کے معمولی سفید کاغذ پر ٹائپ میں چھپا ہے۔ سرورق کے بعد ۶ ص پر احمد علی گوپاموی کی تمہید ہے، ۲ ص پر فہرست مضامین ہے۔ اصل کتاب اس کے بعد شروع ہوتی ہے، جو ۴۶۷ ص پر ہے، ۱۴ ص غلط نامے کے اس کے علاوہ ہیں۔ انشا کا خطبہ ۰ ص میں ہے، حصہ منطق نوشتۂ قتیل ۳۰۹ سے شروع ہو کر ص ۳۹۴ پر ختم ہوتا ہے، حصۂ قافیہ، ردیف ص ۳۹۹ تا ۴۱۵، حصہ صنائع و بدائع و اقسام نظم ص ۴۱۵ تا ۴۷۰۔ خاتمہ جو ان میں موجود ہے ۴۷۰ تا ۴۷۶۔ کتاب میں بالعموم ۱۸ سطریں ہر صفحے میں ہیں۔

سرورق: دریائے لطافت | در علم صرف و نحو زبان اردوے شاہجہاں آباد و منطق | و بدیع و بیان و عروض و قوافی با تفصیل محاورات | و دیگر فوائد نظم و نثر زبان مذکور نصف اول آں تصنیف | میر انشاء اللہ خاں مرحوم و نصف ثانی مؤلفہ | مرزا محمد حسن قتیل مرحوم | کہ در تحقیقات ایں زبان از ابتدائے رواج | اردو کما حقہ ہیچ یک تصنیف بہ ایں تفصیل و تنقیح نشدہ در مطبع مرشدآباد مطبع | آفتاب عالمتاب بطبع شد | در ماہ رجب المرجب ۱۲۶۶ ہجری۔ التماس پانچ سطروں میں التماس ہے کہ کتاب ہذا حسب منشائے قانون بستم ۱۸۴۷ء "داخل بہی رجسٹری گورنمنٹ" ہو چکی ہے۔ بلا اجازت کوئی صاحب قصد طبع نہ فرمائیں۔

تمہید نوشتۂ احمد علی گوپاموی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے اور سطر اول یہ ہے "بہترین فاتحہ کہ فصحائے رطب البیان محفل زبان آرائی و بلاغے۔

اس کے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں: "از ابتدائے ترویج زبان ریختہ کہ بنام اردوئے معلی موسوم و مشہور شدہ تا حال کہ صد سال می گذرد کتابے حاوی جمیع قواعد آں زبان .... مؤلف نشدہ بود، لہٰذا در ... ۱۲۲۲ میر انشاء اللہ خاں ... تلمیذ ... بحسب طبع خود کہ مائل بہ ظرافت و مسخرہ بود، اصول و قواعد صرف و نحو اردو بہ انداز مسخرہ و ظرافت ... بہ ایجاد طبیعت خود قواعد و الفاظ نوشتہ و برائے نصف ثانی آں کہ

مراد از منطق و عروض و قوافی و بیان و بدیع باشد بمرزا محمد حسن متخلص بہ قتیل، اشریک تالیف آں گردانید و کتابے مہذب کرد ..... و اگرچہ مرزا ممدوح ہم انضباط و تالیف ایں علوم .... از کتب متداولہ نمودہ، حسب لیاقت خود بانجام رسانید الا در عروض و قوافی وغیرہ تمسخر و استہزاء بے مزہ نمودہ و علم منطق را بسبب جہالت و ناواقفیت اناں مسخ کرد تا بحدیکہ علمائے ذی شان را ... اعتنا ہم بآں سواز تصحیح وغیرہ ازاں جنس است کہ اطفال چند مشغول بہ بنا ہاے و ہمی امکنہ باشند و کیے بر سر وقت آنہا رسیدہ قصد نہوادی خطوط و سطوح نا ہموار شں قائمۂ ورنہ منطق اگرچہ بعضے گفتگوے علوم دیگر ہم باسلوب حسن لیاقت بجرح و تعدیل از کیا داردو چند جا زدہ و لغزش واقع شدہ۔ الا انصاف ایں ست کہ برائے تعلیم و تربیت مشتغلین تعلم زبان اردو و شعرائے ایں زبان بس نسخۂ عجیب و تحفۂ غریب است ..... و دریں عرصہ کہ نیات ارکین سلطنت برطانیہ مصروف فروغ ایں زبان است و برائے انگریزان جدید الوجود ہندوستان ۔ ایں کتاب نہایت مفید و بکار آمد است و بہمیں نظر از عرصۂ قریب پنجاہ سال کہ مردمان ہم در کلکتہ و ہم در بلاد دیگر ہوم طبع آں نمودند مگر بسبب اشتمال آں بر مصطلحات جدید چوں و قتے پیدا نمودہ و ہم نسخ کتاب ایں نسخہ ہر جا کہ دیدہ شد ما نا یحسق مستق بود کہ ۱) بالفعل ۔ مولوی محمد مسیح الدین علی خاں بہادر، ادام اللہ حشمتہ و برکاتہ دیوان ڈیوڑھی جناب عالیہ متعالیہ نواب امیر النسا بیگم صاحبہ دام اقبالہا بنظر شد عفو رہ نسخ متعددہ بہم رسانیدہ ... بمشقت تمام تصحیح اں بعمل آوردند .. و بندہ عاصی ۔ احمد علی الگوپاموی ہوعفا واللہ عنہ را شریک تصحیح و مامور باہتمام طبع آں ساختند، و اگرچہ در تصحیح آں زمان کثیر صرف شدہ در حقیقت : بادہ از تصنیف و تالیف صعوبت و محنت بہم رسید مگر الحمد للہ کہ حسب خواہ مہذب و مطبوع شد ۔"

تمہید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حصہ منطق کے اغلاط اس قدر زیادہ تھے کہ مولوی مسیح الدین علی خاں صاحب کی تصحیح کی طرف بالکل توجہ نہ کی، لیکن مولوی احمد علی نے تراد مصنف کو مد نظر رکھ کر کاتبوں کے اغلاط کو رفع کر دیا۔ پروف پڑھے، اور کتاب کے چھپوانے میں مولوی محمد سعید جائسی اور منشی وارث علی پنڈوی نے بھی اعانت کی تھی۔ کتاب کے چھپوانے کی غرض یہ بھی تھی کہ ہنری ٹارنس صاحب بہادر اجنٹ نواب گورنر جنرل مرشد آباد کی وساطت سے نواب منتظم الملک محسن الدولہ زبدہ جاہ سید منصور علی خاں بہادر نصرت جنگ ناظم بنگالہ کی خدمت میں پیش کی جائے۔ تمہید کے آخر میں ۲ بیت کا ایک قطعہ تاریخ مرزا آقا جان سیفر تخلص کا لکھا ہوا ہے، آخری بیت یہ ہے ؎

سیفر خستہ بہر سال طبعش ۔۔۔ بگفتا "ایں ست دریائے لطافت"

اس سے ۱۲۶۰ھ نکلتا ہے، لیکن بہت ممکن ہے کہ شاعر نے ایں ہست، میں الف کو حذف کر دیا ہو۔ اصل کتاب تمہید اور فہرست کے اوراق کو نظر انداز کر کے صفحہ اول سے شروع ہوتی ہے۔ ص اول ۱۱ سطریں۔ سطر اول "الحمد للہ ..." الخ، دوسرے رواسطر دارد ہست کردیا ہے اور اس کے بعد مختصر حمد و نعت کے بعد مصنف لکھتا ہے،

اما بعد فقیر [illegible] کتاب اقدام فصحا انشاء [illegible] متخلص به انشا ابن حکیم میر ماشاء الله جعفری نجفی نوید که چون بعنایت قادر منان ، جنین جهالت حضور [illegible] امین الدوله ناظم الملک نواب سعادت علی خان بهادر مبارز جنگ ... [illegible] پادشاه شد که باز انان پیشین ... قواعد زبان [illegible] فارسی [illegible] زبان اردو بحکم کل جدید لذیذ ، زیاده [illegible] مگر [illegible] بخش جان [illegible] بست [illegible] کتاب [illegible] آستین کتابت گردید ، اگر سعی تو شرح و بسط تمام [illegible] شاه [illegible] گردد ، هر آیینه حالا [illegible] صیافت طبع معاصرانه [illegible] بعد از این با وجود آینده نیا شد [illegible] چند [illegible] تالیف نسخه مشتمل بر تحقیق لغت و محاوره و صرف و نحو و منطق و عروض و قافیه و بیان و بدیع [illegible] زبان مبارک برآمده التماس کرد آن حضرت ، الغرض از صرف توجه [illegible] ساقی فصیحان [illegible] تمام این غلام مستهام ست . خلاصه کلام این که امتثال امر عالی را [illegible] استغراق بتحصیل لذات روحانی ابدی بعکس [illegible] محصل عالی حضرت [illegible] یاد کردن لطائف حضور اقدس که هر روز بلا فصل دو سه چار [illegible] بیان [illegible] کتاب لطائف السعادت که تا قیام قیامت بتمامی مرساد ، می نوشتم و [illegible] فرصت [illegible] هیچ [illegible] میرزا محمد حسن قتیل را نیز که [illegible] تامل [illegible] پسندیده [illegible] بر هر حصه براه انه قرار پذیرفت . شریک این [illegible] مصطلحات شاه جهان آباد و علم صرف [illegible] نوبسه [illegible] منطق و عروض و قافیه و بیان و بدیع [illegible] قلم [illegible] آورد چون بنده را بیشتر با نظم [illegible] نثر [illegible] داشتن [illegible] برپسند [illegible] سوائے لفظ و محاوره و اصطلاح [illegible] بر [illegible] خاطر فقیر گذشته "

سب انشا [illegible] لکھتے ہیں کہ [illegible] کتاب کا ایک نام [illegible] تاریخی [illegible] ہے کیونکہ ناظم الملک بہادر کے حکم سے لکھی گئی ہے ، دوسرا نام [illegible] مرزا قتیل نے بھی [illegible] تام رکھے ، ایک دریائے لطافت [illegible] دوسرا حقیقت اردو ، اس کے بعد مندرجات کتاب کی تشریح کی ہے ۔ یہ اس فہرست کے مطابق ہے جو [illegible] موجود ہے ، [illegible] تا [illegible] جز سوم و جز چہارم و جز پنجم جو منطق عروض قوافی پر مشتمل ہیں ، اس فہرست میں [illegible] خطبہ مصنف کے بعد پہلا [illegible] شروع ہوتا ہے ، اس کا عنوان " در بیان کیفیت زبان اردو " ہے [illegible] نام لیے ہیں جو سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت سے [illegible] تجویز کیے ہیں اور یہی نام کتاب میں ہر جگہ برتے گئے ہیں [illegible] اقبال بخش ، پاک طینت ، ترحم ، ثبات قدم ، جوانمردی ، حکمت ، خدا ترسی ، چارہ سازی ، دولت ، ذکاوت [illegible] سطوت ، شجاعت ، صولت ، ضبط ، فرزیبان ، ظہور برکات ، علو نسب ، غیرت ، فتوت [illegible] نفاست ، مروت ، [illegible] ہمت بلند ، یاد حق ۔

میٹرلنک کے خاموش ڈرامے

از "آرزو" جلیل

خاموش ڈراموں میں واقعات کا اظہار زیادہ تر خاموش عمل سے ہوتا ہے۔ "خاموش عمل" کرداروں کی نقل و حرکت پر منحصر ہے، اور اسی نقل و حرکت سے سامعین کل واقعات کو سمجھ جاتے ہیں۔ خاموش ڈرامے کو کامیاب بنانا مشکل کام ہے، کیونکہ خاموشی سامعین کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس لیے خاموش ڈرامے میں انتہائی کشمکش ہونی چاہیے۔ ایسی کشمکش جس سے سامعین کے جذبات پر گہرا اثر ہو۔

بسا اوقات خاموشی گفتگو سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ شعرا کے نزدیک خاموشی ایک بحر بیکراں ہے جس میں گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔ اس خیال کو ڈاکٹر اقبال نے اس طرح قلم بند کیا ہے ؎

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری + خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

خاموشی کی اس اثرانگیزی کا تجربہ ہمیں ڈرامے کے ذریعے بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہمیں اس قسم کے تجربے کا موقع مل سکتا ہے، لیکن زندگی کی تمثیل زندگی سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ جب ہم کوئی ڈراما دیکھتے ہیں تو ہماری توجہ صرف ڈرامے ہی کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ ڈرامے کے واقعات کا ہم غائر مطالعہ کرتے ہیں۔ ہر ممثل کے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات پر ہم غور کرتے رہتے ہیں۔ ممثلین کی خاموشی ہمیں اُن کی گفتگو سے کم دلچسپ نہیں معلوم ہوتی۔

خاموش ڈراموں پر میں نے محض سرسری طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ کیوں کہ میرا اصل مقصد میٹرلنک کے خاموش ڈراموں پر تبصرہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے میں نے اُس کے دو ڈراموں ڈابوگل (اندھے[1]) اور لال تیر[2] کا انتخاب کیا ہے۔

"اندھے" ایک ایکٹ کا ڈراما ہے۔ اس کے افراد اندھے مرد اور اندھی عورتیں ہیں۔ یہ سب رات کے وقت ایک جنگل میں اپنے راہب کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ جنگل سمندر کے کنارے ہے۔ گہری خاموشی طاری ہے۔ کبھی کبھی خاموشی کا طلسم ٹوٹتا ہے اور سوکھی پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اندھے وقتاً فوقتاً بات چیت کرتے ہیں پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ وہ پریشان ہیں کہ راہب اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔

---

[1] اس ڈرامے کا ترجمہ جناب شاہد احمد مدیر ساقی نے کیا ہے ملاحظہ ہو سالنامہ ساقی ۱۹۳۵ء

[2] اس کا ترجمہ "سکون" کے عنوان سے "معیار" کی اسی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے۔

گھنٹی۔ السے لوگ۔ آدمی، دھڑکا وقت۔ بھولی بسائیں سائیں۔ اور کبھی کبھی اندھوں کی آواز .... اس خاموش ماحول پر ڈرامے کی تشکیل منحصر ہے۔ یہ راہب کون ہے؟ بارہ بجے رات کو اندھے اُس کا انتظار کیوں کر رہے ہیں؟ ... . سامعین کا اضطراب لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کتا آتا ہے اور اندھوں میں سے ایک شخص اُس کے اشارے پر چلتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک لاش سے ٹھوکر کھاتا ہے۔ (خاموش لمحہ!)۔ اسے تشویش ہوتی ہے کہ یہ کس کی لاش ہے۔ سب اندھوں کو وہ فرداً فرداً پکارتا ہے۔ اس طرح اندھوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں مرا۔ اور انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اُن کا راہنما پیشوا مر گیا۔ اس کے بعد اندھوں کو قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے، اور بچہ جو اُن کے ساتھ ہے رونے لگتا ہے۔ قدموں کی آہٹ بتدریج قریب تر آتی ہے اور اندھوں کے درمیان آکر معدوم ہو جاتی ہے۔ "نوجوان اندھی عورت" پوچھتی ہے۔ "تم کون ہو؟" تھوڑی دیر تک سناٹا چھایا رہتا ہے۔ پھر سب سے بوڑھی اندھی عورت کہتی ہے۔ "ہم پر رحم کرو!" اس کے بعد خاموش وقفہ ہے۔ بچہ چلانے لگتا ہے اور پردہ گرتا ہے۔ خاموشی نے سامعین پر جو اثر کیا ہے، اُس کو میترلنک شور و غوغا سے درہم برہم ہونے دینا نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ ڈرامے کو عین اس وقت ختم کر دیتا ہے جب بچے کی چیخ فضا میں گونج رہی ہے۔

"اندرون" کے مرکزی کردار ابتدا سے انتہا تک خاموش رہتے ہیں۔ افراد تمثیل حسب ذیل ہیں:

باغ میں: بوڑھا آدمی، اجنبی، میری و مارتھا (بوڑھے کی پوتیاں)،

گھر میں: باپ، ماں، دو بیٹیاں، بچہ۔ (خاموش ہستیاں)

ڈرامے کے واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک لڑکی دریا میں ڈوب کر مر گئی ہے۔ اُس کی لاش لوگ اُس کے گھر کی طرف لا رہے ہیں۔ بوڑھا آدمی جو لڑکی کے والدین کا دوست ہے گھر کے باہر کھڑا ہے۔ وہ کشمکش و پیچ میں ہے کہ ان لوگوں کو کس طرح مطلع کرے کہ لڑکی ڈوب کر مر گئی۔ باہر سے مکان کا ایک کمرا نظر آ رہا ہے۔ جس میں گھر کے لوگ خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ گھریلو زندگی کا پُرامن منظر ہے۔ بوڑھا آدمی کشمکش و پیچ میں مبتلا رہتا ہے اور اسی دوران میں کسانوں کا مجمع لاش لیے ہوئے مکان کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ بوڑھا آدمی مکان کے اندر جاتا ہے اور خبر سنا دیتا ہے۔

اس ڈرامے میں انتظار کا مقام یہ ہے کہ گھر والوں کو لڑکی کے ڈوب جانے کی خبر کس طرح سنائی جائے وہ مکان کے اندر آرام سے بیٹھے ہیں۔ لڑکیاں کپڑے سی رہی ہیں۔ ماں کی گود میں بچہ سویا ہوا ہے۔ سب کے سب خاموش اور بے فکر بیٹھے ہیں۔ انھیں کیا خبر کہ لڑکی دریا میں ڈوب گئی! یہ لڑکی دریا کے اُس پار اپنی دادی سے ملنے گئی تھی۔ گھر کے لوگ اُس کا انتظار بھی نہیں کر رہے تھے۔ غالباً اس وقت اُن کے دلوں میں لڑکی کے متعلق

کسی قسم کا گمان ہی نہ ہوگا۔ اس وقت بوڑھا آدمی ایک اجنبی کے ساتھ باغ میں داخل ہوتا ہے۔ دونوں مکان کے اندر دونی منظر سے متاثر ہوتے ہیں اور لڑکی کے متعلقین کو اُس کی موت کی خبر سُنانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ وہ آپس میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں :-

اجنبی۔ اگر ہم باپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کریں اور اُس کو اشارہ کریں؟ اُس نے اپنا سر اس طرف پھیرا ہے کسی دریچے پر دستک دُوں؟ ان میں سے کسی ایک کو دوسروں کے پہلے یہ خبر سُننی ہی پڑے گی۔

بوڑھا آدمی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں کس کو انتخاب کروں ... ہمیں بہت ہشیار رہنا چاہیے۔ باپ بوڑھا اور مریض ہے۔ ماں بھی علیل ہے۔ بہنیں بہت کم سن ہیں . اور سب اُس سے ایسی محبت کرتے تھے جیسی محبت وہ پھر کبھی نہیں کر سکیں گے۔ میں نے کبھی اس سے زیادہ خوش و خرم گھرانا نہیں دیکھا ہے - - - - - - - -

اجنبی بوڑھے کو تنہا جانے کی ہدایت کرتا ہے مگر بوڑھا اجنبی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ "بدقسمتی" جس کا اعلان ایک ہی آواز کرتی ہے، بہت زیادہ نمایاں اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے خیال میں کسی بُری خبر کا اظہار اس طرح کرنا چاہیے کہ "غم کی پہلی موج اپنی طاقت غیر ضروری الفاظ پر صرف کر دے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ بدنصیبوں کے گرد لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق جمع ہونے دیا جائے۔ بہت سے غیر متعلق لوگ بھی غم کے کچھ حصے کو بغیر محسوس کیے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔"

اس عرصے میں مکان کے اندر کی فضا میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ گھر کے لوگ اس قدر مطمئن اور بے فکر نظر آتے ہیں کہ دوسروں کو اس بات کا احساس بھی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سکون کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔

بوڑھے اور اجنبی میں گفتگو جاری ہی ہے کہ بوڑھے کی پوتی میری آتی ہے اور خبر دیتی ہے کہ لاش آرہی ہے اُن کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ کس طرح مکان کے اندر جا کر موت کی خبر سنائیں۔ میری بوڑھے آدمی سے کہتی ہے :-

" اُن سے آج رات کو کہیے دادا جان !"

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھے کی دوسری پوتی بھی آتی ہے۔ وہ دادا سے خفا ہوتی ہے کہ اُس نے اب تک لڑکی کے والدین کو مطلع کیوں نہیں کیا۔ پھر کسانوں کا مجمع لاش لیے ہوئے قریب پہنچتا ہے۔ بوڑھا آدمی مکان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ مجمع میں کانا پھوسی ہونے لگتی ہے۔ سامعین کا انتشار بڑھ جاتا ہے کہ بوڑھا "خبر" کس طرح سُنائے گا اور لڑکی کے متعلقین پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ بوڑھا جب مکان کے اندر داخل ہوتا ہے تو "ماں" اُس کے استقبال کے لیے اُٹھتی ہے۔ ایک لڑکی اُس سے آرام کرسی پر بیٹھنے کی گزارش کرتی ہے، مگر وہ انکار کرتا ہے۔ بوڑھا باہر کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پھیرتا ہے۔ باپ بڑی بے تکلفی سے بات

پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بوڑھا آدمی کچھ بولتا ہے۔ گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ ماں چونک کر گھر کی بتی جلاتی ہے
[illegible] سے سوالات کرتی ہوئی کہانی بیان کرتی ہے۔ وہ نواسہ کہتا ہے اور سر ہلاتا ہے۔ بیچ میں
بچی روتی ہے "اس نے اُن سے کہہ دیا!" باپ، ماں اور دونوں لڑکیاں باہر کی طرف دوڑتی ہیں۔ مجمع
مکان کے اسی جانب جا کے دوسرے لوگ اور گل رہے ہیں۔ اجنبی سارہ جاتا ہے۔ مکان کے اندر بچہ جیسے
سویا ہوا نظر آتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر بھی چلا جاتا ہے۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ اس ڈرامے میں کشمکش کا موقع یہ ہے کہ لڑکی کے ڈوب جانے کی خبر اس کے متعلقین
کو کس طرح سنائی جائے۔ مکان کا اندرونی منظر اس قدر پرسکون ہے کہ بوڑھا آدمی خبر کا قاصد بننے کی جرأت نہیں
کر سکتا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رات کے مکان کے اندر جاتا ہے۔ اگر اس موقع پر گھر کے لوگ اسٹیج پر بولتے
چالتے پھرتے اور موت کی خبر سے پردہ اٹھ جاتا اور اپنے اظہار غم کرتے تو ناظرین پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا اُن کے
خاموش رہنے سے ہوا۔ بوڑھا آدمی ان کو موت کی خبر سناتا ہے۔ اُن کے چہروں سے پریشانی کے آثار واضح ہیں۔
وہ مکان کے باہر نکلتے ہیں۔ سامعین کا اضطراب انتہائی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ کیوں کہ مکان کے اندر کا منظر وہ
صرف دیکھ رہے ہیں۔ کیسے [illegible] اُن سے کیا کہا؟ اُنھوں نے اُس سے کیا پوچھا؟ لڑکی کی موت کا
اثر ان پر کیا ہوا؟ سب یہ خاموش ہستیاں مکان کے باہر جائیں گی تو ہم انھیں دیکھ بھی سکیں گے؟ ان کی گفتگو
بھی سن سکیں گے؟ ناظرین کے دلوں میں اسی قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں، مگر انھیں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں
ملتا کیونکہ عین اسی وقت پردہ گرتا ہے۔ اس وقت سامعین کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کا اندازہ ڈرامے
کو اسٹیج پر دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

صوبۂ بہار

گیارہویں صدی کی اُردو کا نمونہ

از قاضی عبدالودود

سید صادستہ دینیات کا ایک مختصر رسالہ ہے جو حضرت عماد الدین قلندر کی طرف منسوب ہے اور جس کا سال تصنیف ۱۰۸۰ھ ہے۔ رسالہ بقول جناب تمنا انھیں کتب خانۂ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب شہر پٹنہ سے ملا ہے۔ خاتمے میں کاتب کا نام درج نہیں لیکن جناب تمنا کا بیان ہے کہ یہ حضرت شاہ وجہ اللہ قلندر خواہر زادۂ حضرت شاہ نور الحق (بقول تذکرۃ الصالحین سال ولادت ۱۰۴۰ اور سال وفات ۱۱۰۳ھ) کا لکھا ہوا ہے کیونکہ ان کے خط سے ان کا خط ملتا ہے۔ یہ رسالہ از ابتدا تا انتہا خط نسخ میں لکھا ہے اور بظاہر کم از کم ڈیڑھ سو برس قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی نقل نورالحسن صاحب نے کی ہے اور اس کا مقابلہ اصل سے جناب تمنا نے فرمایا ہے۔ ہم ان دونوں صاحبوں کے شکر گزار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس رسالے کا ایک نسخہ حضرت مصنف کا لکھا ہوا بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے، جناب تمنا اس کی تلاش میں ہیں۔ رسالے کی حسب ذیل نقل بالکل اصل کے مطابق ہے۔ ابتدا میں سورۂ فاتحہ ہے۔ اس کے بعد اس طرح شروع ہوتا ہے۔

سید صادستہ

امابعد یس جانو اے مسلمان بہن اور بھائی سب کہ اللہ تعالےٰ ایک ہیں اون کے تئیں دھر، بدن، ہاتھ، پاؤں، ناکھ، کان، پیٹ، پیٹھ کچھ نہیں ہے۔ دھرم ان مٹی سے بنیں ہیں وے مٹی پانی آگ ہوا سب کے تئیں تو آپی بنائن ہیں، آسمان زمین پہاڑ ندی دریا سب اون ہی بنائن ہیں، اون کی تیں صورت بھی نہیں ہے، صورت بدن کی ہووے ہے، جب اون کے تئیں بدن نہیں تو صورت کیسے ہو سکی۔ اللہ تعالےٰ کے ایسا کوئی نہیں ہے، اور نہیں ہو سکے ہے، اللہ تعالےٰ کا کوئی شریک ساتھی سنگھاتی نہیں ہے۔ اور نہیں ہو سکے ہے۔ نہیں اُن کے تئیں کوئی جنس ہے۔ اور نہیں اون نے کسو کی تئیں جنن ہیں۔ اون کے تئیں جورو جاتا، بال بچہ نہیں۔ نہیں وے عورت ہیں۔ نہیں مرد، نہیں ہیجڑا، نہیں خنثی۔ نہیں وے لڑکا ہیں۔ نہیں بوڑھا۔ نہیں جوان۔ وے ہمیشہ سدا ایسی ہیں اور سدا ایسی رہیں، جیسے تھے ویسے ہی ہیں، اور ویسی ہی رہیں، وے دیکھیں ہیں بنا آنکھ کے اور سُونے ہیں بنا کان کے، اور بولے ہیں بنا مُونھ اور زبان کے وے سرد گرم، کڑا نرم بوجھیں ہیں بنا ٹوئے کے

غیب یعنی چھپی بات سب جھوٹ ہی [illegible] کو نہیں ہوتی ہے، سو خدا ہی جانتا ہے ان کی سوا کوئی نہیں جان سکتا ہے،
وو سب پیغمبر بڑی ولی بڑے بڑے ان سیتی [illegible] بھی کوئی نہیں ہے، وہ سب باتیں کہ تیں خدا سیتی جانیں ہیں
کوئی بات ان سیتی چھپی نہیں ہے کھانا پینا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا سونا اور جاگنا اور ان کے ایسی تمام سب بات سیتی
اُس کو خبر ہے ۔

فصل - خدا ہی کو تئیں پوجنا چاہیے اور سوا خدا کے کسو کو تئیں پوجنا حرام اور شرک ہے،
شرک یعنی [illegible] خدا تعالیٰ کے ساتھ [illegible] کسو کو تئیں پوجنا، کسو کو تئیں بیٹا بیٹی
[illegible] کسو بات میں خدا تعالیٰ کے [illegible] کسو کو ہر جگہ کی بیچ حاضر ناظر
سمجھنا [illegible] اگر نے [illegible] کسو دیوتا
[illegible] کسو کی قبر پوجنا یا قبر کی
خاک [illegible] جن
بھوت [illegible] کرنا اور
حاجت [illegible] ترک کرے والا
کو اللہ تعالیٰ [illegible] کسو مسلمان کے واسطے بخشائش کی دعا مانگنا
ناجائز ہے اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو نہیں شرک سیتی بچاوے آمین ثم آمین ۔

فصل - سب آدمیوں کی ہدایت کے واسطے اللہ تعالیٰ نے بہت سارے پیغمبر آدمی ہی میں سیتی بنائے۔ سب سیتی
پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو تئیں مٹی سے بنایا اور سب فرشتوں کو تئیں ان کی اور منہ کرکے سجدہ کرنے کو کہا
ابلیس شیطان کو تئیں بھی حکم ہوا سو اس کمبخت نے سجدہ نہیں کیا اس واسطے راندہ گیا اور مردود ہو گیا
دیکھو اللہ تعالیٰ کے حکم نہیں ماننے سیتی کیسا برا ہوا سب [illegible] بڑا بزرگ تھا سو ایک حکم کو نہیں ماننے سیتی راندہ
ہو گیا۔ تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی چیر کر کے حضرت حوا کے تئیں اللہ تعالیٰ نے نکالا اور پھر ان دونوں کی بیچ میں
میاں بیوی کا رشتہ کر کے نکاح [illegible] ان دونوں سیتی اللہ تعالیٰ نے بہت سارے آدمی پیدا کیے جن کے
بیچ کی پیغمبر بھی ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے بڑے مشہور پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام ہوئیں، جن کے وقت میں بہت بڑا
طوفان آیا تھا جو ساری دنیا ڈوب گئی تھی ان کے بعد اور بھی بہت سے پیغمبر جن میں سیتی حضرت ابراہیم علیہ السلام
بہت بڑے پیغمبر ہوئیں۔ پھر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام
اور ان کے گیارہ بھائی سب، پھر حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ذکریا علیہ السلام
حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ پیغمبر سب اُن ہی حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد سیتی ہوتیں گئیں۔ جو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھوٹے بیٹے کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں حضرت مریم کو انزی تھیں، اللہ تعالیٰ نیں اپنی قدرت کا تماشا اپنے بندوں سے تئیں دکھلانے کو حضرت مریم کے تئیں بنا شوہر کے بیٹا عنایت کیا، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تب حضرت مریم کے قوم نیں حضرت مریم کے اوپر بوہتان لگانے اور طعنہ مارنے کہ بنا باپ کے یہ بیٹا کہاں سیتی آگیا، تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو چھوٹے دین کے تھیں اُن کی گودی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سیتی گواہی دیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ایک بندہ ہیں میرے کوں اللہ تعالیٰ نیں کتاب دیے ہیں، اَو میرے تئیں مبارک بنائے ہیں اور پیغمبری تک اپنے عبادت کا حکم کیسے ہیں، اور میری ماں سُتی نیک کار ہیں، اور اللہ تعالیٰ میرے تئیں بتھیارا، سنگدل نہیں بنائیگا۔

فصل بڑے بڑے پیغمبروں کوں اللہ تعالیٰ نے معجزہ بھی دیے ہیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سیتی مُردہ کُوں زندہ اور کوڑھی اندھلے کے تئیں دم بھر کے بیچ چنگا اور انکھیا، اینا دیتے تھیں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ کے بیچ لوہا موم ہو جاتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت جو لے کے اوپر اُڑتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تئیں یدِ بیضا اور عصا ملا تھا یعنی جب کدھی وے اللہ تعالیٰ کے حکم سیتی اپنے جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر کے نکالیں تے تو اُن کی تل ہتھی سورج کی طرح سیتی چمکنے لگتی تھی۔ ٭

فصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل کی اولاد سیتی عرب کے ملک کے بیچ مکہ شہر میں پیغمبری کے ختم کرانے والے آخری پیغمبر اور آخری رسول حضرت **محمد مصطفےٰ** صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائیں۔ اگلے پیغمبروں میں سیتی بعض بڑے بڑے پیغمبر جو تھے اُن کے اوپر اللہ تعالیٰ نے کتاب بھی اوتارن تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے اوپر زبور، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوپر توریت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوپر انجیل اوتارن تھا، ہمارے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر قرآن شریف اوتارن، پہلے پیغمبروں کی اُمت نے اپنے پیغمبر کے کتاب کی بیچ بیچ میں اپنی جی سیتی بہت کچھ ملا جلا اور کم و بیش کر دیے ہیں اسواسطے پہلے کتابوں کی اوپر کچھ بھروسا اعتبار نہیں رہا، اللہ تعالیٰ قرآن شریف کی حفاظت کا وعدہ خود اپنے فرمائے ہیں، اسواسطے قرآن شریف کے بیچ میں کوئی بھی کچھ ملا جلا اور کم و بیش نہیں کر سکا، اور قیامت تلک نہیں کر سکیگا، جس طرح سیتی اوتارن تھا اُسی طرح سیتی آج تلک قرآن شریف ہے اور قیامت تلک رہیگا۔ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کوں اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہاتھ سیتی اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوپر وحی کر کے اوتارن اسواسطے اللہ تعالیٰ کے اوپر اور اُن کے سب رسولوں کے اوپر اور اُن کے سب فرشتوں کے اوپر جو اُن سب بھی اللہ تعالیٰ کے بندہ ہیں، اور نہیں وے عورت ہیں، نہیں مرد، اور اُن سب کتابوں کے اوپر جن کوں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے اوپر اوتارن سب کے اوپر ایمان لانا ہر مسلمان مرد و عورت کے واسطے فرض اور ضروری ہے۔ ٭

فصل۔ دنیا کے بیچ میں جو کچھ جو آدمی کرے ہے سب کے واسطے ایک دن حساب کتاب کا ہے جس کوں قیامت کا

دین کی بھی یہ اُسی دن سب کیسو کی ... پہلے کام کا حساب ہووے گا بہوت سارے مسلمان گنہگار بخشے جاویں گے
ہمارے نبی صاحب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت ... سے گنہگار امتی کی شفاعت فرماویں گے۔ اُس دین جو جو ... دانہ دانہ کا
حساب ہو ویگا۔ کافر اور مشرک لوگ دوزخ کے بیچ ہمیشہ ہمیشہ کے تئیں ڈھکیل دیے جاویں گے۔ نیک کار مسلمان اور جو گنہگار بخشا
گیا ہووے گا وہ سب جنت کے اندر جاویں گے۔ دوزخ میں ہر طرح کا عذاب ہووے گا۔ جنت کے اندر ہر طرح کا آرام ہووے گا
ان سب بات پر ایمان لانا ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے۔

فصل۔ ہر مسلمان کے اوپر چوبیس گھڑی کے بیچ میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے **فجر** کے وقت دو رکعت **ظہر** کے
وقت چار رکعت **عصر** کے وقت چار رکعت **مغرب** کے وقت تین رکعت **عشا** کے وقت چار رکعت۔ جو نماز
کے تئیں چھوڑ دیتا وہ لگ فرش ہے۔ ... دین کی عادت ... ڈھاوے ہے۔ اور ہر سال بارہ مہینے کے بیچ سیتی
ایک مہینہ رمضان شریف کا ہر روزہ ... جو بیمار ہووے جب اچھا ہووے تب دوسرے مہینے میں قضا رکھے
اور جو مال دار ہووے اور ... صاحب ... تو سال پورا ہووے پیچھے سونا چاندی یا مال تجارت کے اوپر مال کا چالیسواں حصہ
زکوٰۃ نکالنا بھی ... اوپر فرض ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہووے یا ایک درب
دوسرے کی کمی کے تئیں ... اور ... تو وہ صاحب ... جس کے تئیں اللہ تعالیٰ اتنا دیویں ہیں کہ وہ مال بچہ کی ضرورت
جو گھر ... کے خرچ ... جاوے ... راستہ ... صاف ہووے بیچ میں خوف کی کوئی بات نہ ہووے تو عمر بھر میں ایک مرتبہ
حج کعبہ کا اُس کے اوپر فرض ہے۔

فصل۔ ... شوہر کے فرماں ... اور ... پروس والوں سیتی اچھا سلوک کرنا۔ بال
بچوں کے تئیں اچھی تعلیم دینا ... بدن اور ... کپڑوں کے تئیں پاک رکھنا۔ یتیم۔ غریب۔ مسکین۔ محتاج پر رحم کرنا
بھی ہر مسلمان پر ... ہے ... کسو ... جان مارنا ظلم کرنا مارنا پیٹنا مال چھین لینا امانت کے بیچ خیانت کرنا اپنی
جان کو ... زناکاری ... کینہ ... اپنے تئیں دوسرے سیتی اچھا جاننا۔ دوسرے کے تئیں اپنے
سیتی ... تئیں ... سیتی کسو مسلمان سیتی دل میں غصہ یا عداوت یا بغض یا کینہ رکھنا۔ کیسو کے تئیں کوسنا۔ کاٹنا
بر وقت ... بھوں چڑھاوے۔ رکھنا اللہ تعالیٰ کی نعمت سیتی ... کیسو کا احسان نہیں ماننا۔ کیسو کے اوپر اپنا
احسان جتلانا ... تئیں ... سنگرا ... سمجھنا بہت بڑا گناہ ہے اور ہر مسلمان کے اوپر بالکل حرام
ہے ان سب بات سیتی بچنا ہر مسلمان کے واسطے فرض ہے اللہ تعالیٰ ہر مسلمان مرد عورت کے تئیں نیک کام کی
توفیق دیویں۔ اور بُرے کام سیتی بچاویں۔ اور اس فقیر **عماد الدین** کے تئیں جو شاہ برہان الدین کا بیٹا
ہے اور ... کے ماں باپ کے تئیں اور سب مسلمان عورت مرد جیتے موئے کون اپنی کرم سیتی بخشدیویں۔
اور سب کے گناہوں سیتی درگذر فرماویں اور ... پیچھے اپنے حبیب رسول کی شفاعت دراز فرماویں آمین ثم آمین

رباعی

یارب نگہ عنایت ایدھر کردو کانٹا ہے حماؔد تم گلِ تر کردو
ہے رنگ گنہ سیتی رُخ اس کا کالا تم غازۂ عفو سیتی منور کردو

تمام ہوا یہ رسالہ الصراط المستقیم معروف بہ سید حامد ستہ بتاریخ ۱۲ ربیع الاول شریف بیچ وقت ظہر کے سنہ ۱۰۸۱ھ ایک ہزار اکاسی ہجری میں۔ ٥ +

الحمد للہ کہ این رسالہ در مدت دو روز حسب فرمایش اہل خانہ خود در زبان مروجہ دیار خود نوشتہ شدہ کہ مردان و زنان ناخواندہ را در زبان مادری ایشان ذریعہ معلومات ضروریہ دینیہ گردد و برائے من ذخیرۂ آخرت شود۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ +

حضرت مصنف کے حالات جو تذکرۃ الصالحین مصنفہ محمد حبیب اللہ صاحب عظیم آبادی میں مرقوم ہیں، مختصراً درج ذیل ہیں (ص ۱۱۱ تا ۱۱۳)، "آپ کے حالات تذکرۃ الکرام اور رسالۂ معارف پھلواری بابت شوال ۱۳۴۳ھ میں مندرج ہیں۔ سال ولادت ۱۰۶۱ھ ہے، تکمیل تعلیم کے لیے اٹھارہ، انیس برس کی عمر میں دہلی گئے، اور نبیرۂ شیخ عبدالحق دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی، اس زمانے میں حضرت سید محمد فاضل قلندر ساڈھوری سے فیض روحانی بھی پایا کچھ، کتابیں باقی رہ گئی تھیں ان کی تکمیل کے لیے لاہور گئے پچیس برس کی عمر میں اس سے فارغ ہوئے اور دو سال وہاں کے مدرسے میں درس دیتے رہے، پھر ساڈھورے جاکر حضرت سید محمد فاضل قلندر سے بیعت کی، اور وہیں مقیم رہے۔ ۱۰۸۸ھ میں وطن تشریف لائے اور ۱۱۲۴ھ میں آپ نے انتقال فرمایا، اور دو صاحبزادے، ایک ہشت رسالہ دوسرے دو سالہ یادگار چھوڑے"

اصل نسخے میں یائے مجہول بالعموم یائے معروف کی طرح لکھی ہوئی ہے، کاتب معیار نے کہیں تو اسے اسی طرح رہنے دیا ہے کہیں اصلاح کردی ہے وہ الفاظ جن کے املا میں کاتب کی غلطی کا امکان ہے، حسب ذیل ہیں:۔
اون، ان، اوس، اس، آؤُر، اور، ناکھ، ناک، ہاتھ، ہاتھ، آپی، آپ ہی، میٹھی، مٹی، بہوت، بہت ۔ دُسرے، دوسرے، دُنوں، دونوں، بورا، بُرا، دیکھلانا، دکھلانا، پھیر، پھر

مطبوعات جدیدہ

۱۔ دیوان معروف۔ از قاضی عبد الودود۔ ۲۔ دریائے لطافت از قاضی عبد الودود۔ ۳۔ سحر بنگال از ؟

۴۔ نیم بہار نمبر از ؟ ۵۔ مادھو۔ از آرزو [illegible]۔ ۶۔ افکار مصری از منتظم، جشن [illegible] از ؟

۸۔ حیات الشعرا از ق ح

۱ دیوانِ معروف: مصنفہ نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی، مرتبہ شاہ عبد الحامد صاحب قادری بدایونی۔ تقطیع [illegible] صفحات ۱۴ + ۲۲۰ + ۲۶ + ۲۶۰ ملنے کا پتہ عابد القادری مولوی محلہ بدایوں۔ قیمت عمر

معروف نے یوں تو [illegible] کا زمانہ بھی پایا تھا لیکن ان کی شاعری دراصل اس دور کی شاعری ہے جسے شاہ نصیر کے نام سے موسوم کرنا چاہیے [illegible] سب سے بڑے استاد نصیر تھے۔ ممنون، احسان وغیرہ بھی اس دور کے استادوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن شاہ نصیر نے دہلی ہی میں بلکہ [illegible] دکن میں بھی اپنی استادی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے [illegible] اس دور کے ختم ہونے کے قبل ہی بٹھا دیا تھا۔ اور مومن و غالب نے [illegible] شاعری کے لیے [illegible] کا زمانہ تھا۔ شاعری کا مرکز لکھنؤ کو منتقل ہو گیا تھا [illegible] صاحب طرز شعرا جرأت و ناسخ کی پیروی کرتے تھے، چنانچہ معروف کے دونوں دیوانوں میں [illegible] جرأت و ناسخ کا اثر بکثرت موجود ہے۔ مرتب دیوان معروف کا خیال ہے کہ معروف [illegible] درجہ اول کے [illegible] یہ خیال صحیح نہیں۔ مصحفی سے لے کر ناسخ تک چند تذکرہ نگار گزرے ہیں، ان [illegible] ایسے بھی [illegible] جو درجہ اول کے اساتذہ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کی [illegible] سے قطع نظر کر کے، اگر ان کے کلام کو دیکھا جائے تو وہ بھی انھیں اس مرتبے کا مستحق نہیں ٹھہراتا۔ ان [illegible] کے اساتذہ میں، انھیں ممتاز حیثیت ضرور حاصل ہے اور ان کا کلام خصوصاً وہ جو دیوان اول میں ہے لطف [illegible] سے خالی نہیں۔

کتاب کی ابتدا میں مرتب کا [illegible] مقدمہ ہے، جس میں معروف کے حالات بیان کیے گئے ہیں، اور کلام پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔ مرتب نے مصنف کے حالات زندگی معلوم کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، اور وہی باتیں لکھی ہیں جو [illegible] تذکروں میں ملتی ہیں۔ معروف کے اخلاف کے حالات البتہ مرتب نے زیادہ توجہ سے لکھے ہیں۔ حسب ذیل اقوال محل نظر ہیں: ۱۔ وفات کے وقت عمر [illegible] سے متجاوز تھی۔ اس سلسلے میں خود مرتب کا دوسرا بیان پڑھیے کہ معروف کے والد عہد احمد شاہ میں ہندوستان آئے۔ اور اسی عہد میں ان کی شادی ہوئی۔ ۲۔ عارف جان نے دو لڑکے اپنی یادگار چھوڑے۔ انھوں نے چار لڑکوں کا نام لکھا ہے، اور آزاد کا قول صحیح ہے۔ ۳۔ مرزا علی بخش خاں معروف کے اکلوتے

۱ بیٹھے تھے، میرزا طالب کے بیان سے جو کتاب میں شامل ہے اس قول کی تردید ہوتی ہے۔ خود مرتب نے ایک ہی سطر بعد لکھا ہے کہ مرزا صاحب مرحوم نواب سرور الملک کے حقیقی چچا تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں بیانوں میں ایک ہی صحیح ہو سکتا ہے، لیکن طرہ یہ ہے کہ دونوں غلط ہیں۔ ۴۔ مرتب نے زمانۂ تصنیف دیوان کی تعیین کی بھی کوئی کوشش نہیں کی، دیوان میں ۱۲۳۳ھ کی لکھی ہوئی ایک مثنوی اور تسبیع زمرد مصنفہ ۱۲۳۶ھ شامل ہیں۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کم از کم ۱۲۳۶ھ تک کا کلام اس دیوان میں ہوگا، لیکن اس بنا پر کہ اس کے بعد دیوان دوم کی تصنیف کے لیے صرف ۶ سال بچ جاتے ہیں۔ اور یہ دیوان ضخامت میں دیوان اول سے کچھ بہت کم نہیں، یہ نتیجہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مرتب نے اس قلمی نسخے کے متعلق جس پر دیوان مبنی ہے سوا اس کے کہ میرزا نصر اللہ خاں نبیرۂ معروف سے حاصل ہوا ہے، کچھ اور لکھنا غیر ضروری سمجھا ہے۔

دیوان مطبوعہ کے اشعار کی تعداد ۳۹۲۰ ہے۔ بدیں تفصیل کہ غزلیات و مطلعات ۲۶۹۶، اشعار مثنوی ۲۰۲، قطعات و رباعیات ۶۲ (بعض اشعار ایسے بھی ہیں، اس عنوان کے تحت میں درج ہو گئے ہیں، جو نہ قطعہ بند ہیں اور نہ ان پر رباعی کا اطلاق ہو سکتا ہے)، تسبیع زمرد ۱۰۱، مخمسات ۱۸۹۔ آشفتہ اور ذوق کے لکھے ہوئے دو قطعے بھی شامل دیوان ہیں۔

مرتب دیوان نظری حیثیت سے مرتب کے فرائض میں کن باتوں کو داخل سمجھتے ہیں، اس کا ہمیں علم نہیں، لیکن عملی حیثیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان کا فرض قلمی نسخہ خواہ وہ مکمل ہو یا ناقص، صحیح ہو یا غلط، کاتب کے حوالے کر دینے پر ختم ہو جاتا ہے۔ اب کاتب جانے اور کتاب، سپردم بتو مایۂ خویش را، تو دانی حساب کم و بیش را۔ ایسی صورت میں اگر کتاب اغلاط سے مملو نہ ہوتی تو تعجب ہوتا۔ کچھ غلطیاں ایسی ہیں جن کا پڑھنے والے کو بآسانی پتا چل جاتا ہے، بہت سی ایسی ہیں، جن پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور کچھ ایسی ہیں کہ غور کرنے سے بھی ان کی تصحیح نہ ہو سکی۔ ہم نے ایسے اشعار کو جن میں غلطی کا احتمال ہے، اکٹھا کر دیا ہے، اور تبصرے کے آخر میں ہم انھیں درج کریں گے وہ الفاظ جو غلط یا مشکوک ہیں، ان کے نیچے نشان کھینچ دیا جائے گا۔ اور ان کی جگہ پر جو الفاظ ہم تجویز کرتے ہیں، وہ قوسین کے اندر جگہ پائیں گے۔ بہت سے اشعار جن میں یائے مجہول و معروف اور اسی قبیل کی معمولی غلطیاں تھیں، ہم نے طوالت کے خوف سے درج نہیں کیے، اس پر بھی رسالے کے بہت سے صفحات ان اغلاط نے لے لیے ہیں۔ جہاں تک ہمیں ان کے مقدمے سے پتا چلتا ہے مرتب کے پیش نظر صرف ایک قلمی نسخہ تھا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ غلطیاں بہت رہ گئیں، دوسرا یہ کہ متعدد غزلیں اور اشعار جو دیوان اول کے دوسرے نسخوں میں داخل ہیں، مطبوعہ دیوان میں نہیں ہیں، یہ اشعار ایسے

۱۔ تذکرہ گلشن بیخار شیفتہ مطبوعہ نول کشور طبع دوم اشعار معروف منتخب از دیوان اول میں ہوتا ہے۔۔۔ [illegible] مطلع غزل اس زمین میں دیوان میں ہے۔ مقطع غزل اس زمین میں دیوان میں نہیں ہے۔۔۔ تذکرہ مصحفی ص ۔ اگر کسی شعر کے قبل ۔۔۔ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ بشمول شعر مندرجہ اس قدر شعر ماخذ میں موجود ہیں۔ بقیہ اشعار کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

جن شعروں کے متعلق امتحان ہو کہ مصنف نے نظرِ ثانی میں نکال دیے ہوں گے۔

کی محبت جو کچھ ارمان بھری آہ کی رات — سانس تم کو تھے بیمار نے سونے نہ دیا (ش +)

چشم نمناک [illegible] پانی پھر گیا — اس پہ بھی تو رونے کے طوفان پہ پانی پھر گیا (ش -)

[illegible] جب وہ بس کرے گر یہ اختیاری — آئے ادھر مجھ کو بے اختیار رونا (ش -)

[illegible] ہم بیمار کے سامنے — [illegible] تقصیر [illegible] (ش +)

آپ بھی قسمِ تیغوں کی قسم کھاتے ہیں — ہم تیغوں کے جیسے کی قسم کھاتے ہیں (ش -)

[illegible] قد کی کستی ہے [illegible] — [illegible] کس نے [illegible] ڈال دی (ش +)

ادھر [illegible] ہو گئے مست دل لگاتے ہی داغ — اس کا کھٹکا [illegible] دوسرا یہ بھی تو ہے (ش +)

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل — کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جاتے ہے (ش -)

تو دیکھ مجھے کاش وفا کر [illegible] — مقدور کیا جو کوئی تجھے بے وفا کہے (ش -)

[illegible] ہوں ہو کے سب سے ایک [illegible] نہیں — گریبان دست و پا کو ہی دست و پا کہے (ش -)

عمر آخر ہو چکی قاتل [illegible] — کاٹ ڈالوں جی میں ہے اپنا گلا تلوار سے (س -)

واں زخم [illegible] بھی زخم [illegible] — کیا مارا پھاڑا جو گریباں کسی نے (ش -)

۲ صید [illegible] ہوں میں [illegible] — ذبح کرتا ہے مجھے جو کہ [illegible] (ش -)

[illegible] معروف — اور کہا کہ ہمیں اب [illegible] کوئی (ش -)

۲ مر تو [illegible] قسمت میں گر — امتحاں بھی [illegible] کرتا کوئی (ش -)

[illegible] سینہ [illegible] — نعش کے ہمراہ [illegible] ہوئے [illegible] (ش -)

[illegible] ٹھوکر چل جا — پھر ہم دیکھ چکے فندق پا اچھی ہے (ش -)

کس کی چشم [illegible] — سر پہ میرے جو قضا آئی تو شرمائی ہوئی (ش -)

معروف اب تو [illegible] ہو تم ہمیں [illegible] — تک منہ لگائے یار تو پھر ہم کو دیکھیے (ش - ح)

اور جو بزم میں وہ ان کے بیٹھے ہم سے — کیا ہی پچھتائے [illegible] کیوں نہ ہوئے (ش -)

[illegible] کو تو چلے [illegible] وہاں سے [illegible] — تڑپتے تھے کہ [illegible] کرے جانے (ش -)

ناتواں مجھ سے [illegible] کس طرح کرے قاتل [illegible] — ہوں میں [illegible] ہو جائے (ش +)

کیا [illegible] اس کی تمامی کی [illegible] — ہاتھ ملتا ہوں کئی [illegible] (م -)

[illegible] پتھر — [illegible] پتھر (ح +)

	قبر مجنوں کے بھی اب کوئی نہ چھوڑے پتھر	تیرے دیوانے کو مارے نہیں تھم تھم کے پتھر	(ح +)
	ہر اک سو تختہ لالہ پڑا دیکھ ہے گلشن میں	کوئی دیتی ہے تری او صبا سر چنگ کے آتش	(ح -)
	کہوں کیا کچھ نہ پوچھو اس بت بے پیر کا عالم	کہ بوٹا سا ہے قد اور شکل ہے تصویر کا عالم	(ح +)
۵	اول تو میں رکتا نہیں اور جس سے رکوں میں	تا حشر یہ ممکن نہیں پھر اُس سے پھروں میں	(ح -)
۲	اُن کے گھر ہم ڈر سے جا سو سو کے جا سکتے نہیں	جی تو چلتا ہے بہت پر دل چلا سکتے نہیں	(ح -)
۸	چپکے چپکے ایک تو بس آپ جانی اور دے	تس پہ الٹی ہم کو تہمت آکے لگانی اور دے	(ح -)
	کس برق وش کی تیغ نگہ نے کیا شہید	ہم سرد ہو گئے دل افگار گرم ہے	(ح +)
	گاہک ہوئی تھی جیسے کہ یوسف کی پیرزال	یوں آج یوسف اس کا خریدار گرم ہے	(ح +)
۴	یوں نگہ دل پہ پڑی داغ جگر کے ہوتے	کھائی تلوار صد افسوس سپر کے ہوتے	(ح -)
	ہم نے دیکھا نہ کچھ مگر دھوکا	سو بھی تیرے سوا دیا کس نے	(ح +)
۵	مژگاں کی چشم یار کے ہے ہات میں چھڑی	لے دل کو بس ہمارے اشارات میں چھڑی	(ح -)
	ہے دل میں زلف یار کے عالم کو دیکھیے	پھنستے ہیں آپ دام میں ہم ہم کو دیکھیے	(ح -)
	میں ہی نہیں ہوں شیفتہ حسن گندمی	آگے سے ہوتی آئی ہے آدم کو دیکھیے	(ح -)
۳	خوبرو لاکھ جہاں میں کوئی ہشیار چنے	پر تجھے دیکھے تو تکے سر بازار چنے	(ح -)
	نہیں میری جبیں پہ خاک شفا	درد سر کی دوا لگادی ہے	(ح +)
	محو یاں تک ہوں تصور میں ترے از رہ شوق	ہاتھ ہر دم ترے داماں کی طرف جاتا ہے	(ح +)
	جوش طغیانی باراں ہے فضا اچھی ہے	مے پرستی کے لیے آب و ہوا اچھی ہے	(ح -)

خاتمۂ دیوان کے بعد نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کی ایک تقریظ ہے جس میں معروف کے حالات درج ہیں۔ آزاد کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ معروف ذوق سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جناب احسن ہروی کا تبصرہ، ایک اور تقریظ اور چند قطعات تاریخ ہیں۔

مرتب نے اس کی امید دلائی ہے کہ حالات مساعد ہونے پر دوسرا دیوان بھی شائع ہوگا۔ ہم انھیں مشورہ دینے کی ات کرتے ہیں کہ اول تو وہ جتنے قلمی نسخے ممکن ہو سکے فراہم کریں، دوسرے یہ کہ کاپیوں کی تصحیح ایسے لوگوں کے ذمے یا جو شعر فہم ہوں، ورنہ جس طرح انھوں نے دیوان اول شائع کیا ہے، اس سے تو دیوان کا پردۂ گمنامی میں رہنا بہتر ہے۔

طالب مرحوم کی تقریظ کے بعض مقالات مرتب نے حذف کر دیے ہیں۔ ہم ان کی تقریظ کے خارج شدہ حصے آیندہ شائع کریں گے۔

ص ۱ سے ۱ دشمن سے جہاں غ ۱ میں کثرت ہی کا اکثر ہیں) ص ۱ امکاں جولانیٔ فانوس پیچھے ہو (جوں) جوں کی
جگہ جیوں کاتب نے کی جگہ لکھا ہے۔
ص ۲ سے ۱ نہیں سکتی یک گروہ میں سے معروف آہ۔ اے قمر سے امادگی کی ہے یہاں نقش پا (ایک)
(کے) اس قسم کی غلطیاں بکثرت ہیں۔
ص ۳ سے ۱ دونوں جہاں میں خانہ یار اس پاشنے کا رشت) ص ۱ سے تیرا اقبال لب اے جان دو عالم
نقش لکھی ہے (ترا)

ص ۳ سے تیری [illegible] دریا سے خوبی دل بے مضطرب (ترکا)
ص ۳ سے محتسب مستوں سے الجھا یہ بھی کچھ بیہودہ تھا (بیجا)
ص ۳ سے ایسے ہفت دوست کی غلطی پست جاسے رقیب ، چاندن کی بات ہے یادوں سے بھی یار اعتقاد کے خلل
ص ۳ سے کیونکر [illegible] اس مروۃ سے [illegible] دل مصول (کیونکر)
ص ۴ سے پہلے اے معروف صورت کو تماشا کیجیے ، پھر اس سے کیجیے قبلہ قصد بیت اللہ کا (سورت)
ص ۵ سے [illegible] باتیں پر چھٹ گئیں سب بیٹھے ہی ، آگے منہ سے پر نہ چھٹا ایک گرد دیکھنا (پر چھٹا)
ص ۷ سے شب وصل ہے لے سحر تو مس دوں، کہ ص ۷ سے سحر گہ خواب سے اٹھے تو تھا وہ ان سر مجھ کو (اٹھا)
ص ۸ سے [illegible] آپ رہا فتنہ میں بارش سے تو کچھ وہ کوئی تمہارے تب بیمار ہجراں کا (ہے)
ص ۹ سے [illegible] قیامت [illegible] وحشت قیامت ہے تماشا جو دیکھا روز ہجراں کا (ہے؟)
ص ۱۰ سے پھر ابھی بزم میں کیجیو تو تیر ابیزار [illegible] تیر آوے) یہ ترکیب کلام معروف میں کئی جگہ پائی جاتی ہے۔
ص ۱۰ سے [illegible] اگر آپ تیرے گھر کے آنے والے پر ، تو میری قبر پر بھی ہاتھ اٹھانے تو یہ ٹھہرانا (نہ پھرآنا؟)
ص ۱۱ سے دل [illegible] بتلا اس خیال چشم نہ ہو کو ، پھرا جو دشت میں تو گھرے گھرے آ تو کیا آیا۔ (گھرے گھرے)
ص ۱۱ سے گھرے [illegible] پلک ، مرغ دل بن حال مروپاں (گرے) ص ۱۳ سے تو جھکے معروف ہم وہ جانیں سخنور ہو گیا۔
(وہ نہ ہے)

ص ۱۳ سے بس ایک مرگنہ اتر آیا (یک) ص ۱۳ سے کیا کہتے تھے ہم قہقہے جوں قلقل مینا (جوں)
ص ۲۰ سے لعنت کیا جانے کوہ کر پھرا دکو، وکر) ص ۱۰-۲۰ بناوٹ کی لگاوٹ ہے سمجھتے ہیں نہ ہم چھینٹا (یہ)
ص ۲۱ سے [illegible] کو بھر کر جام پرنے جام ساقی (پیالے) ص ۲۲ سے نہ تجھ سا کبھی چشم جنا نہ دیکھا (پر)
ص ۲۲ سے کل بہرے سوالی ، بے تیغے کرنے ، جہاں میں کوئی ہم سا رسوا نہ دیکھا (ننگ)
ص ۲۳ سے فسردہ [illegible] چھپائی جہاں میں ، کہیں عشق بازی کا چرچا نہ دیکھا (ایسی)

ص ۲۳ سے دل کو دیوان فغاں نے جو پڑھا طالب عشق ٭ کیا ستم تو نے یا اس غزل پہ اُستاد کیا (فغاں)
ص ۲۴ سے آنکھ تک مونڈنے میں حیرتِ عشق ٭ ایسی میں شگفتگی ہے ادر گزرا (حلم)
ص ۲۶ سے ہم بھی اے معروف عیاں کرے بیٹھے ہیں دل و سینہ ہدف ٭ جب سے سنا کمان ابرو کو واں شوق ہے تیر اندازی کا (عیاں کرے بیٹھے)
ص ۳۵ سے نقش ونگیں کی صورت پابند نام معروف ٭ کب تک رہیگا یوں ہی لے رو سیاہ بیٹھا (نقش نگیں)
ص ۳۰ سے عجب پرزہر فرقاں تیر ہے اے سیمبر کا نشا (سیمبر) ص ۳۲ سے ثانی پیچھے تو گرداں میں کنند (پیچھے)
ص ۳۳ سے یہ کبھی اچھا نہ ہوتا عمر بھی اچھا ہوا (ہجر) ص ۳۰ سے جو واں گیا سو مرا ہی بھر رہ گیا (میرا)
ص ۴۲ سے یہ پی ہے ہاتھ سے کس ظالم اقلم کے کام آیا (ہے) ص ۴۴ سے مفت برکون سا بیٹھا تھا میرے پہلو میں (میرے)
ص ۴۴ سے کبھی ایک جز کی نہ دی تھی سویوں ٭ سنو گالیاں اب سُناتے ہیں آپ (سوؤں یعنی سیکڑوں)
ص ۴۵ سے پر ہے ترے روبروئے غیرتِ گلعذار ہے (ترے، گلعذار)
ص ۵۱ سے میری چاک جیب کے گرد بچھے ہوں تم کو سیر (کی و کھینچ ہو) لفظ سیر معروف کی زبان پر مونث تھا۔
ص ۵۵ سے سراف آپ روتے ہیں سیلاب دیکھ کر ٭ سابق میں ہو گئے تھے جو ہندوستاں کی سیر (آپ؟)
ص ۶۵ سے زلف دراز کے وہ کیا ہیں مصرع موزوں ہیں چار (ہیں)
ص ۷۵ سے جام صہبا دو نہ قلیاں سبی و رنگ پاس ہو ٭ یہ کیفیت مرے زیب لب میگوں ہیں چار (ترکے)
ص ۷۵ سے میر و انشا و نصیر الدین و جرأت اور تم ٭ جس طرح ہوں چار عنصر آج باہم۔ یوں ہیں چار (ہم)
کیوں نہ ملک معروف ہو آباد اقلیم سخن ٭ دوست باہم بادشاہ معنی و مضموں ہیں چار
(میر انشا) یہاں چار شاعروں کا بشمول معروف ذکر ہے، میر اور انشا کے درمیان اگر واو رکھا جائے تو پانچ ہو جاتے ہیں۔
ص ۷۰ سے آئینہ سازوں کی اب ہر یک وہ دکاں ہے سر بمہر (دکاں) ص ۷۵ سے اے معروف کہ ہم سو چھپائیں کب ٭ پیتا ہے (اسے، گو)
ص ۷۱ سے کرتا ہے دیکھ سوئے عدم تو ہی سفیر چیں (سفر) ص ۸۵ سے کام پروانے سوا رکھیے نہیں بلبل سے شمع (رکھی)
ص ۸۶ سے لاکھ میرا اک طرف ایک اس دل کی چاہ اک طرف (قہر)
ص ۸۷ سے در اشک کس دن کو رکھے ہیں تو نذر کروں تجھ کو لے دیدۂ تر تصدق ٭ کہ آیا ہے یہاں غم یار اور تو ٭ میں کرتے ہو وہ کے گوہر تصدق ٭ (کرتا)
ص ۹۶ سے یعنی پھر اکسیر بھی ہو جائے گر سیماب خاک (ہے)
ص ۹۹ سے وہ نہیں معشوق عاشق شمع پروانہ کو دیکھ۔ (شمع و پروانہ)

ص ۸۸ س غنچہ تو گوش گل ہے زباں وال تنگ چشم (کر)
ص ۸۸ س ابھی لطف تیغ کا چاہئے، کچھ ہم (د)
ص ۸۸ س عجب نہیں جو نہ دے اُڑ کے نقش پا تعلیم۔ (کے)
ص ۸۸ س آپ جو نہیں کی تو جان لو ہم ہم نہیں۔ (تو یہ جان)
ص ۸۸ س عجب، اہل کرم کی یگہ نگاہ بیاں۔ (گنہگار)
ص ۸۹ س جنوں کی فرصت ایک دم ہے نگاہ بیاں۔ (یک)
ص ۸۹ س عاشقوں کے کیو تکہ دل اے تو کرے تصویر کے۔ (کی)
ص ۸۹ س فلک کے ہاتھوں جدھر جو اُٹھانے جاتے ہیں + ادھر سے جوں گل بازی طمانچہ کھاتا ہوں۔ (جاتا ہوں)
ص ۸۹ س زمین آنکھ کو سمجھے ہیں کھاتا ہوں سجا، ص ۸۹ س مشتاق دید جوں گل خورشید، وکریں (رہوں)
ص ۸۹ س شمار اعمال کے ہے غفلت دست دعا محشر تک صرف دولی آے نیارب درمیاں۔ (احول)
ص ۸۹ س پشت فلک کو جو خم سمجھے ہیں + زمیں پکڑ ن ہے اس پل نے ہم سمجھے ہیں۔ (پل)
ص ۸۹ س حال سے لیتے ہیں کرد ث اہل جہاں + مکان عشق نہ دیا، یوں بدلتے ہیں (مکان عشق بغیر اضافت)
ص ۸۹ س کرد ان دعا سے جو چھالے ہو گئے دیتے ہیں (دیہ) ص ۸۹ س اگرچہ خاک ہیں پر شکل تو تھا معروف۔ (تو تیا)
ص ۸۹ س بغیر اوقات دشمن سے ہم جوکہ ہے بدشکال درویشاں۔ بدسگال
ص ۸۹ س تنہ جو نفت دل بھی سے چشم دیا + تو آکے دیکھے ہاں اب وہ کیا کیا گل کرتے ہیں۔ (آگے)
ص ۹۰ س گنہگار، اس گھڑی سب ہم کو ٹھہراتے ہیں حاکم کا گنہگار۔
ص ۹۰ س خطر کی ہا جو سوتے بھی ہیں تو وہ ہشیار سوتے ہیں۔ (وہ زاید ہے)
ص ۹۰ س انکھیں تیری ملکیں پیسا دپہر تا نیک تکیں ہے + جو معشوق کے زیر سایہ دیوار کتے ہیں (اے سایہ تنگ)
ص ۹۰ س نظر تیز تری دیکھی ہے جو برق جلاوے خرمن وہم و خیالات و گماں فخر الدین (جرں)
ص ۹۰ س وقت پیدائش کے گریاں اس لیے ہوتے ہیں طفل (گریاں)
ص ۹۰ س ہم بھی کوئی روز عالم ساتھ لیتے آئے ہیں۔ (زور)
ص ۹۰ س جو رہتا ہے اک دم کے ہیں ہم جہاں میں مہماں (میہماں)
ص ۹۶ س کس طرح لوگوں میں حال راز میں تم سے کہوں۔ (زار)
ص ۹۰ س سرگیں اس کی میں یاد جو آئیں آنکھیں + جب تلک بزم میں بیٹھے : اُٹھائیں آنکھیں (شرگیں)
ص ۹۰ س ہیں جو رونا اگرچہ دیدہ گریاں تو پھر + سو جاتے اس کی نظروں سے گر دیتے ہیں۔ (سوجتا)

ص ۱۰۱ سے پروا نہیں ہے کچھ مجھے نام و نشاں کی ہے پراگندہ دل جہاں میں ہوں نقش نگیں سے میں ۔ (پراگندہ)

ص ۱۰۱ سے معروف ہوں گدا میں در شاہ مرتضیٰ (گدا ئے)

ص ۱۰۳ سے سمجھ کر ماتھو کیا اِلی کی یاں دکاں نہیں (کے ا یاں)

ص ۱۰۵ سے دم بدم ڈھلتی رہے جیسے مناروں کی چھاؤں ۔ (میناروں)

ص ۱۰۶ سے بشرہ بشر کا دیکھ کے کہتے ہیں بند کو (پند)

ص ۱۰۶ سے معروف درس عشق میں جاتے ہی ایک بار + ہم نے خرد کے طاق پہ رکھا کتاب کو (کی)

ص ۱۰۸ سے کیونکر تلاش در بدر کو بکو نہ ہو (در بدر و کو بکو)

ص ۱۰۸ سے سن کے کہا کہ کہہ بجو ان سے میں نے مزا بس بھر پایا (کہ زاہد)

ص ۱۰۹ سے اضطراب دل سے تیشہ اپنے سر پہ مار کر + ہم سے تنگ عاشقاں چلے ہے اب کیا داد تو (ننگ)

ص ۱۱۲ سے ستم کشوں کو ہے تیرے نفس شماری لگی + بس اب تو آ کہ کہیں جور ہے حیات سے دم (بے حساب)

ص ۱۱۷ سے پھرتے ہیں یاں تک اس کے خریدار ساتھ ساتھ + گویا لیے پھرے تھے وہ بازار ساتھ ساتھ (ہے ۹)

ص ۱۲۳ سے غنچہ سا منہ کو بھی ڈالا نہ گریباں میں کبھی ۔ (ساں)

ص ۱۲۴ سے آنکھ جھپکی ہو اگر ایک پل شب ہجراں میں کبھی (گر اک)

ص ۱۲۶ سے ہے تامل تاج تخت خسرواں سے دوں ابھی ۔ (تاج و تخت)

ص ۱۲۹ سے لب پر فغاں بغل میں دل آزار گرم ہے (زار)

ص ۱۳۰ سے روز پکا لگا دیا تو نے (زور) ص ۱۳۰ سے غیر و فقر کو ہم سی ہے دم پھے (پہ)

ص ۱۳۶ سے جو رسم مہر الفت یک بار بھول جائے ۔ (مہر و الفت)

ص ۱۳۷ سے رہتا ہے یہی اور یہی تیرا ادی ہے ۔ (یہ ہی ترا)

ص ۱۳۸ سے ایسے ظالم کو لکھوں خاک کتابت معروف + قاصد و وہم بھی جائے تو وہ گماں آئے ۔ (قاصد و ہم)

ص ۱۳۹ سے شرمندہ ہوئے طین قطرے کی جو سحاب ہو کے) ص ۱۴۰ سے جو تیر پاس ہو سے خانا تا خراب تو دے (خانا تاں)

ص ۱۴۰ سے کیوں نہ ہو مجنوں سیل اشک بیر چشم زار + اس کے کوچے کی طرف تنکا سا بہتا جانے ہے ۔ (جسم)

ص ۱۴۴ سے کہ ہم کو یاد مژگاں میں کسی کے طلا تا ہے ۔ (تلملا تا)

ص ۱۴۵ سے کہ حرف صلح میں گر خط میں لکھا تو بتا بگڑ تا ہے ۔ (تھا ادہر)

ص ۱۴۰ سے دیا نقشہ جو اس نے کھینچ کر بہزاد اس کو تو دیکھے ۔ کہ کہ آئینہ وہ پہلا ہوں نہیں ہاں ہے ۔ (اس کا)

ص ۱۴۹ سے کھینچتا ہے یار کی کلک تصور سے شبیہ (یار)

ص ۱۰۰ سطر ۱۰ اٹھی معروف دو سے کہ گئے ہیں دو دگی۔ (دو ہی)

ص ۱۰۰ سطر ۱۰ کرایا ہو آپ اس کا اقرار پہلے دکھاں (ص ۱۰۰ سطر ۱۰ ۱) کانٹی آج ہے جیر اتم سحر آفریں (مالی)

ص ۱۰۰ سطر ۱۰ شانگیٰ ہیں جو معروف کی فغاں شب و روز + ازیں سبب مرنی حافظ جو بیدلان شب روز۔ (رکھے ہیں)

ص ۱۰۰ سطر ۱۰ اپر پہلو میں مرے دشتے خنجر کا کمون (دشنہ) ص ۱۰۰ سطر ۱۰ نے رہا ہے مجھ کو قدو بوسے کسی کے + کچھ واسطہ ہم کو نہیں گڑو سے کسی کے + واقف نہیں چشم و لب و ابرو سے کسی کے۔ (گل (؟)

ص ۱۰۰ سطر ۱۰ ہر شخص بتاں نزدیک ہی کر بیٹھے تھے کبھی + فلک چاہتے دیتے اور کبھی رہتے تھے سب سے۔ (سے)

ص ۱۰۰ سطر ۱۰ آپ میں ہے معروف جشن دسازاں (بیابانی سرو سامان)

ص ۱۵۹ سطر اٹھو ہے تیری خو سے خفا او خفا سے ہم (جفا)

ص ۱۶۰ سطر ۱۰ وانے ۱۱ سو محبت خوب ہی جھڑ کا نمک۔ (۱۰۰۱۱)

ص ۱۶۱ سطر کچھ تو کرلے بت اظہار کہوں یا نہ کہوں (حیا)

ص ۱۶۲ سطر لے دل چشم تو گر حقیقت بیں ہے + چشمے بکشا ببیں حقیقت بیں ہست (این ہست)

ص ۱۶۴ سطر جبر نفس کا چاہئے اپنا دل وہ چاہ کا مطلقا سیر ہے مائل۔ مصرع اول نا موزوں ہے کے بعد یا اس کا اضافہ ہونا چاہیے۔)

ص ۱۶۵ سطر حاصل فقیر ایک ہی رباعی کبکرہ + الجھار بچھا کے چارپائی سورہ۔ (خاموش ہوا ایک)

ص ۱۶۵ سطر ہر گل میں بو ہے ، یہ سب ہے گو + دیکھ لے بہار کیا گل میں خرجے جز میں ہے گل دیکھ لے بہار + (کل ، جو ، جو کل)

ص ۱۶۵ سطر سر پر رکھ کر پاؤں مجھ کو ذبح کرتے ہیں وہ مناسب تھا اگر اس پاؤں میں وہ اپنے مانتے ، (پاس)

ص ۱۶۵ سطر سوا ہی چلو اب ہے آخر برنگ شبنم (ہی) ص ۱۶۶ سطر ہم تو مرجاتے کبھی کے زیست کی ہے یہ وجہ (وجہ یہ)

ص ۱۶۶ سطر احکام نرگس نے جو گلشن میں تماشے سے کہا + سحر ہے اے بت بے باک تری آنکھوں میں۔

سے گھر گرایا ہے قدرت تری سیقل باندھے + ہم کو تو تو کتی ہے خاک تری آنکھوں میں۔ (شغل بانوی)

ص ۱۶۶ سطر معلوم ہو گیا ہمیں احوال آپ کا + قافل ہے جو کوئی اسے کہتے کتاب ہے (عاقل لفظ)

ص ۱۶۷ سطر اسما کر یہ اس کے واسطے ہو جیب چاک + باوجود حسن گل کا ہے کو، کھ جیب چاک دگر، حسن بغیر اضافہ

ص ۱۶۸ سطر عزیز طلب جو یاں سنی میں اکثر دیس آتا ہے ، (اکثر دیس گاتا ہے)

ص ۱۶۸ سطر مالوں کو چھپتے ہیں زلف سیاہ مرغوب ہوتی ہے (سیہ)

ص ۱۶۹ سطر عشق کے نام ہی ہیں یہ سہ حرف + (عشق کے نام میں جو تین ہیں حرف)

ص ۱۰۵ سے ننگ و ناموں کو مت کرتے خاک ہم (ناموس)
ص ۱۰۵ سے فلک اپنے پر کروں میں جبر (ناموزوں ہے) اب یا اس قسم کا کوئی لفظ
ص ۱۰۶ سے اس نے پڑھنا کوئی سیکھا تھا غزل پڑھنا ص ۱۰۶ سے نگاہ ہاتھوں سے بجھائی آتش۔ نگاہ بستر میں لگائی آتش
(بجھائی، لگائی)
ص ۱۰۸ سے کہ نہ کچھ سنتے ہو نہ کچھ بولتے ہو (کچھ نہ سنتے ہو نہ کچھ بولتے ہو۔ بلکہ نہ کچھ سنتے ہو نہ کچھ بولتے ہو)
ص ۱۰۸ سے وحشت شوق کے نکیں کی قسم (نگیں) ص ۱۰۱ سے کہ کچھ تھا اس کا مشکل کام لکھنا)
ص ۱۰۲ سے صائب و شوکت ظہیر و کلیم (صائب و شوکت و ظہیر و کلیم) ص ۱۰۳ سے بس کرو اتائے حق و باطل ہم (وہ اعلٰے)
ص ۱۰۳ سے کہتے ہیں کچھ نہیں وہاں اور یہاں یہ ، یاں) اس قسم کی غلطیاں اور بھی ہیں۔
ص ۱۰۴ یعنی کھولی کے بھی محل کو چھوڑ ، (محل کو بھی)
ص ۱۰۵ سے آپ ہی دل میں ، ہو اپنے خجل (رہوں) ص ۱۰۶ سے جس کو صدا فکر مضامین رہے۔ (سدا)
ص ۱۰۶ سے جانیو اجمیری ہی دروازہ سے روک تو ہے واں بھی پہ اندازے سے (جانیو دروازے، انداز)
ص ۱۰۶ سے ریوڑی والی کی دوکاں پہ الگ (دکان پر) ص ۱۰۷ سے جس سے کہ شرمندہ قصر بہشت (شرمندہ ہو قصر بہشت)
ص ۱۰۷ سے روکنے پائے نہ اس بے چوبدار ۔ (نہ اسے چوبدار)
ص ۱۰۰ سے آپ سے مت مجھ کو کچھ دور ہوں (مجھ کو کیا کچھ) ص ۱۰۸ سے ان سخن کے معروف اب (سخن کو مرے)
ص ۱۹۰ سے تا نیرے زندگانی مشکل ہے (نیری) ص ۱۹۰ سے اورے تقریر فرمانے لگے (ہی)
ص ۱۹۲ سے ہو گئی اس سرو قد پہ فاختہ (پر) ص ۱۹۶ سے سب اطبا ایک قلم حیران کار: (یک)
ص ۱۹۶ سے نگاہ ہشیار آئے نگاہ دیوانہ آئے (گہ) ص ۱۹۸ سے الغرض ہنگامہ آزاری یہ تھی، وہ قضا کی کار فرمائی یہی تھی (آرائی،
ص ۱۹۹ سے پھر لگی کہنے کہ اے میران کار، خلق کو کب ہے خدا پر اعتماد (اعتبار)
ص ۱۹۹ سے آپ ہی انصاف کر لو اے حزیں (کریو) ص ۲۰۲ سے دیکھ کر اس طرح کرنے التجا۔ (گرم)
ص ۲۰۵ سے اہل ماتم کا ز بس غوغہ ہوا (غوغا) ص ۲۰۰ سے نگاہ بہاتے چشمے دریائے اشک (گہ)
ص ۲۰۰ سے تھی اور اثبات کو وہ شاہ دیں ہو کر دکھاتے تھے وہاں عین الیقیں۔ (نہی)
ص ۲۰۲ سے جس سے دل لپستا تھا سب کا دمبدم (لپستا تھا)
ص ۲۰۹ سے چاک دامن تک گریباں چاک تھا دل کہ از خود یہ وہ جیران تھا۔ (میرخاک)
ص ۲۰۹ سے تھی وہ غرق بحر سے ساحل پہ تھا (غرق) ص ۲۰۹ سے قبر میں ما چار اس کو گاڑ کر دکھا
ص ۲۰۹ سے گور کھتی تھی اسے دد گود تو۔ (کہتی)

ص ۲۰۳ سے کیا کہوں بیڈشنی طوطی سی ہے انسے ۔ (گے طوطے سے)
ص ۲۱۵ سے ہے چشم سبزہ ۔ نگہ نشے میں ۔ ادشنخ ۔ یا نرغے سی ہے پہ زمرد کا جام سرخ ۔ (سے ہے یہ)
ص ۲۱۶ سے ہے سینہ اس آئینے میں جلوہ گر طوطی کا عکس ۔ (سما)
ص ۲۱۰ سے ساقی نہیں ہے سبزہ مینا سے کیا غرض ۔ (نہیں)
ص ۲۱۰ سے صدری کا اب تک ؛ تماشا قامت کا گرم ۔ (صدری)
ص ۲۱۰ سے اس سبزہ رنگ سے جب کہو ملتے ۔ از کہ ہم کہو ملتے)
ص ۲۱۰ سے کہو سے ہے بر سبزہ ۔ نگہ اس سے ہری ملک نہیں چلک)
ص ۲۱۰ سے جیسے سبزہ ۔ نگہ پشت سبز کی تختی نہیں ۔ (پشت)
ص ۲۱۰ سے یار پہ اس دبیر کی گردے نیب حنی عمر ہو ، بلکہ سبزہ ۔ نگہ سے وہ اس کی خضری عمر ہو (گرد نیب)
ص ۲۱۹ ہے سبزہ ۔ نگہ اس نیب خط ، کیسے ہے دو دانیکے کھل
ص ۲۱۹ سے ہم کب آئے نیند جو اس سبزہ رنگ کے ۔ (نیند)
ص ۲۰ سے سیاہ کاری معروف نے سیاہ رو ، جو سیاہ رو اس بشر کا منہ کالا (سیاہ کار ہے)
ص ۲۰ سے نزول عشق میں یوں دل کو ہے تن آمکے شوخ ۔ عصا کو کرے جوں دم رفتار لحاظ (سوچ)
ص ۱۵ سے اسیر دام الفت ہو کے یک بار جان و دل ۔ گلی میں تیرے نیمہ جب سے دیکھا ہے دو دائی کا (گلے)
ص ۲۰ سے صحبت کا یہ اثر ہے کہ معروف ہے ، نگہ ۔ کرتی ہے دیکھ تو سیہ زر ، گر میں زر کو آگ (دے ، بو تہ)
ص ۹۱ سے سو ریز عشق میں کیونکر نہ دھیان کی باتیں ۔ کہاں کی ہیں ، رالی جہان سے باتیں (کمال!)
ص ۲۲ سے امت خواب عدم دیکھ کے سب نے یک دست ۔ نقش پاسے کف برخاک میں در بند کیا (خاک)
ص ۲۰ سے یہاں تو داغ ہوں دامن سے دھو یا تو نے اے قاتل ۔ وہاں اک دن گلے کا گل ہماری بے گناہی کا (گلے)
ص ۱۸ سے تمام منزل مقصد کو ہم ، یتیق ۔ میں ناتواں چلتے ہی دو گام رہ گیا ۔ (ہم رہاں ؟)
ص ۵ سے اہل دل کے بغیر اب میرے ۔ دد دیکھے ہر اک بشر میرا (اب کی جگہ تو کب معلوم ہوتا ہے ، لیکن
لفظ میرے صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ اس کی جگہ میرا ہو تو یہ خرابی ہے کہ ردیف بھی یہی ہے)
ص ۱۰ سے بلبل ، روح تازہ دیتے معروف ۔ گر سنے ایک شعر تر میرا (ہو)
ص ۲۰ سے معروف کے جو دل میں الفت نہ ہو پیا کی (ضیا) ۴۲ سے لیے اس کے ہزار ڈھونڈیں لوگ (کمرہ کی)
ص ۹۱ سے مشتاق شعلہ نے مضطرب پسرا ہے تو ۔ بھڑکتی ہے مرے دل میں تری آہنگ سے آتش (لے)
ص ۲۲ سے با سامرہ اس کی چشم کے سحر کا دنبالہ کرے ہے نیزہ ناز شاہ ترکستان پر جادو ۔ (نیزہ باز ؟)

دریائے لطافت

مصنفہ سید انشا و مرتبہ عبدالحق صاحب و ترجمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی، ص ۸ + ۲۴ + ۲۹۶ + ۴۲۸ قیمت مجلد ہے غیر مجلد ؏ سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر ۸۳۔

دریائے لطافت ۔ د کے اس وقت تین مطبوعہ نسخے ہیں، نسخہ مرشد آباد ۔ م، جو مکمل اور سب سے صحیح ہے، نسخۂ انجمن ترقی اُردو ۱۹۱۶ء جو بعض تصرفات کے ساتھ شائع ہوا تھا، ان نسخہ ۱۹۳۵ء مزید تصرفات کے ساتھ اصل کا اردو ترجمہ ہے۔ ت ۔ عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمے میں غلط نہیں لکھا کہ اس سے پہلے کسی نے اردو صرف و نحو اور تحقیق زبان پر اس اصول و ترتیب کے ساتھ کوئی کتاب نہیں لکھی تھی، زمانۂ حال میں بھی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ انشا کی تحقیق کو نہیں پہنچتیں۔ اور بعض چیزیں تو وہ ایسی لکھ گئے ہیں کہ اگر وہ نہ لکھتے تو ہمیں ان کا کبھی علم نہ ہوتا۔ کتاب کا مطالعہ کرنے سے واقعہ یہ ہے کہ بقول مرتب ”سید انشا کی ذہانت، باریک نظری، زبان دانی۔ اور زبان فہمی کا قائل ہونا پڑتا ہے“ لیکن کتاب کو جیسی چاہیے ویسی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی۔

ابتدائی بے اعتنائیوں سے قطع نظر بھی کیا جائے تو اس کا کیا جواب ہے کہ ن کے ہزار نسخے اٹھارہ انیس سال میں بکے، اب اس خیال سے کہ شاید اس کی مقبولیت کی راہ میں اس کی زبان حائل ہو، انجمن نے اس کا اردو ترجمہ شائع کرایا ہے۔ فاضل مرتب کا ارادہ اس کتاب کے ان مقامات کے متعلق جن میں گفتگو، بحث اور تشریح کی گنجائش ہے۔ بتفصیل لکھنے کا تھا۔ اس موضوع پر ان کی تحریر واقعی قابل دید ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ کثرت مشاغل سے انھیں اس کا موقع نہ مل سکا کیفی صاحب کا ترجمہ بھی سلیس، بامحاورہ اور شگفتہ ہے، کتاب کے مضامین کی تقسیم بھی اب اس طور پر کی گئی ہے کہ ن اور م کے مقابلے میں اس سے فائدہ اٹھانا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اور اب بھی اگر یہ کتاب مقبول عام نہ ہوئی تو ہمیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ یہ اہل اردو کی بدمذاقی کی بڑی دلیل ہوگی۔

ت کی خوبیوں کے متعلق اس وقت جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں صرف عام ناظرین کے نقطۂ نظر اور ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور ہم اپنے تبصرے کا یہیں خاتمہ کر دیتے لیکن اس ڈر سے کہ کیفی صاحب جو عموماً اہل نظر سے داد طلب ہوا کرتے ہیں اور عوام کی پسندیدگی کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے۔ اس قسم کے سرسری تبصرے کو بے توجہی پر محمول نہ فرمائیں۔ ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے ہم ان کے ترجمے کو جانچتے ہیں۔ اگر ہم کیفی صاحب کی انصاف پسندی کے قائل نہ ہوتے، اور انھیں اہل نظر میں نہ شمار کرتے تو ان کے ترجمے کو دیدہ ریزی سے پڑھتے، اور نہ چند سطروں سے زیادہ اس کے متعلق لکھنے کی ضرورت سمجھتے۔

۱۔ ن میں کتابت کی جتنی غلطیاں تھیں، وہ سب کی سب باستثنائے بعض ت میں موجود ہیں۔

۲۔ بہت سے الفاظ اور عبارتیں ن سے فحش و مبتذل ہونے کی بنا پر خارج کر دی گئی تھیں، وہ اب بھی خارج ہیں، یہ امر قابل اعتراض نہیں، لیکن ن میں کہیں کہیں اس عمل کے ساتھ کاتب کی غلطی شامل ہو گئی ہے

میں سے بعض محاورات اور روز مروں کے غلط معانی درج ہو گئے ہیں۔ کیفی صاحب کو ان کی تصحیح کرنی چاہیے تھی۔

۳۔ کیفی صاحب اپنے دیباچے میں ہنود اور لڑکوں کے نام بدل دینے کے علاوہ کسی اور قسم کے تصرف کرنے سے منکر ہیں لیکن انھوں نے جا بجا تصرفات کیے ہیں۔ الفاظ اور عبارات حسب منشا حذف کر دی ہیں، ضروری مثالیں ترک کر دی ہیں۔ مصنف نے بعض الفاظ کی جو تشریح کی تھی وہ خارج کر دی ہے۔

۴۔ ترجمہ بہت آزادی بلکہ ناجائز آزادی کے ساتھ کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اور ان کے مطالعے سے جو صحیح معلومات حاصل ہوتی تھیں، ترجمے کے دیکھنے سے اس حد تک حاصل نہیں ہو سکتیں۔

۵۔ یہ سن کر لوگوں کو تعجب ہوگا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بعض مقامات پر ترجمہ مصنف کے منشا کے بالکل خلاف کر دیا گیا ہے۔

۶۔ مصنفین کے حالات سے مترجم کیفی بڑی حد تک ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ مترجم کی زبان پر بعض ایسے الفاظ اور تراکیب بھی ہیں جو نہ ہونی چاہئیں

اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ مترجم کی کل غلطیاں پیش کر دکھائی جائیں۔ بعض چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

عبارت ذیل میں سے ماخوذ ہے ان اور م کا فرق بھی دکھا دیا گیا ہے۔ کیفی صاحب کا ترجمہ بھی اس کے بعد درج ہے۔

"سعادت یار خاں، رنگین تخلص پسر اوسط طہماسپ خاں کہ در شیوہ آشنا پرستی و صنعت شجاعت و سواری اسپ و دیگر مراتب عمل سپاہی عدیم البدل است از بس کہ دمے خوش بنشش در اوائل استحان قوت باہ و دیدہ و بیشتر با زنان پردہ نشیں سروکار داشتہ، نبذے از مصطلحات شاں در فصلے از کتاب تالیف نمودہ خود نوشتہ بلکہ دیوانے در ان گفتگو، نظم در آوردہ، بدیوان ریختی کہ ایجاد اوست موسوم ساختہ الحق کہ بادی شعر ہندی درین زبان خان مذکور است۔ راقم آثم این مصطلحات را با مراد درین جا نقل می کند، زیرا کہ از دوستان بے ریا و باصفا است، و راقم را باوصف ہیچ مدانی مسلم الثبوت بہتر از شعرائے حال و ماضی زبان ریختہ می داند۔"

ت میں عدیم کی جگہ نمبر اور قوسین کے الفاظ خارج ہیں۔ "سعادت یار خاں رنگین خلف طہماسپ خاں جو دوستداری کے شعار اور سپاہگری و شجاعت وغیرہ مردانہ اشغال میں اعلیٰ درجہ رکھتا ہے، اس کو پردہ نشین عورتوں سے واسطہ رہا ہے۔ ایک حصہ اس نے اپنی تالیف کی ہوئی کتاب میں ان کی زبان میں لکھا ہے، بلکہ اسی زبان میں ایک دیوان بھی کہا ہے، وہ ریختی کا موجد ہے اور اس دیوان کا نام بھی ریختی رکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس زبان (ریختی) میں ہندی شعر کا موجد خان مذکور ہے۔ راقم آثم یہ اصطلاحیں وہیں سے نقل کرتا ہے کیونکہ موصوف بے ریا اور مخلص دوستوں میں ہے، اور راقم کو باوجود ہیچ مدانی کے مسلم الثبوت اور گزشتہ و حال کے شعرا میں بہتر سمجھتا ہے"

(۱) عدیم المثل بہت، کا ترجمہ "اعلیٰ درجہ رکھتا ہے" کیا گیا ہے۔ ب زنان پردہ نشیں سے مصنف کی مراد شریف عورتیں دھتیں بلکہ بہ مقابل زنان بازار خانگی عورتیں تھیں، اس کا ترجمہ پردہ نشیں مخدرات بالکل مدعا مصنف کے خلاف ہے۔ ج، رنگیں کے بسراوسط ہونے، عیاشی کی طرف بشدت مائل ہونے اور ان کی سواری اسپ میں باہر جانے کا ذکر مترجم نے کیوں غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا، ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ د مصنف نے یہ نہیں لکھا کہ دیوان کا نام ریختی رکھا بلکہ دیوان کا نام دیوان ریختی رکھا۔ ی "بالسرا" کا ترجمہ مترجم نے نہیں کیا۔ و مصنف نے صرف اتنا لکھا تھا کہ رنگیں بھی ماضی وحال کے شعرائے ریختہ میں سب سے بہتر سمجھے ہیں۔ مترجم نے لفظ ریختہ کو اڑا دیا، اور اب دنیا مترجم کی ذرا سی بے پروائی کی وجہ سے یہ سمجھے گی کہ رنگین کی رائے میں انشا دنیا کے تمام شعراء سے بڑھ کر تھے۔

(۲) "چوں در وقت والد مرحوم تحصیل کتب درسیہ منطق وحکمت بہ عمل آورده بودم وازمدتے ..... انچہ خوانده بودم بہ سہو انساں رسیده بود" "سوائے اختلاط شعر وسخن اظہار مقدمات علمی درحضرت ایشاں حمل بر تنگ ظرفی خود کرده" مع چونکہ ۔ والد مرحوم کے وقت میں منطق اور فلسفے کی درسی کتابیں پڑھی تھیں اور مدت سے ..... ان موضوعوں پر جو کچھ پڑھا تھا بھول گیا تھا، موصوف کی خدمت میں علمی مسئلوں سے متعلق گفتگو کے بدلے شعر وسخن سے صحبت گرم کرنا میں نے تنگ ظرفی خیال کیا،" ت ص ۹۰۰، ۔ مصنف کا مدعا اس کے بالکل برعکس ہے، مولوی حیدر علی انشا جن سے ملنے کو گئے تھے جید عالم تھے، چاہیے تھا کہ انشا ان سے عالموں کے مذاق کی باتیں کرتے، لیکن چونکہ انشا کو اب علوم میں حسب دلخواہ دستگاہ نہ رہی تھی اپنے علمیت کے جتانے کو اس قسم کی گفتگو کرنا انشا نے تنگ ظرفی پر محمول کیا اور شعر وسخن سے متعلق بات چیت کو ترجیح دی۔ تنگ ظرفی علوم سے متعلق گفتگو کرنے میں تھی نہ کہ شعر وسخن سے متعلق گفتگو کرنے میں، کیفی صاحب کا مصنف کے مدعا کو نہ سمجھنا حیرت انگیز ہے۔

(۳) مصنف نے دہری مذہب والے سید صاحب کا ایک لطیفہ لکھا ہے، جس میں سید صاحب کا جواب فارسی میں ہے، ت ص ۱۰۴ و ۱۰۵، سید صاحب کا جواب "قبلہ غیرت" سے شروع ہو کر "مباحثہ می کند" پر ختم ہو جاتا ہے، مترجم نے اس کے بعد کی متعدد سطروں کا ترجمہ نہیں کیا، فارسی ہی رہنے دیا ہے اس گمان میں کہ یہ بھی سید صاحب کی تقریر کا جزو ہے، حالانکہ مباحثہ می کند کے بعد کی عبارت کو سید صاحب سے کوئی تعلق نہیں، اور اس کا ترجمہ کرنا چاہیے تھا۔

(۴) "دو ملا میں مرغی مردار۔ ت ۱۳۹، اگر مترجم نے مم کے مطالعے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ انشا کی زبان پر دو ملا میں مرغی حرام ہی تھا "دو ملا میں مرغی مردار" کاتب ن کی ایجاد ہے۔

(۵) پانی پت کے رہنے والے ہیں، اس کی تشریح یوں کی ہے کہ نرم اور ٹھنڈے ہیں، ص ۱۴۰ ت حالانکہ ہم بیمار ہیں

پان چھالیہ، بیچنے والے ہیں اور نرم ہیں، جیسے جب بھی منقول ہیں، ان محاورات کو خارج کرنے کی وجہ ہو سکتی ہے، لیکن خود معنی بتلانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

(۷) الاہی، دو کانی، تالی وغیرہ کی تشریح میں انشا نے صاف لکھا ہے کہ این ہمہ الفاظ طلب باشد کہ باہم شغل مساحقت [illegible] ص ۹۹ ان عبدالحق صاحب نے ان کی تشریح کو خارج کر دیا تھا لیکن کیفی صاحب کی ثقاہت نے برداشت نہ کر سکی ص ۳۰، ت، انھوں نے اصل الفاظ تو رہنے دیے، لیکن ان کی تشریح عبارت بالا کو حذف کر کے ناقص کر دی [illegible] اگر وہ یہ سمجھیں کہ یہ الفاظ انشا کے زمانے میں پاکباز شریف خواتین ایک دوسرے کے لیے استعمال کرتی تھیں تو اس کی ذمہ داری کیفی صاحب کی ثقاہت پر ہو گی۔

(۸) فن بیان کے متعلق جو قتیل کا حصہ باب ہے وہ مترجم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بجنسہ رہنے دیا گیا ہے، لیکن اس میں مترجم نے بہت کچھ قطع و برید سے کام لیا ہے۔ کم از کم ناظرین کو انھیں اس سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا مثالوں میں جن کی اہمیت کا انھیں اعتراف ہے، بہت سی انھوں نے ترک کر دی ہیں میر حسن کا شعر ذیل جو ص ۱۰۸ ف میں موجود ہے انھیں نزاکت معلوم ہوا حالانکہ میر حسن کے مراثی (شعر مرثیے کا ہے) نہایت کمیاب ہیں۔ اور دیوان حسن کے قلمی نسخوں میں بھی نہیں پائے جاتے، ؎

تم تو سسرال میں سدھارے فاطمہ کے پیارے حسینا،
آج آفت ہے گھر پہ تمہارے فاطمہ کے پیارے حسینا،

• قتیل کا نام مترجم نے میرزا محمد حسن لکھا ہے اور ان کا وطن فرید آباد بتایا ہے، ت ص ۲۵۹۔ قتیل کا نام محمد حسن ہے اور ان کی مزید [illegible] تو بحث سے یہ پیش کی جا سکتی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ قتیل کے فرید آبادی ہونے کی سند کیفی صاحب پیش کریں مگر معاصرین کا قول ہونا چاہیے،

(۹) مترجم نے انشا کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جو دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آ گئے تھے، حاشیہ ص ۳ ت۔ لیکن انشا دہلی کے رہنے والے تھے اور یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کا قیام کب سے کب تک دہلی میں رہا۔ انشا مرشد آباد سے شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے تھے، اور ان کی وفات کے بعد فیض آباد سے رخصت ہو گئے تھے، ان کے کلام سے مختلف اسفار سے واقفیت کا پتا چلتا ہے، تعجب نہیں کہ کسی ایک جگہ جم کر رہنے کے بجائے یہ مختلف اقطاع ہند کی سیر کرتے رہے ہوں، دہلی میں ان کا غیر معلوم مدت تک قیام مسلم، لیکن محض اس بنا پر ان کا شمار مہاجرین دہلی میں کیونکر ہو سکتا ہے،

(۱۰) اہل ہنود چونکہ [illegible] کے الفاظ اور تراکیب مترجم کی زبان پر ہیں،

سحر بنگال از طاہرہ دیوی شیرازی، ص ۱۲۰، تقطیع [illegible] قیمت [illegible] ملنے کا پتا ساقی بک ڈپو دہلی

عورتوں کا مردانہ نام اختیار کر کے کتابیں لکھنا کوئی نئی بات نہیں۔ جورج ایلیٹ اور جورج سان کے اصلی نام سے لوگ عام طور پر واقف نہ ہوں، لیکن مغربی ادب سے سرسری شناسائی رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ یہ عورتیں تھیں جو مردانہ نام سے اپنی کتابیں شائع کیا کرتی تھیں، زمانے کا انتقام بھی عجیب ہوا کرتا ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے یہ دونوں اب بھی مشہور ہیں، ان کی کتابیں اب بھی پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن ان کے اصلی نام ادبیات کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والوں کو چھوڑ کر شاید ہی کسی کو معلوم ہوں، عورتوں کا اپنی تصانیف کے لیے مردانہ نام اختیار کرنا بے سبب نہ تھا۔ ایک تو یہ کہ عورتوں کی ذہنی صلاحیتوں کی طرف سے عام بدگمانی تھی، وہ عورتیں جو ادبی شہرت حاصل کرنے کی آرزومند تھیں ڈرتی تھیں کہ اگر کتاب ان کے اصلی نام سے شائع ہوئی تو نقاد اس سے منصفانہ برتاؤ نہ کریں گے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے عورتیں بہت سی باتیں آزادی کے ساتھ کہتے ہوئے جھجکتی تھیں، اور سلامتی انھیں اسی میں نظر آتی تھی کہ جو کچھ کہیں بظاہر وہ مردوں کی طرف سے ہو۔ تیسرا سبب نفسی ہے، اور اسے بھی اس تبدیل نام میں بڑا دخل معلوم ہوتا ہے۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں اپنی پستی (انفی ریوریٹی) کا شدید احساس رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض میں تبدیل جنس، کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، نام بدل لینے سے وہ عورت سے مرد تو نہیں ہو جاتیں، لیکن وہ یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ اس ظلم کی جو فطرت نے ان کے ساتھ روا رکھا ہے، فی الجملہ تلافی ہو گئی۔

اس کی مثال بہت کم ملتی ہے کہ کسی مرد نے زنانہ نام اختیار کر کے کتاب شائع کی ہو، اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان کے ریختی گو شاعروں نے زنانہ تخلص رکھے، لیکن اپنا کلام خود ہی پڑھتے رہے۔ تاریخ ادبیات میں پیرلوئی شاید پہلا شخص ہے، جس نے اپنے نتائج فکر ایک عورت کی طرف منسوب کر دیے۔ پیرلوئی نے اپنی نظموں کا مجموعہ نغمہائے بلیتس، کے نام سے شائع کیا تو اپنی حیثیت صرف مترجم کی بیان کی، اور اصلی مصنف ایک قدیم یونانی شاعرہ کو قرار دیا۔ پیرلوئی کا بیان اپنی جگہ پر اتنا معتبر تھا کہ عامۃ الناس کا کیا ذکر ہے، علمائے یونانیات بھی دھوکا کھا گئے اس کتاب کے ۱۲ سال بعد اردو میں سحر بنگال شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر مصنف کی حیثیت سے طاہرہ دیوی شیرازی کا نام ثبت ہے، دیباچے میں ان کی داستان حیات بیان کی گئی ہے، اور اہل شک کی طمانیت قلب کے لیے مصنف کی تصویر بھی کتاب میں شامل ہے۔ لیکن ان اہتمامات کے باوجود طاہرہ دیوی شیرازی کو عالم آب و گل کی کوئی ہستی سمجھنا ضرورت سے زیادہ سادہ لوحی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ کتاب کسی عورت کی بساط سے باہر ہے یا کسی بیرونی کو اردو پر یہ قدرت نہیں ہو سکتی۔ دور کیوں جائیے ہمارے زمانے میں، اور خود بنگالے ہی میں سروجنی نائیڈو موجود ہیں، جن کو ایک بیرونی زبان انگریزی پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ بہت سے انگریزوں کے لیے باعث رشک ہو سکتی ہے۔ طاہرہ دیوی شیرازی کے وجود خارجی کو تسلیم نہ کرنے کی اصلی وجہ جیسی معلوم ہوتی ہے کہ مولف خود بھی

اس کے زیادہ قابل منتخب نہیں کہا ہو، وہی فیروزی، ان کی مخلوق ذہنی سے زیادہ بھی جائیں اور وہ خود سحر بنگال کی تصنیف کے شرف سے محروم کر دیے جائیں۔ ان کے لیے یہ آسانی ممکن تھا کہ ظاہر ورای کی داستان حیات میں ایسی باتیں موج کرنے سے جو بعید الاحتمال ہوں گریز کرتے، لیکن ایک ایسی بنگالی نژاد ہندو عورت، جو شانتی نکیتن کی تعلیم یافتہ، بنگلہ، ہندی، اردو، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ ان زبانوں میں مضمون نگاری کی اہلیت بھی رکھتی ہو، سب سے بڑھ کر یہ ایک ایسے مسلمان کی بی بی ہو جو سالہا سال میں عہدۂ سفارت پر فائز ہوکر ایران گیا ہو، اور جو اب افسانہ نگاری سے بیوگی کا غم غلط کر رہی ہو، افسانوں کے صفحات میں مل سکتی ہے، لیکن مادی دنیا میں اس کے وجود سے انکار کرنے کے لیے بہت زیادہ خشک ہونے کی ضرورت نہیں۔

مولف نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ "پیش نظر مجموعے میں چند افسانے طبعزاد ہیں، اور باقی ماخوذ یا ترجمہ" لیکن جہاں تک ترجموں کا تعلق ہے، صرف ایک ہی افسانے کے مصنف کا نام بیان کیا ہے، باقی افسانوں کے متعلق مولف کی طرف سے ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ انھیں طبعزاد سمجھیں یا ترجمہ مولف کو شاید اس کا احساس نہیں ہوا کہ ان کی اس فروگزاشت کی وجہ سے اس کتاب کے متعلق ناقدانہ حیثیت سے کچھ لکھنا کس قدر دشوار ہو گیا ہے۔ ہم کسی افسانے کی تعریف بھی کرنا چاہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولف کو اچھا افسانہ لکھنے کی داد دیں یا اچھا ترجمہ کرنے کی۔ ادبیات میں مصنف اور مترجم کا مرتبہ ایک نہیں ہو سکتا۔ اور وقت آگیا ہے کہ ہمارے اہل قلم ان دونوں میں جو فرق ہے اسے محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ مولف نے یہ بھی اقرار کیا ہے کہ انھوں نے اصل افسانوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے میں بہت کچھ بدل دیا ہے۔ مولف کے حق میں ہم اس سے بہتر دعا نہیں کر سکتے کہ انھیں بھی اپنے طبعزاد افسانوں کے لیے ویسے ہی مترجم ملیں۔

دوسری بات جو اس کتاب میں کھٹکتی ہے وہ "دفتر کفش دوز" کی عریاں نگاری ہے۔ اگر مولف نے اپنے نام سے یہ کتاب شائع کی ہوتی تو یہ بات چنداں قابل گرفت نہ ہوتی، لیکن ایک عورت کی زبان سے (خواہ وہ مولف کے تخیل کی موجد ہی کیوں نہ ہو) اس "خفیف اختلاف" کا بیان جو صنف نازک کو صنف کرخت سے جدا کرتا ہے، عضویات کی بحث میں موزوں ہو تو ہو ادبیات میں قطعی بے محل ہے۔ شاید مولف کی نگاہ اس پہلو پر بالکل نہیں پڑی کہ یہ وہی بات ہے جسے ہزی فروش اپنی زبان میں "پھونک کر بیچنا" کہتے ہیں۔ ذوق سلیم جمالی نقطۂ نظر سے اسے پسند نہیں کر سکتا، اور کچھ تعجب نہیں کہ مسز چودھری نے اپنی تقریر میں اس افسانے کو خاص طور پر قابل اعتراض قرار دیا تھا۔

---

[1] انشا کا شعر ہے — دل کو دکو کر دامن دکان تر بیچیے + یعنی اپنا مال ہے اس کو پھونک کر بیچیے۔

[2] اردو کی حمایت میں لکھنؤ کی عورتوں نے ابھی حال میں ایک جلسہ کیا تھا۔ صدر مجلس استقبالیہ مسز چودھری تھیں۔

سحر بنگال میں ایک افسانہ "بنگال ادب اور ایک گمنام شاعرہ" کے نام سے بھی ہے۔ مولف کو اس کے افسانہ ہونے سے انکار ہے، اور اس انکار کے جواز کی انھیں بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک بار اس انکار کے بعد ان سے بجا توقع تھی کہ وہ آخر تک اس پر قائم رہیں گے، اور کوئی لفظ ان کی زبان سے ایسا نہیں نکلے گا جس سے سربالا دیوی کے وجود میں شک پیدا ہو جائے، لیکن مولف نے یہ لکھ کر کہ سربالا دیوی کے والد کو کلکتہ یونیورسٹی نے ڈی او ایل کی اعزازی ڈگری دی تھی، اپنی بنائی ہوئی عمارت خود مسمار کر دی ہے۔ ڈی او ایل کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے ملتی ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے نہیں ہے تو ذرا سی غلطی، لیکن اس کا اثر بڑا ہے۔

سحر بنگال کے دیباچے میں دو رائیں بھی نقل کی گئی ہیں، 'خواب رنگیں' کے متعلق ایک ذمہ دار رسالے کے مرتب جو خود بھی ترجمے کا کافی تجربہ رکھتے ہیں، فرماتے ہیں "اگر آج موپاساں زندہ ہوتا تو یہ فیصلہ ذکر سکتا کہ ترجمہ کون سا ہے اور اصل کون سا" موپاساں تو آج زندہ نہیں، لیکن اس کے افسانے زندہ ہیں، پیرے ژاں کا دیباچہ بھی موجود ہے، جس میں زبان اور اسلوب بیان کے متعلق موپاساں نے اپنے خاص مسلک کی توضیح کی ہے۔ 'خواب رنگین' کی رنگین بیانی کی ایک خاص نقطۂ نظر سے تعریف کی جا سکتی ہے، لیکن ہمیں بہت شبہ ہے کہ اگر موپاساں اردو سے واقف ہوتا تو اسے اپنے نام سے منسوب کرنے کی اجازت دیتا۔ 'ہم جلیس' کی ترکیب موپاساں کی زبان پر نہیں ہو سکتی، اور روزمرہ اردو کے خلاف موپاساں 'سفینے' کو کشتی پر ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔ ہم اس سے بے خبر نہیں کہ میرزا غالب نے سفینے کو کشتی کے معنی میں استعمال کیا ہے، لیکن سوال موپاساں کی زبان کا ہے، میرزا غالب کی زبان کا نہیں۔

دوسری رائے 'سکون کی جستجو' کے متعلق ایک بزرگ کی ہے، جو اردو کے مشہور انشا پرداز اور ایک رسالے کے "رئیس التحریر" ہیں، آپ کا خیال ہے کہ اس افسانے میں "نفیس اعلیٰ پیرایہ میں تجزیۂ نفسی (سائیکو اینل سس) کیا ہے، ادب اردو میں اس کی مثال ملنی محال ہے" ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ افسانہ اچھا ہے، اور اگر طبع زاد ہے تو اس کی تصنیف سے مولف کے بہت سے ادبی گناہوں کا کفارہ ہو گیا ہے، لیکن اس افسانے کو قابل تعریف کہنا اور بات ہے اور اس کو تجزیۂ نفسی (سائیکو اینلسز) کے نمونے کے طور پر پیش کرنا اور بات ہے۔ اگر سائیکو اینل سس یہی ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تحصیل کے لیے ویانا اور زیورچ جانا بے سود ہے، اور پھر لکھنؤ ہے ہی کس قدر قریب۔ سائیکو اینل سز کے متعلق فرائڈ، ایڈلر اور ینگ نے جو کچھ سکھایا ہے اسے حرف غلط کی طرح صفحۂ خاطر سے محو کیجیے اور اس بے مثال بزرگ کے آگے زانوئے ادب تہ کیجیے، جس کے دماغ کی ہمہ گیری کے سامنے عمرو عیار کی زنبیل بھی بے حقیقت ہے۔

ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۶ء، مرتبہ جناب انجم، تقطیع [illegible]، ص ۳۳۲، تصاویر ۲۲، قیمت [illegible]

کچھ عرصہ ہوا کہ بہار کی آب و ہوا اُردو کے رسالوں کے لیے ساز گار نہیں۔ ندیم نے اُردو کی کوئی اور خدمت بھی ہوتی جب بھی اس کے لیے یہ تو کچھ کم نہ تھا کہ اس کے کارکنوں کے حوصلے اور استقلال نے اس ہمت شکن قول کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ یہ معلوم کر کے بھی ہمیں بڑی مسرت ہوئی ہے کہ یہ رسالہ صرف اہل قلم کی ایک جماعت کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے اپنی مالی بنیاد بھی مضبوط کر لی ہے۔ اس صوبے کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم جناب انجم کو مبارک باد دیتے ہیں۔

ندیم چند سال سے، سال میں غیر معمولی ضخامت کا ایک پرچہ بہار نمبر کے نام سے نکالا کرتا ہے، اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کل مضامین بہاری اہل قلم کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ قید بقول جناب انجمؔ صرف اس غرض سے لگائی گئی کہ اپنے صوبہ کے اہل قلم حضرات کو کسی طرح عمل میدان میں کھینچ کر لایا جائے اور اُردو ادب کی خدمت پر آمادہ کیا جائے، بہاری تعصب کو اس میں کچھ دخل نہیں" ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جناب انجم کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

زیرِ نظر نمبر میں ہمارے امتیاز سید سلیمان صاحب ندوی کے مضمون "نوجوانانِ بہار اور خدمتِ ادب" کو دی گئی ہے۔ سید صاحب کو اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے مخاطب اس مضمون سے بُرا نہ مان جائیں، برخلاف اس کے، ہماری رائے ہے کہ سید صاحب کی ہر دلعزیزی میں اس مضمون کی اشاعت سے معتدبہ اضافہ ہو جانے کی توقع ہے۔

سید ریاست علی صاحب کا مضمون "سید غلام حسین مصنف سیر المتاخرین" اور سید ابو ظفر صاحب ندوی کا مضمون "شتاب رائے" قدر کے قابل ہیں۔ یہ دونوں مضمون زیادہ تر سیر المتاخرین سے ماخوذ ہیں، لیکن سیر ایک ضخیم کتاب ہے، اور ان دونوں کے حالات اس کتاب میں کسی ایک مقام پر نہیں ملتے بلکہ منتشر ہیں، ان کو تلاش کر کے نکالنا، اُردو میں ترجمہ کر کے ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کرنا بھی محنت کا کام تھا

پہلے مضمون میں تین نقص ہیں، ایک تو یہ کہ تکمیل سیر کے بعد مصنف پر کیا گزری، اور کب تک وہ زندہ رہا، اس کے متعلق مضمون نگار نے کچھ نہیں لکھا، اس کے لیے ہم انھیں الزام نہیں دے سکتے، کیونکہ ایک آدھ مورخ یا تذکرہ نگار کے سوا کسی نے اس کا حال نہیں لکھا، دوسرے یہ کہ اخلاف غلام حسین کا حال بہت ہی تشنہ ہے اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے، تیسرے یہ کہ غلام حسین کی ادبی زندگی کا بیان بالکل ناکافی ہے۔ غلام حسین کا تخلص وفا تھا اور اس کا دیوان فارسی اور مثنوی اب تک موجود ہیں، اور راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

دوسرے مضمون کے متعلق ہمارے اعتراضات زیادہ سنگین ہیں، ایک تو یہ شتاب رائے کے متعلق کچھ لکھنا اور مہاراجہ کلیان سنگھ کی کتاب خلاصۃ التواریخ کی طرف رجوع نہ کرنا ویسا ہی ہے جیسے غلام حسین کے حالات لکھنا اور سیر سے منہ موڑنا۔

دوسرے یہ کہ اگر ادبیات اردو کی تاریخ کے مطالعے کا انھیں موقع نہیں ملا تھا، تو جب شتاب رائے کی ادبی تاریخ کی طرف توجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی ان کا مختصر سا بیان اغلاط سے بھرا ہوا ہے۔

ا۔ اشتاب رائے کا ادبی ذوق بہت بلند تھا۔ اور خود بھی شاعر تھا،، ۲۔ حزیں۔ نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ ۳۔عظیم آباد میں۔۔ شعر و سخن کا خوب چرچا تھا۔ اور یہ تمام ذوق ادب راجہ رام نرائن اور مہاراجہ شتاب رائے کا پیدا کردہ تھا۔ ۴۔ راجہ شتاب رائے بھی علم و ادب کا شیفتہ تھا، دہلی اور دوسرے مقامات سے شعرا اور ادبا آتے تھے اور گوہر مرادلے کر مالا مال واپس جاتے۔ اور اس طرح اکناف ہند میں پٹنے کا نام روز روشن کی طرح مشہور ہوگیا،، ۵۔ فغاں احمد شاہ کے سوتیلے بھائی تھے۔ ۶۔ راجہ شتاب رائے کے صاحبزادے راجہ بہادر، راجہ تخلص کرتے تھے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے۔ شتاب رائے کے شاعر اور ادب نواز ہونے کا ذکر کسی تذکرے اور تاریخ میں نہیں، اور نہ محض شاعر کی حیثیت سے کسی شخص کے انعام پانے لوگوں کا ان کی قدردانیوں کا حال سُنکر پٹنے کی طرف کھنچنے کا کہیں ذکر ہے۔ لے دے کر ایک فغاں ان کے یہاں ملازم تھے اور وہ بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ مصاحب کی حیثیت سے ورنہ دربار دہلی سے شتاب رائے انھیں ظریف الملک مصاحب الدولہ کے خطاب نہ دلواتے۔ (تیسرا خطاب بھی اسی قسم کا ہے، اس وقت یاد نہیں آتا) فغاں احمد شاہ کے سوتیلے بھائی بھی نہیں بلکہ کوکہ تھے۔ سعادت جنگ نامی کوئی رئیس پٹنے میں نہ تھا، اور نہ حزیں اس نام کے کسی رئیس کے ملازم تھے۔ حزیں کو صولت جنگ سے تعلق تھا اور وہ کسی طرح بھی عظیم آباد کے رئیس نہیں کہے جا سکتے۔ حزیں کا انتقال بھی شتاب کے بہار آنے سے پہلے ہی ہوچکا تھا، راجہ رام نرائن کے یہاں اگر کوئی اردو گو شاعر ملازم تھا تو اس کا نام رائج الوقت تذکروں میں نہیں ملتا۔ اس کے تین شعر البتہ اردو کے تذکروں میں ملتے ہیں، اس بنیاد پر جتنی بڑی عمارت جی چاہے کھڑی کر لیجیے۔ شتاب رائے کے تین بیٹے شاعر تھے ایک کا تخلص عاشق، دوسرے کا مجبور، اور تیسرے کا گریاں۔ راجہ کسی کا تخلص نہ تھا۔

رسالے کی جان سید وصی احمد بلگرامی صاحب کا مضمون ''مِس شِش مَں'' ہے جو رسالے کے ۲۰ صفحات پر آیا ہے۔ اس سے قبل ہمیں بلگرامی صاحب کے کسی مضمون کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن ہم ان کے ایک ہی مضمون کو دیکھ کر، اپنی ذمہ داری کے کامل احساس کے ساتھ، یہ کہہ سکتے ہیں، کہ وہ صرف نثر نگار نہیں بلکہ انشاپرداز بھی ہیں۔ لیکن ان کی انشا میں تشبیہ استعارات اور دوسرے صنائع کا بہت خرچ ہے، اور یہ طرز تحریر ایسا ہے کہ اگر کافی احتیاط نہ کی جائے تو حقیقت سے انحراف بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ضرورت سے زیادہ لفاظی ممکن ہے کہ ابوالفضل کے عہد میں پسند کی جاتی ہو، آج کل تو دو شرویثر کے اس قول پر عمل ہے کہ اپنی تحریر کو زوائد سے بری کرو۔ طرز تحریر سے قطع نظر کرکے ان کے مضمون پر یہ اعتراض بھی وارد ہو سکتا ہے کہ مضمون میں بہت سی بیکار اور خارج از بحث باتیں درج کر دی ہیں۔ داستان گوئی کے سلسلے میں حضرت شفق کے قطعے کی کیا ضرورت تھی، اور اس مضمون میں جو سلطان شاہ صفی کے متعلق ہے حضرت محمد کے

انکسار کے ثبوت میں ان کا خط نقل کرنے کا کون سا محل تھا؟ تاہم یہ ان کی انشا پردازی کا کمال ہے کہ باوجود ان غیر ضروری باتوں کے داخل کر دینے کے ان کے مضمون کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں جو دلچسپی سے نہ پڑھا جا سکے۔ وہ بجلی بسریہ داستان کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اشخاص افسانہ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ دعویٰ ان کا دعویٰ کہ شاد مرحوم نے صفیر مرحوم سے اصلاح لی تھی، اس میں اگرچہ کچھ بولنے کی گنجائش نہیں، یہی ہو تو شاد مرحوم کے اس اعتراف کے بعد کہ صفیر استاد من بود کچھ کہنا مری شست گواہ چست والا معاملہ ہے۔ وسیم کے ندیم میں حق گوئی اس اعتراف کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم کرنا چاہا ہے کہ یہ اعتراف اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ بظاہر حق گو صاحب کے اخلاقی معیار سے ہمارا معیار جدا ہے۔ وہ ایک ہی فعل انھیں اخلاقی کمزوری کا نتیجہ اور ہمیں اخلاقی جرأت کا نتیجہ نظر آتا۔ جناب مثال کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاد کے خط کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں لفظ استادی الحاقی ہے۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ کہ سلطان مرحوم مرقع فیض کے مصنف ہونے سے حکر کے ثبوت کا محتاج ہے، ظریفانہ مضامین بیاض آپ تو ذاتیت شاعری، لطف سے خالی نہیں۔ لیکن مال پوری صاحب نے ذات کی بعض کے بعض منظر ایسے بھی دکھا دیے ہیں، جن پر پردہ ہی ڈالنا بہتر تھا۔

مثنوی مادر ہند معنفہ خان بہادر میر علی محمد صاحب شاد مرحوم، مرتبہ ظہیر احمد صاحب مجروح عظیم آبادی ... تقطیع ... قیمت ۱۲ / روپے کا پتا: شاد بک ڈپو، چوکھنڈا، پٹنہ سیٹی

شاد عظیم آباد کے مایۂ ناز شاعر تھے، ان کی وفات کے بعد ان کی تصانیف کی اشاعت کی غرض سے ایک مجلس قائم ہوئی تھی، جس میں بڑے ذی اثر اور با اقتدار اصحاب شریک تھے، لیکن اس مجلس کا عدم وجود برابر ثابت ہوا، چند تجویزیں منظور کرنے کے سوا اس نے کچھ نہ کیا۔ اب ان کے تلامذہ ان کی تصانیف کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، چنانچہ مثنوی مادر ہند جناب حمید عظیم آبادی کی تمہید، جناب رشید احمد صدیقی صاحب اور سیماب صاحب اکبرآبادی کے مقدموں کے ساتھ ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، یہ مثنوی ملکۂ وکٹوریا کی پہلی جوبلی کے موقع پر لکھی گئی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان کا زمانۂ حال میں مقبول ہونا ذرا مشکل ہے۔

صدیقی صاحب اور سیماب صاحب کے بعض بیانات محل نظر ہیں۔ مثنویوں کی اتنی طویل فہرست کی چنداں ضرورت نہ تھی، اور اگر اس کی ضرورت سمجھی گئی تھی، تو اس کو صحیح اور مکمل بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ دکنی زبان کی بیسیوں اہم مثنویوں کا سیماب صاحب نے ذکر ہی نہیں کیا۔ مصحفی نے بیس کے قریب مثنویاں لکھی ہیں، سیماب صاحب کو صرف ایک کا علم ہے۔ حسن کی مثنوی کا نام گل ارم نہیں، گلزار ارم ہے۔ دریائے لطافت مصنفہ انشا کو مثنوی سمجھنا حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ سیماب صاحب نے قطب شاہ کو اردو کی پہلی مثنوی کا مصنف اور نصرتی کو دوسری مثنوی کا مصنف قرار

دیا ہے۔ قطب شاہی خاندان میں اس لقب کے بہت سے بادشاہ ہوئے ہیں۔ سلطان قلی قطب شاہ، ابراہیم قلی قطب شاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ وغیرہ۔ محمد قلی قطب شاہ نے ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک حکومت کی اور اسی کے نام سے بعض حضرات نے اُردو کی پہلی مثنوی کو منسوب کیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا تخلص دکنی زبان میں معانی تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ۱۰۱۸ھ تک صرف قلی قطب شاہ کی مثنوی ہی تھی۔ اسی سال وجہی نے مثنوی قطب مشتری لکھی۔ اس کے بعد متعدد شعرا نے بیسیوں مثنویاں لکھیں۔ غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال ۱۰۳۵ھ میں لکھی گئی۔ غواصی کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" کا سن تصنیف ۱۰۴۹ھ ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ "یورپ میں دکنی مخطوطات" مرتبہ نصیر الدین ہاشمی)۔ صدیقی صاحب "خاور نامہ" کو اُردو کی دوسری مثنوی قرار دیتے ہیں حالانکہ ۱۰۵۹ھ کے پہلے کی متعدد مثنویاں موجود ہیں۔

مثنوی مادر ہند کا مختصر قصہ یہ ہے کہ مادر ہند کے دو بیٹے رام اور رحیم تھے، ان میں اتفاقاً پھوٹ ہو گئی ہندوستان میں غیر ممالک کے بعض تجار آئے اور مادر ہند کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ رام اور رحیم کے پردے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نااتفاقی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ غیر ملکی تجار انگریز ہیں، جنھوں نے آخر کار ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ اور اسے بڑی ترقی دی۔ ذیل میں مثنوی سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں :-

ساقی نامہ:
ساقی قدح شراب لا جلد — اک آگ لگی ہے سے پلا جلد
جلتا ہے جگر جو اس بیاں پر — شعلہ ہے سخن مری زباں پر
اُٹھتا ہے دھواں جو اپنے سر سے — اوجھل ہے جہاں مری نظر سے

مادر ہند کا بیٹوں کو سمجھانا:
وہ چارہ گر شکستہ حالاں — وہ بانوئے دل فگار و نالاں
سوچی کہ رہوں خموش اگر میں — کھو بیٹھوں گی آپ اپنا گھر میں
دونوں بیٹوں کو تب بلایا — شفقت سے بل گلے لگایا
الفت سے ہر ایک پر نظر کی — کس جوش سے لیں بلائیں سر کی
پھر گرم سخن ہوئی وہ اس طرح — ہے ہے مجھے نیند آئے کس طرح
سنتی ہوں کہ بھائیوں میں ہے سو — پھیلا ہوا ہے یہ خبر ہے ہر سو
کم بخت نفاق رنگ لایا — آخر کو یہ دن تمھیں دکھایا
اس پر بھی نہ تم کو ہوش آیا — آپس میں لڑے یہ جوش آیا

خطاب بہ ساقی:
ساقی ہے فلک کا انقلاب اب — چکر میں ہے عقل دے شراب اب
اک جام میں مجھ کو بے خبر کر — نے ذ حال کے قصہ مختصر کر

بے مدد زوال ہے یہی مے — مشرب میں حلال ہے یہی مے
پھر ہوش و حواس سے جو بہکوں — بلبل کی طرح سے خوب چہکوں

مثنوی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔

افکار عصریہ مصنفہ چارلس آر گبسن۔ مترجمہ محمد نصیر احمد عثمانی۔ سلسلہ دار المصنفین اعظم گڈھ نسخہ ص ۲۵۰، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ قیمت درج نہیں ہے۔

اس کتاب میں جدید سائنس کے بعض انکشافات کو عام فہم پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ابتدا میں جوہروں (ایٹم) اور برق اور مقناطیسیت کی حقیقت سے بحث ہے پھر نور کی ماہیت اور اس کے مختلف نظریوں کا بیان ہے۔ تیرھویں باب میں رنگ کی اصلیت سے بحث ہے۔ اس کے بعد طیف (اسپکٹرم)، ستاروں کی پیدائش، زمین کی عمر، ریڈیم، تجاذب (گراویٹیشن) اور مثبت شعاعوں (پوزیٹو ریز) کے متعلق مختصر مقالے ہیں۔ مصنف نے مندرجہ بالا موضوعات پر محض عام فہم پیرایے میں اظہار خیال کیا ہے کتاب کا علمی پایہ بلند نہیں ہے۔ سائنس کے جدید ترین انکشافات سے بحث نہیں کی گئی ہے نظریۂ اضافیت، نظریۂ وقائق، کوانٹم تھیوری، ویو میکانکس وغیرہ کے متعلق سرسری ذکر بھی نہیں ہے۔ اس کی دریافت، لاسلکی مراسلت، اور ٹیلی ویژن کا ذکر بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف خود کوئی بلند پایہ مفکر یا سائنس کا ماہر نہیں ہے۔ اس کتاب کو لکھے ہوئے بھی عرصہ گزرا۔ سائنس کی ترقی اتنی سرعت سے ہو رہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے متعلق اگر کوئی کتاب آج لکھی جائے تو وہ کل پرانی ہو جائے۔

اس کتاب کا ترجمہ اردو جاننے والوں کے لیے بہرحال مفید ہوگا۔ کیونکہ سائنس کے مشکل مسائل کو سمجھنے کے قبل بنیادی مسائل کی واقفیت ضروری ہے۔ عامۃ الناس کے لیے بلند پایہ علمی کتابوں کی نہیں بلکہ عام فہم کتابوں کی ضرورت ہے۔ "افکار عصریہ" میں ان کے لیے معلومات کا کافی ذخیرہ ہے، ترجمہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔ بعض اصطلاحات بہت اچھی ہیں مثلاً "زیمین ایفکٹ" کے لیے "زیمین مظہر"، "میڈیم" کے لیے "واسطہ"، "ایٹم" کے لیے "جوہر"۔ لیکن بعض اصطلاحات سے غلط معنی پیدا ہوتے ہیں۔ "اورا" کا ترجمہ "شفق" نہیں ہو سکتا۔ بیٹری کو "نورہ" کہنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ "فیلڈ" کا ترجمہ "میدان" مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جنوری ۱۹۳۵ء کے ادبی دنیا میں جناب آرزو جلیلی کا ایک مضمون بعنوان "مصطلحات علمیہ" شائع ہوا تھا صاحب مضمون نے فیلڈ کا ترجمہ "فضا" کیا تھا۔ "الیکٹرک فیلڈ" کے لیے "برقی فضا" زیادہ مناسب اصطلاح ہوگی۔ اس کی توجیہ مضمون نگار نے اس طرح کی تھی کہ "الیکٹرک فیلڈ" اس حلقے کو کہتے ہیں جہاں تک برقی طاقت کا اثر محسوس ہو۔ بیٹری کا ترجمہ انھوں نے "بیٹری" ہی کیا ہے۔ کیونکہ

ایلکٹرک بیٹری کو مورچہ نہیں کہتے۔ فوائی کا مورچہ جس کو انگریزی کی فوجی اصطلاح میں بیٹری کہتے ہیں، برقی بیٹری سے کچھ تعلق نہیں رکھتا! اگرچہ سائنس کی اصطلاحات وضع کرنا مشکل کام ہے اور غلطیوں کا ہونا لازمی ہے، لیکن مترجم کو ایسی فاش غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ "بیٹری" کو مورچہ اور "فیلڈ" کو میدان کتنا فاحش غلطیاں ہیں۔ مجھے ایک اصطلاح بہت پسند آئی۔ صفحہ ۱۵۸ کی تیسری سطر میں مترجم نے "ایلکٹرومیگنیٹک فیلڈ" کا ترجمہ "برقاطیسی میدان" کیا ہے۔ برقاطیسی، "برقی مقناطیسی" کی مخفف شکل ہے۔ یہ نہایت ہی موزوں اور آسان لفظ ہے۔ صرف لفظ "میدان" قابل اعتراض ہے۔ "برقاطیسی فضا" بہتر اصطلاح ہوگی۔

جش اطالیہ :- مرتبہ اختر حسین صاحب رائپوری سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو س ۱۹۲ قیمت عہ

ماضی سے بے تعلقی اگر سطحیت کی دلیل ہے تو حال سے بے پروائی مردہ دلی کی علامت ہے، انجمن ترقی اردو کا ایک رُخ اگر ماضی کی طرف ہے تو دوسرا مستقبل کی طرف، اور یہی وجہ ہے کہ قدیم تذکروں اور دواوین کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ اور حالات حاضرہ سے متعلق کتابیں بھی وہ شائع کیا کرتی ہے، اردو کے تبصرہ نگار کا قول ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان میں حبش کے متعلق ایسی پر از معلومات کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ اور زبانوں کا حال تو ہمیں معلوم نہیں لیکن ہندوستانی زبان میں حبش و اطالیہ کی اشاعت سے قبل، اصغر صاحب کے ایک مختصر سے رسالے کے سوا جو انھوں نے کئی سال ہوئے بچوں کے لیے لکھا تھا، کچھ موجود نہ تھا۔ اس کتاب کے مرتب' اردو کے ہونہار مضمون نگار اختر حسین صاحب ہیں، لیکن اس کے مختلف ابواب مختلف اشخاص سے لکھوائے گئے ہیں' حبش اور عرب' ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے، اس باب میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ انگریزی کتابوں میں بھی نہیں مل سکتیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ خیال کہ ابرہہ کا ہاتھی محمود نامی در اصل میتھ تھا اور محمود میتھ کی خرابی ہے، مزید تحقیق کا محتاج ہے۔ بقیہ ابواب کے عنوانات حسب ذیل ہیں، اس فہرست سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، جغرافیہ، تاریخ، معاشرت، حبش کا دور حاضر، حبش اور اطالیہ، لیگ استعمار اور حبش، مستقبل۔ ضمیمے میں واردات جنگ اور مجلس اقوام کے میثاق کی چند دفعات درج ہیں کتاب میں متعدد تصاویر اور حبش کا نقشہ شامل ہے۔ نقشے میں بہت کم مقامات کے نام ہیں۔ طبع ثانی کی نوبت آئے تو اس کی طرف توجہ مناسب ہے۔ اختر حسین صاحب کی تحریر میں کہیں کہیں مبالغہ کا رنگ آ گیا ہے، کیا انھیں اپنے ناظرین کی سمجھ پر اتنا بھروسا نہیں کہ صرف واقعات کے پیش کرنے پر قناعت کر سکیں؟

نکات الشعرا

مصنفہ میر تقی میر، مرتبہ عبدالحق صاحب، سلسلہ انجمن ترقی اردو، طبع ثانی
ص ۱۲ + ۱۰۰، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد عہ

میر کا دعویٰ ہے کہ نکات الشعراء سے قبل شعرائے ہندوستان کے حالات میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا لیکن یہی دعویٰ قائم کا بھی اپنے تذکرے کے متعلق ہے۔ اور گلشن گفتار تو مسلم ہے کہ زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے نکات الشعراء سے مؤخر نہیں ہے۔ دعوائے اولیت سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو یہ قبول کرنے میں ذرا تامل نہیں ہو سکتا ہے کہ نکات الشعراء شعرائے اردو کے قدیم ترین اور اہم ترین تذکروں میں ہے ... . قدیم تذکرہ نگاروں میں سے اکثر نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا چنانچہ قائم، گردیزی، شیفتہ، مصحفی، خلیل، عشقی، کمال کے تذکروں سے اس کے استفادے کا پتا چلتا ہے۔ قائم نے بھی میر کا حوالہ دیا ہے لیکن نکات الشعراء کے معلوم نسخوں میں وہ الفاظ نہیں ملتے جو قائم نے میر کی طرف منسوب کیے ہیں اس لیے یہ امر مشکوک ہے کہ نکات اس کی نظر سے گزرا بھی تھا یا نہیں۔ ایک امکان یہ ہے کہ قائم نے وہ مسودہ دیکھا ہو جو میر نے ابتدا میں لکھا ہو۔ بعد کے نسخوں میں ان الفاظ کے نہ پائے جانے کی وجہ یہ ہو کہ میر نے اپنے معاصرین کے اعتراضات سے تنگ آ کر انہیں نکال دیا ہو۔ بہرحال اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میر حسن کا اس تذکرے سے استفادہ مسلم ہے۔ تذکرے سے اس کا بکثرت ثبوت ملتا ہے لیکن یقین کے ترجمے میں میر صاحب کے حوالے سے حسن نے جو کچھ لکھا ہے وہ نکات کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملتا۔ حسن نے سہواً ناجی کی جگہ سودا و سوز لکھ دیا ہے یا کسی نسخے میں جو حسن کے پیش نظر تھا یہی الفاظ تھے؟ اس کا حل موجودہ مواد کی وجہ سے نہیں ہو سکتا۔[1] نکات الشعراء قدما میں جس قدر مقبول رہا اسی قدر متوسطین و معاصرین نے اس سے بے اعتنائی کی۔ چنانچہ اب سے بیس پچیس سال قبل تک شعرائے اردو کے جو مطبوعہ تذکرے عام طور پر دستیاب ہوتے تھے ان کے مصنفین باستثنائے صغیر (صغیر کا تذکرہ زیادہ مقبول نہیں ہوا) نکات سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ آزاد نے اس کا حوالہ دیا ہے لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ان کو اس کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ شبلی نعمانی: انجمن ترقی اردو میں اس کی اہمیت کا اندازہ کر کے اسے شائع کرنا چاہتے تھے لیکن اسے کنج گمنامی سے منظر عام پر لانے کی سعادت عبدالحق صاحب کی قسمت میں تھی۔ انہیں کے ہاتھ تذکرہ پہلی بار انجمن ترقی اردو کی طرف سے آج سے کم و بیش ۳۰ برس قبل شائع ہوا لیکن شاید اس وجہ سے کہ متن کی درستی کے لیے ایک سے زیادہ نسخہ ہاتھ نہ آیا۔ اور کاپیوں کی تصحیح کارکنان مطبع کے سپرد کر دی گئی مطبوعہ نسخے میں بہت غلطیاں رہ گئی تھیں کہ بجائے انجمن کے نول کشور کا چھاپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب انجمن نے اسے دوسری بار شائع کیا ہے۔ اور متن کی تصحیح ایک ایسے نسخے سے کی ہے جو میر کے معاصر اور شناسا عبدالولی عزلت نے تکمیل کتاب کے کچھ ہی بعد ۱۱۶۵ھ میں اپنے ہاتھ سے لکھوایا تھا۔ طبع اول اور طبع ثانی میں جو فرق ہے اس کا مفصل ذکر کرنے سے قبل مجملاً ہم اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ طبع ثانی سے انجمن نے اپنی سابق سہل انگاری کی بہت اچھی طرح تلافی کر دی ہے۔ اور یہ نسخہ ان لوگوں کے پاس بھی رہنا چاہیے جن کے پاس طبع اول موجود ہے۔

---

[1] ممکن ہے کہ حسن تکملے سے واقف ہوں۔

(۱) طبع ثانی سے وہ مقدمہ جو مرتب سابق نے لکھا تھا، نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ عبدالحق صاحب کے مقدمے نے لی ہے یہ نسبتہً مختصر ہے، لیکن کل ضروری باتیں اس میں آگئی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ رومانیت سے قطعی معرا ہے جو اس عہد کے مقدمہ نگاروں پر بلائی طرح مسلط ہے۔ تاہم کچھ باتیں ایسی درج ہو گئی ہیں جن میں اختلاف کی گنجایش ہے۔ سید امام الدین خاں کے تذکرہ شعرا کا نام جس کتاب میں سب سے پہلے پایا جاتا ہے وہ تذکرۂ حسن ہے، بعد کے مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حسن ہی سے ماخوذ ہے، گو اس کا حوالہ ہو یا نہ ہو، حسن کی عبارت یہ ہے " سید امام الدین خاں ولد سید معین الدین خاں سرجوکی والاشاہی بود در وقت محمد شاہ ..... او ہم تذکرۂ معاصرین خود نوشتہ بہت احوالش معلوم نیست " ص ۲، ۱ و ۲، ۱ اول تو یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ محمد شاہی عہد میں سرجوکی والا شاہی، امام الدین تھے یا معین الدین، (ہماری رائے میں حسن کی مراد معین الدین سے ہے) دوسرے یہ کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امام الدین عہد محمد شاہ میں اس عہدے پر فائز تھے تو اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکل سکتا ہے کہ تذکرہ بھی عہد محمد شاہی میں لکھا گیا، اور اس بنا پر نکات الشعرا سے متقدم ہے؟ فاضل مرتب نے میر صاحب کی سیرت کے متعلق بھی جو کچھ کہا ہے، اس سے اتفاق مشکل ہے، میر صاحب کی رائے پر ذاتی تعلقات کا بہت اثر پڑتا تھا، اور وہ تمام شعرا جو ان پر اعتراض کرتے تھے، یا ان کے اتنے مداح نہ تھے جتنا وہ چاہتے تھے، ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ میر صاحب کے لیے ناممکن تھا۔ ان کے اعتراضات بے باکانہ ہوں، لیکن ہم انہیں بغیر دوسروں کے ساتھ ناانصافی کیے ہوئے منصفانہ نہیں کہہ سکتے ان کی نکتہ چینیاں جائز حدود سے عموماً تجاوز کر جاتی ہیں، اور نکات الشعرا کے تذکرے میں قطعی بے محل ہیں، مفصل بحث کا یہ موقع نہیں، اس لیے ہم صرف فاضل مرتب کی توجہ تراجم حشمت، قائم، حاتم و قدرت و خاکسار و یقین کی طرف مبذول کرانے پر قناعت کریں گے۔ میر صاحب کی بے باکی بھی مصلحت اندیشی سے خالی نہیں ہوتی۔ میر صاحب کی تحقیقی رائے آرزو کے متعلق ذکر میر سے ظاہر ہوتی ہے، میر صاحب آرزو سے اس قدر خفا ہیں کہ ان کی موت کا ذکر بھی کامل اطمینان بلکہ بی البلا اظہار مسرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ تذکرے میں صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کے تمام شعرائے معاصر سے انہیں افضل قرار دیتے ہیں بلکہ اس زمانے کے ایرانی شعرا پر بھی ترجیح دینے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں یہاں تک بھی مضائقہ نہیں میر صاحب ممکن ہے کہ آرزو کے کمالات کے اسی حد تک معترف ہوں، لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ نکوت کے ترجمے میں جہاں ضمناً آرزو کا نام آجاتا ہے، اور جہاں اظہار عقیدت کی چنداں ضرورت نہیں انہیں استاد و پیر و مرشد بندہ لکھتے ہیں۔ یہ حیا کی نہیں کچھ اور چیز ہے، لیکن ادب یہ بتانے سے مانع ہے کہ کیا ہے۔

(۲) طبع ثانی میں کسی ایسے شاعر کا ترجمہ نہیں ملتا جو طبع اول میں نہ ہو، لیکن مضمون حاتم، یکرنگ، سجاد، کلیم، عزلت، کے زاید اشعار ملتے ہیں۔ ان شعرا کے دواوین یا ناپید ہیں یا کمیاب اس لیے طبع ثانی کی یہ خصوصیت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

(۳) طبع اول میں جا بجا سے الفاظ چھوٹ گئے تھے، اور غلطیاں بھی بہت رہ گئی تھیں طبع ثانی میں یہ نقائص بڑی حد تک دور کر دیے گئے ہیں، گو بعض مقامات اب بھی مشکوک ہیں، اور بعض غلطیاں اب بھی موجود ہیں۔ ص ۳ حیز۔ کی جگہ حیزہ، ص۔ ۱ دوانا گیر

---

[1] ذکر میر ص ۵،

ہے مگر یہ جس سب سے بڑا کام ہوا ۔ ۳۰۰ نسخوں میں ۲۷۰ اشعار نقل کیا گیا ہے ۔ نیز اردو کے پانچ طبع اول میں کوئی جگہ کی ہے یہ امر معلوم نہ تھا کہ اس کا طبع شدہ نسخہ میں مختلف کا ذکر کر دیا تھا ۔ ص ۱۵ میں دلائی ہے کہ دیوان روزہ وہ نوشتہ میر خود حاشیہ میں ہے کو ثابت ۔ ... کی بہ نسبت زیادہ ہوا انتخابی اشعار کی تعداد بتاتا ہے ۔ میر صاحب نے ، انتخابی اشعار کی تعداد نہیں بتائی ۔ ص ۳۵ مقامات کے حاشیہ پر اشعار نقل کئے ہیں ۔ حاشیہ ۱۲ میں روزہ کی جگہ روز دست واویلا اسی قبیل کی کوئی عبارت ہوگی ۳۸ ۔ کتابت ... کر تو غزلیں ۔ قدر ہو نہ ہو ... ۲۲ شعر بخیال خود ہی واند ہی خاند ۔ ۱۶ تیری آنکھوں کے دو پلکیں (غیر موزوں) ۴۴ کیا جانے وصال تیرا ہو کے غضب ... دوسری طرح بہ اختلاف نہیں دکھایا گیا ۔ ۲۹ مطلع کا شعر صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ ۷۱ ملاں طاقت بیانش ۔ ۱۰ ان طاقت بیانش ۲۰ دست اس ... ماپ ۔ ناپ ۔ ۸۸ کیا جانتے تھے ہم ہے ل کر کے ہم سے کل ۔ گل ۹۰ وہ یہاں ... معلوم ہوتی ۔ ۱۰۰ ابیات بگلی ہی گفت ۔ زمین ۔ ۱۰۰ ... ۱۰۰ از دیدن بیگم آتش ۔ بیگم ۔ آتش ۔ ۱۰۰ خروس ... آفت ۔ اس کے علاوہ ممکن ہے اور بھی اغلاط ہوں لیکن کتاب کا لفظ لفظ پڑھنے کا وقت نہیں ملا ۔ ان اغلاط کی طرف اس نیت سے توجہ دلائی گئی ہے کہ طبع سوم میں ان کی تصحیح ہو سکے ۔ طبع ثانی کی تقسیم مقصود نہیں ... حالت میں بھی یہ شاید اس وقت تک جتنے تذکرے چھپے ہیں ان میں سب سے صحیح چھپا ہے ۔

(۴) کتاب کے حسن ظاہر کے متعلق صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ یہ کسی شایان شان ہے ۔ کاش انجمن کلیات میر کا کوئی ناقدانہ نسخہ بھی اہتمام سے شائع کراتی تو شیدائیان کلام میر پر جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے بڑا احسان ہوتا ۔

رسید کتب :-

(۱) خطبات گارساں دتاسی
(۲) دیوان تاباں
— انجمن ترقی اردو اورنگ آباد

(۳) داستان عجم
— شاد بک ڈپو

(۴) اشعار میر
(۵) اشعار مومن
— رام نرائن لعل

اقتباسات

(۱) غزل میرزا غالب ماخوذ از دیوان معروف مطبع نظامی بداؤں
(۲) میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس ماخوذ از اردو اکتوبر ۱۹۳۵ء

غزل میرزا غالب

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں

شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں

دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش ہے در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ مرا احوال جو پوچھے تو اسد
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس

احسن الاخبار بمبئی سے ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کو نکلا۔ یہ فارسی کا اخبار تھا۔ اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع محدود ہونے کے باوجود بیشتر دہلی و قلعہ معلی کی خبریں صحت کے ساتھ شائع کرتا تھا، دہلی میں اس کے نامہ نگار موجود تھے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس اخبار سے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

جلد ۴ نمبر ۲۶ مورخہ ۵ جون ۱۸۴۷ء میرزا اسد اللہ خاں بہادر کو شہر کوتوال کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے کہ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت میں زیر رو ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

جلد ۴ نمبر ۲ مطابق ۲ ماہ جولائی ۱۸۴۷ء۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا

اس کا فیصلہ سنا دیا گیا مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر وہ سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پاس بطور زیادہ وصول کیے جائیں تو شفقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل ہیں، سوا پہر کی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قید معصیت و مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج صاحب کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت نو مداری سے مقدمہ اٹھایا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کی جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، ایسے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے،

استفسارات

۱۔ ذیل کے متعلق ناظرین معیار کو اگر کچھ معلوم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ نہایت ممنون ہوں گا۔ عبدالودود

۱۔ وزیر علی عبرتی کا لکھا ہوا ایک تذکرہ کلکتے میں ہے، اس میں وجیہ الدین عشق عظیم آبادی کا بھی ترجمہ ہے۔ وفات کا جہاں پر ذکر آیا ہے سن کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ کیا دوسرے نسخوں میں سال وفات درج ہے؟

۲۔ دیوان اشرف علی خاں فغاں کے قلمی نسخے سنہ ... والا ہو، (مملوکہ پروفیسر محمد شفیع) کے علاوہ کہاں کہاں ہیں؟

۳۔ مصحفی نے ... میں مندرجہ ذیل مثنویاں لکھی ہیں کیا اس کے علاوہ بھی ان کی مثنویاں ہیں؟ کیا آخری مثنوی کا قلمی نسخہ کسی صاحب کی نظر سے گزرا ہے؟ ذیل میں مثنویوں کے نام یا ابتدائی مصرعے لکھے جاتے ہیں۔ ۱۔ بحر المحبت مطبوعہ ۲۔ گلزار شہادت مطبوعہ (رسالہ اردو) ۳۔ شعلۂ عشق مطبوعہ ۴۔ زہے آئینہ رو ہے طفل حجام۔ ۵۔ یہ جو ہم پاس چارپائی ہے ۶۔ ... کی زہے کرے افراط۔ ۷۔ کیا کروں وصف میری اجوائن۔ ۸۔ اپنے رہنے کو جو ملا ہے مکاں۔ ۹۔ یہ جو موری خانہ ہے سرکار کا۔ ۱۰۔ اب کے سردی کا جو ہوا ہے وفور۔ ۱۱۔ کیا کہوں سوزش ہوائے تموز۔ ۱۲۔ شورش ... کس قدر اس سال۔ ۱۳۔ یہ جو بکری کی بچہ ہے اپنے پاس۔ ۱۴۔ یہ جو اترا ہے چرخ سے سیدھا۔ ۱۵۔ عشق ہے جو بر محیط جہاں ۱۶۔ یہ جو قوم شیخ ہے اے دوستاں ۱۷۔ تو تا ہے جو یہ زمرد میں بال۔ ۱۸۔ توتا ہوں نے جو کہ پالا تھا۔ ۱۹۔ دل میں تھا مدت سے یہ مذکور ہو۔ ۲۰۔ ہے سزاوار ستائش وہ الٰہ۔

سنہ ۳۶ء کے ادبی مضامین :-

اُردو اورنگ آباد مرتبہ عبدالحق صاحب جنوری ۱۹۳۶ء۔ "سرسید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی" از مرتب ص ۲۳ تا ۳۵ (برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی وساطت سے سید احمد خاں نے ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ ورنیکلر سے مراد اردو تھی۔ اس کے متعلق جو مراسلات ہوئے وہ اس مضمون میں درج ہیں۔ معیار)

"بادۂ کہن، گلدستۂ رنگین" از مرتب ص ۳۶ تا ۴۴ (۱۲۰ شعر کی مثنوی سعادت یار خاں رنگین کی تصنیف ہے صنعت تجنیس میں ہے۔ شعر ابتدائی "حمد اسے کہ جو کہ ہے جاں آفریں * تاکہیں سستم کوئے جاں آفریں" شعر آخر "مثنوی گلدستۂ رنگین ہے یہ * نظم زنگار رنگ سے رنگین ہے یہ" ۲۰، ۲۵ سال قبل اردوئے معلیٰ علی گڑھ میں شائع ہوئی تھی۔ معیار) "ایک ہندی شعر لو اردو شعر پر مولانا حالی کا محاکمہ" از مرتب ص ۵۲ تا ۵۹ (حالی کا خط بھی منقول ہے۔ معیار)

"کلام جوشش عظیم آبادی" از قاضی عبدالودود صاحب ص ۹۲ تا ۹۹ (مختصر حالات اور منتخب کلام۔ مرتب تو برائے شغل توسیر مجاز بھی مگر تب تک الحذر "دو دیوانے سے کیا کم ہے جو ایسے دل کو دل جانے" کی جگہ "دو دیوانے سے کم ہوتا ہے" ہونا چاہیے۔ معیار)

نیرنگ خیال، لاہور مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب سالنامہ ۱۹۳۶ء "غدر سے پہلے کی اردو شاعری پر ہندوستانی تمدن کے زوال کا اثر" از جناب عزیز احمد صاحب بی اے ص ۱ تا ۸۔ (۱) دکنی شاعری بھی تقلیدی تھی، لیکن اس میں زندگی اور حقیقت صاف نمایاں ہے۔ تصنع کے باوجود جذبات میں سچائی اور گہرائی تھی۔ زبان وہی تھی جو عوام الناس بولتے تھے۔ ولی کی غزلیں فارسی کی نقل معلوم ہوتی ہیں اور ان کا شمار دور انحطاط کے شعرا میں ہے۔ اس کی ابتدا تقلید سے ہے اور اس کی بنیاد غلط رکھی گئی ہے۔ متقدمین شعرائے اردو کے کلام میں زندگی کا صحیح عکس کہیں نظر نہیں آتا، جذبات مصنوعی ہیں اور انفرادی جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی (۲) فارسی کی تقلید میں اردو شاعری، آزاد اور ذاتی اسالیب بیان سے محروم ہوگئی، طرح طرح کی قیود سے جذبات کی لطیف کیفیات شاعری سے محو ہوگئیں، اور ان کی جگہ خیال آرائی نے لے لی، ہندوستانی الفاظ زبان سے خارج ہوتے رہے اور فارسی الفاظ ان کی جگہ داخل ہوتے گئے۔ (اگر متقدمین سے مراد آبرو، مضمون وغیرہ ہیں تو کم از کم زبان سے ہندوستانی الفاظ کے اخراج کے متعلق مضمون نگار کا قول صحیح نہیں۔ معیار) صنائع لفظی و معنوی کو غیر ضروری اہمیت دی گئی۔ شاعری میں ان وجوہ سے جمود پیدا ہوگیا، اور بعض کے یہاں جمود متانت کے درجے سے گزر کر ابتذال کی حد تک پہنچ گیا۔ (۲) میر، سودا کے دور میں یہ نقائص بہت نمایاں ہیں۔ "یاسیت" "تصوف" "ایہام" اور جدت طرازی کی تلاش کے بجائے مضامین دوراز، ابتذال اور تصنع میں خرچ ہونے لگا۔ یہی رجحان سودا کی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ زوال و انحطاط کی فضا نے ان کی انتہا کو پہنچا ہے۔ (۳) مغلوں کی تہذیب نے لکھنؤ آکر سنبھالا لیا تھا، لیکن مرض اس قدر شدید تھا کہ مریض نے مایوس ہو کر بدپرہیزی شروع کردی۔ زندگی کی تمام ترقی صلاحیتیں سلب ہوچکی تھیں، عیش و عشرت اور رنگینی خیال کی ایک جھوٹی زندگی فروغ پانے لگی، مرغ بازی وغیرہ کی ایجاد کے ساتھ شاعری کے کھیل کو بھی فروغ ہوا۔ شرفا اور خواندہ اصحاب کے لیے ذہنی عیاشی کا اس سے بہتر کیا سامان ہوسکتا تھا

لکھنؤ کی مخصوص معاشرت کا اثر شاعری پر کس حیثیت سے پڑا۔ شاعری زندگی، جذبات اور تخیل سے معرا ہو گئی ساری توجہ انداز بیان اور لطف زبان پر صرف ہونے لگی، روح تو پہلے ہی سے تقریباً مفقود تھی اب وہ ایک بے جان سر دلاش ہو گئی، تکلف اور تصنع کا زور ہوا، زندگی میں با وجود خامیوں کے متعلق وہ جو کچھ ابتذال شامل تھا وہ شاعری میں داخل ہو گیا۔ میر درد اور ابھی لکھنؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، لیکن لکھنؤ کی اصل شاعری ناسخ اور آتش سے شروع ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے انشا مصحفی، رنگین، ریختی کی ایجاد کے متعلق اپنی رائے دی ہے۔ (معیار) ناسخ نے فن مفہوم کو طوطا مینا کی زبان پر تھے خارج کر کے زبان کا دائرہ بہت محدود کر دیا۔ آتش کو قدرت نے دلی سے لکھنؤ میں پیدا کیا تھا۔ ان کا کلام کہیں کہیں لطیف بندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ان دونوں کے جانشینوں میں متقدمین کے عیوب منتقل ہونے لیکن خوبیاں منتقل نہ ہوئیں۔ اور لکھنؤ کی شاعری پست سے پست تر ہوتی گئی۔ (۲۰) (مضمون نگار نے اسباب سے بحث کر کے دہلی کی شاعری ان عیوب سے نسبتاً کیوں محفوظ رہی مومن و غالب و شیفتہ کی تعریف کی ہے معیار) "مومن کی شاعری میں سچے احساسات اور خالص شخصی اور ذاتی جذبات پہلے تو ہیں کی حد تک نظر آتے ہیں" (۵) نظیر اکبر آبادی کی شاعری جنگل کا ایک خود رو پھول تھی، اس کے اگانے میں انسان کی آبیاری کا بہت کم دخل تھا۔ (مضمون نگار نظیر کی شاعری کے معترف نہیں معیار) (۶) "ایک فصل لکھنؤ کی شاعری کے آخری دور کے متعلق ناسخ و آتش کی شاعری ہے" (معیار) "مراثی کا طرز نگارش موضوع اس دور کی قومی ذہنیت کے لیے موزوں تھا" انیس کو طبعاً لکھنؤ کے رنگ سے مناسبت نہ تھی، گو وہ بہر حال لکھنؤ میں رہتے اور دہلی لکھنؤ سے ہو گیا۔ دبیر کے یہاں لکھنؤ کی ذہنیت کے مضر اثر زیادہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

(مضمون دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ اول کا خلاصہ تھا دوسرے کا عنوان "اردو شاعری کے موضوع اور ان پر انحطاط کا اثر" ہے۔ ذیلی عنوانات یہ ہیں عشق اور لوازمات عشق، معشوق، عاشق، رقیب، فراق و وصل، امرد پرستی۔ معیار)

شاہکار لاہور، مرتبہ جناب تاجور "**خواجہ آتش**" از مرزا یاس یگانہ چنگیزی ص ۱۹ تا ۱۱ (ایک مختصر سی تمہید کے بعد آتش کے اشعار کی تشریح کی ہے۔ معیار)

ادبی دنیا لاہور، مرتبہ منصور احمد صاحب سالنامہ ۱۹۳۵ء "تاریخ اردو کا مطالعہ" از جناب کیفی ص ۵۵ تا ۵۷ (۱) صاحب مضمون کا خیال ہے کہ دو باتوں کی اب تک کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ کہ "اردو محض ایک بولی کی صورت میں اور ادبی زبان کی صورت میں کب اور کس سے ظہور پذیر ہوئی" دوسرے یہ کہ "کس مقام اور خطے میں اردو کی ابتدا ہوئی وہاں کی دیسی زبان اردو سے بیشتر اور اس کی پیدائش کے قریب کیا تھی۔ (۲) صاحب مضمون نے محمود غزنوی کی بعد دوج "جس کی چھاؤنی غزنیں میں تھی" اور اس کے ہندو سردار سوہند رائے اور تلک کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "ان واقعات کی بنا پر اگر کوئی یہ کہے کہ اردو کی ابتدا غالباً غزنیں میں ہوئی تو اسے ناقابل غور کیوں قرار دیا جائے؟" صاحب مضمون نے لبابُ الالباب کے مشہور کا بھی ذکر کیا ہے جو محمود کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے" اور "تحقیق الفقسان" مصنفہ قرالدین لاہوری کے حوالے سے بتایا ہے کہ "مسلمانوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے بہت قبل بھی ہندو راجاؤں کے دربار میں ایک خود سی ادب ہوا کرتے تھے" جو بادشاہوں کو خدمت میں خط لکھا کرتے تھے۔ صاحب مضمون نے داستان منقولہ کے درباری شاعر "ملک الشعرا چند" کے کلام میں فارسی الفاظ پائے جانے کا حوالہ دیا ہے (چند کے متعلق جو جدید تحقیقات ہوئی ہے اس سے صاحب مضمون بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ معیار)

(۳) صاحب مضمون کی رائے ہے کہ دکن میں اردو کا رواج دہلی والوں کی بدولت ہوا جنہیں محمد تغلق نے دہلی چھوڑ کر دکن جانے پر مجبور کیا تھا
ثبوت میں یہ بات پیش کی ہے کہ "اگر آج کوئی حیدرآباد، اورنگ آباد، دولت آباد اور گلبرگہ وغیرہ شہروں اور قصبوں میں جا کر گفتگو کرے تو
وہ الفاظ محاورے اور کہاوتیں سننے میں آئیں گی جو ہم دہلی کے عوام الناس اور کم خواندہ لوگوں سے دہلی میں سنتے تھے، بلکہ کچھ نہ کچھ اب بھی
سنتے ہیں" صاحب مضمون نے اورنگ آباد کے بہت سے محاورے اور روزمرے نقل کیے ہیں جو انہوں نے دہلی میں بھی اپنے بچپن میں ایک مخلوق
سے سنے تھے۔ "اٹھاؤ چولھا (خانہ بدوش) پیارے بچی (کوسنا) رسا (کم سنیا) تنے وانی کجلوٹی ستیاناسی خاک پھانک کر رہتی ہوں مشٹونا،
بُڈھوا، گوردار، سینگ (فصیل) برو بر (برابر) ہیا، ہیاو (حوصلہ) سنہ کا سواد بگڑ گیا وغیرہ۔" اردو زبان دہلی سے دکن پہنچی اور وہ
دکنی الفاظ جو معیاری دہلی کی زبان میں کھٹکتے ہیں وہیں اہل دہلی کے ذریعہ شمالی ہند میں آئے جو اردو کو اپنے ساتھ جنوب میں لے گئے تھے" "اردو
یا ہندوستانی اس خطے میں پیدا ہوئی جہاں برج بھاشا کا رواج تھا۔ یہ مقام دکن ہرگز نہیں ہو سکتا" (۴) صاحب مضمون کی رائے میں
قطب شاہ اردو سے ضرور واقف تھا، لیکن کب اور کہاں اس نے اس زبان کو سیکھا اس کے متعلق انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ صاحب مضمون
کی رائے میں قطب شاہ اردو کا پہلا شاعر نہیں لیکن اس کا دیوان "اردو یا کسی قسم کی اردو کا پہلا دیوان قرار دیا جا سکتا ہے" صاحب مضمون نے
قطب شاہ کا یہ شعر "کہ نور پردے یوں نچ خامجریں بد ٭ جوں سوار پرے بادل ریحاں سوں گلستاں" نقل کر کے دعویٰ کیا کہ "اس کا نصف دوسرے
سوراشٹری زبان کا ہے، اور سوراشٹری کی ایک پرانی کتاب پانڈو دا از الکلام ہم آم سیماسی میں جو چند سال ہوئے شائع ہوئی ہے یہ مصدر دسنا
مختلف زمانوں اور نسل کے سینوں میں کئی بار استعمال ہوا ہے۔ کتاب کا زمانہ تصنیف کم از کم ۱۰۰۰م قرار دیا گیا ہے۔ (۵) اردو سے قدیم
کے حوالے سے امیر خسرو کے دو شعر نقل کر کے صاحب مضمون یہ فیصلہ فرماتے ہیں کہ "اردو کی نظم سے متعلق ایجاد و اختراع اور اولیت کا سہرا
حضرت امیر خسرو ہی کے سر رہتا ہے" (۶) اردو نثر کی قدیم ترین کتاب جو اس وقت تک دستیاب ہے معراج العاشقین ہے "ہندوستانی
مشاعرے: از جناب احسن مارہروی ص ۲۲ تا ۳۰ (یہ مضمون تلاش سے نہیں لکھا گیا ہے، حکایات و واقعات بالکل آب حیات کے
ماخوذ ہیں، شاعروں کے سنین جو قائم کیے ہیں وہ بھی زیادہ تر غلط ہیں۔ کرم اللہ کا زمانہ ۱۱۶۳ سے کم از کم ۲۰ برس بعد ہے۔ میر درد کے
شاعروں کا ذکر میر نے کیا ہے، نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۵ ہے، درد کے شاعروں کا زمانہ ۱۱۹۵ کے قبل ہونا چاہیے بلکہ بعد،
یہی حال میر تقی اور سجاد کے مشاعروں کا ہے جن کا زمانہ علی الترتیب ۱۱۶۹ اور ۱۱۰۰ قرار دیا ہے۔ ۱۱۹۱ھ میں ذہین لکھنوی کوئی مشاعرہ
ایسے نہ تھے جن کے شاعروں میں میر، درد، سودا (معاصرین میر) مصحفی، انشا، جرأت شامل ہو سکیں۔ مصحفی تو ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ آئے ہیں اور میر
سودا اور درد کبھی ایک زمانے میں نہ تھے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ مصحفی سلطان شکوہ کے استاد تھے اور نہ وہ اشعار جو اس سلسلے میں آزاد اور
ان کے تتبع میں جناب احسن نے نقل کیے ہیں سلیمان شکوہ سے متعلق ہیں۔ "معیار" اردو ادبیات میں غالب کا اثر ص ۶۰ تا ۶۹ از
ن۔م۔ راشد (۱) غالب کی ذات اور اس کی شاعری ہر چند حالی اور آزاد کی طرح شعوری تھیں لیکن ان کی غزل میں ایک بالکل نئی
تحریک تھی جس کا احساس آج تک نہیں کیا گیا۔ ۔۔ غالب کی ذات ...... کی شاعری کے خلاف ایک بہت بڑی بغاوت تھی جس سے حالی کی نئی
تحریک کے لیے راستہ صاف کیا تھا۔ اس لحاظ سے مومن خاں کو ایک حد تک غالب کا پیش رو کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ذوق کے ساتھ

نہیں کہا جا سکتا ہے کہ مومن نے اس قدر شاہ ہی کے پاؤں پر آخری ضرب لگائی کیونکہ اوائل میں وہ شاہ نصیر کا شاگرد تھا ۔ ۔ ۔ کچھ
عرصے بعد وہ جرأت کی طرز [illegible] کا شکار ہو گیا جیسا کہ آخر عمر تک وہ ان ابتدائی اثرات سے پورے طور پر نجات حاصل نہ کر سکا ۔ ۔
لیکن غالب جو اوائل ہی سے [illegible] کی شاعری [illegible] چل رہا تھا اپنی وقعیت شعری اور یگانگت خیال کی بنا پر اس بات کا متقاضی
ہے کہ اسے زبان کی شاعری کا [illegible] کہا جائے [illegible] اگر کوئی عزت تھی تو وہ اس اثر و اقتدار کی بنا پر تھی جو
[illegible] دربار میں حاصل تھا [illegible] حکومت کرتا تھا" غالب کا فلسفیانہ تصور اور اس کا
بے نظیر جمالیاتی احساس [illegible] کے معاصرین کے [illegible] تھا [illegible] وہ لوگ غالب کی بلند تر زبان اور پیچیدہ اسلوب کا
[illegible] فلسفیانہ اور عامیانہ عشقیہ میلانات سے کوئی [illegible] نہیں رکھتے تھے غالب کو صحیح طور پر سمجھنے والوں میں ذوق کا درجہ
[illegible]" صاحب مضمون کی رائے میں ذوق نے غالب کے ساتھ شوق مسابقت میں اپنے شعروں میں بیجا عارسیت بھر کر شروع
[illegible] غالب کی [illegible] ذوق کی [illegible] سادگی محض مصنوعی تھی" غالب طبعاً ایک فلسفیانہ
رجحان کا مالک تھا اور اس کا اسلوب بیان [illegible] ۔ ۔ اس کی [illegible] ایسی تھی جو
اس کی مصوری [illegible] کے علاوہ کسی اور [illegible] صحیح طور پر [illegible] پیش ہو سکتی" غالب کے معاصرین نے غلطی سے اسی کو اس کی کائنات
سمجھ لیا تھا حالانکہ اس کے لیے یہ محض شاعری [illegible] رکھتی تھی" ذوق کی شاعری صاحب مضمون کی رائے میں تاریخ سے قریب تر تھی۔
اس کی کائنات [illegible] قسم کے اخلاقی مسائل تھے [illegible] اس کی تقلیدی عارسیت [illegible] کلام اور فلسفیانہ مسائل کے لیے
اس کے دل و دماغ ناموزوں تھے۔ [illegible] مومن کے اشعار میں حسیت اور جو ایجاز خلا پایا جاتا ہے وہ یقیناً غالب کا اثر ہے نظیر ناسخ کو
قرأت سے متاثر ہونے کے [illegible] حالات کی [illegible] دکھایا اس کے لیے وہ موزوں تھا" آخر عمر میں غالب کے طریقہ اظہار
[illegible] ہو گیا تھا اس کا ایک سبب کلام مومن بھی تھا" "حکیمانہ نکات اور [illegible] پاکیزہ عشق کا اظہار کسی حد تک سنگین اور مغلق الفاظ سے
[illegible] کیا جا سکتا ہے لیکن مومن بہت زیادہ غالب سے متاثر ہیں ان کی "جدت نگاری" تحکیہ بلند نظری اشکال زبان" اور
متانت اظہار [illegible] بہت حد تک غالب کی مرہون منت ہے" (۴) غالب کا معترف اور بہترین نقاد شیفتہ تھا اسے مغلق اور مبہم
زبان سے نفرت تھی لیکن عاشقانہ مضامین کے عامیانہ پن سے پرہیز انداز بیان میں حکیمانہ متانت اور ترکیبوں کی جدت اس نے غالب سے
سیکھی تھی۔ بعد وفات مومن شاگردی غالب اختیار کی لیکن حکیمانہ متانت کے باوجود طرز خیال انقلابی نہ تھا۔ (۵) مومن و ذوق کے
شاگرد ان دونوں کی موت کے بعد یا تو غالب کے شاگرد ہو گئے یا تقلید غالب کے تلامذہ خاص میں سالک، مجروح، ذکی، حالی قابل ذکر
ہیں [illegible] نے سب سے زیادہ کامیاب تقلید کی مجروح کی "جمالیاتی حس" گہری نہ تھی لیکن غالب سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ (۶) غالب
کی حقیقی عظمت کا احساس حالی اور آزاد کی نئی تحریک کے آغاز سے شروع ہوا۔ معاصرین غالب اس کی زبان اور اس کے خیالات کی
ہم آہنگی کو نہ سمجھ سکے، اس کے شاگردوں نے اس کے اسلوب بیان کی تقلید کی، لیکن کوئی بھی اس کی روح کی گہرائیوں میں نہ اتر سکا
ان کے لیے طبعاً ایسی شاعری نامانوس تھی جو بیک وقت دل و دماغ سے تعلق رکھتی ہو اور جس میں خیال کی انتہائی یگانگت (کذا) پائی

جاتی ہو اور جس کا مقصد محض ہجا یا باتی تو ہو۔» (حالی پر غالب کے متعلق ایک منفرد لکھا ہے۔ معیار) (۸) غالب کی "شعر و کتابت کا نرالا طریقہ اس کی باغیانہ ادبی روح کا مظہر ہے" (۹) داغ و امیر و تسلیم بھی غالب سے متاثر ہیں۔ تسلیم کی مثنویوں سے خاص طور پر اس کا ثبوت ملتا ہے (۱۰) اقبال و غالب میں فرق بھی ہے اور شباہت بھی۔ "اگر حالی کو اقبال میں سے تفریق کر دیا جائے تو حاصل تفریق غالب کے سوا کچھ نہ ہوگا لیکن ایسا غالب جو بیسویں صدی کے فلسفے سے بھی یکساں طور پر آشنا ہو" (۱۱) مضمون کا خاتمہ عہد حاضر کے متغزلین پر غالب کے اثر" اور شارحین و ناقدین غالب کے ذکر پر ہوتا ہے۔ معیار) شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر: ارد و قاضی عظیم صاحب ص ۱۱ — ۲۳ ۲ ۲ ۱ (۱) صاحب مضمون کی رائے میں معترضین نے اس اعتراض میں کہ اردو شاعری مقامی اثرات سے بے تعلق ہے اصولی غلطی سے کام لیا ہے۔ کوئی شاعری ایسی نہیں جس پر مقامی اثرات نہ پڑیں اس لیے اردو شاعری بھی اس اصول سے الگ نہیں ہو سکتی (۲) تین کالموں میں مقامی اثر کے معنی اور مقصد کی تعیین کی ہے۔ "شاعر مقامی رنگ سے متاثر ہو کر جو شاعری کرے گا وہ فطرت سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوگی جب انسان پر مقامی رنگ نے اتنا گہرا اثر کر رکھا ہے کہ وہ خود اس کی فطرت کا ایک جزو لطیف بن گیا ہے تو ظاہر ہے کہ جو چیز اس کے فطری جذبے سے متاثر ہو کر نکلے گی وہ زیادہ قدرتی ہوگی" (۳) دوسرے عنوانات "مقامی ادب اور زبان کا اثر" "مذہب اور اس کی روایات" "توہمات اور خوشیاں" اور "عقائد" ہیں۔ مثالیں قطب شاہ سے لے کر واجد علی شاہ کی شاعری تک کی دی ہیں۔ عہد حاضر کے شعرا کا ذکر کہیں کہیں حواشی میں کیا ہے۔ معیار) عالمگیر لاہور۔ مرتبہ حافظ محمد عالم۔ سالنامہ ۱۹۳۶ء۔ حضرت مضطر علیہ الرحمۃ از سید شاہ عطاء الحق شائق فریدی پھلواروی (۱) خیر آباد کی ادبی تاریخ میں پہلا دور فارسی گو شعرا مخدوم شیخ سعد، حافظ شاہ مشتاق، معشوق علی شاہ کا ہے۔ دوسرا دور اردو گویوں کا منشی قدرت حسین قدرت، مظفر حسین شوقی، محمد جعفر زمری، بہاری لال خاوری، موہن لال گرامی، الٰہی بخش ناز، حاجی بی بی حمید النساء حرمان تخلص خواہر مولانا فضل حق و مادر حضرت مضطر۔ تیسرا دور بسمل و مضطر، کوثر و تسلیم و ریاض کا دور ہے۔ (صاحب مضمون نے رسالہ الناظر جون ۱۹۱۵ء کے ایک مضمون "ریاض سخن اور خیر آباد" کا حوالہ دیا ہے۔ معیار)۔ (۲) مضطر کا نام سید محمد افتخار حسین تھا۔ افتخار سے سال ولادت ۱۲۸۲ھ نکلتا ہے۔ ان کے خطابات اعتبار الملک، افتخار الشعرا، اقتدار جنگ تھے (یہ خطابات کہاں سے ملے اس کی تصریح نہیں کی گئی۔ معیار) ان کے والد کا نام مولوی تفضل حسین تھا۔ نجیب الطرفین سید تھے، مذہب حنفی، مشرب صوفی۔ (۳) احتشام الدین احمد حقی دہلوی کا ایک مضمون ۱۹۱۲ء کے بہارستان میں شائع ہوا تھا اس کے حوالے سے صاحب مضمون کہتے ہیں کہ مضطر نے ایک ناول "قتیل جفا" نامی بھی لکھا تھا جو بہت کامیاب ہوا تھا۔ دیوان حمیہ پیشی بہ نذر خدا چھپ چکا ہے "نعتیہ دیوان نیاز مصطفیٰ" مضطر کی زندگی ہی میں چھپنے کے لیے کسی مطبع کو دیا گیا تھا لیکن مطبع کی بدعنوانیوں سے اب تک "معرض التوا میں ہے"۔ عاشقانہ دیوان مرتب نہ ہو سکا" لیکن سخن صاحب کے پاس کچھ مطبوعہ کتابیں ہیں (کذا) کوئی صاحب دیوان مرتب فرمانا چاہیں تو منگوا لیں" (۴) مضمون نگار اور سخن صاحب کے شاگرد مضطر کی اصلاح کے نمونے (۵) مضطر کے ۸ خطوط جن میں سوا ایک کے سب مضمون نگار کے نام ہیں، ایک سخن اور مضمون نگار دونوں کے نام ہے۔ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ (الف) مضطر کی رائے میں "وضع" دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مذکر ہے مونث نہیں اور بعض دوسرے شعرا نے مونث باندھا ہے۔ معیار) اور اپیل کو وہ مذکر سمجھتے تھے (ب) جون ۱۹۱۳ء میں تبدیلی ہو کر صدر لشکر گوالیار کی ڈسٹرکٹ

پہلے تخلص ع' تھا۔ کہ منہ سے شبنم نے کہیں مبیرا کے ملی چھپنے کئے ہیں۔ داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۹۱۵ء سے قبل انہوں نے ایک سال کی رخصت لی تھی، مولوی صاحب موصوف کی ملازمت کی تلاش ہوئی۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ۵ اگست ۱۹۲۵ء میں ناکو ثانی عمادریک ح ۲۵ء میں کلکتے میں گئے۔ ۔۔۔ نیاز فتح پوری وہاں بھوپال میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں اندور آکر وہاں کے صاحب گیا۔ مسلمانوں میں بعض حلقوں نے ۱۹۲۵ء میں تین دوکاں کا ذکر کیا ہے جن کے تخلص بدر نشتر اور اختر ہیں۔ ۲۵ تا ۱۹۲۷ء میں بستر علیل ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا، ۱۳۳۰ھ کے مطابق ۲ جمادی الثانی تاریخ وفات ہے (۱)، مضطر کے شاگردوں کی فہرست جس میں ایک مضطر خیرآبادی خاں صاحب بسمل کا بھی نام ہے۔

رفتار اردو و ص ۲۲۳ تا ۳۰۸ از حامد حسن قادری (۱) شعرائے متقدمین کے تین دور قائم کیے ہیں (۱) شعرائے دکن ۹۰۰ تا ۱۱۰۰ء (۲) شعرائے دکن ۱۱۰۰ تا ۱۱۵۰ء۔ اس دور میں ولی دکنی، آگاہ، سراج، دولت، ملاوجہی وغیرہ شامل ہیں۔ ہاشمی کے متعلق جو تحقیقات سے معلوم نہیں ہوا۔ خان آرزو کا نام شمس الدین ولی نہ تھے۔ اس سے قبل کے دور میں داخل کرتے۔ سیار (۳) تیسرے دور کا خاتمہ بھی ہو چکا ہے زنگ دیا اور دکن کا ہے۔ اس دور میں آبرو، مضمون، ناجی، یکرنگ، فغاں، حاتم، نعمان، مظہر، سجاد، بہاری میں ولیم۔ مضمون کا اس دور میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ دونوں میر و مرزا کے معاصر ہیں۔ سیار (۴) شعرائے متوسطین کا پہلا دور ۱۱۳۰ تا ۱۱۵۰ء مظہر، میر و مرزا وغیرہ اس دور کے شعراء میں۔ یہ بیان صحیح نہیں کہ سودا نے قصائد کی ابتدا کی۔ شعرائے دکن قبل احسان اس دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ سیار (۵) متوسطین کا دوسرا دور ۱۱۵۰ تا ۱۲۰۰ء۔ خاص شعراء مصحفی، جرأت، انشاء، حسن وغیرہ اس دور میں لکھنؤ کا دو خاص شہر تھا ہے جس کے پیشرو دہلی ہیں۔ رنگین، نظیر، مصحفی کے شاگرد ضرور تھے۔ لیکن یہ دونوں ناسخ کے دور میں داخل ہیں۔ سیار (۶) دور سوم ۱۲۰۰ تا ۱۲۵۰ء۔ ناسخ، آتش، نصیر، مومن، نسیم، نظیر اکبرآبادی، رشید دہلوی (رشید تخلص کا کوئی مستند شاعر اس عہد کا نہیں۔ نظیر اکبرآبادی کا مصحفی و انشاء کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذوق و غالب، وزیر و صبا کو اس دور میں نہیں دکھاتے نسیم کو اس عہد میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ سیار (۷) شعرائے متاخرین کے بھی تین دور قائم کیے ہیں۔ ۱- دور اول ۱۲۵۰ تا ۱۲۷۵ء ذوق، غالب، مومن، اسیر، ظہیر، منیر، صبا، انیس وغیرہ۔ ۲- دور دوم ۱۲۷۵ تا ۱۳۰۰ء۔ داغ، امیر، تسلیم وغیرہ۔ ۳- دور سوم ۱۳۰۰ء سے ۱۳۲۵ء تک داغ و امیر، شاد عظیم آبادی، نظم طباطبائی، مصحفی، عزیز، آرزو وغیرہ (۸) شعرائے معاصرین ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۰ء حسرت، عزیز، ثاقب، فانی، جگر، مضطر، یگانہ وغیرہ (تحقیق کے اعتبار سے مضمون میں بہ کثرت اغلاط ہیں۔ تاہم شیشے کی نادال مقابلہ۔ سیار)

تدریجی کیا جز رسالہ ۱۹۳۵ء مرتب غلام علیم، غالب و اقبال، از سید شاہ ولی الرحمن صاحب ایم اے۔ ص ۱ تا ۳۰ (۱) غالب و اقبال کی خصوصیات: ذہنی سے شغف، صوفیانہ ترکیب، کثرت فلسفہ، تمثال، حکمت، طرز، نازک خیالی، بلند پروازی، جدت، ادائے بیان، جذبات سے اجتناب، "زبان و انداز بیان" مشکل۔ غالب اور اقبال میں فرق یہ ہے کہ "اقبال اسلامی شاعر ہیں، فلسفے کا مقصد انسان کو بیدار کرنا ہے" "غالب کا مسلک شاعرانہ تصوف و تخیل شاعری ہے" اس کے خیالات منطقی

(۲) غالب کے یہاں تشائم خیالات اور ان کے اسباب (مضمون نگار نے لکھا ہے کہ باقر علی خان اور حسین علی خان غالب کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے یہ صحیح نہیں دونوں کا انتقال غالب کے بعد ہوا ہے۔ معیار)۔ اقبال کی شاعری میں بھی ناامیدی و افسردگی کا عنصر موجود ہے۔ (۳) غالب بھی اقبال کی طرح شک سے یقین کی طرف گئے ہیں۔ (۴) خودشناسی، تجرید فقہ، دو جوش عمل، سخت کوشی، جذبۂ پسندی کی تعلیم اقبال کی طرح غالب کے یہاں بھی ہے۔ دل عظیم آبادی از حکیم شیخ احمد اللہ ندوی ص ۶۸ تا ۴۴۔ (۱) (دل کے والد کا نام جسونت تاگر بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ فضل اللہ اول مسلم سے ہوئی اور اس کی ایک خاص وجہ کہتی ہے۔ معیار) (۲) خاندانی مسلم تھے" (یہی صحیح نہیں۔ معیار) (۳) آج ان کی تصنیف عقد نامہ صغیر ان کی تصنیف سے عروض الہندی ابتک موجود ہے۔ معیار) (۴) ۱۱۰۰ — ۱۱۹۲ میں دل کی عمر ۳۰ بتائی ہے اور عروض الہندی کا سال تصنیف ۱۱۹۵ھ ہے قیاس چاہتا ہے کہ پچیس تیس سال سے کم کی عمر میں یہ رسالہ لکھا گیا ہوگا۔ معیار) حیرت کی بات ہے کہ مضمون نگار نے کریم الدین کا مولد ابراہیم کا سن تو لکھا ہے۔ معیار)

ادب لطیف لاہور سالنامہ ۱۹۳۶ء مرتبہ چودھری برکت علی و مرزا ادیب۔ **غالب کے اردو کلام کی چند نمایاں خصوصیات**۔ ص ۶۰ تا ۷۲، از صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (۱) "غالب شاعری کی صحیح روح سے باخبر ہے اس لیے اس کا تخیل ہر گوشہ کائنات اور حیات انسانی کے تمام مناظر و واقعات پر پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے" (۲) "اردو شاعری بالخصوص غزل کے اندر حسن و عشق کے معاملات تک محدود تھی جن لوگوں نے ان حدود سے تجاوز کیا وہ یا تو رسمی تمثیلات میں ڈوب گئے۔ یا سطحیات ہی پر رہ گئے" غالب کے تخیل میں صرف وسعت ہی نہیں تعمق بھی ہے۔ - اس عمیق تخیل کے باوجود اشعار کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ یہی پر غالب کی شاعرانہ عظمت کا دار و مدار ہے۔" غالب کے مشاہدات سطحی نہیں، وہ ہر شے کی تہ میں ایک اور ہی منظر دیکھتا ہے۔ اس مادی جہان کے اندر وہ ایک جہان معنوی تیار کرتا ہے اور پھر اس کو نیا نظام بخشتا ہے۔ اس نظام میں موزونیت حسن اور جاذبیت ہوتی ہے اگر یہ جاذبیت نہ ہو تو اس کے تخیلات خشک فلسفیانہ مسائل بن کر رہ جائیں۔ (۳) غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے علو تخیل کو جذبات کے ساتھ پیوست کیا ہے" ...... غالب کا فنی کمال یہ ہے کہ وہ ٹھوس سے ٹھوس خیال کو کیف حسن میں ملبوس کرکے ہمارے سامنے لاتا ہے اس لباس حسن میں الفاظ کی آرائش چار چاند لگا دیتی ہے" (۴) "اس کی شاعری فطرتاً پستی خیال سے مبرا ہے" غالب کی عظمت کی بڑی دلیل یہی ہے کہ اس نے ایک ایسے وقت میں یہ غیر فانی نغمہ چھیڑا جبکہ ہندوستانی تمدن کی پستی کے ساتھ ساتھ ہمارا ہر چیز زوال پذیر ہو چکی تھی" "غالب اپنے عہد کے معیار ذہنی سے بہت بلند تھا" (۵) "غزل میں تسلسل جذبات کا امکان بہت کم ہے" لیکن غالب کی غزلیات میں بہت سی ایسی ہیں کہ اگرچہ اشعار کی انفرادی حیثیت جداگانہ ہے تاہم ساری غزل میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہے (۶) اس کا تغزل شدید جذبات کا حامل ہے" "غالب حسن و عشق کے میدان میں جب آتے ہیں تو اس کے شعر تیر و نشتر بن جاتے ہیں" (۷) غالب کے تغزل کی دوسری خصوصیت اس کی گہرائی کا احساس ہے۔ یہ عمق نفسیاتی ہے" "اس کے عشقیہ اشعار کے مطالعے سے انسان کبھی سیر نہیں ہوتا بلکہ جتنا غور کیا جائے کیف اور بڑھتے جاتے ہیں۔ ...... "یہ غور لفظی مشکلات کے متعلق نہیں ہوتا" "بلکہ نفسیاتی وسعت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ جذبات و کیفیات کے سیلاب کہیں ختم ہوتا نظر نہیں آتا ...... "ایک شعر مضمون کی لطافت اور اثر کی شدت کے اعتبار سے مستقل کتاب تصور کیا جا سکتا ہے"

(۸) حسن و عشق کے متعلق غالب کے خاص نظریے تھا "حسن ایک ابدی ہے جس کے لیے ظاہری آرائش کی ضرورت نہیں۔
خلوت خود حسن کی ستائش گری کرتی ہے۔ عشق سے مراد وہ پیش کی اشیا کو بھی حسین بنا دیتا ہے۔ عشق ایک غیر فانی جذبہ ہے غیر معین
غیر محدود۔ انسانی قلب فانی اور محدود ہے دریا اس ظرف تنگ میں کیونکر سما سکتا ہے۔ انسان کی بیتابی پیہم کی یہ بہت دلیل ہے
کہ کوئی وصال سے سرافراز نہیں ہو سکتے۔ غالب کی عاشقانہ ترقیت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے (۹) غالب کی شخصیت اس کے
اشعار میں نمایاں ہے۔ "وہ فطرت کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں لیکن اپنی ہستی کو نہیں سمجھتا" (۱۰) عہد حاضر کی جدید نگاری
حالی و آزاد کی ممنون احسان ہے لیکن غیر شعوری طور پر اس حد تک اساس غالب کی متعدد روش سے ہوا۔ مصحفی کا قیام
دہلی ص ۱۰۰ تا ۱۱۱ (خواب و فسر) (۱) مصحفی ۱۱۹۱ اور ۱۱۹۳ کے درمیان پیدا ہوئے (۲) تعلیم و تربیت امروہے میں ہوئی
دہلی ۔۔۔۔ پہنچے۔ نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۳ مضمون نگار نے بتایا ہے حالانکہ اس کا سال تکمیل ۱۱۶۵
ہے۔ سیار (۳) مصحفی ۱۱۸۶ میں دہلی گئے اور ۱۲۰۹ میں لکھنؤ۔

محکمہ:-

(۱) آصف الدولہ و نواب شمس النساء بیگم: آصف الدولہ کا دیوان ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے
اس میں یہ غزل چار شعروں کی "ہم دیکھتے ہیں" "تم دیکھتے ہیں" والی زمین میں پائی جاتی ہے۔ غزل یہ ہے:

تمھے میرے حب دیکھتے ہیں ۔۔ دیکھے کوئی جو کہ ہم دیکھتے ہیں
وہ چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال کا تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں
تو جلدی سے آ ورنہ میرے مسیحا کوئی دن کو راہ عدم دیکھتے ہیں
گلی میں بتوں کی شب و روز آصف تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

شعر اول، سوم، چہارم تذکرہ ہندی مصنفہ مصحفی ص ۵۰۹ میں بھی موجود ہیں۔ شعر سوم میں "کوئی دن" کی جگہ "کوئی دم"
ہے۔ شعر چہارم میں "گلی میں بتوں کی" کی جگہ "بتوں کی گلی میں" ہے۔
دیوان جہاں کا ایک قلمی نسخہ بھی اسی کتب خانے میں ہے۔ بیگم کی غزل میں ایک شعر زائد ہے:

بت جو نے وعدے کیے تو نے ہم سے بھلا اب کے تیری قسم دیکھتے ہیں

ق۔ع۔و

عالم ادب

شاہ جارج پنجم کی وفات: ملک معظم کی وفات کا غم عالمگیر ہے اور ہر طبقے اور ہر حیثیت کے لوگ خاندان شاہی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ معیار بھی اس غم میں شریک ہے اور نہایت ادب کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی پیش کرتا ہے۔ ملک معظم کو دستوری سلطنت کا قابل مثال بادشاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا وہ اپنے مشوروں سے اپنے وزرا کی اعانت کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن امور انتظامی میں کبھی انہوں نے ایسی مداخلت نہ کی جو دستور کے خلاف ہو خاص خاص مواقع پر بادشاہ مجاز ہے کہ اپنے اختیارات تیزی سے کام لے ایسے مواقع بہت کم پیش آتے ہیں لیکن جب کبھی ایسا موقع آیا وہ اس طرح عمل پیرا ہوئے کہ دوست دشمن سب نے آفرین کی اور دستور انگلستان کا مسلمہ کلیہ کہ بادشاہ غلطی نہیں کر سکتا ایک نئے مفہوم میں صحیح ثابت ہوگیا ان کی فرض شناسی ضرب المثل تھی اور ان کی صیانت نفس کا بڑے بڑے اہل نظر لوہا مانتے تھے واتی قربانی سے انہوں نے کبھی دریغ نہ کیا۔ اور وہ قوم کے دکھ سکھ کو ہمیشہ اپنا دکھ سکھ سمجھتے رہے۔ اگر وہ اپنی قوم میں ہر دل عزیز نہ ہوتے تو تعجب ہوتا۔ ان کے عہد میں جو دینی سیاسی اور معاشی انقلاب ہوئے وہ تاریخ عالم میں یادگار رہیں گے ان کے عہد کا ادب بھی صحیح معنی میں انقلابی ادب ہے اور یہ کہنا بالکل مبالغے سے خالی ہے کہ انسان کی مکمل تصویر کھینچنے کی اگر کوشش کی گئی ہے تو صرف اسی عہد میں۔ عہد گذشتہ کے مصنفین نے مشاہدات و محسوسات کے ایک چھوٹے سے جزیے پر قناعت کر لی تھی اور اصلی بر اعظم جن کی نظروں سے پنہاں تھا۔ عہد وکٹوریہ کے مصنفین انیسویں صدی کی علمی ترقی کے مادی نتائج کو دیکھ کر اس قدر حیران ہوئے کہ خود انسان کو بھول ہی گئے۔ ادبیات کے حدود کی یہ غیر معمولی توسیع قواعد فن میں غیر معمولی تبدیل کی خواہاں ہے اور اس عہد کے مصنفین قواعد فن میں قدما کی پیروی سے بے نیاز ہو گئے ہیں اس عہد کے اصلی نمایندے جوائس، لارنس، ورسٹر، ہکسلے، ورجینیا وولف، ایلیٹ، لٹن اسٹریچی وغیرہ ہیں اور اس عہد کی خصوصیات کی تلاش ان کی تصانیف میں کرنی چاہیے۔ ولز اور شا اب بھی زندہ ہیں اور ان کے تخیل کا سرچشمہ اب تک خشک نہیں ہوا بنٹ اور گولزوردی کی بھی بہت سی تصانیف اس عہد میں لکھی گئیں لیکن ان سبھوں کی تصانیف اس عہد کے میلانات کے صحیح مظہر نہیں۔

رڈیرڈ کپلنگ کی وفات: انگریزی زبان کے اس نامور شاعر اور افسانہ نگار نے ۔ جنوری کو انتقال کیا اور ویسٹ منسٹر ایبے میں دفن ہوا۔ اس کی وفات فرد واحد کی موت نہیں بلکہ ایک دور کے خاتمے کا اعلان ہے کپلنگ انگلستان کے مقبول ترین مصنفین میں ہے اور ایک زمانہ تھا کہ نوجوان اس کا کلمہ پڑھتے تھے اب بھی اس کے ماننے والوں کی تعداد کم نہیں۔ لیکن نوجوان اس کے نقش قدم کو دلیل راہ نہیں سمجھتے اور ذہنی حیثیت سے اس کی وقعت گذشتہ سال کی جیتری سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس کے متعلق جون میسفلڈ ملک الشعراء انگلستان کے اس قول سے اختلاف مشکل ہے کہ عہد وکٹوریہ کے شاندار کارناموں کی قصیدہ خوانی جیسے زور سے کسی شاعر نے نہیں کی اور برطانی خلافت ارض کا ترانہ اتنے بلند سروں میں کسی نے نہیں گایا۔ اہل ہند کو اس سے بجا شکایت ہے کہ اس نے ہندوستان کی نئی نسل کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کی اور ان کی آرزوؤں کی ہمیشہ تضحیک کرتا رہا۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تحقیر کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ان کے مفروضہ عیبوں کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے۔ دی بیلڈ آف دی ایسٹ اینڈ ویسٹ لکھا ہے اس خیال کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگا کہ کپلنگ بڑا متعصب جانبداری

ہمیشہ یاد رکھنے والی سب کی صفت کیوں کے پہلو ہیں، یہ اور اسی وجہ سے ہم یورپ والوں کے اس قول کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں کہ کپلنگ شہنشاہیت کا سب سے بڑا کاتب تھا۔ کپلنگ کے والدین انگریز تھے۔ لیکن اس کی پیدائش ۱۸۶۵ء میں بمقام بمبئی ہوئی۔ بچپن کا زمانہ ہندوستان میں گزرا۔ تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا گیا۔ اس کی عمر ابھی ۱۷ ہی برس کی تھی کہ اس نے اپنی پہلی کتاب لکھی جس کے صرف ۲۵ نسخے چھپے تھے۔ ہندوستان واپس آ کر سیاہ بورڈ کے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے اسٹاف میں لے لیا گیا۔ لیکن اس نے تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابھی کم سن ہی تھا کہ اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'سپاہیوں کی کہانیاں' ہندوستان میں شائع ہوا۔ ابتدا میں یہ چنداں مقبول نہیں ہوا۔ لیکن سیر چشمہ ایک تجربہ کار نے سے مقبول عام بنا دیا۔ اس کے بعد کپلنگ انگلستان چلا گیا اور وہیں مستقل طور پر مقیم ہو گیا۔ ۱۹۰۰ء میں کپلنگ نے انگلستان میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی اور ۱۹۰۰ء میں وہ عالمگیر شہرت کا مالک تھا۔ ۱۹۰۷ء میں اسے انعام نوبل ملا۔ اس کی تصانیف میں سب سے مقبول دی جنگل بک ہوئی۔ اس کے ۴ لاکھ سے زیادہ نسخے اب تک بک چکے ہیں۔ جسٹ سو اسٹوریز، کم، سنگ مینیل بک، اسٹاکی اینڈ کو، اور دوسری مقبول کتابیں ہیں۔ ان کے ۱۲ لاکھ سے زیادہ نسخے فروخت ہوئے ہیں۔ فرانسیسی اور المانی میں اس کی اکثر تصانیف کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ہماری اردو میں بھی دی جنگل بک کے سوا جہاں تک ہمیں علم ہے کسی کا ترجمہ نہیں ہوا۔ ہم اس کی بعض کہانیوں کا ترجمہ اور اس کے متعلق ایک ناقدانہ مضمون بعد شائع کریں گے۔

رامون ماریا دل ویل انکلان کی وفات: ویل انکلان کا انتقال جنوری کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ رائٹر نے یہ خبر ہندوستان نہیں بھیجی۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ باوجود اس کے کہ ویل انکلان موجودہ ہسپانوی مصنفوں میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ ہسپانوی زبان بولنے والے ممالک کے باہر چنداں مشہور نہ تھا۔ اس کا سال ولادت ۱۸۶۹ء ہے اور اس کا مولد و منشا گلیشیا ہے جس کی شعریت اور فضا جزیرہ ہسپانیہ میں اپنی آپ نظیر ہے۔ ویل انکلان مصنفین کی اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جو ۹۸ء کی نسل کہی جاتی ہے اور جس کا موجودہ ہسپانیہ کی معنوی تعمیر میں بہت بڑا حصہ ہے۔ یونامونو، بیروخا، آزورین اسی گروہ کے لوگ ہیں، گو خیالات میں ایک دوسرے سے بہت اختلاف رکھتے ہیں۔ ویل انکلان ادیب، شاعر، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار تھا۔ بعض ناقدین کی رائے میں اس زمانے کا کوئی نثر نگار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فلسفیانہ دقت آفرینیوں سے اسے کوئی سروکار نہ رہا اور باوجود جمہوریت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے گھبراتا تھا۔ اس کی شخصیت نرالی اور دلآویز تھی اور اس کو ہر دل عزیز بنانے میں اس کا بھی کچھ حصہ کم نہ تھا۔ پرانی وضع کے شرفا کا لباس پہنے لمبی داڑھی بڑھائے ہوئے بال، وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ اس کی جنگ جوئی اور جسمانی تکالیف سے حد درجہ بے پروائی ہر طرح کے واقعات کو چھوڑ کر اور ان کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی، لوگوں نے ہزاروں قصے گڑھ لیے تھے۔ اور ویل انکلان کو ان کا ہیرو بنا دیا تھا۔ اسے بارہا ڈوئیل لڑنے کا اتفاق ہوا۔ اور ایک بازو اسی کی نذر ہوا۔ جس وقت ڈاکٹر اس پر عمل جراحی کر رہا تھا وہ بے پروائی کے ساتھ سگرٹ پی رہا تھا۔ ہندوستان سے بھی اسے ایک قسم کا تعلق تھا۔ مہاراجہ کپورتھلہ کی شادی ایک غیر معروف ہسپانوی رقاصہ سے اسی نے کرائی تھی۔ اس کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور سوناٹا ہے۔ یہ علم نہیں کہ انگریزی میں اس کی کتابوں کا ترجمہ ہوا یا نہیں لیکن فرانسیسی میں متعدد تصانیف کے تراجم موجود ہیں۔ اس کی تصانیف اس کی شخصیت سے علیحدہ نہیں۔ اور ہر کتاب میں خود بھی کوئی ...

گستاخیوں پر حیرانی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی کتابیں باوجود اس کے کہ مصنف کی شخصیت ہمیشہ ان میں مداخلت کرتی رہتی ہے، شروع سے آخر تک دلچسپی سے پڑھی جا سکتی ہیں۔ ناقدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ بڑا صنعت کار تھا۔

عبدالراشد الخیری مرحوم: ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ سنا کہ دہلی کے مقبول افسانہ نگار راشد الخیری نے ۳ فروری کو اس دنیا سے رحلت کی۔ مرحوم کا سال پیدائش ۱۸۶۸ء ہے۔ ان کے والد حافظ عبدالواحد مرحوم ایک ایسے خاندان کے فرد تھے۔ جس میں کئی مشہور عالم گزرے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مرحوم کی پہلی تصنیف صالحات شائع ہوئی لیکن یہ چنداں مقبول نہ ہوئی۔ ان کی شہرت کا سنگ بنیاد رسالہ مخزن کے مضامین اور منازل السائرہ کی اشاعت نے رکھا۔ ۱۹۰۸ء میں مرحوم نے سرکاری ملازمت ترک کر کے عورتوں کے لیے رسالہ عصمت نکالا جو کامیابی کے ساتھ اب بھی جاری ہے اور اپنی قسم کے بہترین پرچوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں مرحوم اور محمد اکرام صاحب کی ادارت میں رسالہ تمدن نکالا لیکن یہ چند سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ ترک ملازمت کے بعد مرحوم نے اپنی زندگی خدمت ادب اور حمایت نسواں کے لئے وقف کر دی تھی چنانچہ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ۵۰ سے زیادہ ہے۔ کم سن بچیوں کے لیے مرحوم نے پندرہ سولہ سال قبل ایک مدرسہ بھی قائم کیا اور ان کی سرپرستی میں عورتوں کے لیے عصمت کے علاوہ دو پرچے اور نکلے۔ مدرسہ اور پرچے اب تک قائم ہیں۔ عورتوں کی حمایت مرحوم کی زندگی کا مقصد عظم تھا۔ لیکن ابتدا میں آزادی نسواں کے متعلق ان کے خیالات انتہائی درجہ کی قدامت پرستی پر مبنی تھے۔ زمانہ ایک ایسا معلم ہے جو بہ قدر استعداد سب کو سبق دیتا ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مرحوم کے خیالات میں بھی کافی اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی تصانیف میں صبح زندگی کے سلسلے کی کتابیں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان کی وفات سے ایک خاص طرز انشا پردازی کا خاتمہ ہو گیا اور حقوق نسواں کا ایک زبردست حامی اٹھ گیا۔ ہمیں بیگم راشد الخیری اور ان کے لائق فرزند رازق الخیری اور مرحوم کے دوسرے اعزہ سے دلی ہمدردی ہے۔

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میسور: آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا آٹھواں اجلاس بمقام میسور دسمبر کے آخری ہفتے میں زیر صدارت راجا سیوکا نا راؤ بہادر ڈاکٹر ایس کرشنا سوامی آئینگر منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ای۔ پی۔ متکاف وائس چانسلر میسور یونیورسٹی صدر مجلس استقبالیہ کی تقریر کے بعد ہز ہائی نس یوو راج میسور کی تقریر ہوئی اور آپ نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ صدر کی تقریر سے ان کی قدامت پرستانہ تنگ نظری ابلی پڑتی ہے۔ ہندو سوسائٹی کے نقائص کو دور کرنے کے لئے جو تحریکیں ملک میں زور پکڑ رہی ہیں صدر صاحب کو ان سے بالکل ہمدردی نہیں۔ خطیبانہ انداز میں وہ اپنے سامعین سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر ان نقائص کے باوجود قدیم زمانہ کے ہندو ہندوؤں کی تہذیب کو سکندر اعظم کے ممالک میں پھیلا سکے جہاں یہ نقائص نہ تھے، تو پھر آج کیوں ہندوستان کی ترقی کے لیے ان کا دور کرنا لازمی شرط سمجھی جائے۔ خطبہ صدارت میں کوئی جگہ ہندوؤں کے مذہب کے مستقبل پر غور کرنے کے لیے نکالی گئی ہے لیکن ہندوستانی فارسی عربی سے متعلق ایک لفظ اس میں تلاش کرنے پر بھی نہ ملا۔ ہمارا خیال ہے کہ صدر صاحب نے اپنے عہدے کے فرائض کو اچھی طرح سمجھا نہیں۔ یا اس دھوکے میں رہے کہ کانفرنس کو ہندوؤں کی تہذیب اور ہندوؤں کے مذہب کے علاوہ کسی اور چیز سے تعلق ہی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عجیب بات بھی ہمارے سمجھ میں نہیں آئی کہ عربی فارسی کے شعبے کا نام بدل کر شعبۂ اسلامیات رکھ دیا گیا ہے۔ ہندوستانی اور ہندی کے شعبے اس سال بھی نہ کھل سکے

اور ہندوستانی زبان سے متعلق تھے مقالات تھے وہ شعبۂ اسلامیات میں پڑھے گئے۔ یہ غرض کا یہ رویہ صد ہا قابل اعتراض ہے اور علمیان زبان ہندوستانی کو لاتعداد سبب وقت میں [illegible] کرنا چاہیے تا کہ [illegible]۔ ہم ذیل میں ہم ان مقالات کی فہرست دیتے ہیں جو کانفرنس میں پڑھے گئے۔ یا مقالہ نگاروں [illegible] مقالہ [illegible] پڑھے نہیں گئے جو سب [illegible] تو تو نہیں لگا۔ فہرست میں صرف وہی مقالات ۵۰ ہیں ان کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ عام ناظرین معیار کو ان سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔

شعبۂ ایرانیات: صدر پرنسپل پی ڈی انجینیر [illegible] (۱) عمر خیام پر شیث صاحب کا مضمون ازجی ای سکتھ الابنی خیام میں رہبانیت کے جانب معرفت کیں و محبت تھی و بل تصوف میں ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے خیام اور توس زہر کے فلسفۂ زندگی کا مقابلہ کیا ہے جن کا سنہ میں اگر مستقبل ات سے قطع نظر لیکے ان میں پر [illegible] تو خیام جب لی کے نشے میں سرشار نظر آتا ہے۔ براؤننگ اور فینہ کے نظریۂ محبت کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔

شعبۂ اسلامیات: صدر ڈاکٹر ابوالنصر محمد نظام الدین پی۔ ایچ ڈی (کیمبرج) (۱) آغاز میں اردو شاعری کا احیا (عہد آصف جاہ ثانی از عبد القادر سروری ایم اے) دکن میں مغلوں کا عروج دکنی زبان کا زوال ابتدائے دور آصف جاہی میں شاعری کی حالت نظام علی خاں کے دربار میں کن شعرا کو شمالی ہند سے پہنچا اور اس کا اثر شعرا کے تین گروہ جن کی سلطنت سے سرپرستی کی خاص کر کی خاص شمالی ہند کے شعرا کو برتتے تھے اور وہ دکنی شعرا کو مخلوط زبان استعمال کرتے تھے۔

(۲) نظام الملک طوسی کی زندگی اور سیاسی کارنامے کا تاریخی مطالعہ (از ابو محمد خالدی بی اے (عثمانیہ))

(۳) شمس تبریزی اور حافظ کی عرفانی شاعری (از قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی) اسی مصنف نے شمس تبریز کے والد کا نام علاء الدین جلال الدین تحریر کیا ہے۔ یہ دونوں الموت کے اسماعیلی فرماں روا تھے۔ اس سے بعض لوگوں نے شمس تبریز کو اسماعیلی سمجھ لیا ہے۔ شمس کے والد کا نام جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے محمد بن علی بن ملک داؤد یا ملک داؤد تھا۔ شمس اسماعیلی نہ تھا۔ دولت شاہ نے نام علاء الدین لکھا ہے اس کی تردید۔

(۵) مشرق و مغرب کے مشترک نقطے (از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی پیرس)

(۶) اردو شاعری کا لکھنوی اسکول (از ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور عثمانیہ)

(۷) آئینۂ ادب و ایران و حکومت پہلوی (از صدر شعبہ فارسی [illegible]) ایک نئے دور کا آغاز۔ شاہ پہلوی کی حیثیت اور ادبیات ادب کے جدید میلانات۔ صدر حاضر کے فارسی ادبیات کا مختصر جائزہ۔ فارسی کا مستقبل۔

(۸) اسشیر محمد ملا امان [illegible] (از سید محمد ایم اے)

شعبۂ کلاسیکل سنسکرت: صدر ڈاکٹر [illegible] (۱) آیا عمر سماج تمثیل کا نمونہ سنسکرت ادب کا نقص ہے؟ اور دوسرا [illegible] ہے۔ سنسکرت ناٹکوں میں غم والے واقعات موجود ہیں۔ سنسکرت کے شاعروں کے نزدیک ادب کا مقصد وہ ہے کہ غم انجام ناٹکوں کے لکھنے سے مانع آتا ہے۔

(۲) "کالی داس اندھرا دیس کا باشندہ تھا" از گوبند چاریا سوامی مہاراجہ سنسکرت کالج ترانگرام

(۳) "رس کا ایک نیا تصور" از سی۔ آر۔ نارا سمہا شاستری مہاراجہ کالج میسور

(۴) "کالی داس کا پیام" از نارا سمہا شاستری دیوودو ایم۔ اے بنگلور (کالی داس اس خصوصیت میں بے نظیر ہے کہ اس میں اُن کے ادبی محاسن کے ساتھ ساتھ عبادت کے عمیق مذہبی خیالات بھی ہیں۔ اس کی شاعری امید پرستوں کی شاعری ہے۔ شکست کو وہ نہیں جانتا لیکن کامیابی سے دیوانہ بھی نہیں ہو جاتا وہ خوش دلی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں ہے حصول کے لئے اس کے نزدیک یہ ہیں کہ چیزیں جو سدراہ ہیں دور کی جائیں۔ دنیا کی مسرتوں میں وہ حصہ لیتا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ کوئی چیز ہے جو اس سے بلند تر ہے اس لیے اس کی نگاہ میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ انسان اگر مناسب ذرائع اختیار کرے تو ہر بات میں کامیاب ہوگا)

(۵) "سنسکرت میں غم انجام ناٹک" از رام چندر راؤ ایم۔ اے سنسکرت میسور یونیورسٹی (چہ ناٹک بوروبھنگا "کرنا بھارا" وینی سمہارا "چنداکوسی" کا مغربی معیار سے جانچنے کے بعد غم انجام ٹھہرتے ہیں۔ دوسرے ناٹک کو غم انجام کہنے کی وجہ باوجود اس کے کہ ہیرو اس میں مرتا نہیں پہلے ناٹک میں ہیرو کی موت۔ چوتھے میں موت کو ایک خاص پیرایے میں ظاہر کرنا تیسرے میں ہیرو کی موت۔ اس ناٹک کا ہیرو دوریودھن کو سمجھنے کی وجہ۔ ہیرو خاص قسم کے کردار کے لوگ نامور اور عالی مرتبہ اشخاص ہوتے ہیں۔ تیسرے چوتھے ناٹک شیکسپیر کے انداز کے ہیں پہلے دوسرے یونانی انداز کے ان ناٹکوں اور یونانی تمثیلوں کی مشترک خصوصیات)

(۶) "ہندوستانی شعریات میں قوت تخیل" از ٹی این سری کنٹیا ایم اے مہاراجہ کالج میسور۔

شعبہ پراکرت، صدر ڈاکٹر پی۔ ایل وئیدیا ڈی لٹ (۱) "جین رامائن" از نارا سمہاچار ر۔ ایم اے میسور۔

شعبہ تاریخ، صدر ڈاکٹر رادھا سکری پی ایچ ڈی پی آر ایس (۱) "جہاں آرا بیگم" از علم الدین سالک ایم اے لاہور۔

(۲) "نواب علی وردی کی سیرت اور اس کی حکومت" از کالی کنکر دت ایم اے لکچرر پٹنہ کالج پٹنہ۔ (ماخذ: سیر المتاخرین وقائع فتح بنگالہ وفا، احوال علی وردی خاں یوسف علی، تاریخ بنگالہ سلیم اللہ، ریاض السلاطین غلام حسین سلامی (؟) خلاصۃ التواریخ کلیان سنگھ چند شائع شدہ و غیر شائع فرانسیسی و انگریزی کاغذات)

(۳) "پیشواؤں کی زندگی" از راگھوندر راؤ ایم اے میسور (۲) "گوبند پنت بندیلہ دیالی مت" از ایضاً۔

(۴) "ٹیپو سلطان" از ونکٹا سبا شاستری پی ایچ ڈی مہاراجہ کالج میسور (حال کے مصنف تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ٹیپو رعایا کا بہی خواہ تھا اور رعایا میں نامقبول نہ تھا۔ دونوں گھاٹوں کے درمیان جو ہندو رہتے ہیں ان کے ساتھ اس کا سلوک نارواداری کا نہ تھا صرف ویلزلی ہی اسے بیوقوف بنا سکا۔ لیکن جدید شہادتوں کا لحاظ کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معمولی زمانے میں ٹیپو بھی معمولی قسم کا حکمراں تھا۔ لوگوں کے مذہب کا تبدیل کرانا سیاسی اغراض سے تھا۔ وہ اپنے ہندوستانی اور یورپی معاصرین سے زیادہ احمق نہ تھا)

شعبہ اثریات، صدر کے این دکشت ایم اے (۱) "تاریخی عمارات اورنگ آباد" از بی احمد خاں اورنگ آباد

"باٹلی پترا" میں کھدائی میں کون کون سی چیزیں نکلیں از منورنجن گھوش میوزیم پٹنہ۔

شعبۂ فنون لطیفہ وغیرہ۔ صدر پروفیسر شاہد سہروردی بی اے۔ (۱) قدیم ہندوؤں کی تماشا گاہیں: ہندوؤں میں غنائیت ہر دور قدیم ترین ویدوں میں ڈراما کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ [illegible] اور دوسرے مقامات کی کھدائیوں سے شہادت ملتی ہے کہ ویدوں کے دور میں اُنکے قبل بھی باقاعدہ تھیٹر موجود تھے

شعبۂ السنہ دراویدی: صدر آر۔ اے۔ اسما چار ایم اے (۱) تمل کی جدید تولیف اس کا آغاز اور نشوونما، از ڈاکٹر سی نرائن راؤ پی ایچ ڈی۔

شعبۂ السنہ جدیدہ ہند۔ صدر ڈاکٹر ایس کے چٹرجی ایم اے ڈی لٹ [illegible] ایم اے۔

ہندوستانی اکیڈمی: ہندوستانی اکیڈمی کی [illegible] بمقام الہ آباد منعقد ہوئی۔ کانفرنس [illegible] تقریریں ہوئیں۔ [illegible] گورنر [illegible] کونسل جارج [illegible] اس لیے اس [illegible] معیار میں درج کیا جاتا ہے (۱) الہ آباد [illegible] یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس صوبے میں ایک اکیڈمی قائم کی جائے [illegible] اکیڈمی قائم کرنے کے حق میں ہوئی لیکن اس کے [illegible] اس سفارش پر عمل درآمد ہو سکا (۲) اکیڈمی نے اس وقت تک [illegible] شائع کی ہیں۔ [illegible] کیا تھا اور یہ سلسلہ ۱۹۳۲ء تک [illegible] اس وقت [illegible] مصنفین کو دیے ہیں طلبہ کی ہمت افزائی کے لیے [illegible] (۳) شمالی ہند کے اس [illegible] جہاں ہندو [illegible] ہیں بنگلے میں انگلا اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہو سکتی ہے لیکن صوبجات متحدہ میں اردو ہندی کے جھگڑے کی وجہ سے کسی دیسی زبان کا ذریعۂ تعلیم ہونا ناممکن ہے۔ ان صوبوں میں کچھ [illegible] ابتدائی مدارس کے لیے یہ قاعدہ ہوگیا ہے کہ دیسی زبان میں تعلیم دی جائے [illegible] یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ [illegible] اس کی تعلیم کی گئی ہے (۴) اردو ہندی تو دونوں نام [illegible] ان کو ترک کرکے ایک نام ہندوستانی رکھنا چاہیے۔ ہندی والے سمجھتے ہیں کہ بہتر یہ ہے [illegible] دیسی زبان کے الفاظ [illegible] روزمرہ کے ہندوستانی الفاظ [illegible] اردو والے اسے یوں جانتے ہیں کہ [illegible] الفاظ جہاں تک ممکن ہو استعمال کریں اور عربی فارسی الفاظ جہاں تک ہو سکے بھر دیں۔ [illegible] عربی فارسی الفاظ داخل ہو رہے ہیں جو پہلے کبھی سننے میں بھی نہ آتے تھے۔ [illegible] عبدالرحیم، تلسی داس، بہاری لال، ملک محمد جائسی کا کلام بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے لیکن آج کل کے لکھنے والوں کی کتابیں سمجھنے کے لیے قدم قدم پر لغت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مقام مسرت ہے کہ اس رجحان کی مخالفت بھی ہو رہی ہے۔ چنانچہ ہندی کے ایک [illegible] کے سپوت ہیں، ایسے لوگوں کی خوب ہنسی اڑائی گئی ہے جو خواہ مخواہ بڑے بڑے

مخلوط زبان میں شونستے ہیں۔ اُردو ہندی قدیم نام نہیں، اور نہ ان کے ترک کرنے سے یہ ڈر ہے کہ لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی نیز علی محمد شاد مرحوم، شیدعلی بلگرامی مرحوم اور سید سلیمان صاحب ندوی کی رائے ہے کہ اُردو کی جگہ ہندوستانی نام زیادہ موزوں ہے۔ شاد مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو قدیم نام زبان کا نہیں ہے بلکہ ایک تیرھویں صدی کے وسط میں عالم وجود میں آگیا یعنی "زبان اردوئے معلی شاہجہاں آباد" لکھا ہے۔ مصحفی کے اشعار میں جو تیرھویں صدی کی ابتدا کے لکھے ہوئے ہیں۔ "اردو زبان" آیا ہے اور دریائے لطافت جب تصنیف ہوئی ہے تو لفظ اردو زبان کے لیے عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شاد کا قول صحیح نہیں۔ معیار)۔ (۴) عوام کی زبان پر ہزاروں الفاظ ہیں جو خالص ہندوستانی ہیں لیکن شرفا کی زبان سے خارج ہیں۔ اکیڈمی کو ایسے الفاظ کا لغت تیار کرانا چاہیے۔ (۵) ہندی اردو کے مستند مصنفین کی کتابوں کے ناقدانہ نسخوں کا ایک سلسلہ طبع ہونا چاہیے جن کی قیمت ایک روپیہ فی جلد سے زیادہ نہ ہو۔ (۶) ایک مستقل سلسلہ ایسی کتابوں کا شائع ہونا چاہیے جو نہ مغلق ہندی میں ہوں نہ مشکل اُردو میں، بلکہ ایسی زبان میں جس کو اردو والے بھی سمجھ سکیں اور ہندی والے بھی۔ انشا کی کہانی، پنڈت شری دھر پاٹھک اور پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیا کی کہانیاں، نظیر اکبر آبادی اور آرزو کا منتخب کلام اس سلسلے میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ کچھ روپے جو انعامات میں دیے جاتے ہیں ایسے مصنفوں کے لیے مخصوص کر لینے چاہییں جو اُردو ہندی کے فرق کو بڑھاتے نہیں بلکہ کم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ خطبہ صدارت کے بعد اکیڈمی کی کارگزاری کی رپورٹ پڑھی گئی، اور اس کے بعد پنڈت گنگا ناتھ جھا صدر شعبہ ہندی اور عبدالحق صاحب صدر شعبہ اُردو نے اپنے اپنے خطبے پڑھے۔ عبدالحق صاحب کا خطبۂ صدارت رسالہ اردو جنوری میں چھپا ہے۔ انہوں نے ابتدا میں گذشتہ صدی کی چار منظم تحریکوں کا ذکر کیا جن سے اردو زبان و ادب کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ، اور پنجاب یونیورسٹی، پھر اس کی شکایت کی کہ ادبی اداروں میں باہمی اتحاد اور ارتباط نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت سا وقت محنت اور روپیہ رائیگاں جاتا ہے۔ اگر سال میں ایک بار اردو کی خدمت کرنے والوں میں سے وہ لوگ جو اہل نظر اور صاحب رائے ہیں ایک جگہ جمع ہو کر کام کی نوعیت، کام کی تقسیم اس کی ترقی و اشاعت اور جدید ضروریات کے متعلق غور کر کے کچھ امور طے کر لیں اس کے عمل میں لانے کی تدابیر سوچیں اور ان کے انجام دینے کے وقت کا بھی تعین کریں تو یقین ہے کہ وقت محنت اور روپے کی بڑی بچت ہوگی۔ صاحب موصوف نے ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ ایک ایسی کتابیں لکھوائے جو ایسی زبان میں ہوں جو بعینہٖ دونوں رسم الخط میں چھپوائی جا سکیں۔

قابل ذکر مضامین جو جلسے میں پڑھے گئے حسب ذیل ہیں:۔ ڈاکٹر زبیر احمد "اردو قواعد" ڈاکٹر سید محی الدین قادری "دکن کی اُردو شاعری عہد آصفیہ میں" مولوی نعیم الرحمٰن صاحب "اردو کے اعراب" عبدالماجد صاحب "اردو کا واحد شاعر" ریاض الحسن صاحب "آرٹ اور حقیقت" آغا محمد حسین صاحب "قدیم اُردو ادب" سحاب صاحب "ہندوستان کی تربیت جدید میں اردو شاعری کا حصہ" ڈاکٹر سید حسن برنی صاحب "شاہ دولہ" ڈاکٹر تارا چند "دور سلطانی کے امرا" محمد اجمل خاں صاحب "لاطینی رسم الخط کے ذریعے سے ہندی اور اردو کا ملاپ" پنڈت کشن پرشاد کول "اردو ہندی زبانیں" عبدالسلام صاحب ندوی "اردو شاعری کے جدید تجربات کی نوعیت" مہیش پرشاد صاحب "غالب کے خطوط" خاں صاحب سید افضل حسین "نفیس لکھنوی"۔

انجمن ترقی اردو ۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے کتب ذیل بہت جلد شائع ہونے والی ہیں۔ تذکرۂ گل عجائب (۱۱۹۲-۱۱۹۴ھ) مصنفہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی " مرتبہ " از عبدالحق صاحب تقریباً ۲۰۰ صفحے" سودا" تحقیقی مقالہ از شیخ محمد چاند صاحب ۲۲۰ صفحات۔

دیوان آتش عظیم آباد کے اس نامور شاعر کا دیوان دستیاب ہو گیا ہے اور اس کی ترتیب و تہذیب کا انتظام ہو رہا ہے۔ مثنویات مصحفی: مصحفی کی سات مثنویاں تعداد میں ہیں کہ قریب ہی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو کی فرمائش سے قاضی عبدالودود صاحب انہیں مرتب کر رہے ہیں۔ قرینہ ہے کہ اس سال ان کا مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہو جائے۔ تذکرہ میر حسن: یہ تذکرہ ایک بار چھپ چکا ہے لیکن کتابت کی غلطیاں بہت رہ گئی تھیں اور زیادہ قلمی نسخوں کے مقابلے کا بھی انتظام نہ ہو سکا تھا۔ اب قاضی عبدالودود صاحب اسے کئی قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کر رہے ہیں۔ اس کی طباعت انجمن ترقی اردو کی طرف سے بہت جلد شروع ہونے والی ہے۔ ثلاثۂ غسّالہ: اس نام کی ایک کتاب کشف العلوم کی مدد سے حکیم حبیب الرحمن صاحب ڈھاکہ لکھ رہے ہیں اور اب قریب تکمیل ہے۔ قرینہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے اس سال یا سال آئندہ شائع ہو جائے۔ اس کتاب کو حکیم صاحب کی ادبی زندگی کا حاصل قرار دی جائے تو غلط نہ ہوگا اس لیے کہ اس کی تکمیل میں ان کی مدت کے بیس پچیس سال صرف ہوئے ہیں۔ ثلاثۂ غسالہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اول تو کتاب بنگالے کے متعلق ہے دوسرے اس میں تین زمانوں سے بحث کی گئی ہے۔ ثلاثہ غسالہ میں تین کی رعایت تو ظاہر ہے یہ بھی ناظرین کو معلوم ہوگا کہ یہ ترکیب حافظ کے ایک شعر سے ماخوذ ہے اور جس غزل کا یہ شعر ہے وہ حافظ نے سلطان بنگالہ کو بھیجی تھی " شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود "۔ اس کتاب میں ان تمام کتابوں کا ذکر ہوگا جو تینوں زبانوں میں بنگالی مصنفین نے لکھی ہیں۔ بیرونی اشخاص نے بھی جو کتابیں زمانہ قیام بنگالہ میں لکھی ہیں وہ اس میں شامل ہیں۔

دنیا کے بہترین افسانے منصور احمد صاحب (مدیر ادبی دنیا) کی یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اب متعدد افسانوں اور مقدمے کے اضافے کے ساتھ دوسری بار چھپ رہی ہے۔ اپریل تک شائع ہو جانے کی توقع ہے۔

رسول کریم منصور احمد صاحب کے قلم سے امیر علی مرحوم کی روح اسلام کے پہلے حصے کا ترجمہ اپریل تک شائع ہو جائے گا۔

تمدن عرب سید علی بلگرامی مرحوم نے گستاؤلیبون کی اس کتاب کا ترجمہ اصل فرانسیسی سے کیا تھا اور ۱۸۹۸ء میں اس کا مصوّر نسخہ شائع کیا تھا۔ کتاب مدت سے کمیاب تھی سید عبدالقادر صاحب مالک اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن اسے طبع کرا رہے ہیں۔ قیمت طبع اول کے مقابلے میں کم رکھی گئی ہے۔

کتاب الہند بیرونی ۔ سید حسن برنی صاحب بی اے ایل ایل بی (علیگ) بیرونی کی مشہور عالم کتاب کا بظاہر اصل عربی سے ترجمہ کر رہے ہیں اور بفضلہ تعالیٰ انہوں نے یہ کام انجام بھی کر لیا ہے۔ دوسرے باب کا ترجمہ انہوں نے سالنامہ عالمگیر ۱۹۳۶ء میں چھپوایا ہے اور اہل نظر سے متمنی ہیں کہ اس ترجمے کے حسن و قبح سے انہیں آگاہ کریں۔

ہوں براہ کرم تعارف کو غور سے پڑھ لیں۔ (۲) یہاں پر صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں مترجم اپنی خواہش کے مطابق رد و بدل کر دیتا ہے نہ شائع ہوں گے۔ ہر ترجمے کے ساتھ مصنف اور اصل افسانہ نگار یا مضمون کا نام ضرور درج ہونا چاہیے۔ (۳) جو صاحب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں مضمون کے ساتھ اس کی تصریح فرما دیں۔ (۴) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں کہ ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کیے جائیں۔

معاصرین سے ۔ جن معاصرین کو تبادلہ منظور ہو وہ (یہ صرف ادبی رسائل کے لیے ہے) براہ کرم سال رواں کے کل پرچے روانہ فرمائیں تاکہ معیار میں ہم ان کے ادبی مضامین کے خلاصے درج کر سکیں اس عنایت نوازش کے لیے ہم نہایت ممنون ہوں گے۔

مشتہرین سے ۔ مشتہرین میں رسالے کو مقبول بنانے کے لیے اجرت بہت کم رکھی گئی ہے اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی اشتہار شائع ہو سکتے ہیں۔ نرخ نامہ طلب کرنے پر بھیجا جائے گا۔

نمونہ ۔ خاص خاص اصحاب کی خدمت میں معیار کا پہلا پرچہ نمونۃً حاضر ہو رہا ہے امید ہے کہ وہ اس کے مطالعے کے لیے وقت نکال کر ہمیں شکر گزاری کا موقع دیں گے۔ اس کے حسن و قبح سے ہمیں آگاہ فرمائیں گے بعد ازیں بشرط پسند ہمیں اجازت دیں گے کہ ان کا نام خریداروں کی فہرست میں درج کر لیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ دوسرا پرچہ بھیجا تضیع اوقات کا باعث بنے گا۔

مندرجات معیار ماہ مئی

مئی کے معیار میں اس کی مخصوص عنوانات کے علاوہ حسب ذیل مضامین ہوں گے۔

۱۔ اشعار غیر مطبوعہ مرزا غالب۔ ۲۔ دیوان دوم معروف از قاضی عبدالودود مدیر معیار۔ ۳۔ چیخوف افسانے کی ڈالہ ۴۔ قدیم فارسی شاعری از ڈاکٹر نظام الدین استاذ فارسی جامعہ عثمانیہ۔ ۵۔ امانت کی اندر سبھا کے متعلق غلط فہمیاں از آنند وجیلی۔ ۶۔ حسن اُگلاں۔ از گی دموپاسان بہ ترجمہ آرزو جلیلی۔

امیر مینائی اور ان کے خاندان کے بعض افراد کی ایک مجموعی تصویر ہمیں مل گئی ہے۔ ہم اس نایاب تصویر کو مئی کے معیار میں شائع کریں گے۔ یہ تصویر ہمیں جناب ریاض حسن خاں خیال کی عنایت سے مل گئی ہے۔

مقام اشاعت۔ مراد پور بانکی پور (پٹنہ) "منتظم"

دیوان جوشش

جوشش عظیم آبادی کا مشہور شاعر ہے اور اس کی غزلگوئی کے
آج تک معترف ہیں اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ تھا جو وہ بھی
بوسیدہ کرم خوردہ تھا لیکن رتی رتی دو دو اس کا نسخہ ایسوسی ایٹ
کی ذاتی محنت سے مرتب کیا گیا ہے اس کی ایک عجیب خاص بات یہ ہے کہ جوشش
کے حالات میں چند اقتباسات تذکروں سے اور کئی متعدد پیراگرافس میں
صرف کے جوشش کے حالات اور ان کے اشعار کی تنقید شامل کی گئی ہیں
جس میں جوشش کے علاوہ ان کے بھائی محمد علی کے حالات بھی ہیں
اور ان کے صحیفہ ہاں سے بھی بعض اشعار منتخب کئے گئے ہیں کلام جوشش
کو ہم نے یکجا کیا ہے ان کے متعدد نسخوں سے حاصل کیے گئے ہیں اور
یہ دیوان جوشش شائع ہو گیا ہے یہ دیوان ہندوستان بھر کے ادبا
و اہل ذوق کی قدر شناسی کا مستحق ہے لیکن اہل بہار سے خاص طور پر توقع
ہے کہ وہ اس کی خریداری فرمائیں گے یاد رکھنا چاہیے کہ بہار کے قدیم
شعرا میں جوشش کے سوا کسی کا کلام اب تک طبع نہیں ہوا اگر کلام شائع
ہوا ہے تو دیوان جوشش ہی اس حالت میں ہے کہ اگر ہم اس کی اشاعت
کا اہتمام نہ کرتے تو بہت جلد کیڑوں کی نذر ہو جاتا بلکہ کہا جا سکتا ہے
کہ ایک عشق تذکرہ شورش عظیم آبادی کے مصنف عظیم آبادی ہیں
جس کا مسودہ ابھی شائع کیے جانے کے قابل ہے لیکن اس کا وقت آئندہ پر
اس وقت یہی کہنا ہے کہ دیوان جوشش کی خریداری قدردانی ہم پر ظاہر کر دیں
کہ نفیس کاغذ عمدہ چھپائی کے ساتھ ۲۰۰ صفحات کا یہ دیوان طبع ہوگا
پہلے کاتبوں نے کئی بار ... اس کی مناسب قیمت
صرف ... قیمت ۱۰ روپے کے قریب ہوگی۔

درخواستیں بنام منتظم معیار بانکی پور پٹنہ

اصلاحیہ بک ڈپو

مہندرو پٹنہ

مغل اور اردو۔ داستان اردو کا ایک دلچسپ باب۔ از
جناب ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال۔ قیمت صرف ۱۲
داستان عجم۔ قیمت صرف ایک روپیہ عہ
فکر بلیغ۔ از حضرت شاد عظیم آبادی قیمت ۸
ظہور رحمت " " ۴
مادر ہند " " ۲
تاریخ شعرائے بہار جلد اول مؤلفہ سید عظیم آبادی محمود ۹
اردو شاعری کی تاریخ بیان کرنے کے بعد صوبہ بہار کے تین سو شعرائے
متقدمین اور متوسطین کا تذکرہ اور ان کے ادبی کارناموں کی ...
مع نمونہ کلام تین المشاہدوں میں تفصیل مذکور ہے قیمت ۱۲
تذکرہ بہار اور اردو لٹریچر۔ مرتبہ محمودہ خاتون مرحومہ
مسٹرس گرلز اسکول پٹنہ۔ بہار کے جغرافی تاریخی اور ادبی حالات
درج ہیں۔ قیمت صرف دس آنہ۔ ۱۰
اس کے علاوہ بھی کتابیں اردو ادب کی رہتی ہیں۔
خرچ ڈاک و پیکنگ وغیرہ ذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ

منیجر اصلاحیہ بک ڈپو

مہندرو، پٹنہ

نور الحسن پرنٹر و پبلشر نے ... پریس ... سے چھپوا کر دفتر معیار ... بانکی پور سے شائع کیا۔

انجمن ترقی اردو شاخ پٹنہ کا ادبی رسالہ

معیار

مرتب :- قاضی عبدالودود　　　معاون :- آرزو جلیلی

اپریل　　　بانکی پور، پٹنہ　　　۱۹۳۶ء

معیار

سالانہ چندہ للعہ
ممالک غیر سے معہ

فی پرچہ ۱۲ار
کبھی ایڈیشن (دیسی کاغذ) فی پرچہ مہ
ضمیمہ (۴۲ صفحات) فی پرچہ ۲ر

بانکی پور - (پٹنہ)

(جنوری - مارچ - مئی - جولائی - ستمبر اور نومبر میں ۱۱۲ صفحات - باقی مہینوں میں ۴۲ صفحات)

مرتب:- قاضی عبدالودود
معاون:- آرزو جلیلی

جلد ۱ | اپریل سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۲

نمبر	مندرجات	نگارندہ	صفحہ	نمبر	مندرجات	نگارندہ	صفحہ
۱	تعارف	ادارہ	۱۱۳	۶	رسائل کے سالنامے اور خاص نمبر	[illegible]	۱۲۱
۲	آثار ادبیہ:-	~~~	۱۱۵				
۳	صوبہ بہار:-	~~~	۱۱۷	۷	سنہ ۳۶ء کے ادبی مضامین	ادارہ	۱۲۷
	مطبوعات جدیدہ:-			۸	تکملہ:-	ق-ع-د نثر	۱۴۳
۴	اشعار میر	آرزو جلیلی	۱۱۹	۹	مراسلت:-	عبدالحفیظ شمر	۱۳۶
۵	اشعار مومن	آرزو جلیلی	۱۲۱	۱۰	عالم ادب	ادارہ	۱۳۶

تعارف

میرحسن کے اشعار کلیات حسن کے اسی نسخے سے ماخوذ ہیں، جس کا ذکر گزشتہ اشاعت میں کیا جا چکا ہے۔ سراج و مضمون و میشر کی غزلیں تذکرۂ معیار الشعرا مصنفہ منسوب چند ذکا سے نقل کی گئی ہیں۔ اس کا صرف ایک نسخہ دنیا میں ہے، اور وہ دفتر وزارت ہند لندن میں محفوظ ہے۔ ولی عظیم آبادی کے اشعار تذکرۂ عشقی سے لیے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ بھی بہت کمیاب ہے، اور اس کے صرف دو نسخوں کا اس وقت تک پتا چلا ہے۔ صولت مرحوم کے اشعار ان کے مطبوعہ دیوان سے انتخاب کیے گئے ہیں۔ سید محبوب خیر صولت مرحوم اور ان کے استاد حسن بلگرامی کا ذکر سید احمد بلگرامی صاحب نے اپنے مشہور مضمون "س ش م" میں کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ حسن اپنی لکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھا کر اپنے شاگردوں کو مہینے دو مہینے میں شاعر بنا دیتے تھے۔ صولت کا کلام مشاہیر اساتذۂ فارسی کے مقابلے میں

نہیں بیٹھ سکتا، لیکن بہ قدرت نہیں شرک ان پر ہوگا۔ وہ جن کی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ ہے تو ان کی کرامت میں کوئی شبہ نہیں۔ صحت کے حالات بھی ہم کسی موقع پر لکھیں گے۔

مراسلت ۔ یہ باب اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ ادب یا زبان کے متعلق وہ مسائل جو وقتی اہمیت رکھتے ہیں ان سے بحث کی جاسکے۔

تصحیح

مارچ کے پرچے میں کتابت اور طباعت کی غلطیاں اس قدر رہیں کہ ان کی مکمل تصحیح غلط نامے میں نہیں ہو سکی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ناظرین کو دوبارہ زحمت دینی پڑی۔ ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ پرچے صحیح چھپیں۔ اگر کسی پرچے میں غلطیاں رہ جائیں گی تو ان کی تصحیح دوسرے ماہ کے پرچے میں کی جائے گی۔

ص الف س ۲۲ چھاپے ۔ چھپے ۔ ص ۱ مندرجات بابت ماہ مارچ ۔ مارچ (نمبر شمار = شمار)۔ اقتباسات کے بعد فہرست میں ایک عنوان " استفسارات " چھوٹ گیا ہے۔ اس کا شمار ۲۷ ہوگا، اور اس کے بعد ۲۷ کی جگہ ۲۸، ۲۸ کی جگہ ۲۹ اور ۲۹ کی جگہ ۳۰۔

ص ۳/۲۱ پسند = پسند آئیں۔ ۴/۲ ساتھ = سے۔ ۵/۱۲ زبان = کس زبان ۵/۲۲۔ بعض = انہوں نے بعض ۔ ۶/۴
ص ۲۲ = ص ۳۰ ۔ ۶/۲ ملے گی = سکی ۔ ۸/۳ فروری = فروری ہے ۔ ۸/۱۲ ہے اہر = اہر ۔ ۸/۱۲ ملے = منضبط ۔ ۷/۲۲
یہ = پرچی ۔ ۲/۴ گی ہم = سی ۔ [illegible] بیٹھ = اپنے ۔ ۲۲/۲۲ ممکن = ممکن ۔ ۲۶/۲۳ بالاخانہ = بالاخانے ۔ ۲۶/۱۲ زمانہ = زمانے ۔ ۲۶/۸ ہوئی = ہوئے ۔
[illegible] گھر کی منزل = جس کے پاؤں منزل ۔ ۲۹/۲۲ کا پیارہ = کا پیارا ۔ [illegible] منہ = منہ ۔ [illegible] دایاں = دہانہ ۔ ۴۲/۲۲ الا = الا ۔ ۴۸/۳ سکینہ = سکینہ ۔
[illegible] ۔ [illegible] نکلتے ہیں = ۲۶/۱۱ نکلتا ہے ۔ ۴۸/۱۲ بھی حال = حال بھی ۔ ۵۱/۱۱ مزا = مزہ ۔ ۵۶/۲۵ جلوۂ = جلوہ ۔
[illegible] ای ست = ایں است ۔ ۶۰/۱۲ بود واست = بود و است ۔ ۹۲/۱۱ لڑکی = لڑکی کی ۔ ۹۲/۱۰ لکھا ہے = ہے ۔
[illegible] مطلعات = اور مطلع ۔ ۱/۲۴ پھروں = لوں ۔ ۹/۱ کیا = کی ۔ [illegible] ایکس ۔ [illegible] اشتاب = شتاب ۔
[illegible] = کر ۔ [illegible] منقد = منعقد ۔ ۹۸/۱۲ لینا = لینا تھی ۔ ۱۰۰/۱۱ وکٹوریہ = وکٹوریا ۔ ۱۰۵/۱۵ (لارنس = لارنس)
(روبینا = روبینا) (اسٹروبی = اسٹرابی) [illegible] ارض = ارضی ۔ ۱۰۲/۱۲ جزیرہ = جزیرہ نمائے ۔ ۱۰۶/۲۲ رابہ = راجا ۔
[illegible] مقالہ = مقالہ ۔ [illegible] روپیہ = روپیا ۔ [illegible] ہو = ہوں ۔ [illegible] زبیر = زبید ۔ [illegible] (شاہ = شاہ) دیکھئے سکینہ
[illegible] اس کتاب کو ... دی جائے = یہ کتاب ...... دی جائے ۔ (اس کی جو تصحیح سابق میں ہوئی تھی وہ غلط ہے) ۔ [illegible] امتحان = ارتقا ۔

[illegible] صحت ۔ اصلاحات

آثارِ ادبیہ

(۱) مثلثات میرحسن (۲) ترکیب تضمین ایجادِ میرحسن (۳) غزلیات سراج اورنگ آبادی و ممنون دہلوی و قمر الدین منت دہلوی۔

مثلثات میرحسن

گزر ہر دل میں ہے از بس کہ تیرا ۔ ز خود ہرگز نیازارم دلے را ۔ کہ می ترسم در و جائے تو باشد ۔ نظیری
سوا اس کے نہیں درکار کچھ شے ۔ جائے مختصر خواہم کہ در وے ۔ ہمیں جائے من و جائے تو باشد ۔ لاادری
کسی کے درد کو سمجھے گا تو خاک ۔ ترا ہرگز گریبانے نشد چاک ۔ چہ دانی لذت دیوانگی را ۔ حیاتی
نکالا اب کہاں کا اُس نے یہ تیر ۔ چناں آمیزشے کرد است با غیر ۔ کہ بے او در خیال ما نیاید ۔ لاادری
مجھے ٹھہرا گیا نہ آخر کار ۔ رفتم از خویش وقت رفتن یار ۔ او چناں رفت و من چنیں رفتم ۔ ،،
سب طرف سے ہاتھ اُٹھا کے اک دم ۔ سر بر قدمت نہادہ بودم ۔ افسوس کہ روزگار نگذاشت ۔ ،،
کیا حال، ہائے اس میں ایسا خاک ۔ از بس کہ فرو زدیم و شد چاک ۔ ایں سینہ ہمہ بدوختن رفت ۔ لاادری
ٹک دیکھ کے راہ چل ستمگر ۔ از نقش قدم بسے فزوں تر ۔ در راہ تو چشم انتظار است ۔ حزیں
وفا کیسی کہاں کی بے وفائی ۔ شکایت را بود شرطِ آشنائی ۔ چہ باید گفت آں نا آشنا را ۔ [illegible]
اس بت کی ادا نے مجھ کو مارا ۔ گفتم کہ نگاہ کن خدا را ۔ گفتا کہ حنا نگاہ دارد ۔ نسبتی
گر سفر پہ کرے تو نے کسی ۔ بہ غریبان شہر او چو رسی ۔ نسبتی را سلام ما برساں ۔ ،،
دید وا دید ہو گئی کل واں ۔ چشم با چشم شد پیام رساں ۔ از میان منت زباں برخاست ۔ ،،
یہ کج فہمی ہے تیری میں کہوں کیا ۔ ظہوری شکوہ ات از یار بیجاست ۔ تو بے طالع فتادی جرم او چیست ۔ ظہوری
ایک دل ہو کہ جو کدھر لے کر ۔ یک طرف زلف و یک طرف کاکل ۔ جانِ من در کشاکش افتاد است ۔ ،،
بے شرکت غیر آہ یک چند ۔ بودیم بہ دوستیش خورسند ۔ آں نیز نصیب دشمناں شد ۔ امید

ترکیب تضمین ایجادِ میرحسن

(۱)

بلندی پر کوئی کیا اپنے ٹکراے ۔ پہ تیری سی یہ چھب تختی کہاں لائے
اگر سرو ہے پہ بالائے تو باشد ۔ دو چار قد دل آرائے تو باشد

حسن [illegible] کسی کو ہوئے سدا یاد سودا ۔ خوش ہست اندر دل دیوانہ سودا ۔ بشرطے آں کہ سودائے تو باشد
شاہ خوبہ نظر آیا تیرے جلوے کا عجب رنگ ۔ دو عالم را بیک بار از دل تنگ ۔ بروں کردیم تا جائے تو باشد
ابھی کل تو کچھ نہ نکلے مرا کام ۔ یک امروز است ما را نقد ایام ۔ مرا کے صبر فردائے تو باشد

خوشی کے واسطے کوئی کسی کے پاس جاتا ہے (۲) وہ مجھ کو دیکھ کر آگے ہی اپنا منہ بنا تا ہے

"دوم ہر گہ بہ بزم یار تا خوشنود بر خیزم / نگوید با من بیدل سخن تا زود بر خیزم"

جو کوئی بوالہوس ہووے تو ... سے وہیں تن / "سیداد تو کے خواہم جدائی برگزیدم من

کہ از بزمت بہ یک حرف عتاب آلود بر خیزم"

اشارے سے مجھے کرتے ہیں کتنا ہوں اٹھا بیٹھا / "بے ترتیب بزم خاص مجلس می زنی برہم

اگر من ہم دریں مجلس نہ خواہم بود بر خیزم"

خدا جانے کہ کیا عالم ہو اور کیسی پڑے پھر تن / "ز رشک غیر می ترسم چو دام سر زند از من

ز بزم او ہمیں بہتر کہ امشب زود بر خیزم"

غزلیات سراج ممنون و مشیر

(۱) چمن میں گل بدن جب قامت رعنا سے آتے ہیں / بہشتی چھوڑ جنت سایۂ طوبیٰ سے آتے ہیں

مراد خاص اشک واہ طوف کعبۂ دل ہے / کوئی دریا سے آتے ہیں کوئی صحرا سے آتے ہیں

ہجوم داغ کے طرز سے ہنسنے غم کے مالی نے / عجب پھولوں کے دونے گلشن سودا سے آتے ہیں

دل پھر خود بخود کرتا ہوں تعریف اس کے قامت کی / یہی مضمون مجھ کو عالم بالا سے آتے ہیں

کہو کیونکر رہے روح خودی کا سر بچہ قائم / کہ یہ قلقل کے گولے قلعہ مینا سے آتے ہیں

سراجا اس ہستی سے ہو جو کاہ احوال لکھنے کو / عدم کے صاف تحفے کشور عنقا سے آتے ہیں

(۲) کوئی ہمدم نہ ہمدم نہ یگانہ اپنا / روبرو کس کے کہیں ہم یہ فسانہ اپنا

بلبل سی بیٹھے پھول اور نہ دامن کے کنار / کس لیے تھا چمن دہر میں آنا اپنا

فائدہ کیا جو ہوئے شیخ حرم راہب دیر / نہ ہوا دل میں کسی کے جو ٹھکانا اپنا

اے ممنون نامہ کے دنبال ہم اور بیتاب / دیکھیو پر وہ محمل نہ اٹھانا اپنا

(۳) باغ میں کیا ورق گل الٹ گیا / جس کے الٹنے سے ہمدم بلبل الٹ گیا

ہو قہقہہ کبھی اس مست ناز نے / جلنے کا دم بزم قلقل الٹ گیا

شاید کسی کی روح پیاسی تھی اے صبا / جو خود بخود صبوح خم مل الٹ گیا

آتا تھا قیس ناقہ لیلےٰ تری طرف / زنجیر پا کا سنتے ہی وہ غل الٹ گیا

مشکل کہو ترا ہاں گرہ باز اے مشیر / یاں اشک جو مژہ سے گیا ڈھل الٹ گیا

صوبۂ بہار:۔ (۱) کلام شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی۔ (۲) کلام سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی

کلام دل

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا
اب تک دل مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا

ہے تیغ نگہ کا ترے گھائل نہ جیے گا
میں سوچ چکا ہوں دل بسمل نہ جیے گا

اضطراب ہجر میرے دل پہ زور اور پڑا
صبر تیری اس توانائی پہ کیا پتھر پڑا

دھوکے میں ہم کنار وہ طناز ہوگیا
یہ بھی اک اتفاق خدا ساز ہوگیا

کہہ نہ یوسف کو تو اس ماہ لقا سے بہتر
کوئی بندے کو بھی کہتا ہے خدا سے بہتر

ان لبوں سے کہیں کہ کام نہیں
اتنے بھی تو نمک حرام نہیں

دل مضطر کو مارے درد و غم ناحق جدائی میں
یہی انصاف ہے کیا اے خدا تیری خدائی میں

اے ابر ہم تو وہ ہیں اگر چشم نم کریں
طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو ہم کریں

نہ دیکھ اس طرف وہ ظالم مبادا دیکھتا ہی ہو
دل اپنی جان کا دشمن تو مت خواہی نخواہی ہو

پہنچے پائے نہ عارض تلک اس یار کے ہاتھ
زلف نے باندھ لیے جیسے گنہگار کے ہاتھ

کلام صولت عظیم آبادی

از سر نام گذشتن ہمہ نام است ایں جا
دست از کام کشیدن ہمہ کام است ایں جا

بادہ خم خم بکش و نغمہ و شکرانہ بسنج
کہ ہمہ عشرت کونین تمام است ایں جا

زہے زخار رہت گل بہ جیب آبلہ ہا
عبیر خلد بہ کوئے تو گرد قافلہ ہا

نقاب حسن فزاید رخ فرنگ ترا
کند دو آتشہ مینا شراب رنگ ترا

دے قرار نہ گیرد بہ کنج سینۂ من
گر پر از رم آہو بود خدنگ ترا

بود خجانۂ تو خوشتر ز لطفہائے دو کون
بہ صبح گل نہ فروشم ادائے جنگ ترا

خدنگ تو نہ ہمیں می کشد دلم بہ خودش
دلم مدام بہ خود می کشد خدنگ ترا

چکد از جلوۂ ہر عضو تو اے سرخیل آفتہا
بلاہا فتنہ ہا کافر ادائیہا شرارتہا

بہ خواب اندر ز بس عمر رفت انگیزم ہر شب
بود تا رشتہ ہمی تا رو پود بسترم ہر شب

مپرس از روئیداد بزم ما دور از لب قلقت
فغاں خیزد بجائے موج مے انسانم ہر شب

گل آب و رنگ یافتہ موج خون ماست ‌‌‌‌‌ صبح بہار جبینۂ داغ جنون ماست
تسخیر عالمے بقناعت نمودہ ایم ‌‌‌‌‌ آواز پای شکستگی افسون ماست

بے نسبت جامی از دیدۂ پرنم کم نیست ‌‌‌‌‌ در صہباکدہ از حلقۂ ماتم کم نیست
بس کہ از عارض رنگین تو ترشحت بہار ‌‌‌‌‌ گل بہ صحن چمن از قطرۂ شبنم کم نیست

دلم ز ذوق طرب دیدہ از ضیا خالیست ‌‌‌‌‌ بیا کہ جای تو اے شوخ جا بجا خالیست
کدام نالہ چہ مطلب چہ دعا چہ پیام ‌‌‌‌‌ بعالمے کہ منم کوہ از صدا خالیست
گذشتہ اند ازیں دشت با سر پرشور ‌‌‌‌‌ زمین وادی الفت ز نقش پا خالیست
جہان ز جلوۂ آن آفتاب لبریز است ‌‌‌‌‌ نشان دہید کہ یک ذرہ از کجا خالیست
چنان نمودہ مرا از خمیدن مژگان ‌‌‌‌‌ کہ جای اہل تواضع بہ دیدہ ہا خالیست
برنگ نکہت گل صولت از سبک روحی ‌‌‌‌‌ بہ ہر مکان کہ در آیم جاے ما خالیست

سرخ پوشہ نگینے بت رعنائے ہست ‌‌‌‌‌ در سر ما بہ بینید تماشائے ہست

با نسیم وزندگی ماتپیدن است ‌‌‌‌‌ تسلیم جان نمودن ما آرمیدن است

من دمونسے کز ودل تابہ تفتیدہ ماند ‌‌‌‌‌ نفس تار رشتہ جان موئے آتش دیدہ ماند

شب کہ بے صہبائے لعلت خاطرم دلگیر بود ‌‌‌‌‌ قلقل مینا بگوشم نالۂ شبگیر بود

اگر ز خویش خودت رہا توانی کرد ‌‌‌‌‌ چہ گویمت کہ ازیں پس چہا توانی کرد

ہے دل ز ہجوم غم جانان گلہ دارد ‌‌‌‌‌ این خانہ ز انبوہی مہمان گلہ دارد

ساز یا سے کہ روان در تن امید دمد ‌‌‌‌‌ گریہ گیرد ز خندۂ جاوید دمد

از دور شہر و نہ از راہ بیابان رفتم ‌‌‌‌‌ از رہ چاک جگر تا در جانان رفتم
ذوق نظارہ نگر تا بہ چہ عنوان رفتم ‌‌‌‌‌ دل بود گشتم و خون گشتہ بہ مژگان رفتم
ہیچ دانی کہ دران کو بہ چہ عنوان رفتم ‌‌‌‌‌ پائے کوبان بہ دم خنجر بران رفتم

زنی گرد دعا گر سخن از بیم ناشادم ‌‌‌‌‌ گر گرد نہ از خاک زمین شعر بنیادم

چہ گویم کہ خود جلوۂ کیستم من ‌‌‌‌‌ درین پردہ گر او نیم چیستم من

بہ ہر محفل کہ ریزد جلوہ شمع روئے جانانہ ‌‌‌‌‌ خط ساغر شود تار نگاہ چشم پروانہ

از حسن چہ کم گردد اے کافر ترسائی ‌‌‌‌‌ یک جلوہ کرم در راز ناز بفرمائی
مردم بہ تمنایت وقت است کہ باز آئی ‌‌‌‌‌ اے آمدنت جان اعجاز مسیحائی

مطبوعاتِ جدیدہ

۱۔ اشعارِ میر از آنند دہلی۔ ۲۔ اشعارِ مومن از آزاد دہلی۔ ۳۔ زمانہ حالی نمبر از ؟ ۴ ساقی جاپان نمبر از ؟ ۵ ہمایوں سالگرہ نمبر از ؟ ۶ نیرنگِ خیال۔ سالنامہ ۱۹۳۶ء از ؟ ۷ ادبی دنیا سالنامہ ۱۹۳۶ء از تسلم۔ ۸ ادبِ لطیف سالنامہ ۱۹۳۶ء ۔ از سید حسن

اشعارِ میر۔ مرتبہ پروفیسر عبدالمنان بیدل ایم اے پٹنہ کالج۔ ناشر رام نرائن لال الہ آباد۔
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ص۔ ۳۱ + ۱۱۸ قیمت ۱۰ ر

جناب بیدل نے میر کے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ میر کے مختصر حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے یہ کتاب پٹنہ یونیورسٹی میں آئی اے کے نصاب میں داخل ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے ۱۳ صفحات کا تعارف لکھا ہے۔ اس تعارف میں انہوں نے مختلف موضوعات پر میر کے اشعار کا انتخاب کیا ہے اور تقابل کے لیے دوسرے شعرا کا کلام بھی درج کیا ہے پیش لفظ کے عنوان سے بیدل صاحب نے کتاب کی وجہ تالیف بیان کی ہے۔ اس کے بعد ۲۶ صفحات میں میر کے حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ میر کی تصانیف ان کے معاصرین اور شاگردوں کی فہرست دی ہے، اور میر کے عہد کی معاشرت اور شاعری کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔

انتخاب طلبہ کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ کلام پر تبصرہ بھی اسی انداز سے کیا ہے کہ طلبہ کے لیے مفید ہو بعض بیانات محل نظر ہیں:۔

(۱) صفحہ ۱۹ جناب بیدل نے آزاد کا قول نقل کیا ہے کہ "اردو میں واسوخت کے موجد میر ہی ہوئے" آزاد کا یہ قول صحیح نہیں۔ کیونکہ اس سے قبل کا آبرو کا واسوخت موجود ہے۔ (۲) "میر کی مثنویوں میں جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے کوئی مافوق الفطرت عنصر کار فرما نہیں"۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں۔ میر کی مثنویوں میں مافوق الفطرت عنصر پایا جاتا ہے۔ مثنوی شعلۂ شوق ملاحظہ ہو ـــ جو کلیات میر کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہے۔
جناب مرتب سے گزارش ہے کہ "اشعارِ میر" کی دوسری اشاعت میں میر کی مثنویوں کے حوالے سے اپنے اس قول کی تصحیح کر لیں۔ (۳) صفحہ ۲۲ راسخ عظیم آبادی کے سن وفات کے متعلق مرتب نے صرف محو کا سال وفات کا قول نقل کیا ہے، جو نہایت بے پروا تذکرہ نگار ہے۔ واسی نے سال وفات ۱۲۴۰ھ لکھا ہے۔ لیکن صحیح سال وفات ۱۲۳۸ھ ہے جو "سخن شعرا" مرتبہ نساخ میں درج ہے۔ یاس آروی کے دیوان میں راسخ کی

وفات کا قطعہ تاریخ ہے جس سے ۱۲۳۰ھ نکلتا ہے۔ (۴) انعام اللہ خاں یقین کے متعلق مرتب نے مصحفی کے تذکرے کا حوالہ دیا ہے کہ یقین ۲۵ برس کے سن میں مرے۔ دوسرے تذکروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین نے ۲۵ برس سے زیادہ کی عمر پائی تھی۔ (۵) ص۳۹ مرتب نے ہدایت دہلوی کا سال وفات ۱۲۱۵ھ درج کیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ ۱۲۱۵ھ کریم الدین نے لکھا ہے جو تاسی کے تذکرے سے ماخوذ ہے بعض تذکروں میں ۱۲۱۳ھ یا ۱۲۱۹ھ لکھا ہے۔ صحیح سال وفات کی تعیین مشکل ہے۔ قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرے میں ان کو مرحوم و مغفور لکھتے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں لکھا گیا۔ اس لیے صرف یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہدایت ۱۲۲۱ھ کے قبل مر چکے تھے۔ (۶) ص۴۲ میر الم کا سن وفات ۱۲۱۵ھ لکھا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ حقیقت میں الم کا سن وفات ۱۲۲۱ھ کے بعد ہے۔ مجموعہ نغز کی تصنیف کے زمانے میں یہ زندہ تھے۔ (۷) میر سوز کی ولادت کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا کہ ۱۱۳۳ھ میں ہوئی درست نہیں۔ یہ صحیح سن ولادت اب تک تیقن کے ساتھ معلوم نہیں (۸) ص۴۵ "میر محمد بیدار"۔ ان کا نام میر محمد بیدار نہیں بلکہ میر محمدی بیدار ہے اصل نام میر محمد علی ہے۔ (۹) ص۴۷ مرزا احمد علی فدوی دہلوی ۱۱۹۰ھ میں عظیم آباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ صحیح نہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ فدوی کا قیام کبھی فیض آباد، کبھی مرشد آباد، کبھی عظیم آباد رہتا ہے۔ میر حسن کے تذکرے کی تصنیف ۱۱۸۸ھ کے قریب شروع اور ۱۱۹۰ھ کے قریب ختم ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۱۹۰ھ کے قبل ہی سے فدوی عظیم آباد سے تعلقات قائم کر چکے تھے۔ (۱۰) تصانیف کی فہرست نامکمل ہے۔ خصوصاً ذکر میر (میر کی خود نوشتہ سوانح عمری) جیسی اہم تصنیف کا ذکر نہیں جو چھپ بھی چکی ہے۔

مرتب نے خصوصیات کلام میر کی جو تشریح کی ہے اس سے مجھے چنداں اختلاف نہیں لیکن عیوب کلام جو مرتب نے لکھے ہیں وہ میر کے مخصوص عیوب نہیں۔ یہ عیوب ہر غزل گو شاعر کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً تعلی صرف میر ہی کا شیوہ نہ تھا بلکہ ہر شاعر کا۔ میر پر مرتب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ ایک شعر اعلیٰ ہوتا ہے تو دوسرا بالکل پست۔ یہ کمزوری تو صنف غزل ہی کی ہے۔ ضرورت شعری اور قافیے کی پابندی کی وجہ سے غزل میں اس قسم کا ابتذال پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔

مرتب نے میر کے لکھنؤ آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا اور نہ طلبہ کے نقطۂ نظر سے اس کی کوئی خاص ضرورت تھی لیکن میں اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میر اور سودا سے لکھنؤ میں ملاقات نہیں ہوئی۔ بعض بے پروا حضرات یہ لکھ دیا کرتے ہیں کہ میر اور سودا کا لکھنؤ میں یکجا ہونا تحقیق طلب ہے۔ جناب نیاز فتحپوری نے جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار میں لکھا ہے کہ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ میر اور سودا سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی یا نہیں۔ جناب نیاز کا یہ خیال ان کے سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ تاریخ ادب سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ میر ۱۱۹۶ھ اور ۱۱۹۷ھ کے

دہلی میاں لکھنؤ آئے۔ سودا کا سنِ وفات ۱۱۹۵ھ ہے جس میں شک کی مطلقاً گنجائش نہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ سودا اور میر لکھنؤ میں یکجا ہوے ہوں؟

اشعارِ مومن ـ مرتبہ پروفیسر عبدالمنان بیدل۔ ناشر رام نرائن لال الٰہ آباد۔
تقطیع ۲۰×۳۰ ص ۲۰۰۔ قیمت ۱ر

جناب بیدل نے پٹنہ یونیورسٹی کے آئی اے کے طلبہ کے لیے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ یہ کتاب بھی اشعارِ میر کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ مومن کے حالات اور اس کے کلام پر تنقید ۵۲ صفحات میں ہے۔ انتخاب ۱۴۰ صفحات میں ہے۔ انتخاب میں رباعیات غزلیں اور قصیدے ہیں۔ مومن کے متعلق مرتب لکھتے ہیں (ص۲۰) "مومن نے شاعری میں کسی کی تقلید نہ کی۔ بلکہ عام روش سے بالکل الگ اپنا راستہ بنایا جو عام طبائع کو نامرغوب تھا۔ شاعری کی پرانی شاہراہ سے الگ چلنے والا دلیر اور جدت پسند مومن جا بجا ٹھوکریں بھی کھا جاتا ہے مگر اس پر بھی اپنی طبیعت سے نکالے ہوے نئے رستے کو نہیں چھوڑتا۔ ... ." اس کے بعد لکھتے ہیں (ص۲۱) "ناسخ کے تتبع کی وجہ سے کلام میں جا بجا خشکی سی آگئی ہے"۔ مجھے حیرت ہے کہ مرتب نے اپنے پہلے قول کی تین تردید چند سطروں کے بعد ہی کس طرح کر دی! ـ شاعری میں کسی کا تتبع نہ کرنے والا "دلیر اور جدت پسند" مومن ناسخ کا تتبع کس طرح کر سکتا تھا۔ یا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ناسخ کا تتبع کرتا تھا، تو وہ دلیر اور جدت پسند کس طرح ہو سکتا تھا؟

نیرنگِ خیال، سالنامہ ۱۹۳۶ء، مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب حجازی تقطیع ص ۱۶۴ علاوہ تصاویر قیمت ۱۲؍ نیرنگِ خیال مدعی ہے کہ اردو میں سالناموں کی ابتدا اسی نے کی ہے، اور اس دعوے کو قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ رہا یہ سوال کہ یہ بدعت حسنہ ہے یا بدعت سیئہ اس کے جواب میں اختلاف کی گنجایش ہے لیکن اس وقت ہم یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے۔ ۱۹۳۶ء کے سالنامے کو ملا کر ۹ سالنامے نیرنگِ خیال نے نکالے ہیں، اور زیرِ نظر سالنامہ اپنے پیشرووں سے کسی طرح کم نہیں۔ خود نیرنگِ خیال کی رائے میں یہ ایک محیر العقول کارنامہ ہے دوسرے رسائل تو کسی شمار میں نہیں، نیرنگِ خیال کے سابق سالناموں سے بھی بازی لے گیا ہے۔ نوزائیدہ بچے کہیں اگر ان سے زیادہ ہو جو پروان چڑھ چکے ہیں تو تعجب کی کوئی بات نہیں بہ قولِ حسن یہ بھی "رفتہ رفتہ اپنے قرینے پر آ رہے گا"

دو دن کے چاؤ چوز حسن کے بھی ہو چکے
پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پہ آ رہے

زیرِ نظر سالنامے کو دلچسپ اور مفید بنانے میں شاعر، افسانہ نگار، انشا پرداز، اہلِ تحقیق سب کا حصہ ہے۔ شاعروں میں، حفیظ، ساغر، افسر، آشفتہ، فانی، ذوقی، جوش، اثر کے اشعار موجود ہیں۔ جوش کا دماغ تشبیہ سازی کا ایک کارخانہ معلوم ہوتا ہے جہاں ہر رنگ اور ہر وضع کی تشبیہیں ڈھلتی رہتی ہیں۔ ایک غزل جناب راجا صاحب محمود آباد کی بھی

۹

کلام الملوک ملوک الکلام کے عنوان سے چھپی ہے ممکن ہے کلام اس تعریف کا مستحق ہو لیکن ہمیں اب تک علم نہ تھا کہ والی محمود آباد کو حکومت برطانیہ نے امیر افغانستان اور ہمارا مہاراجاؤں کی طرح بادشاہ تسلیم کر لیا ہے۔ اگر یہ خطاب حکومت برطانیہ نہیں بلکہ نیرنگ خیال کے دربار سے عطا ہوا ہے۔ تو حکیم صاحب کو تاج بخش تسلیم کرنے میں اب عذر نہ ہونا چاہیے۔ افسانو میں بیگما امتیاز حجاب امتیاز علی صاحبہ نے تحفۂ نو دی گئی ہے موصوفہ کے اکثر افسانوں میں اپنی لڑکیوں اور ناتجربہ کار لوگوں کا عشق دکھایا جاتا ہے اشخاص [illegible] عالم محسوس سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس خیالی دنیا کے باشندے ہوتے ہیں جس کی سیر کرنے کی موصوفہ خوگر ہیں اور وہ ادراک سے مخلوقات ہیں کے نام بھی ساری دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ انہی محاورات کے تراجم اس پر مستزاد! موصوفہ کی تصانیف کی [illegible] اہمیت [illegible] ہے وہ پیر لوتی کی یاد دلاتی ہے میں پیر لوتی کبھی جاپان کبھی ترکی کبھی حبش [illegible] ہے موصوفہ صرف ایک ملک پر اور وہ بھی ایسا جو دنیا کے سر و رہ نقشوں میں میں نہ ملے۔ [illegible] فرق یہ ہے کہ پیر لوتی الفاظ سے مصوری کرتا تھا موصوفہ کو وہ قدرت زبان پر حاصل ہے اور [illegible] شناس نظر پائی ہے ٹھنڈی بجلی میں جو کچھ ہوت ہے وہ اس کے نام پر ہے کیونکہ نام کی صحت کا ہی [illegible] ہو سکتا ایک بیوہ کا عروج اور گناہ بے گناہی اپنی قسم کے افسانے میں آپس کے [illegible] اور نور الٰہی مرحوم کی موت کی وجہ سے ناتمام رہ گیا ہے تحقیقی مضامین میں سب سے بڑا حصر خاں اور دوال دیوی سے متعلق سید حسن برنی صاحب کا مضمون ہے اسلام اور عورت ڈاکٹر سید محمد الدین ہاشمی نے لکھا ہے صاحب مضمون فرماتے ہیں کہ اسلام نے نسوانی مسئلے کا "مکمل ترین حل دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور اسلام کے دیگر حقوق کی طرح اس مسئلے کا حل بھی مساوات کی بنیاد پر قائم ہے" اس رائے کے پہلے حصے سے اگر اتفاق بھی کیا جائے تو دوسرے سے اتفاق بالکل ناممکن ہے۔ اور مساوات کو ثابت کرنے میں فاضل مضمون نگار نے تاویل بیجا سے کام لیا ہے اور ان کا استدلال بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اگر طلاق کے معاملے میں مرد و عورت کے حقوق اسلام نے یکساں مقرر کیے ہیں تو پھر جہاں مرد کے حقوق کی تصریح کی گئی ہے عورتوں کے حقوق کی تصریح کیوں نہیں کی گئی؟ مرد کو یہ اختیار ہے کہ کوئی وجہ بتائے بغیر عورت کو طلاق دے دے یہ فعل بہت برا سہی لیکن مرد کے قانونی حق سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا یہ صحیح ہے کہ عہد رسالت میں ناموافقت زوجین کی بنا پر عورت کی درخواست پر نکاح فسخ کر دیا گیا لیکن کوئی حکم عام اس بارے میں نہیں دیا گیا کہ فسخ نکاح کے متعلق ہر عورت کی درخواست عام اس سے کہ کسی بنا پر ہو منظور ہی کر لی جائے گی۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ عہد رسالت میں جو فیصلے ہوئے وہ آئندہ کے لیے بطور نظیر پیش کیے جا سکتے ہیں اور قاضی کا فرض ہے کہ نکاح فسخ کر دے۔ جب بھی مساوات نہیں قائم ہوتی مرد بغیر عدالت میں گئے ہوئے خود فیصلہ کر سکتا ہے اور عورت کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے مرد کو تعدد ازدواج کی جو اجازت ہے اس کے متعلق بحث یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ عورت پابند نہیں کہ شادی شدہ شخص سے نکاح کرے۔ مساوات

جب ہوتی کہ عورتوں کو بھی اس کی اجازت ہوتی کہ ایک سے زیادہ شوہر کریں۔ ترکے کے متعلق بھی صاحب مضمون نے فیصلہ کر دیا ہے کہ "باپ کی جائیداد میں بیٹی کا حصہ جو کم رکھا اس کی تلافی شوہر کی جائیداد سے حصہ دلا کر کر دی، اور یوں بھی شوہر کو تمام اخراج کا کفیل بنا کر باپ کی جائیداد میں سے حصے کی کمی کی تلافی ہو جاتی تھی" اس دلیل کا آخری ٹکڑا اگر صحیح ہے تو شادی شدہ عورتوں کو سرے سے باپ کا ترکہ ملنے کی ضرورت ہی نہیں۔ فاضل مضمون نگار نے کافی غور نہیں کیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ آزاد عورت کے لیے شوہر کا کفیل ہو جانا کافی نہیں۔ ہم شکل ذیل پر انہیں غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں باپ کی سالانہ آمدنی تیس ہزار ہے۔ لڑکے کا حصہ ۲۰ ہزار اور لڑکی کا ۱۰ ہزار ہوتا ہے، لڑکی کی شادی ایک غریب شوہر سے ہوتی ہے۔ کیا مالی حیثیت سے لڑکا اور لڑکی دونوں برابر ٹھہر سکتے ہیں؟ دلیل کا پہلا ٹکڑا بھی اسی قدر کمزور ہے جتنا کہ دوسرا۔ شوہر کی جائیداد میں اگر بی بی کا حصہ ہے تو کیا بی بی کی جائیداد میں شوہر کا حصہ نہیں ہوتا؟ پھر مزید برآں یہ کہ عورت ۴ کی حقدار ہے شوہر ۴ کا۔ اور اگر شوہر ۴ بیبیاں رکھتا ہے تو کسی بی بی کو آدھ آنے سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ اگر مساوات یہی ہے تو اس لفظ کا مفہوم ہمارے اور فاضل مضمون نگار کے ذہن میں الگ الگ ہے۔ فاضل مضمون نگار کو شکایت ہے کہ "ہماری سرشت میں دوسرے مذاہب کے تمدن کا بہت گہرا اثر ہو گیا ہے" اس آئینے میں تو ہمیں انہیں کی تصویر نظر آتی ہے عورت مرد کی مساوات کا تصور تہذیب نو کا پیدا کردہ ہے، کیا ضرورت ہے کہ کھینچ تان کر اسلام کے احکام عہد حاضر کے مزعومات کے مطابق ثابت کیے جائیں۔ عزیز احمد صاحب کا طویل مضمون نذر سے پہلے کی اردو شاعری، پر جتنا طویل ہے اتنا بصیرت افروز نہیں۔ پرویز صاحب نے خالد کی شاعری کا تعارف مناسب طریقے سے کرایا ہے، جاپانی شاعری، پر ایک مضمون لطیف الدین احمد صاحب کے قلم سے نکلا ہے، یہ بھی لطف سے خالی نہیں، اختر صاحب شیرانی اور اختر حسین صاحب کے تراجم بھی اچھے ہیں۔ رشید احمد صدیقی صاحب کا مضمون اصغر کی شاعری پر سنجیدگی اور ظرافت کے اجتماع کا کامیاب نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ صدیقی صاحب اگر "مرشد" کی ہدایت کے بغیر مضمون لکھا کریں تو شاید زیادہ کامیاب ہوں۔

زمانہ کان پور، حالی نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم صاحب ص ۲۰۰ و علاوہ تصاویر قیمت ۱۲ار۔ رسالہ زمانہ کی بڑی وقعت ہماری نظر میں ہے، اور ہم اس کا مقابلہ بازاری رسائل سے نہیں کر سکتے۔ اپنی زائد از سی سالہ زندگی میں اس نے متعدد خاص نمبر کامیابی کے ساتھ نکالے ہیں، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حالی نمبر نہ حالی کے شایان شان ہے اور نہ اس معیار کے مطابق ہے جو خود اس رسالے نے قائم کیا ہے۔ مضامین زیادہ تر سرسری طور پر لکھے ہوئے ہیں ان کا معتد بہ حصہ پہلے بھی کہیں نہ کہیں شائع ہو چکا ہے، اور حالی کی ادبی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے بحث ہی نہیں کی گئی ہے۔ نگم صاحب کی یہ رائے کہ حالی کی شہرت کا دارومدار بہ نسبت نظم کے نثر پر ہے، شاید ہی اہل نظر میں قبول کی جا سکے۔ ایک مضمون زمانہ کی کسی گذشتہ اشاعت سے نقل ہوا ہے۔ مضمون نگار کا نام منشی عبدالرحمن

سید ہاروی صاحب نے بجا پایا ہے کہ یہ مرحوم عبدالرحمن بجنوری ہیں۔ حالی کی تحریر کا عکس اور تین غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل رسالہ ہیں۔ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو ان خطوط کی وجہ سے قدر شناسانِ حالی کو حالی نمبر کی خریداری کرنی چاہیے۔

ساقی دہلی جاپان نمبر، مرتبہ شاہد احمد صاحب و نور الحسن برلاس صاحب، ص ۲۴۰ علاوہ تصاویر، قیمت عہ۔ جاپان گذشتہ صدی میں ایک غیر معروف ملک تھا جس کا نام صرف کتابوں میں ملتا تھا، اب اس کا نام بچے بچے کی زبان پہ ہے۔ پہلے ایک ناقابلِ اعتنا اور ادنیٰ سا جزیرہ تھا، اب دنیا کی بڑی طاقتوں میں اس کا شمار ہے اور اس کی ہمسایہ اقوام اس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف زدہ ہیں۔ اس صدی کے اوائل میں جب جاپان نے روس کو شکست دی ہے تو وہ ایشیا میں مشرق کا نجات دہندہ سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس ملک سے جو عقیدت پیدا ہو گئی تھی اس کی ادبی یادگار ظفر علی خاں کی کتاب جنگ روس و جاپان ہے۔ اس کے بعد مشرقی اقوام کے ساتھ جاپان کا جو سلوک رہا، وہ ایسا نہ تھا کہ اس عقیدت کو قائم رکھنے میں مدد دیتا۔ چنانچہ عہد حاضر کے مشہور شاعر حسرت موہانی نے اپنی مایوسی اور بدگمانی کا اظہار اس طرح کیا:

ہے چین و کوریا کے مٹانے پہ مستعد جاپان بھی ہوا ہے گر مبتلائے حرص

اس بدگمانی اور مایوسی کے باوجود جاپان سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی وہ روبہ تنزل نہیں بلکہ روبہ ترقی ہے۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کو چھوڑ کر تین مستقل کتابیں گذشتہ سال میں صرف اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی ظن غالب ہے کہ اس معاملے میں اردو سے پیچھے نہ ہوں گی۔ ہم ساقی کے جاپان نمبر کا خیر مقدم کرتے ہیں، اور اس کی کامیابی پر اس کے خوش سلیقہ مدیر کو مبارکباد دیتے ہیں۔ بعض رسائل میں یہ اعتراض ہماری نظر سے گزرا کہ چند مضامین سرسری طور پر لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن ہمارا خیال ہے کہ اردو کے رسائل جن حدود سے گزر رہے ہیں، اس میں کسی اعلیٰ معیار کو از اول تا آخر قائم رکھنا قریب قریب ناممکن ہے، اور قلیل قیمت میں ادارہ ساقی نے ظاہری اور باطنی حیثیت سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ صد درجہ قابلِ داد ہے۔

ہمایوں لاہور، سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۳۶ء، مرتبہ بشیر احمد صاحب و حامد علی خاں صاحب، ص ۱۴۲ علاوہ تصاویر۔ پنجاب کے رسائل میں ہمایوں امتیاز خاص رکھتا ہے۔ اس کا سالگرہ نمبر ضخامت اور تعداد تصاویر میں دوسرے رسائل کے سالناموں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن معنوی حیثیت سے کسی سے ہیٹا نہیں۔ اس کے مضمون نگاروں میں دو ہمیں خاص طور پر پسند ہیں، ایک تو فلک پیما، دوسرے فیاض محمود۔ فلک پیما کا تخیل فلک پیما ہو یا نہ ہو دور کی کوڑی ضرور لاتا ہے، اور اس کا انوکھا پن ممکن ہے عام پسند نہ ہو، لیکن اہل نظر کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ فیاض محمود کی ادبی زندگی کی عمر چند سال سے زائد نہیں لیکن ان کے ابتدائی مضامین سے ان کی نکتہ رسی اور افسانوں سے اصول فن سے باخبری کا پتا چلتا ہے۔ اگر وہ زبان میں صفائی پیدا کریں تو ادب اردو میں اپنے لیے مستقل جگہ نکال سکتے ہیں۔ شام کی بزم آرائیاں جوش ملیح آبادی

کی نظم ہے۔ موصوف کا ایک خط بھی ہمایوں میں چھپا ہے جس کے آخر میں کاتب کا نام جوش مرحوم لکھا ہے۔ اگر تخلص کے اختتام سے شعرا کی افتاد طبیعت کا حال کھل سکتا ہے اور جوش صاحب کو اس پر بہت اصرار ہے، تو جوش کے بعد لفظ مرحوم کے اضافے کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ نظم کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے "ڈھانچے" میں وہی اگلے برس کی تیلیاں ہیں جنہیں جوش صاحب سوختنی قرار دے چکے ہیں۔ تصاویر میں ایک قابل غور ہے۔ چار پانچ آدمی مغربی لباس پہنے ہوئے قہقہہ زنی کی مشق کر رہے ہیں، اور بشیر احمد صاحب بہ نفس نفیس اس مجمع کی صدارت فرما رہے ہیں۔ ایک تو ہنسا دوسر دکھا کر ہنسانا، ستم بالائے ستم! انہیں باتوں سے لوگوں میں حسد کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بشیر احمد صاحب کو اس کا خود بھی کچھ احساس ہوا ہے، اور جس طرح نظر بد سے بچانے کے لیے بچوں کی پیشانی پر کالا ٹیکا لگا دیتے ہیں، انہوں نے اس تصویر کے ساتھ ایک بھدی سی نظم بھی شامل کر دی ہے۔ کئی تراجم قابل داد ہیں، لیکن ایک ایسے رسالے میں جس کے مرتب بشیر احمد صاحب ہیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ مصنف بیچارے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے، اور ان کی دماغ سوزی کی اس طرح داد دی جاتی ہے کہ بعض تراجم کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا۔

ادبی دنیا لاہور، سالنامہ ۱۹۳۶ء۔ مرتب جناب منصور احمد صاحب تقطیع ۲۲×۲۹ ص ۲۰۹ تصاویر ۶
قیمت :- (عمہ)

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ اس سال کے بہترین سالناموں میں سے ہے، اس میں ادبی مضامین کا اچھا ذخیرہ ہے۔ مضامین کے انتخاب سے ایڈیٹر کے سنجیدہ مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ سالنامے کے ممتاز مضامین یہ ہیں۔

(۱) شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر۔ از جناب وقار عظیم۔ (۲) تاریخ اردو کا مطالعہ۔ از پنڈت کیفی۔ (۳) اردو ادبیات پر غالب کا اثر۔ از جناب راشد وحیدی۔ جناب وقار عظیم نے اپنے مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ جو لوگ اردو شاعری کو مقامی خصوصیات سے مبرا سمجھتے ہیں انہوں نے نادانی سے کام لیا ہے پھر صاحب مضمون نے مقامی رنگ کا مطلب بیان کیا ہے اور مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ اردو شاعری میں مقامی رنگ کی کمی نہیں۔

جناب احسن مارہروی کے مضمون "ہندوستانی مشاعرے" میں متعدد تاریخی اغلاط ہیں اس مضمون کا بیشتر حصہ "آب حیات" پر مبنی ہے۔ مضمون نگار نے اس مضمون کے متعلق مزید مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ "سوسائٹی کے اجارہ دار" کامیاب تمثیل ہے، لیکن اس کی زبان میں سلاست اور روانی نہیں۔ زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ "وہ مصنف کی بی بی" ایک فرانسیسی ڈرامے کا ترجمہ ہے جس کے مصنف کا نام مترجم نے نہیں ظاہر کیا۔ اس ڈرامے کا مصنف ژوردژ کورتلین ہے۔ مترجم نے ڈرامے کی سرخی کے نیچے لکھا ہے "ایک فرانسیسی ڈراما، ہندوستانی فضا میں"۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ محض کرداروں کے ناموں کو ہندوستانی نام دینے سے ڈرامے کی فضا ہندوستانی کیوں کر ہو گئی؟ اگر مترجم کا اصول صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم کرداروں کے نام جاپانی نہیں بنا دیں اور

اس ڈرامے کا ایک فرانسیسی ڈراما جاپانی فضا میں" بھی ۔ ترجمہ بھی اچھا نہیں مثلاً مترجم نے ایک جگہ لارڈ بائرن کا ترجمہ" ہندوستانی شیکسپیر" کیا ہے کیا شیکسپیر ہندوستانی نام ہے کہ بائرن کا ترجمہ شیکسپیر کر دینے سے ڈرامے کی فضا ہندوستانی ہوگئی!

ادبِ لطیف لاہور سالنامہ ۳۶ء

مرتبہ چودھری برکت علی و میرزا ادیب

تقطیع ۲۰×۳۰ صفحات ۲۰۰ ۔ تصاویر ۔ قیمت ۱ر ملنے کا پتا مکتبۂ اُردو مال لاہور

ادبِ لطیف ایک پیارا رسالہ ہے ، اس لحاظ سے اس کا سالنامہ بہت کامیاب ہے ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے مجھے اس سالنامہ کو سنہ ۳۶ء کے بہترین سالناموں میں شمار کرنے میں تامل نہیں۔ "میٹرلنک" "کلام غالب کی نمایاں خصوصیات" ، "آوارہ مصنف کو تیموری" قابل ذکر مضامین ہیں "میٹرلنک" کے مطالعہ سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ میٹرلنک کے تصنیف کردہ کرداروں کے نام بھی اس کی مثالیت کے آئینہ دار ہیں اس لیے میرا خیال ہے کہ جو لوگ میٹرلنک کے ڈراموں کے ترجمے میں کرداروں کے نام ہندوستانی نالیتے ہیں وہ میٹرلنک کی تحسین کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ صاحب مضمون کی تنقید کا ماحصل یہ ہے کہ غالب کے کلام کو مہمل یا اس کے مشکل اشعار کو محض شعریت کا مرقع کہنے والے دونوں گروہ نے کلام غالب کی حقیقی خصوصیات کو نہیں سمجھا ۔ غالب کے وہ اشعار بھی جنہیں لوگ مہمل سمجھتے ہیں ، پڑھنے والے کے دل پر خاص اثر ڈالتے ہیں ۔ یہ اثر غالب کے ہمعصر شعرا یا ان کے متقدمین کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ غالب کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تخیل ہے ۔ دوسری خصوصیت تحقیق اور تیسری طرز تخیل ہے غالب اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے طرزِ تخیل کے ساتھ جذبات کو پیوست کیا ہے ۔ مضمون نگار نے غالب کے تصورات شعری اور رسالہ حسن وعشق پر بھی بحث کی ہے ۔ اخیر میں غالب کی چند فارسی ترکیبیں نقل کی ہیں ۔ جو ہراندیشہ ، کمال گم ، نسل حیا ، ساحل ، موجِ نگاہ ۔ جناب افسر نے مصحفی کے قیام دہلی کے متعلق صحیح رائے قائم کی ہے تاریخی مضامین میں کوئی محققانہ مقالہ نہیں ۔ مجھے حیرت ہے کہ ادارے نے تذکرہ میں بھی جناب تبسم اور جناب افسر کے مضامین کا تذکرہ نہیں کیا ہے ، اور بعض معمولی ترجموں کی تعریف کی ہے ۔ "شالامار" اپنے طرز کی ایک دلکش نظم ہے ۔ جناب علی اختر کی نظم "غنچۂ پژمردہ" بھی قابل ذکر ہے۔

ادبِ لطیف کا یہ سالنامہ اس قابل ہے کہ شائقین ادب اس کو اپنے کتب خانے میں جگہ دیں

سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

تنویر کراچی (شعر و سخن نمبر) دسمبر ۱۹۳۶ء مرتبہ عبدالحمید جیسلیری: - جلیس ثانی از خواجہ عشرت لکھنوی ص ۹ تا ۱۴۲۔ (۱) محمد حنیف علی رعب، متوطن شاہ آباد ضلع کرنال، فارغ التحصیل، داخلہ تکمیل الطب لکھنؤ ۱۹۰۸ء سند تکمیل، ملازمت شفا خانہ مدرسہ، تقرر بعہدہ طبابت در کلکتہ و چین، واپسی لکھنؤ پر سائیکل سے گرے، پاؤں کی ہڈی ٹوٹی، پھر کلکتے ملازم ہو کر گئے بیمار ہو کر لکھنؤ واپس آئے۔ وفات بعمر ۳۴ سال در وطن ۱۹۱۹ء (۳۰ شعر) تمام اردو و فارسی مشق جلال (۲) میر ذاکر حسین، یاس لکھنوی، مشق مونس و در مرثیہ، بعدہ مشق جلال، واقف عروض، پہلا تخلص ذاکر، پیر توقیر، گندمی رنگ، پستہ قد، چوگوشیا ٹوپی پہنتے تھے، خلیق با وضع، آغا ابو صاحب کے یہاں سلسلہ ملازمت تھا، صاحب دیوان مطبوعہ، شاگرد بھی تھے (۳۰ شعر) (۳) نواب مرزا مہدی حسن خاں رفعت، صاحب دیوان مطبوعہ، گلزار محمدی، لکھنؤ، گورے دبلے، میانہ قد، ثقل سماعت تھا، مشاعرے کیا کرتے تھے، مشق جلال (۱۰ شعر) (۴) محمد قاسم قاسم متوطن کڑہ مانک پور، ہمشیرزادہ امان علی سحر بقول خود لکھنؤ آکر فارسی پڑھانے کی نوکری کر لی تھی، امرا کے یہاں قصیدے لکھ کر لے جاتے، مشاہرے اور جائزے پر معاش تھی۔ زمین کی بھی قلیل آمدنی تھی، جب عشرت سے ملاقات ہوئی ہے تو ۷۰ سال کے تھے، بی بی بچے سب مر چکے تھے، صرف ایک یتیم نواسہ رہ گیا باقی تھا لکھنؤ یا وطن میں انتقال کیا تخمیناً ۳۰ برس قبل، زمانہ ملاقات سنیؔ ۴۴ سال (۲ شعر) (۵) خیراتی لال شگفتہ، ساکن اشرف آباد لکھنؤ، مشق نسیم دہلوی، پستہ قامت، سیاہ فام، لاغر کمر، فارسی میں قتیل سے تلمذ، قادرالکلام، شاعری زیادہ فارسی آمیز، صاحب دیوان مختصر مطبوعہ، تلامذہ بکثرت، ازاں جملہ تبسم کا گلدستہ کاپی لکھنے والا اور نواب کسریٰ جاہ، سنا گیا ہے کہ شاگردوں کو غزل بھی کہہ کر دے دیا کرتے تھے۔ وفات ۳۰ - ۳۲ سال قبل۔ (۱۰ شعر) طالع میں نامرادی حسرت ازل سے ہے + اک بیوفا سے مجھ کو محبت ازل سے ہے + زندگی ہے تو میسر نہ راحت ہوگی + لے مصیبت تجھے اک روز مصیبت ہوگی (۶) نواب کاظم حسین خاں کاظم تخلص ساکن سرائے معالی خاں لاغر، متوسط قد، سانولے، چیچک رو، دستعدار ۳۰، ۴۰ روپے کا وثیقہ اور مصوری کی بھی آمدنی تھی، سنگلاخ زمینوں کا بہت شوق تھا، آسان زمینوں میں شعر کہتے، نازک مزاج تھے اور حفظ مراتب کا بہت خیال تھا، انتقال تخمیناً ۱۰ سال قبل بعمر تخمیناً ۶۰ سال (۷) حکیم شیر علی خاں، سہا تخلص ساکن جھوائی ٹولہ لکھنؤ، گورے، بھرے بھرے، دراز قد، کتابی چہرہ، کرنجی آنکھیں، خوش پوشاک، پہلے شوکت تخلص تھا۔ (۸) غلام محمد خاں، تپش تخلص، ساکن دہلی، دراز قد، فربہ، گول چہرہ، لکھنؤ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو کر آئے۔ اس کے بعد اپنا اخبار شمشیر تیز جاری کیا، تین بیٹے مطلع کا کلام کیا کرتے۔ عشرت کے یہاں اکثر جایا کرتے، خرچ زیادہ، آمدنی کم، دو بیبیاں تھیں

خلیق، مزاج پسند، جانثار حامی زبان دہلی اور اعتراضات برامیر اللغات۔ آخر میں شیر قیصر تیرہ ہو گیا۔ طبیعت پر معاش تنگی پابند صوم
صلوٰۃ، رنگینیاں بھی کم تھیں۔ بڑے لڑکے کا نام نذیر احمد خاں تھا۔ شعر کم کہتے تھے۔ وفات ۱۹۱۰ء (۱۰ شعر) (۸) اشیخ
احمد علی کامل، تخلص، فارسی میں تیم لکھنؤ میں ماخذ چند اولی انگریزی زبان سے ترجمہ کیے۔ اس کے بعد لوہ اخبار میں مترجم انگریزی
ہوئے۔ کالے دبلے، میانہ قد۔ قیام ہوا کشمیری، مولا بعدہٗ گورنمنٹ کالج۔ پیشہ راج۔ مذہب: وفات تخمیناً بعمر قریب ۵۰ تخمیناً (۸ شعر)
(۹) سید عزیت استعجان، ہ تخلص، ہیرہ ماشار اللہ خاں کتابی چہرہ، سادہ لازنگ، میانہ قد تو گوشیا ٹوپی اور چکن کا رومال"
مذہب: وضعدار، تقریباً شصت، ابریشم نو وزہ بی بی استعدا، کامل اشاں کرنا تھے (یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا معیار)
انتقال تخمیناً ۰ سال قبل (۴ شعر) آسیا کی طرح دست دعا ہے ساحت قطع کر۔ دیکھ کیونکر رزق بے وہم و گماں ملتا نہیں۔
(۱۰) شمس العلما سید علی محمد شاد، ۹ سال کی عمر میں انتقال کیا (یعنی شاد کو ہیں عمر بھی صحیح ہیں معیار) حشرت نے
ابتدائے شباب میں پہنچنے والے مغلئی نواب تسبیم کی تعلق کے امراء سے مشاعرے میں شریک ہونے کا ذکر کیا ہے۔ بانی مشاعرہ
نہت تخلص، وکالت پیشہ، " میانہ قد، گندمی رنگ، چیچک رو، نہایت صلیق، وضعدار، ذی ذخ" شہرت بھی شریک مشاعرہ تھے۔
شاد کی عمر اس وقت تخمیناً ۲۰ سال کی ہوگی۔ سب سے آخر میں شاد نے اپنا کلام پڑھا (۴ شعر)

تنویر پانچ، قصیدہ عیدیہ، از صفحی ص ۹ تا ۱۳ (۱) سال تصنیف ۱۳۲۸ھ (یہ صحیح نہیں، ۱۲۰۰ اور ۱۲۰۹ کے
درمیان یہ قصیدہ لکھا گیا ہے معیار) مطلع اول و شعر آخر: حطائے خسروی کچھ یہ بخت کا ہے قصور + کرم سے جو رنجش
نہیں جز اء صور + جو ہیں غلام انھوں کو ہو عید قربانی + جو خیرہ سر ہیں گلا ان کا ہو تہ ساطور (اس قصیدے کے ابتدائی
اشعار محمود ریحن اور شعر المند میں چھپ چکے ہیں، کتابت کی غلطیاں بکثرت ہیں معیار)

ادبیات لطیف، مجوری ۱۹۳۶ء، قدیم کالی اور دہلی ایجنڈا از جناب نیاز ترمذی ص ۹ تا ۱۵ (مضمون کا مقصد بیشتر پنجاب میں اردو کا نمونہ ہے
صدی کے متعلق یہ قول صحیح ہے کہ وہ شاہ کے زمانے میں دہلی گیا تھا۔ اس کے لکھنؤ جانے کا بھی کہیں ثبوت نہیں ملتا معیار) شاگردان غالب، ازجناب
عرشی ص ۳۱ تا ۲۲ (بسلسلۂ سابق جو ختم ۱۹۳۵ء) (۱۱) عبد السمیع بیدل رام پوری، صاحب دیوان نعت (۲ شعر) (۲) حکیم مراد علی بیکانیری
(۳) سید علی حسن بہرہ ہیئت سخن علی کبر آبادی شش سیر اکبر آبادی ہو غالب مصنف خزینۃ القواعد و فتح الاذان شریک مشاعرہ ملا الجواں سنگھ
(۳ شعر) (۴) سید محمد تسلیم میر غلام احمد کوش غالب لکھا ہے (یہ کہیں معلوم ہوتا معیار) نواب اکبر علی خاں کے زمانے میں پانڈوی میں تھے پھر
لکھنؤ گئے (۲ شعر) (۵) حافظ قاضی عبد الرحمن پانی پتی (م ۱۲۹۴ (فارسی شعر ۲) (۶) آفتہ صاحب ۵ دیوان ہے ۱۲۴۲ تا ۱۲۵۰ھ (۵ فارسی شعر)
(۷) محمد حسین تنہا مراد آبادی، دہلی میں غالب کے شش تھے (فارسی شعر ۲) (۸) محمد حسین مرزا پوری، شاہ زخمی مرزا پوری
غالب مصدر مرزا پوری ان کے ششد تھے۔ بیس پچیس سال قبل مرے۔

سلہ مولانا محمد مسیح

کلیم دہلی نومبر مرتبہ جناب جوش ملیح آبادی **حالی کی مصلحانہ شاعری**، از خواجہ غلام السیدین صاحب ص ۱۵۹ تا ۱۶۲،

(۱) "جو شاعر۔ تڑپ اور احساس سے محروم ہے، جس کا دل اپنے زمانے کی خرابیوں پر اور نا انصافیوں پر نہیں دکھتا جو صداقت اور شرافت کی طرف سعی نہیں کرتا، جس کا خون حق و باطل کی جنگ کو دیکھ کر تیز تیز حرکت نہیں کرنے لگتا، ممکن ہے ایسا شاعر اپنے کلام میں محاورے اور روزمرے کا کمال دکھائے، لیکن نگاہ حقیقت بیں میں اس کی وقعت بازی گر کے کرتبوں سے زیادہ نہیں" (۲) "حالی کو حساس اور درد آشنا دل ملا تھا، اور حق پسندی اور حق گوئی کا جوہر عطا ہوا تھا" طبیعت ہمدردی کی طرف مائل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا دل پر گہرا اثر ہوا۔ "حالی کی شاعری ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے، مگر کس کے دل کی ؟ وہ ایک فرد واحد۔ کا دل نہیں، بلکہ ایک قوم و ملت کا، ایک تہذیب و تمدن کا دل ہے جو اپنی وسعت میں ایک جہان درد و آرزو لیے ہوئے ہے"۔ حالی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض ذاتی جذبات و واردات کا آئینہ نہیں، "بلکہ ایک پوری قوم کی داستان عروج و زوال ہے" (۳) دوسری خصوصیت حالی کی نظر کی رسائی اور رائے کی اصابت ہے"۔ حالی نے صرف مرض کی تشخیص ہی نہیں کی بلکہ دوا بھی تجویز کی۔ انھوں نے اسلام کے بھولے ہوئے اصول یاد دلائے" اور مغرب کی اُن خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جو اس کی ترقی کا باعث ہوئی ہیں (۴) زوال سلطانان ہند، اور ان کی قومی سیرت کا مسخ ہو جانا، سید احمد خاں کی تحریک اصلاح، حالی کا مسدس سید احمد خاں کی فرمایش سے، ہر طبقے اور ہر گروہ پر صحیح نکتہ چینی، قصیدہ و نعتیہ (عرض حال) میں اسلام کا صحیح تصور۔ (۵) حالی تمدن اور معاشرت کے "مختلف فیہ مسائل میں ادھر ہوتے ہیں، جو عدل و انسانیت اور انصاف کا راستہ ہے"۔ اقبال کے اس شعر کا جو شیکسپیر کی شان میں ہے، بڑ کمال حالی پر اطلاق ہوتا ہے۔ "حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن۔ دل انساں کو ترا حسن کلام آئینہ"۔ حالی کی شاعری میں قوم کے بلند ترین جذبات اور اعلیٰ ترین مقاصد کی ترجمانی موجود ہے (۶) "حالی کی کامیابی اور اثر آفرینی کی۔ بڑی وجہ ان کا خلوص ہے۔ ان کی شاعری میں بھی وہی خالص سونا دکھتا ہے جس سے ان کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا" تکلف اور تصنع کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا قول صحیح ہے کہ حالی "یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط انسان اور صوفیہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے"۔ اس کی تائید جسٹس سید محمود کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو (بہ روایت سر سید راس مسعود) ان کی زبان سے سر سید کے سامنے نکلا تھا "ابا جان، اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے، ان میں سے کوئی ایسا ہے جس کی پرستش کے لیے تو تیار ہے، تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے"۔

نیرنگ خیال لاہور مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب فروری **محمد شاہ جہانی کا علمی و ادبی طبقہ** ص ۹ تا ۱۶، از سید نیاز احمد ترمذی صاحب (۱) چندر بھان برہمن اکبر آبادی

وفات ۱۲۶۶ھ غزل ۱ ؎ خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لا کے ڈالا ہے ، نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے ، یہ غزل اور لوگوں نے بھی بر ہمن سے منسوب کی ہے ، لیکن یہ معلوم نہیں کہ کس سنہ سے معیار) (۲) ولی رام ولی ، عربی فارسی ہندی کتا تھا ، ۱ ؎ اشکوہ کا شیر خاص ، مثنوی ملقب بہ بخشش ، از مطبع دار العلوم میں چھپ چکی ہے ، کلام سے

چہ دل وارہی ہم دیں و نیا کو دیئے چلا جاتا ہے | چہ دل سے دریں عالم کو سر پر چھوڑ جاتا ہے
چہ ہنگام اجل آید بہ کاوت گو : کو آید | بھالی کا و کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے

(۱ ؎ لوگوں نے بھی اس شاعر کی طرف ان شعروں کو نسبت دی ہے لیکن سند کا پتا نہیں چلتا ، معیار)

معارف

منظر گشنہ مرتبہ سید سلیمان صاحب ندوی ، کتبخانہ دفتر دیوانی حیدر آباد میں کرناٹک کی تاریخ کے مخطوطات از جناب محمد غوث صاحب ص ۱۱۱ تا ۱۲۲ مضمون میں ۴۶ کتابوں کا ذکر ہے جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں :-

(۱) نواب سعادت اللہ خاں ۱۶۵ تک کے حالات (۲) انور نامہ میر محمد اسمٰعیل ابجدی انور الدین خاں اور والاجاہ کے زمانے کی منظوم تاریخ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱۷۰ تک (۳) قصر والاجاہی ۱۲۵۶ تک (۴) فوز عظیم مصنف نامعلوم منظوم ۱۲۱۰ تک کے حالات (۵) شان والاجاہی ۱۲۵۵ تک (۶) سرگزشت زمانہ نیابت مصنف نواب عظیم جاہ ۱۲۲۱ تک (۷) تذکرۃ الانساب مصنف خوشدل (۸) گلستان نسب مصنف ملا عبد القادر ، قادر عظیم خاں ناظر (۹) وقائع امیر الامرا (۱۰) تشریح النوم مصنف امیر الامرا ذاتی حالات اور مشائخ طریقت کے حالات (۱۱) شرف نامہ مصنف حفیظ اللہ خاں خود وفات (۱۲) دستور الالقاب (۱۳) مجموعہ مکاتیب شاہان انگلستان و ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۱۶۴ تا ۱۱۹۴ (۱۴) مجموعہ فرامین شاہ عالم ثانی ۱۱۰۳ تا ۱۲۲۱ھ (۱۵) گلدستہ کرناٹک مصنف حکیم باقر حسین ، کرناٹک کے شعرائے فارسی کا تذکرہ ، (۱۶) جغرافیہ ملاذ ۱۲۰۰ مرتبہ سید شاہ ابو الحسن ۱۲۰۰ زبان اردو ، خطوط کے مجموعے بھی متعدد ہیں ۔

ندیم گیا

مرتبہ جناب انجم گیاوی ندوی ، میر کمال علی شاہ ، المتخلص بہ کمال اور ان کی مثنوی اردو از حافظ سید عبد الرؤف صاحب ص ۱۵ تا ۲۱ ، (۱) پسر شاہ فیض علی ، دپسر زادہ پوتا) شاہ سلیم اللہ گیاوی ، دختر زادہ شاہ غلام علی ، دیوے کے مشہور بزرگ حضرت شاہ برہان الدین سے ننھیالی قرابت تھی مولد و منشا ننھیال موضع دیو ، ضلع گیا ، (۲) میر ندیم نے حاشیے میں لکھا ہے کہ شاہ سلیم اللہ کا مزار محلہ نادرا گنج میں ہے کمال کو بعض نے مانپوری اس وجہ سے لکھا ہے کہ شاہ سلیم اللہ کے ماما شاہ آدم مانپوری تھے ، بعض کے عظیم آبادی لکھنے کا سبب یہ ہے کہ کمال کے بھائی شاہ ذو الفقار علی اور دو بہنیں پٹنے میں رہیں ، مولوی نصیر الدین پھلواروی ان کے سازندے تھے ، (۳) فارسی کی درسی کتابیں ، عربی کی مختصرات ، خاندان اور شہر کے ارباب فضل سے پڑھ کر پٹنہ مٹن گھاٹ کے مدرسے میں پہنچے ، وہاں مولوی زاہد میرٹھی سے تعلیم پائی ، پھر لکھنؤ جا کر مولانا بحر العلوم کے حلقہ درس میں شریک ہوئے

(مضمون نگار نے لکھا ہے کہ نشو و نما دیورے میں پائی، اور اس کے بعد ہی تعلیم کا حال شروع کر دیا ہے یہ صاف نہیں کھلتا کہ فارسی کی درسیات اور عربی کی مختصرات کہاں پڑھیں اگر دیورے میں تو شہر کے ارباب فضل سے کیا مراد ہے؟ معیار)
(۴) ان کا انتخاب خانقاہ برہانیہ کی سجادہ نشینی کے لیے ہوا تھا، لیکن اپنے ماموں، شاہ غلام ولی کے نواسے شاہ خادم علی کے حق میں دست بردار ہو گئے، (۵) لکھنؤ میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، فارسی کا ضخیم دیوان خانقاہ کمالیہ دیورہ میں موجود ہے، اردو کی ایک مثنوی ہے' تعداد اشعار ۴۲۰ (سال کتابت مضمون نگار نے قیاساً ۱۲۱۳ بتایا ہے، لیکن جیسا کہ مدیر ندیم نے لکھا ہے یہ صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ کاتب نے مصنف کے نام کے بعد مغفور لکھا ہے، معیار)
(۶) کمال الحکمت (فلسفے میں) اور چہار درود آپ کی دوسری تصانیف ہیں (۷) سید شاہ ولایت حسین صاحب دیوروی کی زبانی روایت ہے کہ حزیں اسی مکان میں پہنچ کر ٹھہرا تھا جہاں کمال مقیم تھے، مذاکرے سے مباحثے اور مناظرے کی نوبت آئی، حزیں بھی لوہا مان گئے۔ فارسی دیوان کمال میں اس کی طرف اشارے ہیں (جب تک کوئی قدیم سند نہ ہو یہ قابل قبول نہیں، شاہ نے حیات فریاد میں بہ زمانۂ طلب علم حزیں کی خدمت میں ان کی حاضری کا ذکر کیا ہے۔ یہ روایت بھی مصنوعی معلوم ہوتی ہے، معیار) (۸) کم و بیش ۸۵ برس کی عمر میں ماہ جمادی الثانی ۱۲۱۵ھ وفات پائی۔ صحیح سال ولادت معلوم نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ بارہویں صدی کے ربع اول کے بعد پیدا ہوئے۔ اوائل جمادی الثانی میں آپکا عرس ہر سال ہوا کرتا ہے، دریغا سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ سید محفوظ الحق صاحب سے سال وفات، تاریخ وفات، تالیفات اور دیورے کا وطن ہونا معلوم ہوا، اور وہ تذکرہ شورش کا حوالہ دیتے ہیں (بحر العلوم کے شاگرد کا سال ولادت ۱۱۲۵ کے لگ بھگ خلاف قیاس ہے اس لیے کہ خود ان کی پیدائش ۱۱۴۴ھ یا اس کے بعد کی ہے۔ اگر شاعری کا شوق لکھنؤ میں ہوا تو یہ شباب کا زمانہ ہوگا اور لکھنؤ میں ۱۱۷۵ سے قبل شعر گوئی کا بالکل چرچا نہ تھا۔ شاد نے بھی جو کچھ لکھا ہے اس سے ۱۱۲۵ کے بہت بعد پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ تذکرۂ شورش کے حوالے سے کمال کا سال وفات ہرگز معلوم نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ۱۲۱۵ سے ۲۰ برس قبل شورش کا انتقال ہو چکا تھا۔ معیار) (۹) مثنوی فلسفہ آمیز تصوف میں ہے، مختلف سرخیاں مثل حمد و نعت وحدت الوجود، توکل، رضا، تسلیم، قضا و قدر وغیرہ قائم کر کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سلسلۂ کلام میں پنڈوے کا بھی ذکر آیا ہے، وہاں کے شاہ صفی اور ان کے ساتھ سعدی و مہدی کا نام بہت ادب سے لیا ہے۔ شعر اول «الٰہی حمد تیری کب بیاں ہو٭ اگرچہ مو بمو تن پر زباں ہو» (حاشیہ جس شعر پر ہوتا ہے وہ صاحب مضمون نے درج نہیں کیا) مثنوی خلاف قاعدہ ایک بحر میں نہیں، بلکہ دو بحروں میں ہے۔ صاحب مضمون کی نگاہ اس پر نہیں پڑی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں: «یہ سرخی ہے تعریف بنگالہ میں کہ خورشید واں داغ ہے لالہ میں طلب ہے اگر تجھ کو واں جلد جا کہ رہتے ہیں ہر دو ریں یاد دیا۔» شاد مرحوم نے کمال کے حالات کچھ اس طرح سے لکھے ہیں کہ شبہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے کسی دوسرے کمال کا حال لکھا ہو، شاہ سلیم اللہ کا نام شاہ سلام اللہ لکھا ہے اور انھیں کمال کا چچا نہیں بلکہ برادر بتایا ہے، سال وفات بھی ۱۲۱۵ کے بہت

ان کے صاحب زادے جناب مضمون نگار سے ہماری گزارش ہے کہ دیوان فارسی اور حیات فرہاد کے مطالعے کے بعد کمال کے حالات پھر لکھیں۔ اور ان کے اخلاف کا بھی ذکر کریں۔ معیار)

کنول (نگار) خاص نمبر جنوری ۱۹۲۶ء مرتبہ جناب منظر صدیقی **سحر معنی** از جناب سیماب ص ۷۵ تا ۸۲۔ (۱) مولوی غلام امام ابن مولوی اللہ ابن محمد علی نبیرۂ شیخ خیرالدین ابن خیر اللہ العمری، گوپاموی، اسی خاندان سے تھے جس کے رکن ارتضا علی خاں گوپاموی، اور مجتبیٰ علی خاں خوشدل تھے۔ مفتی انعام اللہ سے قرابت قریبہ تھی۔ آخر عمر میں شجاع الدولہ کے دربار میں منسلک ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور وطن میں مدفون ہوئے۔ (۲) انتظام اللہ صدیقی صاحب کے پاس ان کی تصنیف سے ایک مثنوی سحر معنی ہے، جو تصنیف الدولہ کی بیاض میں ہوئی کسی کوٹھی کے متعلق پر لکھی گئی تھی، نسخہ مصنف کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے مصرع اول و آخر سے ابھی دو صورت اتحاد ہے، نہ کچھ قصہ ہے اس میں نہ کہانی۔ مگر یہ مثنوی ہے سحر معنی۔ (کاتب کا لکھا ہوا خاتمہ جو منقول ہے اس میں ان کی سکونت بسوہ لکھی ہے۔ معیار)

یوپی میں اُردو (سلسلہ) از انتظام اللہ صدیقی صاحب ص ۱۹ تا ۲۶۔ یہ کتاب رسالے میں کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ (۱) سعید تخلص مفتی ابوسعید گوپاموی، بحوالۂ تذکرۃ الانساب مصطفیٰ علی خاں، تاریخ خاندان مفتیان گوپامؤ، قلمی بیاض، ہندی اور فارسی کے شاعر (۲) مولوی عبدالرب اکبرآبادی عہد محمد شاہ میں دہلی گئے۔ چین کی کتاب مساحت کا انگریزی سے اُردو میں و لنگا کسر (کذا) مہتمم رصدخانہ کی اعانت سے ترجمہ کیا۔ یہ نسخہ اب تک موجود ہے، نمونۂ عبارت بھی دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب محمد علی شاہ کے وقت میں لکھی گئی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ مصنف کو اتنا بھی علم نہیں کہ اس نام کا ایک بادشاہ اودھ میں گزرا ہے اور اس عہد میں علمی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ہوا تھا۔ کہاں چین اور کہاں عہد محمد شاہ!) (۳) مولوی غلام امام پیدائش ۱۱۰۵ کے لگ بھگ مفتی محمد ولی، شیخ غلام محمد وغیرہ سے علم حاصل کیا، شاعری میں فیض احمد سے مشورہ تھا سال وفات ۱۱۹۵ بحوالۂ مواقیت الفواتح مرتبہ مجتبیٰ علی خاں خوشدل متوفی ۱۲۳۳ھ۔ سال وفات مصطفیٰ علی خاں ۱۱۹۰۔ (۴) حکیم محمد شریف خاں ابن حکیم محمد اکمل خاں خاندانی حالات، ولادت ۱۱۴۰ کے قریب، خطاب اشرف الحکما، جاگیر ۲۰ ہزار از بادشاہ، ترجمہ مشکوٰۃ بزبان فارسی بنام کاشف المشکوٰۃ، ۱۱۹۳، حاشیہ نفیسی حاشیہ شرح اسباب، آثار نبوت، صحیح حماسہ، ترجمہ فارسی قرآن مجید وغیرہ اُردو میں بھی قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے جو مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا حکیم محمد احمد خاں صاحب دہلوی کے پاس موجود ہے سال وفات ۱۲۲۲۔ نمونہ " جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے، لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا تمام عالموں کا بخشنے والا وجود کا آخرت میں تک" یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے تقریباً ۵ سال قبل کا ہے۔ (۳) (تتمہ) دور اول کے عنوان سے ۱۱۰۰ اور ۱۲۰۰ھ

کی کتابوں کی فہرست دی ہے، لیکن اس فہرست میں اس سے بہت قبل کی کتابیں بھی موجود ہیں، اور بکثرت اغلاط ہیں
آزاں جملہ ناصر افضل کا زمانہ ۱۰۵۰ نہیں، آبرو کا دیوان غدر سے قبل طبع نہیں ہوا، شاہ حکیم اللہ نہیں، نام شاہ کلیم اللہ
ہے، عشرۂ کاملہ اردو میں نہیں، حسب ذیل کتابوں کے نام قابل ذکر ہیں) مرأۃ المستطیلین، ابن میر صدی خاں،
روضۂ کرم منشی عبد الغنی، چراغ ابدی تفسیر شاہ عزیز اللہ، ہر سہ کتبخانہ آصفیہ۔ عین الحلاوت، سید محمد چشتی آزاد،
۱۱۵۴ کتبخانہ شیب محمد یہ آگرہ، روضۃ الاطہار مصنفہ نوازش علی مشہدی ۱۱۶۲ معرفت السلوک محمد ولی اللہ قادری،
فقہ محفوظ خانی، قدر عالم بن بدر عالم ۱۱۹۹ ہر سہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد، رسالۂ تصوف نادر علی شاہ قادری
۱۱۹۰ کتبخانہ انجمن محمدیہ بمبئی ترجمہ منظوم، مثنوی مولانا روم از عبد اللہ دہلوی، رسالہ نجیبی از محمد نجیب امیٹھوی (۵)
تفسیر قرآن موسومہ حقانی از سید شاہ حقانی نبیرہ شاہ برکت اللہ مارہروی، تحریر ۱۲۰۶ھ نمونہ" رنج میں نہ ڈالیگا
اللہ، خدائے تعالےٰ کسی کو مگر موافق طاقت اُس کی کے اس کو ہی جو عمل کیا، اور اوپر اس کے جو گناہ کیا"
(۶) حکیم غلام امام اکبر آبادی، طبیب شاہی، رہے۔ اردو ترجمہ چہل حدیث ۱۲۰۶ھ منتخب النجوم علم ہیئت میں ۱۲۱۴ھ
(۷) قتیل فرید آباد، نہیں بلکہ مضافات لاہور کے رہنے والے تھے، کایستھ نہ تھے، کھتری تھے۔ ان کے شاگرد کا نام
امداد الدین تھا، ان کا سال وفات ۱۲۴۰ سے کئی سال قبل ہے، اور بھی اغلاط ہیں۔ معیار) (۸) انشا کے حالات
میں یہ صحیح نہیں کہ ان کے اجداد سمرقندی تھے۔ سودا کے حالات میں بھی غلطیاں ہیں

ادبی دُنیا لاہور، جنوری "**غالب کا تصور حسن و عشق**"، از صوفی تبسم صاحب ص ۴۰، تا ۴۳،
غالب کی شاعری تصوف کی شاعری نہیں، اگرچہ ان کے نزدیک کائنات حُسن حقیقی کا
مظہر ہے۔ حُسن روحانی شے ہے، ازلی اور ابدی، اس کی فطرت میں خود نمائی کا جذبہ ہے اور یہی کائنات کے عالم
ظہور میں آنے کا باعث ہوا۔ انسان اس حسن کا بہترین مظہر ہے، اور حسن کی کشش سے متاثر ہونے کا نام عشق ہے
یہ ایک جذبہ بے قرار، اضطراب پیہم ہے، مجازی جب جنسیت کی حدود میں مقید ہو اور حقیقی جب ایک ہستی دوسری
میں کھو جانے کو ہمیشہ بیتاب ہو، غالب حقیقت کا مشاہدہ مادی عالم میں کرنا چاہتے ہیں، وہ اس پر تصرف
حاصل کرنا چاہتے ہیں، اپنے ذاتی تشخص کو کھو دینا نہیں چاہتے۔ باوجود اس کے ان کا تصور حسن کبھی مادیت محض
سے ملوث نہیں ہونے پاتا۔ ان کی مخاطبت دراصل روح حسن سے ہوتی ہے، اس لیے وہ معشوق کے مختلف اعضا کی تعریف
نہیں کرتے، اور نہ حسن کے لیے خارجی سامان آرائش ضروری سمجھتے ہیں۔ حُسن ابدی راحت ہے "مژدہ خورمی بے ظلی ہلمانی، ابدی جنت فیض
ازل را مانی" کیٹس کے مشہور مقولے "اے نغمہ نگار شوئی اوف بیوٹی از اے جوائے فوراور" کے مقابلے میں غالب نے حسن کی مسرت میں زیادہ وسعت پیدا کر دی ہے۔
غالب کی روح حسن کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہے، لیکن نہیں کر سکتی، ایک شدید خواہش، ایک تشنگی ہے جو نہیں بجھتی

شاہکار لاہور فروری "**تاریخ اردو زبان**" ص ۳۶ تا ۴۲، از جناب تاجور، یہ غالباً ایک کتاب کا جزو ہے، ابھی تمہید ہی ہے، اردو تک بھی نہیں پہنچے۔ معیار)

محکم ۔ (۱) دیوان معروف از ق۔ ع۔ د۔ (۲) میم، جا۔ نمبر۔ از مر۔

دیوان معروف ۔ اس کی اشاعت میں ایسا اشعار نقل کیے گئے تھے یا ان کا حوالہ دیا گیا تھا جو مطبوعہ دیوان معروف میں موجود نہیں۔ لیکن دوسری جگہ ملتے ہیں۔ تذکرہ قاسم۔ ق، تذکرہ گلستان بے خزاں۔ گ، کے مطالعے سے اشعار محکم کئے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان میں یہ غزل مطبوعہ دیوان میں ہے یا نہیں ہے۔

بے شکل اہل داغ اپنا تماشا دنا ۔ دل کے میان اپنے اوراراڑنا ۔ گ۔

اک طرف بخشش اس کی لے معروف ۔ بیرے سامنے گناہ ایک طرف ۔ گ،

چشم تر سے گر کر آ دیکھا تو پانی پھر گیا ۔ یہ بھی تو نوٹ کے طوفان یہ پانی پھر گیا ۔ گ

کیا کریں گے جب سوا نیزے پہ ہوگا آفتاب ۔ ہم تو اسے معروف یاں جلتے ہیں پھرا دھوپ میں ۔ گ +

جو بیمار ہے صا کا وہ دل فریب جواب ۔ تو کاتب کو مجھے دیتا بھلا طبیب جواب ۔ ق۔

جو اُٹھتے قتل کو تھے عاشق بیدل کے ہاتھ ۔ اب ہے تم کو سامنے سو اس قاتل کے ہات (کذا) ق۔

جس کو تکیہ ہے صبا کا اس کو لا دیا تکیے سے کام ۔ سو رہے جب نیند آئی رکھ کے نیچے سرکے ہاتھ ۔ گ +

مے سے منہ سے جو اس کا آ لگا منہ ۔ تو ان نے پیٹ پیٹ اپنا لیا منہ ۔ ق +

ساقیا دیکھے ہے کیا تار رگ ابر سیہ ۔ ہر قطرہ کرتی ہے یاں کا رگ ابر سیہ ۔ ق۔

دیکھ آئینہ مت دیدہ تر ہی تو ہے آخر ۔ ذرہ ہے نہ کرے کام نظر ہی تو ہے آخر ۔ ق +

نہ قیامت کا ت اچھی بات کیا اس شوخ کی ۔ خط دھواں چہرہ پری ابرو ستم تصویر زلف ۔ گ۔

صبح کے مرقد پر کھڑی روتی ہے تو آپ ۔ سو، تیر کیا کیا ہی ہیں دیکھو اس محل میں شمع ۔ گ۔

نالہ وہی ہے کہ ساتھ اس کے غیجا پھٹ جائے ۔ خوشی اک پڑ گئی ہے مرغ گرفتار کو تو ۔ گ +

وہ تفتہ دل ہوں گریے اشک گرم گر برسا ۔ کباب جل کے ہوں دریا میں مچھلیاں ساری ۔ گ +

جان کر شیشہ دل پر جو پہ، کما تھا ہاتھ ۔ یہ اثر دیکھو کہ دست شیشہ گر میں درد ہے ۔ ق +

ہو کئی دن سے ہمیں اب رات کا سونا حرام ۔ جو کے جھٹکوں کے گوشِ سیم بر میں درد ہے ۔ ق +

وہ ہی سے دیکھ کر کہتا ہے بھائی اب تمہا ۔ تو نہ لائیگا مجھے آگے ہی سر میں درد ہے ۔ ق +

جام بھر بھر کے جو ساقی تو پلاتا ہے مجھے ۔ گردش چشم بتاں یاد دلاتا ہے مجھے ۔ ق +

کیا ہوا چھوٹے قفس سے بھی اگر ہم ناتواں ۔ رہ گئے بیٹھے کے بیٹھے یونہی پر کھولے ہوئے ۔ گ۔

شکل آئینہ صفا اے دل اگر پیدا کرے ۔ عکس روئے یار تیرے دل میں گھر پیدا کرے ۔ گ۔

ایک دن معروف برہم ہوگی یہ محفل تمام
حیف گل افسوس بلبل وائے قمری ہائے سرو

یوں ہے دل زلف میں زلف اس ستم ایجاد کے ہاتھ
صید جو دام میں ہو دام ہو صیاد کے ہاتھ

دیوان معروف میں ابھی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں از آں جملہ ۳ دی ہے تحت معرہ - دے ہے تحت معرہ خوش حال وہ کوئی جو وہ ناکام رہ گیا - ہے جو ۸ تنور چرخ میں ہو سرخ ترجس ہوا زیر آب کیونکر - نہ ۱۰ گل عارض کہ تری نازکی - کی تیرے تازگی ۱۳ ہے معروف نام اور یار ہرجائی کا بھرنے دے - بھرنے ۲۰ عشق کی راہ میں نقش قدم و سوز خروش - شور و خروش ؟ ۲۸ قتل کرکے مجھ کو قاتل کیا موحد بن گئے - بن گیا ۔ ۳۱ گو نہ مجاز اور سے سرکا معروف نے - ور دہسر ۴۴ گنہ جرم و تقصیر و موجب سبب - اور دونوں جگہ فاصل ؟) ۵۹ تیرے دیوانے کیے اس ہوش کا دیوانہ ہوں - کے ۶۳ جرم و تقصیر گنہ واسطہ پھر کیا باعث - واو فاضل ۶۲ ایک دم ہو تی نہیں پھر دل لگی ہے ہو گر - ہے ۶۸ آخر اک روز تیغ کم ہو ۸۰ ، در شہر بہ شہر بیرو ، سگ دربان - سگ و دربان ۹۰ نگین دل یہ تیرا - ترا ۱۰۱ حال میرا - مرا ۹۶ سیاہ صفت جوہر اکسیر فنا ہوں - بنا ۹۵ خلد میں بھی وہ صنم - یہ ۱۰۱ پر گندہ دل جہاں کے ہوں نقش نگیں سے میں - پرکندہ ۱۱۱ جو کوہکن - جوں ۱۱۲ پیچ تاب - پیچ و تاب ۱۱۴ جو شخص خوش الحان پر جادو - جوں ۱۱۴ بیان کو ... عمران پر جادو - گو ۱۱۵ نہ کیونکر لوں میں ہر اک سے چھپا منہ - کیونکر ۱۱۸ روز میں نیند مٹس اس پری پیکر کے ہاتھ - تھا ۱۲۳ آنکھ جھپکی ہو اگر ایک بھی شب ہجراں میں کبھی - گر اک ۱۲۲ سوزیدۂ ازل ہوں ڈھب ہے مجھے سیدا کی - شوریدہ صدا ۱۲۰ اکس کا وصف دہن کیا تھا تنگ منہ میں خوشبو گلاب کی سی ہے - کرتی ۱۳ اخیر دشتر کو ہم اسی پہ دھر چلے - پر ۱۴۴ عاشق بیتاب - بیتاب ۱۴۹ روز حکمت یاد ہے - زور ۱۵۰ ہزار حسرت و صد حیف صد ہزار دریغ - وصد ۱۵۱ ہنسا زیر لب اک بھر کے نالے سے دم سرد - ناز ۱۶۰ احیا کا گرچہ معجزہ آرائی ہے مسیح - آرائے ۱۶۲ دل میں باتیں ہوں بھری جتنی زیادہ از حد - کر ۱۴۳ حق سے صحبت کا طلبگار رہا میں - صحت ۲۲ رہے بے ثمر آہ جوں سرو معروف - جوں ۲ جو داں گیا سو مرا ہی ہمدرد ہو گیا - تیرا ؟

ندیم بہار نمبر: ” مولانا سید سلیمان ندوی نے دیباچۂ کلام شاد میں لکھا ہے کہ شتاب رائے شاعر تھا اور شتاب تخلص کرتا تھا۔ اس کے بیٹے کا تخلص راجا تھا اس کی سند مجموعۂ نغز میں ملاحظہ ہو جلد الحفیظ ثمر۔

” جب تک یہ علم نہ ہو کہ سید صاحب نے کس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور نہ اپنی رائے بدلنے کی کوئی ضرورت سمجھتے ہیں مجموعۂ نغز ہماری نظر سے گزرا ہے لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش ، عشقی ، عبرتی نے کلیان سنگھ کا تخلص صرف عاشق لکھا ہے راجا کا ذکر نہیں کیا اور ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ کلیان سنگھ کا راجا تخلص نہ تھا۔ اور قاسم نے غلطی سے ایسا لکھا ہے “ ۔ ؟

مراسلت

جناب مدیر معیار تسلیم

میں آپ کے رسالہ کے ذریعے محکمۂ تعلیم صوبہ بہار کی توجہ اسکولوں کی درسی کتابوں کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ اکثر درسی کتابیں غلط زبان اور غلط معلومات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں "رہنمائے اُردو" حصہ اوّل مؤلفہ لطیف الدین خستہ کے بعض اغلاط بتانا چاہتا ہوں۔ یہ کتاب اسکولوں کے درجہ ہشتم اور نہم کے لیے منظور شدہ ہے۔ اس کی بعض غلطیاں نہایت مضحکہ خیز ہیں:۔

(۱) صفحہ ۵ - "کولمبس دنیا کا زبردست تاریخ داں محقق و عالم فاضل گزرا ہے۔" (۲) صفحہ ۶ "ہومر دنیا کا زبردست تاریخ داں، محقق و عالم فاضل گزرا ہے۔" (۳) صفحہ - "بن جانسن زبردست تاریخ داں اور صاحب قلم تھا۔" مؤلف کی نادانی کا یہ حال ہے کہ تاریخ شاعر اور تمثیل نگار سبھی کو زبردست تاریخ داں، عالم و فاضل اور صاحب قلم سمجھتے ہیں! ایک صدیث کی کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ کئی ہزار جلدوں میں ہے۔ "رہنمائے اردو" اسی قسم کی فاحش غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ٹکسٹ بک کمیٹی کے اراکین اس کی وجہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کتاب اسکولوں کے نصاب میں کیوں داخل کی گئی؟

عبدالحفیظ قمر

عالم ادب

پیلیاس اور میلیسانڈ:۔ میٹرلنک کے اس ڈرامے کا جناب تمنائی نے ترجمہ کیا ہے اور آمنہ وجیلی نے مقدمہ لکھا ہے، جو "ادب لطیف" کے دو پرسالانے میں چھپ چکا ہے۔ کتاب پنجاب بک ڈپو لاہور کی طرف سے زیر طبع ہے۔

مذہب اور باطنی تعلیم:۔ مرزا احمد سعید دہلوی سابق آئی سی ایس کی یہ تصنیف جس کے اکثر اجزا رسالہ شاہکار لاہور میں چھپ چکے ہیں۔ کتابی شکل میں عنقریب آجور صاحب کی طرف سے شائع ہوگی۔

کلیات سودا:۔ شیخ محمد چاند صاحب ایم اے کلیات سودا کا نقادانہ نسخہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے اشاعت کے لیے مرتب کر رہے ہیں۔ انجمن نے ۲۰، ۲۵ قلمی نسخے کلیات کے فراہم کرلیے ہیں اور سودا کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی حاصل کیا ہے۔

رام پور اور غالب:۔ مرزا غالب نے نوابان رام پور اور متوسلین ریاست کو جو خطوط لکھے تھے، وہ محفوظ ہیں اور ریاست کی جانب سے ان کا مجموعہ جلد شائع ہونے والا ہے۔ امتیاز علی صاحب عرشی منتظم کتب خانہ ریاست خطوط کے جمع و ترتیب کا کام انجام دے رہے ہیں۔

REGD. NO. P. 394.

جلد نمبر ۳

انجمن ترقی اردو شاخ پٹنہ کا ادبی رسالہ

معیار

قواعد

(۱) معیار ماہانہ رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال میں صرف چھ پرچے نکلا کریں گے، یہ پرچے جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر، نومبر میں کم از کم ۱۱۲ صفحوں پر شائع ہوا کریں گے۔ بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہوں گے۔ ۳۲ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، دسمبر میں شائع ہوا کریں گے۔ سال بھر میں معیار تصاویر و سرورق کے علاوہ کم از کم ۸۱۶ صفحات پیش کیا کرے گا۔

(۲) سالانہ قیمت للعہ فی پرچہ ۱۲ر۔ نمونے کا پرچہ ۱۳ر کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جائے گا۔ کچھ پرچے معمولی کاغذ پر نمونۃً بھیجنے کے لیے چھاپے گئے ہیں، قیمت فی پرچہ ۸ر۔ اگر وہ پرچے منگانا ہو تو ۸ر کے ٹکٹ بھیجیے۔ جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ بھیجنے چاہئیں۔

(۳) معیار خالص ادبی رسالہ ہے، جو اصحاب اس کی قلمی اعانت کا ارادہ رکھتے ہوں براہ کرم اس کی مخصوص خصوصیات کو مدنظر رکھیں۔ یہاں پر صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں مترجم اپنی خواہش کے مطابق رد و بدل کر دیتا ہے، نہ شائع ہوں گے۔ ہر ترجمہ کے ساتھ مصنف اور اصل افسانہ یا مضمون کا نام ضرور درج ہونا چاہیے۔

(۴) جو صاحب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں مضمون کے ساتھ اس کی تصریح فرما دیں۔ (۵) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں، کہ ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کر دیے جائیں۔

جن حضرات کی خدمت میں معیار نمونۃً بھیجا گیا ہے وہ مطلع کر دیں کہ انہیں معیار کی سرپرستی منظور ہے یا نہیں۔

ورکنگ ممبر و پبلشر نے بیدل برقی پریس مراد پور۔ بانکی پور سے چھپوا کر دفتر معیار مراد پور بانکی پور سے شائع کیا۔

معیار

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کا ادبی رسالہ

معیار

سالانہ چندہ للعہ [جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر اور دسمبر میں ۲۰۰ صفحات، اور بقیہ مہینوں میں ۱۲۰ صفحات] فی پرچہ ۱۲ر
مالک غیر سے للعہ — عمومی ایڈیشن ۸ر
ضمیمہ ۲ر

قواعد

(۱) معیار ماہوار رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال بھر میں صرف چھ پرچے نکلا کریں گے۔ یہ پرچے جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر اور دسمبر میں کم از کم ۱۱۲ صفحوں پر شائع ہوا کرینگے۔ بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہونگے ۴۰ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، اکتوبر اور دسمبر میں شائع ہوا کرینگے۔ سال بھر میں معیار تقریباً سرورق کے علاوہ کم از کم ۱۰۱۶ صفحات پیش کیا کریگا۔ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوگا۔

(۲) سالانہ قیمت للعہ فی پرچہ ۱۲ر۔ معیار کا ایک معمولی ایڈیشن بھی ہوتا ہے جس کی قیمت فی پرچہ ۸ر ہے نمونے کا پرچہ ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔ یہ رسالہ سالانہ خریداروں کو نہیں دیا جاتا۔ جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ بھیجے چاہییں۔

(۳) معیار خالص ادبی رسالہ ہے جو اصحاب اس کی قلمی اعانت کا ارادہ رکھتے ہوں براہ کرم اس کے مخصوص عنوانات کو مدنظر رکھیں۔ یہاں پر صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں مترجم اپنی خواہش کے مطابق رد و بدل کر دیتا ہے، نہ شائع ہونگے۔ ہر ترجمے کے ساتھ مصنف اور اصل افسانہ، ناٹک یا مضمون کا نام ضرور ہونا چاہیے۔

(۴) جو صاحب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں مضمون کے ساتھ اس کی تصریح فرمائیں۔

(۵) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں کہ ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کر دیے جائیں۔

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کا ادبی رسالہ

معاصر

بانکی پور (پٹنہ)

مُرتب۔ قاضی عبدالودود | تصویر:۔ امیر مینائی اور اُن کے اعزہ | مُعاون: آرزو جلیلی

جلد ۱ | مئی سنہ ۱۹۳۶ء | شمار ۳

شمار	مندرجات		صفحہ
۱	سرِ حرفات	از قاضی عبدالودود	۱۳۸
۲	تعارف (۱)	از ق ع و	۱۳۹
۳	(۲)	از جناب اعجاز حسن خاں صاحب	۱۴۰
۴	غالب	غیر مطبوعہ اشعار	۱۴۳
۵	آثار ادبیہ۔ مثنوی تہنیت عید	از میر حسن	۱۴۴
۶	نظم۔ شملہ کی برکھا	از پریم بہاری	۱۴۶
۷	افسانے۔ حسن رائگاں	از موپاساں (مترجمۂ آرزو جلیلی)	۱۴۸
۸	دہات کی جھونپڑی	از چیخوف (مترجمہ جناب عبدالحفیظ تربی)	۱۶۸
۹	تمثیل۔ بدگمانی	از مولیر (مترجمۂ آرزو جلیلی)	۱۷۰
۱۰	مقالات۔ میر تقی میر	از ق ع و	۱۷۹
۱۱	سال وفات حاتم	از ق ع و	۱۸۰
۱۲	صوبہ بہار۔ عظیم آباد اور ایک ایرانی مجتہد	از آقا بہبہانی (مترجمہ جناب یوسف الدین بلخی)	۱۸۳
۱۳	عالم ادب	ادارہ	۱۸۶
۱۴	اوراقِ پارینہ۔ دیوانِ مصحفی	از ق ع و	۱۹۴
۱۵	مکاتبِ مصحفی (؟)	از ق ع و	۱۹۸
۱۶	حیدرآباد کے کتب خانوں اور کتبخانوں میں قلمی نسخے	از جناب سید نظیرالدین قادری صاحب	۲۰۲
۱۷	استفسارات	از ق ع و	۲۰۷
۱۸	محاکمہ۔ دیوان شہرت و دیوانِ عشرت وغیرہ	از ق ع و	۲۰۸
۱۹	مخمس مصحفی وغیرہ	از جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی و ق ع و	۲۱۲
۲۰	گرمی	از جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی و جناب احمد ارشد تستوی	۲۱۲
۲۱	مسار کی زبان	از جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی	۲۱۲
۲۲	اقتباس۔ خسرو کی ہندی شاعری	(ماخوذ از حیات و تصانیف خسرو مصنفہ ڈاکٹر وحید مرزا)	۲۱۴
۲۳	مراسلت۔ بہارتیا سابتیا پریشد کی حقیقت	از جناب عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو	۲۱۷
۲۴	سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین		
	مطبوعات جدیدہ۔		
۲۵	خطبات دراسی	از ق ع و	۲۳۳
۲۶	سالنامہ سہیل	از ؟	
۲۷	کلیم عجم	از ؟	

محمد علیم الدین پرنٹر و پبلشر نے برقی پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر معاصر دارالمحرر انجمن محلہ سید اولاد حسین سے شائع کیا

معروضات

(از ق ع د)

عبدالحق صاحب اور دوسرے محبان وطن جو متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھتے ہیں لاکھ چاہیں کہ زبان کے مسئلے کو سیاسیات سے دور رکھیں، لیکن ہندوستانی سیاسیات کا ترشح ہو کر رہیگا۔ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہزار سالہ میل جول کی یادگار رہے، لیکن ایک جماعت تنگ نظری سے اسے مسلمانوں کے گذشتہ سیاسی اقتدار کی نشانی سمجھ کر اسکے مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ ہندوستان کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس جماعت نے گاندھی جی کی سرپرستی حاصل کرلی ہے۔ گاندھی جی کی شرکت نے اس جماعت کے حوصلے بڑھادیے ہیں اور یہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اردو پر بہت جلد حملہ کرنے والی ہے۔ ناگ پور میں گاندھی جی کا یہ بیان کہ "ملک کی زبان ہندی یا ہندوستانی ہے (یہی ہندی جس کا نمونہ ہنس کے صفحات پر نظر آتا ہے) اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے جو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے یہ زبان مسلمان بادشاہوں کی بنائی اور پھیلائی ہوئی ہے اور اس کا رکھنا اور پھیلانا خاص مسلمانوں کا کام ہے"۔ اردو کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ گاندھی جی کے بیان سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ اگر ہندوستان پر ان کا یا ان کے ہم خیال لوگوں کا قبضہ ہوا تو اردو کا کیا حشر ہوگا۔ گاندھی جی کے راج میں اردو بولنے والوں کے لیے مزید سہولتوں کا حاصل ہونا درکنار، اس کی موجودہ حیثیت بھی باقی نہ رہیگی جو آج ہے۔ ہندی کو ملک کی زبان قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو دفتروں اور عدالتوں سے خارج کی جائیگی اور ہندی کے ذریعہ تعلیم ہونے کے بعد ان لوگوں کو بھی جن کی مادری زبان اردو ہے مجبوراً ہندی سیکھنی پڑیگی۔ اردو بولنے والوں کو اپنے خاص مدرسے قائم کرنے ہونگے، بشرطیکہ حکومت ایسے مدارس کو فرقہ وارانہ مدارس قرار نہ دے جن کا اجرا قانوناً ممنوع ہوگا۔ حامیان اردو میں سے بعض کا رجحان اس امر کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی سے اس مسئلے کے متعلق مزید گفت و شنید کی جائے۔ ہم اسے لاحاصل سمجھتے ہیں۔ تاریخ اور لسانیات کی مدد سے اردو کی ابتدا اور اس کی ترویج کے متعلق آپ گاندھی جی کے نظریے کو باطل ٹھہرا سکتے ہیں۔ آپ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ گاندھی جی کا موجودہ اعلان انڈین نیشنل کانگریس کی منظور کردہ قرارداد کے مطابق نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ خود گاندھی جی کی سابق تحریریں ان کے موجودہ رویے کے خلاف پیش کرسکتے ہیں، لیکن کیا آپ ایسے شخص کو قائل کرسکتے ہیں جو الہام الٰہی سے براہ راست تعلقات رکھتا ہے اور جس کا ہر قول و فعل دیوتاؤں کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے؟ ہمیں یقین کامل ہے کہ گاندھی جی اپنے موجودہ طرز عمل اور پرانی روش میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتے۔ جنگ عظیم میں انگریزوں کے لیے رنگروٹ بھرتی کرانے کے بعد بھی اگر وہ اپنے کو عدم تشدد کا حامی تصور کرتے رہے تو ہندوستانی اور ہندی۔ ہندوستانی کو ایک سمجھنا ان کے لیے کونسی بڑی بات ہے۔

حامیان اردو کو اس موقع پر کیا کرنا چاہیے، اس سے ہم آئندہ بحث کرینگے۔

تعارف

(۱) از قاضی عبد الودود، (۲) از جناب اعجاز حسن خاں صاحب۔

(۱)

از قاضی عبد الودود

میرزا غالب کے اشعار تذکرۂ عظیم الدولہ سرور سے ماخوذ ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ ہندوستان میں بھی ہے لیکن جو نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے وہ دفتر ہند لندن میں ہے۔ اس تذکرے میں میرزا کے اور اشعار بھی ہیں لیکن ہم نے وہی نقل کیے ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

مثنوی میر حسن کا ایک مصرع صریحاً غلط ہو جناب خیال کی قیاسی تصحیح حاشیۂ مثنوی میں درج ہے لیکن وہ بھی اس سے مطمئن نہیں۔ اگر کسی صاحب نے یہ مثنوی کہیں اور دیکھی ہو تو اس مصرعے کی طرف توجہ فرمائیں۔

حسن رانگاں لا بوتے ان یوتیل کا ترجمہ ہے، دماغ چوپیڑی کا انگریزی نام لے کنٹری کوبچ ہے۔ بدگمانی لاژ الوزی کا ترجمہ ایک جگہ مترجم کو اصل میں ترمیم کرنی پڑی ہے جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔

آقا احمد بن محمد علی بن محمد باقر الاصفہانی المشہور بہ بہبہانی کا مولد و منشا ایران تھا۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے ربع اول میں ہندوستان آئے۔ ان کے سفرنامے کا نام مراۃ الاحوال جہاں نما ہے۔ اس کے تین قلمی نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں، دو پٹنے میں اور ایک کلکتے میں۔ آقا بہبہانی تین بار عظیم آباد آئے۔ اس شہر کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ معیار میں بہ اقساط شائع ہوگا۔

معین الدین دردائی صاحب کے مضمون میں بہت سے اشعار غلط معلوم ہوتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ اصل نسخوں میں یہ اشعار اسی طرح درج ہیں۔ امیر خسرو کی ہندی شاعری ڈاکٹر وحید مرزا کی انگریزی کتاب لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو کے ایک باب کا خلاصہ ہے ہم ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے زبان کے لحاظ سے معیار کو جانچا، اور اس کی اغلاط سے ہمیں واقف کیا۔ ان کے مفصل خط کا ایک حصہ اس بار شائع ہو رہا ہے، باقی آیندہ شائع ہوگا۔ صاحب موصوف کے اکثر اعتراضات صحیح ہیں، لیکن بعض غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ ہم آیندہ مہینے اس خط کے متعلق اپنی رائے بھی ظاہر کریں گے۔

سالنامۂ سہیل کا حسن ترتیب اور اس کی تصاویر اسے دوسرے سالناموں سے ممتاز کرتی ہیں، معیار کا تبصرہ ان خصوصیات کو اچھی طرح نمایاں نہ کر سکا۔ ہمیں اس فروگزاشت کا افسوس ہے۔

تصحیح

اپریل۔ صفحہ ۱۴۳ سطر ا مطالعہ۔ مطالعے، ص ۱۰۵ از میان منت زباں برخواست۔ از میاں منت زباں برخاست ص ۱۱۵ چھپ تخی۔ چھپ تختی ص ۱۱۰ طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو کم کریں۔ طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو ہم کریں۔
مارچ ص ۲۶ ٹھنڈھی ٹھنڈی ص ۱۰۵ صیابت۔ اصابت۔

(۲)

از جناب اعجاز حسن خاں صاحب

منشی امیر احمد امیر مینائی (۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ تا ۱۹ جمادی الاخرہ ۱۳۱۸ھ) کے محاسن و اوصاف اپنی شہرت کے باعث کسی تعارف کے محتاج نہیں عنفوان شباب ہی کے زمانے سے آپ کو اساتذہ عصر قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مرزا غالب مرحوم اپنے عزیز شاگرد منشی شیو نرائن صاحب آگرہ والے جو رسالہ معیار الشعرا شائع کرتے تھے) ایک خط میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"یہ میرے دوست ہیں اور میرا ان کا [illegible] ہے۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں [illegible] صاحب [illegible] ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں [illegible] یعنی غزلیں غالب نے [illegible] اس کا حال معلوم ہوا۔ اس کو ابکے معیار الشعرا میں چھاپ کر ایک [illegible] رام پور بدرِ دولت حضور رسیدہ بصحت [illegible] مجھ کو اس کی اطلاع [illegible] مرسلہ یکشنبہ ۱۲ جون ۱۸۶۵ء۔"

(اردوئے معلیٰ مطبوعہ دہلی ص [illegible])

جس وقت مرزا صاحب نے یہ خط لکھا ہے امیر مینائی کی عمر اکتیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ غدر سے پیشتر لکھنؤ میں شاہ اودھ کے دربار میں مصاحبت کا اختصاص حاصل تھا اور شاہی مشاعروں میں بھی شرکت فرماتے تھے۔

مولوی [illegible] صاحب مرحوم [illegible] مولوی منشی طالب حسن مرحوم امیر مینائی کے برادر بزرگ) سے پڑھی تھی اور شاعری میں [illegible] کے شاگرد تھے [illegible] بیان فرماتے تھے کہ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں بادشاہ نے ان کو گلے سے لگا لیا اور چند بار ایسا ہوا کہ شال جو [illegible] اس کا ایک سرا منشی صاحب کے شانے پر رکھ دیا۔ یہ نوازش خوشنودی خاص کے اظہار کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ جب اودھ کی سلطنت کو زوال آیا غدر کے زمانے میں آپ کا گھر تک کھد گیا یہ رباعی فرمائی ؎

گھر کھدنے کی پوچھو۔ مصیبت ہم سے | روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہوکر | یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

گھر کے ساتھ گھر کا سامان اور پہلا دیوان بھی ضائع ہو گیا۔

غدر کے بعد آپ کو فردوس مکان نواب یوسف علی خاں ناظم تخلص فرمانروائے رامپور نے رامپور بلا لیا اور حاکم عدالت بنایا۔ کبھی کبھی مشورۂ سخن بھی آپ سے فرماتے تھے۔



* امیر مینائی اور ان کے اعزہ *

فنِ سخن میں ان کی اُستادی اور قادر الکلامی مسلّم الثبوت ہے۔ وہ آخری دور میں غزل گوئی کے سوا کہ اس صنف خاص میں میرزا داغ کو فضیلت تھی، جملہ اصنافِ سخن میں اپنے کُل معاصرین سے افضل تھے۔

قطعِ نظر شاعری کے اخلاقِ حسنہ، صفاتِ برگزیدہ، علم و عمل، زہد و ورع اور عبادت میں زبان اردو کا کوئی شاعر باستثنائے حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ آپ کے ایسا نہیں ہوا۔ سلسلہ چشتیہ صابریہ میں حضرت سید محمد امیر شاہ سے بیعت تھی، پیر و مرشد سے خلافت بھی ملی تھی۔ شمس العلما علّامہ شبلی نعمانی مرحوم مجھ سے فرماتے تھے کہ "شاعری کے سوا بھی ان میں ایسے اوصاف تھے کہ صرف اُن اوصاف کے لحاظ سے اُن کے سوانح لکھے جائیں۔" افسوس ہے کہ منشی صاحب کے حالات میں اب تک کوئی مفصل کتاب شائع ہوئی۔ مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے آپ کے مکتوبات چھاپے ہیں اُس کے ساتھ کچھ حال بھی لکھا ہے اور نواب فصاحت یار جنگ جلیل مانکپوری نے بھی ایک کتاب آپ کے متعلق تصنیف فرمائی ہے مگر اُس میں بھی حالات کا حصہ بہت کم ہے۔

منشی صاحب کے تصنیفات نظم کے علاوہ نثر میں بھی متعدد ہیں۔ اردو کے سوا فارسی میں بھی صاحبِ دیوان تھے، عربی اشعار بھی کبھی کبھی فرماتے تھے۔ مگر باستثنائے معدودے چند آپ کے اور تصانیف ابتک چھپ کر شائع نہیں ہوئے۔

راقم الحروف کے خاندان سے تعلقات کا آغاز میرے والد ماجد حکیم محمد ہادی حسن خاں نایاب مرحوم و مغفور کے زمانے سے ہوا۔ والد مرحوم شعر و سخن میں حضرت اسیر سے (جو جناب امیر مینائی کے اُستاد تھے) اصلاح لیتے تھے۔ ۱۲۹۹ھ میں جب حضرت اسیر کا انتقال ہو گیا تو والد مرحوم نے حضرت امیر مینائی کی طرف رجوع کیا مگر اس کے بعد بہت تھوڑے دنوں زندہ رہ کر ۳ رجب کو ۱۳۰۰ھ میں انتقال کیا اس وجہ سے غالباً زندگی میں اصلاح سخن کی نوبت نہیں آئی۔ اگر آئی ہو تو دو ایک غزل کے سوا نہیں آئی ہوگی۔ جب میرے والد مرحوم کا انتقال ہو گیا، میرے چچا، محمد صدیق حسن خاں شاداں مرحوم (جو اپنے بڑے بھائی حضرت نایاب سے برابر اصلاح لیتے تھے) حضرت امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے اور میرے والد مرحوم کے دیوان کو بھی اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں بھیجا۔ عم مرحوم سے تعلقات بہت زیادہ ہو گئے تھے، منشی صاحب کے سیکڑوں خطوط اُن کے نام آئے جن میں بعض بعض چار، چار چھ چھ صفحوں کے تھے۔ خطوط میں شاعری کے متعلق ایک ایک باتیں ایسی تھیں جو عام کتابوں میں نہیں مل سکتیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ سب خطوط عم مرحوم کی وفات (یکم رمضان ۱۳۲۲ھ) کے بعد ضائع ہو گئے۔ صرف دو چار خط میرے ہاتھ آئے جن کو میں نے "خطوط منشی امیر احمد" میں طبع کرا دیا ہے۔

جناب امیر مینائی عظیم آباد صرف ایک بار، وہ بھی میرے عم بزرگوار کی خواہش پر تشریف لائے تھے تشریف آوری ۱۳۱۲ھ میں ہوئی تھی۔ عم مرحوم کے مکان لال کوٹھی میں (جہاں اب انجنیرنگ کالج ہے) ہفتے دو ہفتے قیام فرمایا تھا۔ اسی زمانۂ قیام میں امیر اللغات کے متعلق بھی لوگوں کو متوجہ کیا۔ اس کے علاوہ اور کبھی تشریف آوری کا اتفاق نہیں ہوا

جناب امیر مینائی مرحوم مغفور، یادگار ایک مرقع جس میں ان کی اور ان کے اعزہ کی تصویریں گروپ کی شکل میں تھیں میرے عم محترم کو ارسال کیا تھا وہ حسن اتفاق سے میرے پاس تھا۔

قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹرایٹ لانے جو ولایت کے تعلیم یافتہ ہیں اور برخلاف دوسرے تعلیم یافتوں کے ان کو اردو زبان کی طرف توجہ اور اس سے شغف ہے اس کا شائع کرنا پسند کیا اس لیے وہ مرقع میں نے اُن کے حوالے کیا گروپ میں حسب ذیل حضرات کی تصویریں ہیں۔

۱ منشی لطیف احمد (امیر مینائی کے منجھلے صاحبزادے) آپ کا تخلص اختر ہے۔ ریاست حیدر آباد دکن سے وظیفہ پاتے ہیں۔ سابق میں وہاں کسی معزز عہدے پر ممتاز تھے۔
۲ منشی مسعود احمد (امیر مینائی کے چھوٹے بیٹے) "ضمیر" تخلص۔ علیگڈھ کالج میں بھی تعلیم پائی ہے۔
۳ منشی لیاقت حسین (امیر مینائی کے بھتیجے)
۴ منشی امیر احمد مینائی (خود)
۵ منشی محمد احمد (امیر مینائی کے خلف اکبر) پہلے "قمر" تخلص کرتے تھے پھر "محو"۔ اب "صبر" تخلص اختیار کیا ہے۔
۶ منشی عبد الرحمٰن (امیر مینائی کے نواسے)
۷ منشی طالب حسن مرحوم (امیر مینائی کے برادر بزرگ)
۸ منشی خورشید احمد (امیر مینائی کے منجھلے صاحبزادے)

گروپ میں بھی اسی ترکیب کے ساتھ بندے ہیں۔ فقط
(یہ قطعہ خود اس گروپ کی پشت پر لکھا ہوا ہے، اس لیے استعمال کیا گیا)

[جلوۂ خضر جلد دوم (ص ۲۰۹ تا ۲۹۶) میں صفیر بلگرامی مرحوم نے امیر مینائی کے عظیم آباد آنے اور ان سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ "رمضان ۱۲۸۸ھ میں امیر مینائی کچھ اپنے شاگرد جناب شاد، اب کی خواہش اور کچھ سرانجام لغت کی غرض سے پٹنہ آئے۔ اپنے سالہ ریاض کو تو شر بھی ساتھ تھے۔ صفیر بلگرامی آرہ سے بلوائے گئے۔ ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ امیر کا ارادہ زیادہ قیام کا تھا، لیکن ایک ہفتہ سے زیادہ نہ ٹھہر سکے۔ گھر سے لڑکوں کی علالت کی خبر آگئی اور انھیں واپس جانا پڑا۔ شعراء امیر کی ملاقات کے لیے آتے رہے اور شعر و سخن کی صحبتیں ہوتی رہیں لیکن کوئی باضابطہ مشاعرہ منعقد نہ ہو سکا" نزک خیال میں جو، سالہ جادو ڈھاکہ میں کچھ دنوں با اقساط شائع ہوتی رہی تھی مرحوم نصیر حسین خاں خیال نے لکھ دیا تھا کہ "امیر مینائی سال میں ایک مرتبہ عظیم آباد ضرور آتے، مشاعرہ ہوتا اور بیسیر گھر بھی وہ مرحوم برابر آیا کرتے (جادو ڈھاکہ، مئی فروری ۱۹۲۶ء ص ۱۵) یہاں تک ہر سال عظیم آباد آنے اور مشاعروں کے انعقاد کا تعلق ہے، یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ امیر کے شاگردوں کی تعداد صوبۂ بہار میں کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس صوبے کو امیر مقابلے میں داغ اور تسلیم سے زیادہ فیض پہنچا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے جناب شاد کے علاوہ مرحوم فضل اللہ شاگرد تھے جو مستقل بنارسی مدرسہ اصل ضلع عظیم آباد کے باشندے تھے) اور جناب شفق عماد پوری] اضافہ از جانب ادارۂ معیار۔

غالب

اشعار غیر مطبوعہ

دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو — آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو — وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے — یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے — دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش — اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

محفل شمع عذاراں میں جو آجاتا ہوں — شمع ساں میں تہ دامان صبا جاتا ہوں

ہوئے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام — جس گزرگاہ میں مَیں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سبک رُو کے نہ بیٹھے رہو — کہ بہ یک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے — رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد — ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

نیاز عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر — جو ہو جائے نثار برق مشت خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط — کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے — عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

آثار ادبیہ

مثنوی میر حسن در تہنیت عید

فلک کی یہ تھا کہ دی ہے عید
کہ وہ سال ہو ہو کے تبت یہ عید
کروں اس جگہ مدح … وہ …
کہ جس سے مجھے ہو کو … فخار
یہ ہیں عید میں یاں میں آیا کروں
ثمر اپنے روزوں کا پایا کروں
سبب کے کہ جس کے یہ سات دن
… دنیا سے ہیں مطمئن
سلامت رکھے اس کو پروردگار
کہ بیٹھے ہیں جا اس کے دم سے بہار
اسی سے یہ سرسبز ہے سرزمیں
کہ ہیں ساتھ اس کے بہت مومنیں
جواہر علی خاں ہو … یہ دیار
کہ بیٹھے کو اس نے کیا سبزہ زار
سخاوت میں ہمت میں یکتا ہے وہ
عدالت میں … اعلیٰ ہے وہ
شجاعت تو ہمت سے وابستہ ہو
غرض خوبیوں کا وہ گلدستہ ہو
ہے … شرع شریف
قوی اس سے ہیں … ضعیف
وہ جو شخص دنیا میں ہے متقی
اسے الفت اللہ سے ہے دوستی

غریبوں کی خاطر نجیبوں کی چاہ
ہر اک کے موافق کرم کی نگاہ
صلاحیت و اتقا بر ملا
نبی و علی پہ وہ دل سے فدا
کہ جو ہے تو اے ساقی لالہ فام
لے تہنیت سے پلا مجھ کو جام
کہ ہے آج دن عید کا میری جاں
خوشی ہر طرف ہے ترقی میں یاں
زبس اب کے ساون میں آئی ہے عید
سو ہے یہ گہربار سال سعید
ہے رنگ گیاہ و شاخ نہال
اگے ہے خوشی ہر جگہ ابکے سال
ہوئی ہے خوشی اچھے موسم میں یہ
کہ جوں دانہ کھلتی ہے اگ کر گرہ
برستی ہے اس طرح عیش و خوشی
کہ ہنستے ہیں کل تک ہے کلی
خوشی عید کی بس کہ پاتا ہے رعد
دمامے خوشی کے بجاتا ہے رعد
شفق سرخی پان پر ہے گواہ
لئے ہے مسی منھ میں ابر سیاہ
زبس شادیانے کی رات ہے رواج
ہر اک عیدی اپنے مانگے ہے آج

پپیہا جو پی پی کرے ہے صدا
سو مانگے ہے عیدی یہ کہنا بجا
غرض ہر روش ہو گلستاں میں سو
نفیری بجانے کو آتے ہیں مور
گل و غنچہ نے مٹھی میں زر لیا
ہوا نے بھی جگنو سے زیور لیا
نہ کچھ بلبلیں ہیں غزل خواں یہاں
پڑھے ہیں مری مثنوی طوطیاں
کہ جس کے معانی سے ہے یہ مراد
کہ بندہ کرے اپنے خالق کو یاد
رہے یاد حق میں جو ثابت قدم
انھیں عید کیوں کر نہ ہو دم بہ دم
بھلا کیونکر ہوئیں نہ خوش روزہ دار
جنھیں ابر رحمت کرے بار بار
یہ برسات میں عید کا جو ہلال
پڑا ہے نظر سو یہ ہے اس پہ دال
کرم پر ہے اس کے تقاطر گواہ
کہ دھوئے گئے مومنوں کے گناہ
بچا مہر سے سایۂ بوتراب
کہ برج اسد میں گیا آفتاب
یہ سبزہ یہ موسم یہ آب و ہوا
یہ پاکیزہ دھویا مکاں جابجا

تر و تازہ گل اور چمن آبدار
سحاب سیہ سایۂ خوش گوار
مکانوں کا ہونا یہ آراستہ
صفا اور نفاست میں پیراستہ
شفق کا یہ خیمہ یہ سبزے کا فرش
پئے عید گویا ہوا تا بہ عرش
نماز جماعت کی ہونا قطار
گلستان دین نبیؐ کی بہار
گھٹاؤں کا ہونا ادھر سے طلوع
مبارک سلامت کی ایدھر شروع
پئے تہنیت مومنوں کا ہجوم
ہر اک دم میں اُٹھ اُٹھ کے ملنے کی دھوم
یہ نذروں کا لینا قرینے کے ساتھ
یہ قطعوں پہ کرنا نظر لے کے ہاتھ

تجمل نجیبوں کا کرنا نظر
نظر سب کی نذروں پہ کرسر بسر
ہنگا عطر ہر ایک کو بخشنا
اس انداز سے واں کہ صل علیٰ
غرض منصفی سے جو کیجے نظر
تو عالم ہے یاں عید کا خوب تر
یہ تیاری عید و ہنگام عید
یہ جاہ و یہ حشمت یہ اکرام عید
مبارک ہو نواب ناظر کے تئیں
کہ حجت نہیں اس میں حاضر کے تئیں
موافق رہیں سب ملے یک دگر
سو یوں میں جس طرح شیر و شکر
جو حق نمک اس کا بھولے رہیں
وہ سوجے رہیں اور پھولے رہیں

چھوارا ہو بھیگا ہوا جس طرح
ورم ان کے منھ پر رہے اس طرح
رہے جب تلک جگ میں ماہ صیام
رہے سبز نواب ناظر کا نام
دعا سے حسن کی نہیں کچھ بعید
کہ خاطر رہے یاں شب و روز عید
محب و موالی سلامت رہیں
سلامت رہیں بے ملامت رہیں
مخالف جو ہوں اُن پہ ماتم رہے
سدا عید ان کو محرم رہے
رہے جگ میں جوں گندم ان کا جگر
وہ خطرہ پھریں مانگتے در بدر
دعا پر یہ کی مثنوی میں تمام
کہ ہے عید کی تہنیت اس کا نام

---

[1] بنگلہ فیض آباد کا دوسرا نام ہے۔ آصف الدولہ کے لکھنؤ چلے جانے کے بعد فیض آباد کی رونق بہو بیگم، مادر آصف الدولہ کے دم سے تھی۔ ان کے بھائی سالار جنگ اور دوسرے اعزہ لکھنؤ اور فیض آباد دونوں سے تعلق رکھنے پر مجبور تھے۔ جواہر علی خاں، خواجہ سرا، بہو بیگم کا ناظر تھا، اور اس حیثیت سے فیض آباد میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ حسن نے اس کی مدح میں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اس کا سال وفات غالباً ۱۲۱۵ھ ہے۔

[2] ان کی جگہ اس بہتر ہوگا۔ [3] جناب خیال کے مجوزہ الفاظ یہ ہیں "گر ہے گی ہنسی گل سے لے تا کلی"، یہ شعر بھی ہو سکتا ہے۔ [4] دیکھ بلبلیں ہی غزلخواں ہیں یاں، بہتر ہے۔ [5] رواج آج کل مذکر ہے۔ اصل نسخے میں 'کی' ہی ہے۔ [6] اصل نسخے میں یہ کا لفظ نہیں، اور کرنا کی جگہ کرتا ہے۔ [7] اصل نسخے میں 'یہ جاہ' کی جگہ 'یہ جاذ' ہے۔

یہ مثنوی کلیات کے اسی نسخے سے ماخوذ ہے جس کا کسی دوسری اشاعت میں ذکر ہو چکا ہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۱۹۲ھ کے بعد ہے۔

نظم
شملہ کی برکھا

(از بسمل بہاری)

اُف وہ اُٹھی کالی گھٹا سرشار، متوالی گھٹا
سرمایۂ دریا لیے
دریائے گوہر زا لیے
بس گوہر یکتا لیے
مستوں کی صورت جھومتا چھاتا، اُمنڈتا، گھومتا
اُف وہ اُٹھی کالی گھٹا
سرشار، متوالی گھٹا
گرنے لگیں وہ بوندیاں گوہر فشاں، انجم فشاں
جانِ نسیم ہے پھوار
جوشِ نمو کی رازدار
رُوحِ چمن، رُوحِ بہار
جس سے ہوا مینو وش ہے رُوئے زمیں گلپوش ہے
گرنے لگیں وہ بوندیاں
گوہر فشاں، انجم فشاں
بجنے لگے بارش کے تار فطرت نے چھیڑا، سرنگار
چھم چھم چھما چھم کی صدا
اک نغمہ ہے فردوس کا
وجد آفریں، کیف زا
لیکن دلِ ہجراں زدہ ہے آج بھی ماتم کدہ
بجنے لگے بارش کے تار
فطرت نے چھیڑا سرنگار

پڑنے لگا مینہ زور سے کہسار گونجے شور سے
اللہ ری بھادوں کی پھبن
نالے بنے گنگ و جمن
سیلاب ہر سو موج زن
لیکن ابھی تھم جائے گا رنگ اور ہی جم جائے گا
پڑنے لگا مینہ زور سے
کہسار گونجے شور سے
ہر ایک شکلِ برشکال رکھتی ہے ندرت میں کمال
نیچے بخاراتِ سحاب
اور فصل ہی آفتاب
تشبیہِ شاعر لاجواب
یعنی ترے آتش دُھواں حیرت کنندۂ مردماں
ہر ایک شکلِ برشکال
رکھتی ہے ندرت میں کمال
نیلا ابھی تھا آسماں کس طرح بدلا یہ سماں
اک پل میں دھانی ہو گیا
پھر زعفرانی ہو گیا
اب ارغوانی ہو گیا
پھر لاجوردی رنگ ہے جیسے دھنک ہے، دنگ ہے
نیلا ابھی تھا آسماں
کس طرح بدلا یہ سماں
لو پھر برس کر کھُل گیا فطرت کا چہرہ دُھل گیا
عشووں سے بھر کر جھولیاں
زہرہ وشوں کی ٹولیاں
ہر گھر کی ہمجولیاں

موجِ خرام ناز ہیں   ذرہائے فتنہ باز ہیں
لو پھر برس کر کھل گیا
فطرت کا چہرہ دھل گیا
کچھ طور والی بجلیاں   کچھ مستیاں، کچھ شوخیاں
رنگِ شفق، نورِ سحر
شادابیٔ گلہائے تر
دوشیزہ فطرت کا اثر
سب مل ملا کر بن گئیں   یہ لعبتانِ دل نشیں
کچھ طور والی بجلیاں
کچھ مستیاں، کچھ شوخیاں
چھپتے ہوئے خورشید کی   اللہ ری جادوگری
پرتَو سے جس کے جیتار
بادل کے ٹکڑے شعلہ کار
جو ہیں سما میں بے قرار
آتش کی گویا کشتیاں   ہیں بحرِ اخضر میں رواں
چھپتے ہوئے خورشید کی
اللہ ری جادوگری
یہ سحر یا اعجاز ہے   یا اور کوئی راز ہے
سمتِ افق میں ابر تار
رنگِ شفق سے شعلہ زار
آتش فشاں یا کوہسار
اور پھر معلق ور ہوا   نیرنگِ فطرت مرحبا
یہ سحر یا اعجاز ہے
یا اور کوئی راز ہے
فطرت کی نادر کاریاں   کیا کیا کرے کوئی بیاں
ہر چند بادل پردہ دار
خورشید کی ضو آشکار
اک روشنی کا آبشار
جو ہے سما میں جلوہ ریز   ساکن فضا میں حشر خیز
فطرت کی نادر کاریاں
کیا کیا کرے کوئی بیاں
چشمِ تماشا کے لیے   دستِ تمنا کے لیے
خاموشیٔ ہر جلوہ پاش
گویا صدائے دُور باش
لیکن نظر گرمِ تلاش
دل دادگانِ حُسن کی   واماندگانِ حُسن کی
چشمِ تماشا کے لیے
دستِ تمنا کے لیے
ایک ایک گوشہ مال کا   پھر انجمستان بن گیا
یہ فتنہ کاروں کا ہجوم
یہ ماہ پاروں کا ہجوم
اتنے ستاروں کا ہجوم
اس راہ سے شرما گئی   اب کہکشاں چھپ جائیگی
ایک ایک گوشہ مال کا
پھر انجمستاں بن گیا

؎ مال روڈ محل۔

افسانے :-

حسنِ رائگاں :-

(۱) حسنِ رائگاں۔ مصنفہ موپاساں۔ مترجمہ آرزو جلیلی
(۲) دہات کی جھونپڑی۔ مصنفہ چیخوف۔ مترجمہ عبداللطیف اثر

حسنِ رائگاں

مصنفہ :- گی دُ موپاسان مترجمہ :- آرزو جلیلی

ایک عالی شان عمارت کی سیڑھیوں کے سامنے ایک نہایت نفیس وکٹوریا کھڑی تھی' جس میں دو اعلیٰ قسم کے مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے' ماہ جون کا آخری دن اور ساڑھے پانچ بجے شام کا وقت تھا۔ ان مکانوں کی چھتوں کے درمیان سے جو صحن کو گھیرے ہوئے تھے' آسمان تیز روشنی' حرارت اور شادمانی سے معمور نظر آرہا تھا۔

کونتس دی ماسکارے سیڑھیوں پر تھیں' اس وقت پہنچی جب اس کا شوہر پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ اپنی بی بی کو بغور دیکھنے کے لیے وہ چند لمحوں تک رک گیا اور اس کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اس کی بی بی اپنے لنبے بیضاوی چہرے' ہاتھی دانت جیسے سفید رنگ' بڑی بڑی بھوری آنکھوں اور سیاہ بالوں کی وجہ سے بہت حسین' نازک اندام اور پروقار معلوم ہوتی تھی۔ وہ بغیر اپنے شوہر کی طرف دیکھے گاڑی کے اندر ایسے انداز سے داخل ہوگئی کہ وہ جذبۂ حسد و رقابت جو مدت سے اس کے شوہر کو الجھن میں ڈالے ہوئے تھا پھر جوش میں آگیا۔ وہ اس کے قریب گیا......

"تم سیر کے لیے جا رہی ہو!" اس نے کہا

اس کے لبوں سے' جن سے حقارت ٹپک رہی تھی صرف چار الفاظ نکلے ،

"تم دیکھ تو رہے ہو!"

"بوا کی طرف جاؤ گی ؟"

"غالباً"

"مجھے تمہارے ساتھ چلنے کی اجازت مل سکتی ہے ؟"

"گاڑی تمہاری ہی ہے"

اس جواب کے بعد بے تعجب کیے بغیر وہ گاڑی کے اندر داخل ہوا اور بی بی کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کوچبان کو حکم دیا۔

"بوا کی طرف !"

سائیس اچک کر کوچبان کے پاس بیٹھ گیا۔ اور گھوڑے جب تک سڑک پر نہ پہنچے حسب عادت اپنے سروں کو ہلاتے رہے۔

شوہر اور بی بی ایک دوسرے کے پہلو میں خاموش بیٹھے رہے شوہر نے چاہا کہ گفتگو شروع کرے' مگر بی بی کے چہرے پر اس قدر ضد اور غصے کے آثار نمایاں تھے کہ وہ ہمت نہ کر سکا۔

آخر کار وہ پیچھے سے اپنا ہاتھ اپنی بی بی کے ہاتھ کے قریب لے گیا' جو دستانے میں ملفوف تھا۔ اور اس کو آہستہ سے اس طرح چھوا کہ گویا اس نے محض اتفاقاً ایسا کیا ہو۔ لیکن بی بی نے بڑی پھرتی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا جس سے ایسی سخت حقارت نمایاں تھی کہ باوجود اپنی فطری خودسری کے وہ پریشان ہو گیا۔

آخر کار اس نے کہا:

"گیبریل"

بغیر شوہر کی طرف دیکھے ہوئے اس نے پوچھا:

"کیا چاہتے ہو ؟"

"تم حد درجہ قابل پرستش ہو"

اس نے کچھ جواب نہیں دیا اور ایک غصے میں آئی ہوئی رانی کی طرح گاڑی میں تنی ہوئی بیٹھی رہی۔

اب وہ شانز الیزے کے راستے سے ارک دی ترایمف دلتوال کی طرف جا رہے تھے۔ سربفلک محراب جو اس طویل رہ گزر کے اختتام پر تھی' سرخ آسمان کے مقابلے میں اپنا سر اٹھائے ہوئے تھی' آفتاب کی شعاعیں اس پر پڑ رہی تھیں' معلوم ہوتا تھا کہ افق سے آتشیں غبار اُڑ رہا ہے۔

اور گاڑیوں کا ایک سلسلہ دو طرفہ قطاروں میں پارک اور شہر کی طرف جا رہا تھا گاڑیوں کے ساز اور ان حصوں سے جہاں چاندی اور تانبے کے پرزے جڑے ہوئے تھے' سورج کی کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔

کاؤنٹ مسکرانے لگے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔

"پیاری گیبرئیل"

اس نے آپے سے باہر ہو کر غصے کے لہجے میں کہا۔

"میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے چین سے رہنے دو اپنی گاڑی میں بھی اطمینان سے بیٹھنے کی آزادی اب مجھے حاصل نہیں!"

"میری آنکھوں میں تم اب سے پہلے ایسی خوبصورت نہیں معلوم ہوتی تھیں" اس نے اس انداز سے کہا کہ گویا اس نے گیبرئیل کا جواب سنا ہی نہ ہو

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اپنے غصے پر قابو نہ پا سکی اور چلا کر بولی "اس سے تمہیں کیا بحث؟ میں عہد کرتی ہوں کہ آج سے میں تم سے کچھ بھی واسطہ نہ رکھوں گی"

وہ مضطرب اور حیرت زدہ ہو گیا اس نے اپنی خوش مزاجی پر قابو پا کر کہا "کیا کہا تم نے؟" اس کے طرز تکلم سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محبت کرنے والا انسان نہیں، بلکہ ایک بے رحم آقا ہے۔

پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی وجہ سے لوگ اس کی آواز نہیں سن سکتے تھے، لیکن پھر بھی گیبرئیل نے دھیمی آواز میں کہا،

"کیا کہا تم نے؟ کیا کہا تم نے؟ میں تمہیں خوب پہچانتی ہوں میں بتا دوں کہ تم کیا ہو؟"

"بتا دو"

کیا میں ان جذبات کا اظہار کروں جنہیں میں اپنے دل میں اس وقت سے لیے پھرتی ہوں جب سے میں تمہاری خوفناک خود غرضی کا شکار ہوئی ہوں؟

تعجب اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے دانت پیس کر کہا،

"ہاں کہے جاؤ"

وہ ایک طویل قامت انسان تھا اس کے شانے چوڑے تھے۔ داڑھی لمبی اور بھورے رنگ کی تھی۔ وہ حسین تھا، شریف تھا۔ اور دنیا کے سرد و گرم کا تجربہ کر چکا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا شوہر اور فرض شناس باپ تصور کیا جاتا تھا۔

گھر سے روانہ ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گیبرئیل اس کی طرف پھری اور دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

"اچھا اب تم بعض ناگوار باتیں سنو گے لیکن یہ جو کریں سب کچھ بھگتنے کے لیے تیار ہوں مجھے کسی بات

کا خوف نہیں۔ اور آج تو تمہارا اتنا ہی ڈر نہیں جتنا کسی اور کا ہو سکتا ہے۔

اس نے گیبرئیل سے آنکھیں ملائیں، اور غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو!"

"نہیں میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر اب میں اس طرح ہمیشہ حاملہ نہیں بنتی رہوں گی جس طرح تم نے مجھے پچھلے گیارہ سالوں میں بار بار بنائے رکھا ہے۔ میں اس طرح رہنا چاہتی ہوں جس طرح دنیا کی عورتیں رہتی ہیں۔ جس کی میں حق دار ہوں اور جس طرح دنیا کی کل بیبیوں کا حق ہوتا ہے۔"

اس کا چہرہ دفعتہً زرد ہو گیا اور اس نے ہکلا کر کہا۔

"میں ... میں سمجھا۔"

"تم یقیناً سمجھ گئے ہو گے ابھی تین ہی مہینے گزرے ہیں کہ مجھے بچہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ باوجود تمہاری کوششوں کے میں اب تک بہت حسین ہوں۔ جس کا اندازہ تم نے اس وقت کیا ہو گا جب تم نے آج دروازے کی سیڑھیوں پر مجھے دیکھا تھا۔ تم سوچتے ہو گے کہ میرے حاملہ ہونے کا وقت پھر آ گیا۔"

"تم مہمل باتیں کر رہی ہو"

"نہیں —— میرا سن تیس سال کا ہے اور میرے سات بچے ہیں۔ ہماری شادی کو گیارہ سال کا عرصہ گذرا تم یہ امید کرتے ہو گے کہ اگر آئندہ دس سال تک یہی سلسلہ جاری رہا تو اس کے بعد تمہیں مجھ سے حسد کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

اس نے اپنی بی بی کے بازو کو زور سے دبایا۔

"میں تمہیں اس قسم کی گفتگو نہیں کرنے دوں گا"

"مگر میں بولتی رہوں گی جب تک سب کچھ نہ کہہ لوں جو میں تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ اگر تم مجھے بولنے نہ دو گے تو میں اپنی آواز اس قدر بلند کر دوں گی کہ دونوں خادم بھی سن سکیں جو باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں تمہیں اپنے نزدیک اسی وجہ سے بیٹھنے دیا تھا، کیونکہ ان خادموں کی موجودگی تمہیں میری باتیں سننے اور اپنے جذبات پر قابو رکھنے کے لیے مجبور کرے گی۔ سنو! میں ہمیشہ تم سے نفرت کرتی رہی اور میں نے تمہیں، اس کا احساس ہونے دیا، کیونکہ میں اب تک کبھی جھوٹ نہیں بولی —— تم نے میری مرضی کے خلاف مجھ سے شادی کی۔ تم نے میرے والدین پر دباؤ ڈالا جنہوں نے میری شادی تم سے کر دی، کیونکہ تم بہت امیر تھے۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ میرے آنسوؤں کی بھی پروا نہ کی۔ گویا تم نے مجھے خرید لیا۔ جب سے میں تمہارے قبضے میں آئی، اور تمہاری بی بی بنی، میں نے کوشش کی کہ تمہاری دھمکیوں اور جابرانہ سلوک کو بھول جاؤں۔ کیونکہ میں ایک وفادار بی بی ہونا چاہتی تھی جب میں تم سے حد درجہ

محبت کرنے لگی تم سخت بدگمان ہو گئے۔ شاید ہی کسی اور کو ایسی بدگمانی ہوئی ہو گی تمہاری بدگمانی ذلیل درجے کی تھی تو تمہارے بینگ اور میرے لیے توہین کا باعث تھی۔ شادی کو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ تم نے مجھ کو ہر قسم کی وفا بازی کا مرتکب سمجھا۔ بلکہ تم نے خود مجھ سے اپنے شک کا اظہار کیا۔ کیسی شرمناک بات ہے! چونکہ تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ مجھے حسن اور دلفریبی سے محروم کر دو، مگر گھر میں بیٹھا ہو نے دو، اور اخباروں میں میری تعریف نہ چھپنے دو، تم میری طرف سے دوسروں کی توجہ ہٹانے کی کوئی صورت سوچنے لگے تم نے ناقابل نفرت ترکیب سوچی کریں بچے بعد دیگرے بچے جنتی رہوں یہاں تک کہ لوگ مجھ سے متنفر ہو جائیں۔ اس سے انکار نہ کرو۔ بہت دنوں تک تو مجھے اس کا شائبہ گمان بھی نہ تھا۔ لیکن پھر میں سمجھ گئی۔ تم نے اپنی بہن سے یہ بات فخریہ کہی تھی، اس نے مجھ سے کہہ دیا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی، اور تمہارے دہقانی بھونڈے پن سے گھبراتی ہے۔ ہماری آپس کی لڑائیوں کو یاد کرو۔ دروازے زبردستی کھولے جاتے، اور تالے توڑ دیے جاتے تھے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ تم نے گیارہ سال سے مجھے کس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایسی زندگی جیسی بچے جننے والی گھوڑی اصطبل میں بسر کرتی ہے۔ پھر میرے حاملہ ہوتے ہی تمہیں مجھ سے رغبت باقی نہ رہتی اور میں مہینوں تک تمہارے دیدار سے محروم ہو جاتی مجھے اتنا بہلاوا دی جاتی کہ میں جا کر مجھ ہوں۔ جب میں واپس آتی، ویسی ہی حسین دلفریب اور مرکز جاذبیت بن کر، کیسی بھی تھی، میرے دل میں یہ تمنا ہوتی کہ اب تھوڑے دنوں تک ایسی زندگی بسر کروں جیسی ایک نوجوان اور تندرست عورت کو بسر کرنی چاہیے۔ لیکن تم پھر شک کرنے لگے اور اسی قابل نفرت خواہش سے مغلوب ہو کر تم! میرے پہلے آثار ہو جاتے تھے جس خواہش سے مغلوب ہو کر تم ابھی میرے پاس بیٹھے ہوئے ہو، یعنی میرے حسن سے لطف اندوز ہونے کی خواہش نہیں، کیونکہ یہ تم نے کبھی مجھ سے اظہار نہیں کیا، بلکہ میری صورت تباہ دینے کی خواہش ہے۔

"اس کے علاوہ ایک اور بات بہت قابل نفرین و ملامت۔ عجیب و غریب بات جس کا احساس مجھے دیر سے ہوا، لگا اس تمہارے افعال و خیالات کی غایت کو بہت جلد سمجھ جاتی ہوں، تم اپنے بچوں سے محض اس لیے محبت کرتے ہو کہ جب تک میں انہیں اپنے جسم کے اندر لیے پھرتی ہوں تمہیں میری طرف سے بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ تم انہیں پیار اس لیے کرتے ہو، کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے۔ جب تم میری جوانی کو روز بہ روز ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہو، تو تمہارے شرمناک وسوسے عارضی طور پر معدوم ہو جاتے ہیں۔

میں نے بار ہا تمہاری اس خوشی کو محسوس کیا اور تمہاری آنکھوں میں اسے دیکھا ہے۔ تم اپنے بچوں کو اپنی فتح کی نشانی سمجھ کر پیار کرتے ہو۔ اس لیے نہیں کہ ان کی رگوں میں تمہارا ہی خون بہتا ہے۔ ہر بچہ ایک فتح ہے۔ جو تمہیں مجھ پر، میری جوانی پر، میرے حسن، میری دلفریبی اور ہردلعزیزی پر حاصل ہوئی ہے۔ تمہیں ان بچوں پر فخر ہے۔ تم انہیں دکھاتے پھرتے ہو، جاڑوں میں انہیں اور ماں موران سی میں سیر کرتے ہو، اور تمہیں پہر تھیئٹر میں لے جاتے ہو تاکہ لوگ تمہیں ان سے گھرا ہوا دیکھ کر کہیں "کیسا اچھا باپ ہے"۔ اور اس جملے کو بار بار دہرائیں۔ . . . . "

اس نے وحشیانہ انداز سے گیبرئیل کی کلائی پکڑ لی اور اس سختی سے دبائے رکھا کہ وہ چپ ہو گئی اور اس کے حلق سے گھرگھراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔

کونت نے دھیمی آواز میں کہا:

"مجھے اپنے بچوں سے محبت ہے۔ تم تو ایسی باتیں کرتی ہو کہ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ ماں ہو کر ایسی باتیں! لیکن میں تمہارا مالک ہوں۔ مالک! ...... میں جب چاہوں تمہیں اپنا حکم بجا لانے پر مجبور کر سکتا ہوں، اور قانون بھی میری ہی مدد کرے گا۔"

اس نے گیبرئیل کی انگلیوں کو اپنی بھاری مردانہ مٹھی میں جکڑ کر دبا دیا۔ شدتِ درد سے بے چین ہو کر گیبرئیل نے اپنے ہاتھ کو اس سخت گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی، جس سے اس کا ہاتھ پچا جا رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر ہانپنے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

کونت نے کہا:

"اب تم محسوس کرتی ہو گی کہ میں تمہارا مالک ہوں اور تم سے زیادہ طاقتور!"

کونت نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ گیبرئیل نے جواب دیا:

"تم مجھے پارسا عورت سمجھتے ہو؟"

اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا: "بے شک!"

"تم یہ باور کر سکتے ہو کہ میں گرجا میں قربان گاہ کے سامنے جھوٹی قسم کھاؤں گی؟"

"نہیں"

"میرے ساتھ تم کسی گرجا میں چلو گے؟"

"کس غرض سے؟"

"وہاں پہنچ کر دیکھ لینا۔ چلو گے؟"

"اگر تمہیں اصرار ہے تو میں چلوں گا۔"

گیبرئیل نے بلند آواز سے کہا:

"فیلیپ!"

کوچبان نے گھوڑوں پر سے نظر ہٹائے بغیر اپنی گردن ایک طرف جھکائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے صرف اپنا کان اپنی مالکہ کی طرف پھیر دیا تھا۔ مالکہ نے کہا:

"سان فیلیپ دورول کے گرجا کی طرف گاڑی لے چلو"

اور وکٹوریہ گاڑی جو بوا دو بولون کے پھاٹک تک پہنچ چکی تھی، پیرس کی طرف واپس ہوئی۔

گرجا پہنچنے تک میاں بی بی میں ذرا بھی گفتگو نہ ہوئی۔ جب گاڑی گرجا کے پھاٹک پر رکی تو مادام دسکارے کود کر باہر نکلی اور گرجا کے اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے کونٹ بھی داخل ہوا۔

وہ سیدھی کوآر[1] کے کٹہرے تک گئی اور ایک کرسی کے سامنے دوزانو بیٹھ کر اس نے اپنا منہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور عبادت کرنے لگی۔ وہ دیر تک عبادت کرتی رہی اور کونٹ نے اس کے قریب کھڑے ہو کر دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ خاموشی سے رو رہی تھی، جس طرح عورتیں انتہائی رنج و غم کے لمحوں میں رویا کرتی ہیں۔ یہ رونا ایک قسم کا لرزہ تھا جو اس کے جسم پر طاری تھا اور ایک سبکی سی سسکی میں ختم ہوتا تھا۔

لیکن کونٹ دسکارے نے فیصلہ کر لیا کہ یہ کیفیت بہت دیر تک قائم رہ چکی ہے، اور اس نے گیبرئیل کے شانوں کو چھوا۔ گیبرئیل چونک کر کھڑی ہو گئی اور کونٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے کہا:

"مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ میں تم سے نہیں ڈرتی۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ چاہو تو مجھے قتل بھی کر دو۔ ہمارے بچوں میں ایک بچہ تمہارا نہیں ہے۔ میں اس خدا کے سامنے تم سے قسم کھا کر کہتی ہوں، جو یہاں پر میری آواز سن رہا ہے۔ یہی ایک انتقام تھا جو میں تم سے لے سکتی تھی۔ تمہارے ظلم سے بغاوت کرنے اور بار بار دردِ زہ میں مبتلا ہونے سے بچنے کی کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ میرا عاشق کون تھا، یہ تم کبھی نہ جان سکو گے۔ تم ساری دنیا پر شک کرو گے، لیکن اس شخص کا سراغ نہیں ملے گا۔ میں نے اپنے آپ کو بغیر کسی احساسِ محبت یا خوشی کے اس کے حوالے کر دیا تھا محض تم کو دغا دینے کی غرض سے اور اس شخص نے بھی مجھے ایک بچے کی ماں بنا دیا۔ وہ بچہ کون ہے؟ یہ تم کبھی نہ جان سکو گے۔ میرے سات بچے ہیں، تم انہیں میں سے اس بچے کو تلاش کر کے نکال لو۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد تمہیں اس راز سے آگاہ کروں، کیونکہ محض بے وفائی سے انتقام مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ مرد جان بھی نہ لے۔ تم نے مجھے آج یہ اقرار کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ بس! جو کہنا تھا میں کہہ چکی۔"

یہ کہہ کر وہ گرجا کے اس دروازے کی طرف بھاگی جو سڑک کے قریب تھا۔ وہ یہ خیال کرتی ہوئی بھاگ رہی تھی کہ اب اپنے شوہر کے قدموں کی چاپ سنے گی، جو اس کا تعاقب کر رہا ہو گا۔ کیونکہ آج اس نے اپنے شوہر سے بغاوت کی تھی اور عنقریب اس کے گھونسوں کی زبردست ضربیں کھا کر وہ خاک و خون میں لوٹتی نظر آئے گی۔

مگر اس نے کوئی آواز نہ سنی اور گاڑی تک پہنچ گئی۔ وہ اچک کر گاڑی میں بیٹھی اور اس نے گھبرا کر کوچبان سے کہا:
"گھر چلو"

---

[1] Choeur وہ جگہ جہاں پر گرجا میں نغمے گائے جاتے ہیں۔ مترجم

گھوڑے تیز چال سے روانہ ہوگئے۔

(۲)

اپنے کمرے کی تنہائی میں کونتس دسلادے کھانے کے وقت کا انتظار کر رہی تھی جس طرح سزا یافتہ مجرم اپنی پھانسی کا منتظر رہتا ہے۔ وہ کیا کرے گا؟ وہ واپس آگیا؟ وہ بالطبع تندمزاج تھا۔ ہر قسم کا ظلم ڈھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس نے کون سی تجویز سوچی تھی اور کیا فیصلہ کیا تھا؟ مکان میں کسی قسم کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ بار بار گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خادمہ اسے شام کا لباس پہنانے کے لیے آئی اور پھر واپس چلی گئی۔

آٹھ کا گھنٹا بجا اور اس کے ساتھ ہی دروازے پر کسی نے دو بار دستک دی۔

"اندر آؤ" گیبریل نے کہا۔

خانساماں کمرے میں آیا اور اس نے کہا:

"کھانا تیار ہے" مادام

"کونت صاحب بھی ہیں؟"

"جی ہاں مادام، صاحب کھانے کے کمرے میں موجود ہیں"

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال گزرا کہ اس پستول کا خیال کرتے ہوئے، جس کا خاکہ وہ اپنے ذہن میں تیار کر چکی تھی، اسے اس ریوالور سے مسلح ہو کر جانا چاہیے جسے کچھ دنوں قبل وہ خرید کر لائی تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ بچے بھی وہاں موجود ہوں گے، اور نمک کی شیشی کے سوا اس نے کچھ بھی اپنے ساتھ نہ لیا۔

جب وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی، تو اس کا شوہر اپنی کرسی کے قریب کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ صرف سر کے اشارے سے ان دونوں میں صاحب سلامت ہوئی۔ پھر وہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تینوں لڑکے اپنے اتالیق اے مو اِن کے ساتھ ماں کے دہنے بازو بیٹھے، اور تینوں لڑکیاں اپنی انگریزی استانی مس اسمتھ کے ساتھ بائیں طرف بیٹھیں سب سے ننھا بچہ جس کا سن محض تین مہینے کا تھا اپنی کھلائی کے ساتھ اپنے کمرے ہی میں رہا۔

تینوں لڑکیاں، جو سب کی سب حسین تھیں اور جن میں سب سے بڑی لڑکی کا سن دس سال کا تھا، نیلے رنگ کے فراک پہنے ہوئے تھیں، اور خوبصورت گڑیوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی کا سن ابھی تین سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ لڑکیاں حسین تھیں اور قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ جوان ہو کر وہ اتنی ہی حسین ہو جائیں گی جتنی حسین ان کی ماں تھی۔

دو لڑکیوں کے بال بھورے تھے، اور سب سے بڑے لڑکے کے بال، جس کا سن نو سال کا تھا تقریباً بالکل سیاہ ہو چکے تھے۔ قرینہ تھا کہ یہ تینوں جوان ہو کر لمبے، طاقتور اور پھر تیلے ہو جائیں گے، اور ان کے شانے بہت چوڑے ہوں گے۔

یہ خاندان ہی کسی تندرست شخص کی نسل سے تھا۔

پادری نے حسبِ معمول دعا مانگی جس طرح وہ ہمیشہ مانگا کرتا تھا جب کھانے پر کوئی مہمان نہ ہوتا تھا کیونکہ مہمانوں کی موجودگی میں بیچہ کھانے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ دعا کے بعد وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

کونتس جو ایسے جذبے سے مغلوب ہو رہی تھی جس کی توقع اُسے نہ تھی' نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ کونت تینوں لڑکوں اور تینوں لڑکیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں ایک سے دوسرے پر جا تی تھیں۔ یکایک اس نے اپنے گلاس کو زور سے گرا دیا۔ گلاس ٹوٹ گیا اور سُرخ سیّال میز پر بہہ گیا۔ کونتس اس زور سے چونکی کہ وہ اپنی کرسی پر اچھل پڑی۔ اب پہلی مرتبہ اس نے اپنے شوہر کو دیکھا۔ دونوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن اس حقارت کے باوجود' جسے وہ اپنے ماتھے کے بل اور دل کی دھڑکن سے محسوس کر رہے تھے' وہ بار بار ایک دوسرے کو گرم نگاہوں سے دیکھتے رہے۔

اگرچہ پادری اس کشیدگی کی وجہ نہیں سمجھ سکا' مگر فضا کو مکدر محسوس کر کے اس نے بات چیت کا سلسلہ چھیڑنا چاہا۔ اس نے مختلف موضوعات پر اظہار خیال شروع کیا۔ مگر اس کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

کونتس نے اپنی فطری ہوشیاری اور حسنِ اخلاق سے پادری کی باتوں کا جواب دینا چاہا' مگر ناکام رہی۔ خیالات کی الجھن میں اسے مناسب الفاظ نہ مل سکے۔ اس وسیع کمرے کی خاموشی میں جہاں چھریوں اور کانٹوں کی آواز کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہ دیتی تھی وہ خود اپنی آواز سن کر ڈر رہی تھی۔

یکایک اس کے شوہر نے' اس کی طرف جھک کر' کہا:

"یہاں' اس کمرے میں' اپنی اولاد کی موجودگی میں' تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا' وہ سچ کہا تھا؟"

وہ حقارت' جس کا خمیر اس کی رگوں میں تیار ہو رہا تھا' یکایک بھڑک اٹھی۔ اس نے اس کے سوال کا جواب بھی اسی جوش سے دیا جس سختی سے اس کی نگاہوں کا جواب دیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے' دایاں ہاتھ لڑکوں کے سر کی طرف اور بایاں ہاتھ لڑکیوں کے سر کی جانب بڑھایا۔ پھر اس نے بغیر ہچکچائے ہوئے' ایسی آواز میں' جس سے عزم راسخ کا اظہار ہوتا تھا' کہا:

"میں اپنے بچوں کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے تم سے حقیقت بیان کی تھی۔"

کونت کھڑا ہو گیا' اس کے چہرے پر اس کی الجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے رومال کو میز پر پھینک دیا' اور اپنی کرسی کو دیوار کی طرف دھکیل کر' کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب کونتس نے اس طرح گہری سانس لی گویا اس نے پہلے بار فتح پائی ہو۔ وہ مطمئن لہجے میں بولی:

"میرے بچو! تم پریشان نہ ہو' تمہارے باپ کو کسی بات کا ذہنی صدمہ ہے۔ اس لیے وہ مغموم ہیں۔ چند

دنوں میں یہ کیفیت دور ہو جائے گی "

اب اس نے پادری اور مس ابیتہ سے گفتگو کی' بچوں سے پیار کی باتیں کیں- ایسے میٹھے الفاظ استعمال کیے اور ایسی شفقت کا اظہار کیا کہ بچوں کے ننھے دل مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ سبوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں گئی- بڑے بچے آپس میں باتیں کرتے رہے' چھوٹے بچوں کو اس نے کہانیاں سنائیں' اور جب ان کے سونے کا وقت آیا' تو ان کے بوسے لے کر' انہیں سونے کے لیے جانے دیا- پھر خود اپنے سونے کے کمرے میں تنہا واپس گئی۔

وہ اپنے شوہر کی آمد کا انتظار کرنے لگی' چونکہ بچے اس وقت اس کے پاس موجود نہ تھے' اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنے فانی جسم کی اسی طرح حفاظت کرے گی جس طرح دنیا میں اس نے اپنی نسوانیت کی حفاظت کی تھی- اس نے اپنے لباس کی جیب میں اس چھوٹے پستول کو بھر کر رکھ لیا' جسے اس نے چند دنوں قبل خریدا تھا

کئی گھنٹے گزرے- گھڑیاں گھنٹے بجاتی رہیں- مکانوں میں شور و غوغا بالکل کم ہو گیا- صرف گاڑیاں سڑک پر چل رہی تھیں ان کی گھڑ گھڑاہٹ کی آواز دیواروں سے گزر کر بہت دھیمی' اور دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی-

وہ بڑے اطمینان سے اس کا انتظار کرتی رہی- اب وہ اس سے نہیں ڈرتی تھی بلکہ فاتحانہ خوشی محسوس کر رہی تھی - کیونکہ اس نے اپنے شوہر کو ستانے کا ایسا طریقہ نکالا تھا- جسے وہ ہر گھڑی' زندگی بھر محسوس کرتا رہے گا۔

صبح کی روشنی پردوں کے جھالر والے کناروں سے چھن کر کمرے کے اندر آئی مگر وہ اب تک واپس نہ آیا- کونتس گھبرائی اور اسے یہ خیال ہوا کہ وہ نہیں آئے گا- دروازہ بند کر کے اس نے کنڈی لگا دی اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی- وہ نہ سمجھ سکی کہ اس کا شوہر اب کیا کرے گا-

جب خادمہ چائے لے کر آئی تو اس نے کونتس کو ایک خط دیا' جو کونت نے لکھا تھا- اس نے اپنی بی بی کو اطلاع دی تھی کہ میں ایک طویل سفر کے لیے جا رہا ہوں اور اپنے قانونی مشیر کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ تمہارے اخراج کے لیے دیتا رہے -

(۳)

ہو پیرا میں "شیطان رابرٹ" نامی ڈراما کھیلا جا رہا تھا- ابھی دوسرا ایکٹ شروع ہونے والا- مرد' ٹوپیاں اور نیچی واسکٹ پہنے کھڑے تھے- واسکٹ کے اوپر سفید قمیص نظر آتے تھے- جن کے بٹن سونے اور جواہر کے تھے مرد دوربینی نظریں عورتوں کے درجے کی طرف تھیں- عورتیں شام کے لباس پہنے ہوئے تھیں- جن میں موتی اور ہیرے جڑے ہوئے تھے - اس منور کمرے کی فضا' موسیقی اور انسانی آواز سے معمور تھی- عورتوں کے حسین چہرے اور چمکتے ہوئے شانے نگاہوں کے مرکز توجہ تھے-

دو' دوست جن کی پیٹھ اور کسیوں کی طرف تھی گفتگو میں مصروف تھے' اور ان نشستوں' حقیقی یا مصنوعی

بخشی" اور شان و شوکت کی مذمت کر رہے تھے" جن کا مظاہرہ اس عظیم الشان تھیٹر میں ہو رہا تھا۔

ان میں سے ایک نے" جس کا نام روشہ وی سالاں تھا۔ اپنے ساتھی برنارو گراندان سے کہا۔

"کونتس دسکاسے کو دیکھو۔ وہ ابھی تک بہت حسین ہے"

وہ سرا شخص اس لمبی عورت کو دیکھنے لگا جو سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ اب بھی بہت کم سن معلوم ہوتی تھی۔ اور تھیٹر کے ہر گوشے سے نگاہیں اس کے چہرے کی طرف متوجہ تھیں۔ چہرے کی زردی کے باعث وہ ایک مجسمے کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بال پڑ جو اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے۔ ایک تیلا" قوس قزح کی شکل کا تاج تھا" جس پر ہیرے کے سنہرے جڑے ہوئے تھے" اور جو کہکشاں کی طرح چمک رہا تھا۔

کچھ دیر اس کی طرف دیکھنے کے بعد" برنارو گراندان نے تیقن کے لہجے میں جواب دیا۔

"بے شک! وہ دلفریب اور حسین ہے"

"اس کا سن اب کتنا ہوگا؟"

"ٹھہرو۔ میں تمہیں اس کا صحیح سن بتا سکتا ہوں۔ بچپن سے ہی جانتا ہوں میں نے اسے ایک کم سن لڑکی کی حیثیت سے سوسائٹی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا سن۔۔۔ تیس تیس چھتیس سال کا ہے"

"بالکل غیر ممکن"

"مجھے یقین کامل ہے"

"وہ تو پچیس سال کی معلوم ہوتی ہے"

"اور اس کے سات بچے ہیں"

"یہ بات ماننے کے قابل نہیں"

"ساتوں بچے ابھی زندہ ہیں۔ اور وہ ایک شفیق ماں ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے گھر پر جاتا ہوں۔ اس کا مکان بہت چمکیلا اور دلفریب ہے۔ اسے خانہ داری کے فرائض کا احساس ہے"

"تعجب کی بات ہے نا؟ اور کبھی اس کے بارے میں بدمگوئیاں نہیں ہوتیں؟"

"کبھی نہیں"

"مگر اس کا شوہر؟ وہ تو عجیب و غریب آدمی ہے نا؟"

"اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے آپس میں کوئی جھگڑا ہوا ہو۔ خانگی رنجشوں کے متعلق انسان صرف قیاس کر سکتا ہے کیونکہ اصل واقعہ اس کے سننے میں نہیں آتا"

"ان دونوں میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"میں نہیں جانتا۔ کسی زمانے میں مسکارے بہترین شوہر تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ اس شہر کے زندہ دل لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جب تک وہ ایک اچھا شوہر تھا' بہت تند مزاج اور تنکی تھا۔ جب سے وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا' بہت بے پروا ہو گیا ہے پھر بھی ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ مسکارے کسی پریشانی' غم' یا الجھن کا شکار ہو رہا ہے۔ اگر اس کی بی بی بوڑھی نہیں ہوئی تو وہ قبل از وقت بوڑھا ہوتا جا رہا ہے"

تھوڑی دیر تک یہ دونوں دوست ان خانگی جھگڑوں کے متعلق فلسفیانہ بحث کرتے رہے' جو تفاوتِ فطرت یا طبیعی اختلاف کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں۔

روژے دی سالاں نے — جو ابھی تک مادام مسکارے پر نظریں جمائے تھا — کہا:

"یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کے سات بچے ہیں"

"ہاں۔ گیارہ برس کے عرصے میں اس کے سات بچے پیدا ہوئے۔ جس کے بعد تیس برس کے سن میں اس نے اس سلسلے ہی کا خاتمہ کر دیا۔ تاکہ اس کے حسن کی نمائش کا دور شروع ہو۔ یہ دور ابھی ختم ہونے والا نہیں معلوم ہوتا"

"غریب عورتیں!"

"تمہیں ان پر رحم کیوں آتا ہے؟"

"کیوں؟ ... میرے دوست ذرا غور تو کرو۔ ایک عورت کا گیارہ برس تک بار بار حاملہ ہونا! عذاب ہے' عذاب! اس کا شباب' اس کا حسن' کامیابی کی امید' شاندار زندگی کا شاعرانہ تخیل' یہ سب اس طاقتی قانون کے شکار ہو گئے جس نے عورت کو محض انڈا دینے والی مشین بنا دیا ہے"

"اس کا چارہ ہی کیا ہے؟ یہ فطرت کا تقاضا ہے"

"یہ صحیح ہے' لیکن میں کہتا ہوں کہ فطرت ہماری دشمن ہے ہمیں زندگی بھر فطرت کے خلاف جنگ کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ ہمیں پھر جانور بنا دے۔ دنیا میں نفاست' حسن' اخلاق' اعلیٰ تخیل' جو کچھ بھی ہے اس کی تخلیق خدا نے نہیں کی۔ بلکہ انسان نے' انسان کے دماغ نے۔ ہمیں نے دنیا کو حسن' لطافت' اور دلکشی عطا کی ہے' ان گیتوں کی بدولت جنہیں ہم اس کے متعلق گاتے ہیں' شعرا کے کلام کی تشریح' فن کاروں کی تخئیل اور ان عاقلانہ ادیوں کے ذریعے جو غلط ہوا کرتی ہیں' گر بظاہر قدرت کی معقول توجیہ کرتی ہیں۔ خدا نے صرف بھدی مخلوقات کو پیدا کیا ہے' جن میں بیماری کے جراثیم ہیں اور چند سالوں کے حیوانی ارتقا کے بعد ضعیف اور زیادہ بدصورت ہو جاتی ہیں۔ غالباً خدا نے انہیں قابل نفرت طریقے سے اپنی نسل کو پھیلانے اور شام کے قلیل الحیات کیڑوں کی طرح مرجانے کے لیے پیدا کیا ہے' میں نے ابھی کہا تھا۔" قابل نفرت طریقے سے اپنی نسل کو پھیلانے کے لئے ہیں پھر اس جملے کو دہراتا ہوں نہ تنہا قدرت ہی کی تخلیق

انسان کے گناہ فطرتی سے بھی زیادہ شرمناک اور قابلِ نفرت کوئی دوسری چیز ہے، جس سے لطیف احساسات دُور جاسکتے ہیں۔ اور ہمیشہ بھاگتے ہی رہیں گے۔ کل اعضا جو اس کمال شعار اور کمینہ ور خلاق نے بنائے ہیں ان کے دو دو کام بھی ہیں۔ اس نے ایسے اعضا کیوں نہیں بنائے جو آلائشوں سے پاک ہوتے۔ تاکہ ان اعضا سے اس پاک مقصد کی تکمیل ہوتی جو انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ منہ، جو مادی غذا کے ذریعے جسم کی نشوونما کرتا ہے، گفتگو اور خیالات کی بھی تشکیل کرتا ہے۔ ہمارے جسم کی بقا کا باعث ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ذہانت کو بھی پیدا کرتا ہے۔ قوتِ شامہ پھیپھڑوں میں زندگی بخش ہوا پہنچاتی ہے، دماغ کو پھولوں، جنگلوں، درختوں اور سمندروں کی خوشبوؤں سے بھی معطر کرتی ہے۔ کان ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع دیتا ہے، اسی کان کی بدولت ہم نے موسیقی ایجاد کی، اور آوازوں سے جسمانی انبساط اور ابدی مسرت کی تخلیق کرنا بھی سیکھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کمینہ پرور خالق کا مقصد یہ ہے کہ مرد کے لیے ممکن ہی نہ ہو کہ عورت سے اپنے تعلقات کو لطیف بنا سکے۔ پھر بھی، مرد نے عشق کی بنا ڈالی، جو اس حاسد خلاق کا چنداں بُرا جواب نہیں لیکن اس نے عشق کے ساتھ ایسی شاعرانہ خوبی بھی وابستہ کر دی ہے کہ عورت اکثر بھول جاتی ہے کہ اُسے مجبوراً کیسے کیسے تعلقات قائم کرنے پڑتے ہیں لیکن ایسے لوگ جو اپنا کوئی نصب العین مقرر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اخلاقی جرائم اور مہذب عیاشی ایجاد کرتے ہیں، جو خدا کو دھوکا دینے اور حسن کی بے باکانہ پرستش کرنے کا دوسرا طریقہ ہے

انسان کے بچے تو اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح جانوروں کے، فرق یہ ہے کہ انسان کے فعل کو قانون جائز قرار دیتا ہے۔

" اس عورت کو دیکھو! کس قدر وحشت زا خیال ہے کہ یہ گوہر بے بہا حسین عورت جو صرف اس لیے پیدا کی گئی تھی کہ اس کے حسن کی پرستش کی جائے، اپنی زندگی کے گیارہ سال کونت دی مسکارے کے جانشینوں کو پیدا کرنے میں گزار چکی ہے!"

برنار گراندال نے ہنستے ہوئے کہا:

" تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر بہت کم لوگ تمہارا مطلب سمجھ سکیں گے۔"

سالانس جوش میں آگیا۔

" تم جانتے ہو کہ خدا کی حقیقت کے متعلق میرا کیا تصور ہے؟" اس نے کہا " ایک عظیم الشان تخلیقی آلہ جسے ہم نہیں جانتے جو فضاؤں میں کروڑوں دنیائیں اس طرح پیدا کر دیتا ہے جیسے مچھلی سمندر میں انڈے دیتی ہے۔ تخلیق اس کا " خدائی فرض" ہے۔ لیکن وہ جو کچھ کرتا ہے، اس سے بے خبر رہتا ہے۔ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے پھیلائے ہوئے جراثیم میں مختلف طریقوں سے ارتباط ہوتا ہے۔ انسانی تخیل ایک اتفاقی حادثہ ہے جو بالکل خلاف توقع ہے۔ ممکن ہے کہ یہ زمین

کے ساتھ فنا ہو جائے اور پھر اسی شکل میں یا کسی دوسرے عنوان سے یا کسی دوسری دنیا میں معرضِ وجود میں آ سکے۔ اسی ذہنی حادثے کے باعث ہم اس دنیا میں جو ہمارے لیے نہیں بنائی گئی ہے، اس قدر بے چین رہتے ہیں۔ خواہ ہم پہلی کا خیر مقدم کرنے، ان کو رہنے کی جگہ دینے، اور ان کی نشو و نما میں مدد دینے کے لیے ہم تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگ، جو حقیقتہً شائستہ ہیں، قدرت کے ارادوں کے خلاف مسلسل جنگ کرتے رہتے ہیں۔"

گراندال غور سے اس کی تقریر سنتا رہا۔ وہ اس کی تخیل کی حیرت انگیز پرواز سے واقف تھا۔ اس نے اپنے دوست سے پوچھا:

"گویا تمہارا خیال ہے کہ خدا نے محض اتفاقاً انسانی تخیل کی تخلیق کی؟"

"بے شک! انسانی تخیل ہمارے دماغوں کے اعصابی مرکزوں کا اتفاقی عمل ہے، نامعلوم کیمیائی تغیرات سے، شاید یا شاید بجلی کے، جو رگڑ یا غیر متوقع اتفاقات سے پیدا ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ انسانی تخیل ان تمام مظاہر سے مشابہ ہے جو جاندار مادے کی پراسرار خمیر سے ہویدا ہوتے ہیں۔

"میرے دوست! انسانی تخیل کو ایک حساس خالق نے پیدا کیا ہے اگر اس کی تخلیق کا مقصد وہی ہے جو ہم عام طور پر سمجھتے ہیں، اگر یہ جانوروں کے تخیل، اور جذبۂ صبر و رضا سے بالکل جداگانہ، جابر، متجسس، اور پریشان ہے، تو یہ دنیا، جو ہمارے لیے بنائی گئی تھی، ایسی نہ ہوتی، لومڑی کی تنگ قیام گاہ، سلاد کے کھیت، اور پتھریلے خانہ باغ کی طرح نہ ہوتی، یہ کیسی دنیا ہے جہاں تمہاری تنگ نظر قدرت نے ہمیں رہنے کی جگہ دی ہے کہ ہم غاروں میں یا درختوں کے نیچے رہیں، اور مقتول جانوروں کے گوشت، یا کچی ترکاریوں کو جو دھوپ اور پانی سے نشو و نما پاتی ہیں، اپنی غذا بنائیں؟

"اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے غور کریں، تو ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ دنیا ہم لوگوں کے لیے نہیں بنائی گئی۔ ہمارا تخیل جس کی پیدائش اور پرورش، دماغی اعصاب کی کسی امتیازی صفت سے ہوتی ہے، بالکل بے بس، کم نگاہ، اور الجھا ہوا ہے، اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ اسی کی بدولت ہم دنیا میں جلاوطنوں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔

"اس دنیا پر غور کرو، جو خدا نے اپنی مخلوقات کے رہنے کے لیے بنائی ہے۔ کیا یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ خاص کر جانوروں کے لیے بنائی گئی ہے؟ انہیں کے لیے یہاں درخت لگائے گئے اور جنگل آباد کیے گئے ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ مگر جانوروں کے لیے سب کچھ ہے، درخت، سبزہ زار، دریا، سیر و تفریح کے مقامات اور کھانے پینے کی چیزیں! اس لیے مجھ جیسے حریص لوگ یہاں ہرگز خوش نہیں رہ سکتے۔ صرف ایسے لوگ خوش و خرم رہ سکتے ہیں جو حیوانوں سے مشابہ ہوتے اور انہیں کی طرح قانع اور مطمئن رہتے ہیں۔ مگر اوروں کا کیا حشر ہوتا ہے؟ شعرا، بے صبر، عالمِ خواب میں رہنے والے، متفکر اور بے قرار لوگ ... ... بدنصیب ہستیاں!"

" ہم چقندر کرم کلے پیاز گاجر اور مولیاں کھاتے ہیں کیوں کہ ہم مجبور کر دیے گئے ہیں کہ ان چیزوں کے عادی بنیں اور ہمیں ان سے رغبت ہو جائے اس لیے کوئی دوسری چیز پیدا ہوتی ہی نہیں ۔ لیکن یہ چیزیں تو صرف بیلوں اور بکریوں کی غذا کے لائق ہیں جس طرح گھاس اور لونگ کے پودے گھوڑوں اور گایوں کی غذا ہیں جب میں کھیت میں اناج کے خوشے دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اناج کے خوشے بٹیروں اور دوسری چڑیوں کی چونچوں کے لیے زمین سے پھوٹ کر نکلتے ہیں میرے منہ کے لیے نہیں ۔ اسی طرح جب میں روٹی چباتا ہوں تو چڑیوں کی حق تلفی کرتا ہوں ۔ جب مرغ کا گوشت کھاتا ہوں تو بیلوں اور لومڑیوں کی ملک پر غاصبانہ قبضہ کرتا ہوں کیا کبوتر اور اس جنس کی دوسری چڑیاں باز کی قدرتی خوراک نہیں ؟ گائے اور بھیڑیے کے گوشت بڑے بڑے گوشت خوار درندوں کی غذا نہیں ؟ لیکن ہمارے نصیب ایسے کہاں کہ ہم ساگ کے ساتھ گوشت پکا کر کھائیں !

" جانوروں کو دن کاٹنے کے سوا اور کیا کرنا ہے ؟ ان کے رہنے کی جگہ مقرر اور ان کی غذا کا سامان مہیا ہے ان کا کام صرف گھاس کھانا ، شکار کرنا اور کسی غیر ارادی احساس سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے کو کھا جانا ہے ۔ خدا نے دنیا میں امن و امان قائم کرنے کا خیال نہیں کیا بلکہ اس کے مد نظر صرف اپنی مخلوق کی موت تھی اس کے تصور میں ایسی مخلوق تھی جس کے افراد ایک دوسرے کو برباد کرنے اور نوچ کھانے پر تلے ہوئے ہوں ۔

" جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے ہمیں محنت کوشش صبر ایجاد تخیل ذاتی جوہر اور خداداد صفات سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ ہم اس تیرہ زمین کو رہنے کے قابل بنا سکیں ذرا غور تو کرو کہ ہم اس دنیا نوی طریقے سے زندگی بسر کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے ؟ قدرت کے خلاف جنگ کرتے ہیں ۔ صرف اس لیے کہ ہم اس کثیف ماحول میں زندہ رہ سکیں جو ہماری شان کے لائق ہی نہیں ۔

" ہم جس قدر مہذب ہوتے ہیں اور شائستہ ہوتے جاتے ہیں اسی قدر ہمیں اس حیوانی جذبے پر قابو پانا پڑتا ہے جو ہماری فطرت کا جزو ہے :

" غور کرو کہ ہم نے کس طرح تمدن کی بنا ڈالی جس کی بدولت ہمارے پاس موزے سے لے کر ٹیلیفون تک ہر قسم کی چیزیں موجود ہیں ۔ چیزیں جنہیں تم ہر روز دیکھا کرتے ہو ہمارے لیے بہر صورت کارآمد ہیں ۔ اپنی قسمت سے جنگ کرنے کے لیے ہم نے ہر قسم کا سامان مہیا کر لیا ہے ۔ مکانات لطیف مٹھائیاں کیک شربت شراب کپڑے زیور بستر چٹائیاں گاڑیاں اور مشینیں ۔ ان کے علاوہ ہمارے قبضے میں سائنس آرٹ اختیار پروازی اور شاعری کے ذخیرے ہیں ۔ ہم نے آرٹ شاعری موسیقی اور مصوری کی تخلیق کی ہے ہر وہ چیز جو تخیل کی پیداوار ہے ہماری ہی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے ۔ دنیا کی ان گوناگوں لطافتوں کے باعث ہمیں

اپنی زندگی، جسے خدا نے محض افزائشِ نسل کے لیے مخصوص کیا تھا زیادہ حسین، زیادہ اہم، کم بے مزہ اور کم تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔"

"اس تھیئٹر کو دیکھو۔ یہاں ایک ایسی دنیا ہے جس سے خود تقدیر بھی واقف نہیں جس کی حقیقت صرف ہمیں سمجھ سکتے ہیں۔ ہم جیسے غیر قانع اور بے قرار حیوانوں کی بنائی ہوئی، مضطرب اور حساس دنیا!"

"پھر مادموازل مسکارے ہی کے وجود پر غور کرو۔ خدا نے اس کو غاروں میں جانوروں کے چمڑے لپیٹ کر آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ کیا ایسی زندگی اس کے لیے موزوں نہ ہوتی؟ لیکن نہیں معلوم کہ اس کے ظالم شوہر نے یکایک اسے چھوڑ کر بازاری عورتوں سے اختلاط کیوں بڑھا دیا، حالانکہ اس کے سات بچے بھی ہو چکے تھے؟"

گراندال نے جواب دیا:

"میرے دوست! غالباً اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس نے محسوس کیا ہوگا کہ اپنی بی بی سے میل جول رکھنا مہنگا سودا ہے۔ خانگی اقتصادیات کی بنا پر اس نے بھی وہی نظریے قائم کیے ہوں گے جو تم نے اپنے فلسفے کی بدولت قائم کیے ہیں۔"

آخری ایکٹ کے لیے تین بار گھنٹی بجی، دونوں دوست ٹوپیاں اتار کر اسٹیج کی طرف پھرے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

(۴)

تماشے کے بعد کونت اور کونتس مسکارے اپنی گاڑی میں بیٹھے، گھر واپس جا رہے تھے۔ یکایک شوہر نے بی بی کو مخاطب کیا:

"گیبرئیل!"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کیا تمہیں اس کا احساس نہیں کہ اس الجھن کی مدت بہت طویل ہو گئی؟"

"کیسی؟"

"وہ ناقابلِ برداشت الجھن جس میں تم نے مجھے گزشتہ چھ سالوں سے مبتلا کر رکھا ہے؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"یہ بتا دو کہ وہ بچہ کون سا ہے؟"

"نہیں بتا سکتی!"

" تم نہیں جانتیں کہ جب میں اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں یا مجھے ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے تو اس شک سے میرے دل میں کیسی ٹیس اٹھتی ہے! خدارا مجھے بتا دو کہ وہ کون بچہ ہے؟ میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہارا قصور معاف کر دوں گا۔ اور اس بچے کے ساتھ بھی اپنے بچوں کی طرح سلوک کروں گا۔"

" مجھے یہ بتانے کا حق حاصل ہی نہیں۔"

" تم نہیں محسوس کرتیں کہ اب مجھے زندگی دوبھر معلوم ہوتی ہے؟ یہ سوال جو میں اپنے سے کرتا رہتا ہوں، یہ پریشان کن خیال جو مجھے ستانے لگتا ہے جب میں اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں: میں پاگل ہو جاؤں گا!"

بی بی نے پوچھا:

" تم واقعی بہت پریشان ہو؟"

" بہت زیادہ پریشان ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا مجھے گراں معلوم ہوتا ہے۔ یہ احساس مجھے بار بار ستاتا ہے کہ ان بچوں میں ایک بچہ ایسا ہے جسے میں نہیں پہچانتا، اور جس کی وجہ سے میں دوسرے بچوں سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔"

بی بی نے دوبارہ پوچھا:

تم واقعی بہت پریشان ہو؟

اس نے مغموم اور دھیمی آواز میں جواب دیا:

" میں نے تم سے بارہا کہہ دیا کہ یہ الجھن بالکل ناقابل برداشت ہے، اگر مجھے اپنے بچوں سے محبت نہ ہوتی تو کیا میں اس گھر میں رہتا بھی؟ تمہارے اور ان بچوں کے نزدیک رہنا گوارا بھی کرتا؟ تم نے میرے ساتھ بڑا شرمناک سلوک کیا۔ میرے دل میں اگر کوئی جذبہ ہے تو صرف اپنے بچوں کی محبت کا۔ تم تو اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو۔ میرے دل میں ان کی ایسی ہی محبت ہے جیسی صرف پرانے زمانے کے لوگوں کو ہو سکتی تھی۔ تمہارے لیے میں ایسا شوہر ہوں جس کا نصب العین قدیم طرز کی خانگی زندگی ہے۔ کیونکہ میں ذی حس آدمی ہوں، فطرت کی پیروی کرنے والا، اگلے زمانے کا انسان ـــــ ہاں میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے مجھے بدگمان بنا دیا، کیونکہ تم بالکل جداگانہ روش کی عورت ہو۔ میں وہ باتیں کبھی نہ بھولوں گا جو تم نے مجھ سے کہی تھیں۔ اسی دن سے مجھے تمہارے افعال کی پروا نہ رہی۔ میں نے صرف اس لیے تمہیں قتل نہ کیا کہ پھر یہ معلوم کرنے کا آخری ذریعہ بھی باقی نہ رہتا کہ ہمارے ..... بلکہ ... تمہارے بچوں میں کون بچہ میرا نہیں ہے۔ میں نے اس قدر صبر کیا اور یہ الجھن برداشت کی جس کا احساس تمہیں نہ ہو سکے گا۔ سب سے بڑے لڑکے کے سوا میں کسی بچے سے محبت کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ میں انہیں جی بھر کر دیکھ نہیں سکتا، انہیں پکار نہیں سکتا،

ان کو پیار نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو یہ سوچے بغیر گود میں نہیں لے سکتا: "کہیں یہی تو وہ بچہ نہیں؟" چھ برس سے میں تمہارے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آ رہا ہوں۔ سچ سچ بتا دو کہ حقیقت کیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بُرا سلوک نہ کروں گا۔"

اگرچہ گاڑی میں اندھیرا تھا مگر وہ یہ محسوس کر سکا کہ گیبرئیل اس کی گفتگو سے متاثر ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ شاید اب وہ بولے گی۔ اس نے پھر کہا:

"میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اصل واقعہ بیان کر دو۔"

گیبرئیل نے آہستہ سے کہا:

"شاید میرا جرم اس سے بھی زیادہ سنگین ہے جتنا تم اُسے سمجھ رہے ہو۔ مگر میں بار بار حاملہ ہونا نہیں چاہتی تھی تم سے الگ رہنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے خدائے برتر کی حضور میں جھوٹی قسم کھائی۔ اپنے بچوں کے سر کی قسم کھا کر جھوٹ بولی، کیونکہ میں نے کبھی تم سے بے وفائی نہیں کی۔"

اس نے بی بی کے بازو کو اسی طرح زور سے دبایا، جس طرح اس نے اس دن دبایا تھا، جب یہ دونوں سیر کے لیے بوا کی طرف گئے تھے۔

پھر اس نے ہکلا کر کہا:

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"حرف بہ حرف سچ کہہ رہی ہوں۔"

اس نے وحشت زدہ ہو کر کہا:

"اب تو میں نئے نئے شکوک کا شکار ہو جاؤں گا جن سے کبھی نجات نہ ملے گی۔ میں کس طرح سمجھوں کہ تم جھوٹ کب بولی تھیں، اُس دن یا آج؟ تمہاری بات کا اب کیونکر یقین کروں؟ ایسے اقرار کے بعد میں کسی عورت پر کس طرح بھروسا کر سکتا ہوں؟ میں تو اب کچھ سوچ ہی نہ سکوں گا۔ میں بہت خوش ہوتا اگر تم مجھ سے کہتیں: "وہ بچہ ژاک ہے" یا "وہ بچہ ژاں ہے۔"

اب گاڑی مکان کے صحن میں داخل ہوئی جب گاڑی سیڑھیوں کے سامنے رُکی تو کونت پہلے اُترا، اور حسبِ معمول اس نے سیڑھیوں پر چڑھنے کے لیے بی بی کو اپنے بازو کا سہارا دیا۔

"کیا میں تم سے تھوڑی دیر تک باتیں کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا:

بی بی نے جواب دیا:

"بہ شوق تمام۔"

وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں گئے۔ نوکر جو کمرے میں لیمپ جلانے آیا تھا، انہیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔
جب وہ تنہائی نصیب ہوئی تو کونت نے پھر گفتگو کا سلسلہ جاری کیا:

"آخر میں حقیقت سے کیوں کر واقف ہو سکوں گا؟ میں نے ہزار بار منتیں کی ہیں کہ تم خاموش رہیں اور کسی طرح بھی بولنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ آج تم کہتی ہو کہ یہ جھوٹ بول رہی تھیں ... تک تم مجھے اس قسم کی عجیب بات کا یقین دلاتے رہیں۔ نہیں ۔۔۔ جھوٹ تو تم نے بولا ہی نہیں ... کی وجہ میں کیا بتاؤں؟ شاید مجھ پر ترس کھا کر؟"

بی بی نے اپنے سینے ہونٹوں میں جواب ... سے یکساں نیک رہی تھی۔

"نہیں اگر میں جھوٹ بولتی تو آہستہ ... کرتے کہ چار بچے پیدا ہو گئے ہوتے۔"

اس نے چلا کر کہا۔

"ماں بھی کیسی ایسی باتیں کرتی ہے؟"

بی بی نے کہا:

"میں اپنے کو ان سے کیوں کر ... اب تک پیدا ہی نہیں ہوئے؟ میرے لیے وہی بچے کافی ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں میں انہیں دل و جان سے پیار کرتی ہوں۔ اس مہذب زمانے کی عورتیں صرف دنیا کی آبادی بڑھانے کے لیے وقف ہیں۔"

وہ کھڑی ہوئی مگر کونت نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے

"صرف ایک بات اور میری جان مجھ سے اصل واقعہ بیان کر دو گی؟"

"میں تو کہہ چکی ہوں کہ میں نے کبھی تم سے بے وفائی نہیں کی۔"

وہ بھی بھرے نین ... وہ کس قدر حسین معلوم ہو رہی تھی! اس کی بھوری آنکھیں آسمان کی طرح خنک تھیں اس کے سیاہ بالوں پر ایک مرصع زرنگار تاج کہکشاں کی طرح چمک رہا تھا۔ کونت نے دفعتہً محسوس کیا کہ یہ ہستی جو میرے سامنے ہے صرف ایک عورت ہی نہیں جس کا کام محض افزائش نسل ہے وہ ان تمام عجیب و غریب خواہشوں کا پراسرار حاصل ہے جو صدیوں سے ہماری فطرت میں داخل ہو گئی ہیں اور جو اپنی منزل مقصود سے ہٹ کر ایک دلفریب اور غیر مرئی پرستان حسن کی طرف جا رہی ہیں ہماری بعض خواہشیں ہیں جو خوشگوار خواب دکھاتی ہیں۔ ان خواہشوں اور تمناؤں میں شعریت، خود بینی، جمالیاتی احساس غرض وہ تمام لطافتیں جو قدرت نے عورت کو عطا کی ہیں موجود ہیں۔ گوشت اور پوست کا یہ مجسمہ جسے ہم عورت کہتے ہیں ہماری مادی خواہشوں اور لطیف جذبات کو یکساں برانگیختہ کرتا ہے۔

اس کا شوہر اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ اس انکشاف حقیقت سے وہ کشتہ حیرت ہو گیا تھا۔ وہ اپنی عجیب و غریب

بدگمانی پر غور کر رہا تھا، مگر اس وقت کچھ کہنے سے قاصر تھا۔

آخر اس نے کہا:

"مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم اس وقت سچ بول رہی ہو: مگر اس کے پہلے مجھے یقین تھا کہ تم ہمیشہ جھوٹ بولتی تھیں۔"

کونتس نے شوہر کی طرف ہاتھ بڑھایا:

"تب تو پھر ہماری دوستی قائم ہے؟"

اس نے بی بی کا ہاتھ چوما اور کہا:

"مجھے اب تم سے کچھ بھی رنجش نہیں۔ گیبرئیل! تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا"

وہ کمرے سے باہر نکلا گر اس کی نظریں بی بی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گبرئیل اب تک کس قدر حسین ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں اب ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا ہے، ایسا جذبہ جو اس کے اگلے جذبۂ محبت سے زیادہ شدید ہے۔

دہات کی جھونپڑی

مصنف:- چیخوف۔
مترجمہ:- عبدالحفیظ قمر

ایک نوجوان اپنی کم سن بی بی کے ساتھ ایک چھوٹے سے دہاتی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ شوہر کا بازو بی بی کی کمر میں حائل، اور بی بی کا سر شوہر کے کاندھے پر جھکا ہوا تھا۔ دونوں خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

چاند تیرتے بادلوں میں سے جھانک رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کی خوشی پر چیں بہ جبیں اور اپنے تکلیف دہ اور لاحاصل تجرد پر متاسف تھا۔ ہوا ساکن اور تاریک اور شاہ دانے کی خوشبو سے گراں بار تھی۔ ریلوے لائن کے اس پار کہیں دور پر ایک کرن سی چمک رہی تھی۔

بی بی نے آہستہ سے کہا "ساشا! کیسا سہانا منظر ہے۔ یہ تو خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا دیکھنا یہ جھاڑی کس قدر خوشنما اور دل فریب ہے اور یہ تار کے کھمبوں اور خاموش کھمبے کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت سامنے کے منظر میں خاص مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اور گمان ہوتا ہے کہ انسانیت اور تمدن یہاں سے قریب ہی ہیں۔ جب دوش ہوا پر گاڑی کی گنگناہٹ کی آواز آتی ہے تو کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔"

"بے شک وریا! مگر تمہارے ہاتھ گرم کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ وریا کو آج شب کے کھانے کے لیے کیا کیا ہے؟"

"مرغ کا گوشت اور سلاد ہے۔ مرغ اتنا بڑا ہے کہ دو آدمیوں کے لیے کافی ہے اور پھر سامن اور سارڈین بھی ہیں جو شہر سے آئی ہیں۔"

چاند نے بادلوں کی آڑ میں منہ چھپا لیا۔ انسانی مسرت کے مشاہدے سے اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا اور اس تجرد زندگی کی یاد تازہ ہو گئی جو وہ پہاڑیوں اور وادیوں سے پرے فضا میں بسر کر رہا تھا۔

"ٹرین آ رہی ہے" وریا نے کہا۔

تین آتشیں آنکھیں کچھ فاصلے پر نظر آئیں۔ اسٹیشن ماسٹر پلیٹ فارم پر آیا۔ سگنل کی روشنی لائن پر ادھر ادھر چمکنے لگی۔

ساشا نے جمائی لیتے ہوئے کہا "ٹرین یہاں پہنچ جائے تو ہم گھر واپس چلیں۔ وریا۔ ہم دونوں کس مزے سے وقت گزار رہے ہیں۔ زندگی میں اتنا لطف! یقین کرنا مشکل ہے۔"

وہ سیاہ فام بلا ہانپتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ انہیں ڈبوں کی دھندلی روشنی میں کھڑکیوں سے مسافروں کے شانوں، ٹوپیوں اور خواب آلود چہروں کی جھلک دکھائی دی

ایک ڈبے کے اندر سے یہ آواز آئی "دیکھو! دیکھو! وریا اور ساشا ہمیں لینے کے لیے آئے ہیں! وریا .... وریا .... ادھر دیکھو!"

دو چھوٹی لڑکیاں اچھلتی کودتی ٹرین سے باہر نکلیں۔ اور وریا کے گلے سے لپٹ گئیں۔ ان کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اور ایک لمبا۔ دبلا پتلا مرد باہر نکلے۔ مرد کے بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ان کے پیچھے دو اسکول کے لڑکے تھیلے لیے ہوئے آئے لڑکوں کے بعد استانی اور استانی کے بعد لڑکیوں کی دادی۔

"ہم آگئے، ہم آگئے۔ پیارے بچے" مونچھ والے مرد نے ساشا کا ہاتھ زور سے دبا کر کہنا شروع کیا "تم تو ہم لوگوں کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہوگے! میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تم اپنے بوڑھے چچا کو بُرا بھلا کہہ رہے ہوگے کہ اب تک آئے نہیں۔ کولیا۔ کوسٹیا۔ نانئا۔ فیفا۔ .... بچو۔ اپنے بھائی ساشا کو سلام کرو، ہم لوگوں کی پوری جماعت یہاں پہنچ گئی۔ اگر تین یا چار دن کے لیے .. . ... غالباً ہماری تعداد زیادہ نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں تکلیف ہو۔"

ساشا اور وریا اپنے چچا اور اس کے خاندان کو دیکھ کر دم بخود ہوگئے۔ چچا نے ان دونوں کو پیار کیا اور ان سے باتیں کرنے لگا مگر ساشا مو خیال ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جھونپڑی میں اتنے لوگ کس طرح رہیں گے۔ اسے اور وریا کو اپنے کمرے خالی کر دینے پڑیں گے۔ تکیے اور بستر بھی مہمانوں کو دینا پڑے گا۔ سیمن، سارڈین اور مرغ آن کی آن میں ختم ہو جائیں گے۔ چچا کی لڑکیاں باغیچے کے تمام پھول توڑ لیں گی۔ روشنائی گرا دیں گی، اور جھونپڑی میں ہنگامہ برپا کر دیں گی۔ چچی بار بار اپنی بیماری کا حال سناتی رہیں گی۔ اور فخریہ بیان کریں گی، کہ بیرن وون فنٹک میرا باپ تھا .. ..

ساشا نے نفرت کی نگاہوں سے اپنی بی بی کو دیکھا اور اس کے کان میں کہا:

"یہ سب تم سے ملنے آئے ہیں!..... .. .. لعنت ہو ان پر!"

"نہیں۔ یہ سب تم سے ملنے آئے ہیں"، وریا نے غصے سے لال پیلی ہو کر کہا، "یہ سب تمہارے رشتہ دار ہیں۔ مجھ سے کیا واسطہ؟"

پھر وہ اپنے مہمانوں سے مسکرا کر بولی "خوش آمدید"

چاند پھر نکل آیا۔ وہ مسکرا رہا تھا گویا وہ خوش تھا کہ اس کے کوئی رشتہ دار نہیں۔ اپنے غضب آلود اور رنجیدہ چہرے کو چھپانے کے لیے ساشا نے مہمانوں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے اپنی آواز میں گرمجوشی پیدا کرنے کی کوشش کی اور کہا:

"خوش آمدید۔ آپ نے میری جھونپڑی کو سرفراز کیا۔"

---

[1] ایک قسم کی چڑیا۔

تمثیل

بدگمانی

مصنف۔ مولیئر مترجمہ۔ آرزو جمیل

افرادِ تمثیل

باربویے آنژیلیک کا شوہر
[illegible]
آنژیلیک
[illegible] آنژیلیک کا دوست

کاتو آنژیلیک کی خادمہ
گورژیبو آنژیلیک کا باپ
ویلیئر
لا [illegible]

پہلا منظر باربویے

باربویے یہ شخص کو [illegible] کا کوئی نہایت عجیب [illegible] ہوں [illegible] مجھے [illegible] میری خواہش کے مطابق کام [illegible] مجھے [illegible] کرتی ہے کہیں [illegible] میں مرتبہ اسے ڈانٹوں گھر رہتے [illegible] وہ [illegible] کھاتی پھرتی اور خدا معلوم کس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ اف! غریب باربویے تم کس درجہ قابل رحم ہو! لیکن اسے سزا دینی چاہیے [illegible] کر تم نے اسے قتل کر دیا! اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس کے بعد تم پھانسی پر چڑھا دیے جاؤ گے اگر تم اس کو [illegible] اور [illegible] سے نکل آئے [illegible] کرے گی لیکن [illegible] آ گیا! ہاں! ڈاکٹر ادھر ہی آ رہے [illegible] اپنی پریشانیوں کے متعلق اس سے مشورہ کروں

دوسرا منظر۔ ڈاکٹر اور باربویے

باربویے میں تمہیں بلانے جا رہا تھا۔ مجھے ایک ضروری بات کے [illegible] میں تم سے رائے لینی ہے

ڈاکٹر میرے دوست! تم نہایت بے تمیز اور غیر مہذب معلوم ہوتے ہو۔ تمہیں ٹوپی اتار کر سلام کرنا چاہیے تھا اور عجز و انکسار کے ساتھ یہ کہنا چاہیے تھا کہ زبدۃ الحکما مسیحائے زماں جناب ڈاکٹر صاحب! غلام آداب عرض کرتا ہے مجھے سمجھ کیا ہے؟

باربویے ڈاکٹر میں تم سے نادم ہوں مگر بات یہ ہے کہ میں آپے سے باہر تھا اور میں نے سوچا ہی نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم باہمت [illegible]

---

* مولیئر نے [illegible] elegant [illegible] کس طرح [illegible] میں [illegible] galant کے معنی "باہمت" استعمال کیا [illegible] باہمت galant [illegible] مترجم

آدمی ہو۔

ڈاکٹر تم جانتے ہو کہ "باہت آدمی" آیا کہاں سے ؟

باربوئے مجھے اس سے کیا بحث کہ وہ دلیتریق سے آیا یا آذبرو ولیپیر سے۔

ڈاکٹر نہیں جانتے تو مجھ سے سنو! باہت آدمی ماہتابے آیا ہے۔ ماہتاب کے آخری ارکن سے بے اور الف لیے سے 'با' ہوا۔ بے 'میم اور تے ملا کر لفظ 'مت' بنا 'دونوں کو ملا دینے سے 'بامت' ہوا' اور پھر 'آدمی' جوڑ دینے سے "باہت آدمی" ہو گیا لیکن میں تم سے کہہ رہا تھا کہ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے ؟

باربوئے میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک ڈاکٹر ہو۔ لیکن ذرا یہ تو سنو کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں تمہیں جاننا چاہیے کہ

ڈاکٹر پہلے تم یہ سنو کہ میں صرف ایک ڈاکٹر نہیں ہوں' بلکہ میں ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ' سات' آٹھ' نو' اور دس ڈاکٹر ہوں۔ اول تو یہ کہ ایک کل اعداد میں پہلا عدد اور سبھوں کی جڑ ہے اس لیے میں ڈاکٹروں میں اول ڈاکٹر ہوں سب قابلوں سے زیادہ قابل۔ دوسرے کامل علم حاصل کرنے کے لے دو صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ احساس اور سمجھ۔ میں جسیم احساس اور جسیم سمجھ ہوں گویا میں دو ڈاکٹر ہوں۔

باربوئے میں مانتا ہوں۔ جو میں کہنا چاہتا

ڈاکٹر [illegible] ہے ارسطو کا قول ہے کہ [illegible]

ہے۔ میں خود کامل ہوں' اور جو کام کرتا ہوں' وہ بھی کامل ہوتا ہے۔

باربوئے بہت اچھا ڈاکٹر . . . . . .

ڈاکٹر چوتھے فلسفے کے چار حصے ہیں: منطق' اخلاقیات طبیعات اور مابعدالطبیعات۔ میں چاروں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ گویا میں چار ڈاکٹر ہوں۔

باربوئے بس کرو۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ اب میری سنو

ڈاکٹر پانچویں کلیات خمسہ یعنی جنہیں جانے بغیر صحیح نتائج اخذ کرنا غیر ممکن ہے جنس' نوع' فصل' خاصہ اور عرض' میں ان پانچوں سے کام لیتا اور ان کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہوں۔ گویا میں پانچ ڈاکٹر ہوں

باربوئے مجھے صبر ہی کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر چھٹے۔ چھٹا عدد "کام" کا عدد ہے۔ میں اپنی ناموری کے لیے مسلسل کام کرتا رہتا ہوں۔ گویا میں چھ ڈاکٹر ہوں۔

باربوئے اچھا' اچھا جب تک جی چاہے بولے جاؤ۔

ڈاکٹر ساتویں۔ ساتواں عدد خوشی کا عدد ہے مجھے ان باتوں کا مکمل علم ہے جن سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور اپنے کمالوں کی بدولت میں برابر خوش رہا کرتا ہوں۔ اس لیے مجھے اپنے بارے میں مجبوراً کہنا پڑتا ہے "میں سات ڈاکٹر ہوں"۔ آٹھویں۔ آٹھواں عدد انصاف کا عدد ہے۔ کیونکہ اس میں برابری پائی جاتی ہے۔ عقل [illegible]

بدولت' جس سے میں اپنے کل [illegible]

[illegible]

[illegible]

بھئی میں ڈاکٹر ہوں۔ نو پہلے تھیلی کی دو دیا ں
یہ ہے میں ان سبھوں کی آنکھ کا تارا ہوں۔ دنیا
بھر کی دولت اور وہ ہر لطف کوئی شخص دنیا میں دیکھ
نہیں سکتا اور یہ صدا کی مند پر حاوی ہے
ان حکام صاحب میں نہیں ملا تو گویا تم نے ڈاکٹر و حکیم
ڈاکٹروں کو پالیا اور میری ذات دنیا کے کل ڈاکٹروں
کا نچوڑ ہے۔ یعنی ان معقول صحیح دماغ اور دل
نشین دلائل سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میں ایک دو تین
چار پانچ چھ سات آٹھ نو دس ڈاکٹر ہوں

باربوئیے یہ کیا بک رہا ہے؟ میں نے سمجھا تھا کہ یہ ہوشیار
آدمی ہے۔ اور مجھے معقول مشورہ دے گا۔ لیکن
یہ تو ایک ایسا کم بے معلوم ہوتا ہے جو مجھ سے بات کرنے
کے بدلے پہیلیاں بجھا رہا ہے۔ ایک دو تین چار
—— !!! —— !!! چلو چلو
تمہیں میری بات سننا پڑے گی اور یاد رکھو کہ میں
تمہارا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم نے میری
تشفی کر دی تو میں تمہیں خوش کر دوں گا۔ اگر تم
چاہو گے تو روپے بھی دونگا۔

ڈاکٹر اوہو روپے!

باربوئیے ہاں روپے اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ
مانگو۔

ڈاکٹر (تیزی سے — اپنے گاؤن کو پیچھے کی طرف کھینچ کر)
تم سمجھتے ہو کہ میں روپے کے لیے سب کچھ کروں گا!
تم مجھے پیسے کا لالچی سمجھتے ہو؟ سنو میرے دوست!
اگر تم مجھے سونے کی ایک تھیلی دو اور یہ تھیلی ایک
بیش قیمت بکس میں ہو، یہ بکس ایک قیمتی صندوقچے
میں ہو اور یہ صندوقچہ ایک صندوق میں، یہ
صندوق ایک عجائب خانے میں، یہ عجائب خانہ
ایک عالی شان عمارت میں، یہ عمارت ایک شاندار
محل میں، یہ محل ایک حیرت انگیز قلعے میں، یہ قلعہ
ایک مشہور شہر میں، یہ شہر ایک زرخیز جزیرے میں،
یہ جزیرہ ایک ہرے بھرے صوبے میں، یہ صوبہ
ایک ترقی یافتہ مملکت میں، اور یہ مملکت ساری
دنیا میں ہو اور اگر تم مجھے یہ دنیا دے دو جس میں
یہ ترقی یافتہ مملکت ہو، جس مملکت میں یہ ہرا بھرا
صوبہ ہو، جس صوبے میں یہ زرخیز جزیرہ ہو،
جس جزیرے میں یہ مشہور شہر ہو، جس شہر میں یہ
حیرت انگیز قلعہ ہو، جس قلعے میں یہ شاندار محل ہو،
جس محل میں یہ عالی شان عمارت ہو، جس عمارت
میں یہ عجائب خانہ ہو، جس عجائب خانے میں یہ
عجیب و غریب صندوق ہو، جس صندوق میں یہ
قیمتی صندوقچہ ہو، جس صندوقچے میں بکس ہو، اور
جس بکس میں سونے کی تھیلی ہو، میں اتنی بھی پروا
نہ کروں گا (انگلیاں چٹکاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

باربوئیے مجھ سے بھول ہوئی۔ اسے ڈاکٹر کے لباس
میں دیکھ کر میں نے اسے روپے کا لالچ دینا ضروری
سمجھا۔ لیکن چونکہ اسے روپے کی ضرورت نہیں
اس کو خوش کرنا بہت آسان ہے۔ میں اس کے
پیچھے دوڑوں گا۔

(دوڑتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا منظر — آنژلیک۔ والیر۔ کاتو

آنژلیک — میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آئیں تو بڑا احسان ہو۔ میرا شوہر ایسا بدصورت، بے تمیز، اور شرابی ہے کہ اس کے ساتھ رہنا میرے لیے بہت کٹھن ہو۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ ایسے احمق کے ساتھ رہنے سے کسی کو کیا خوشی نصیب ہو سکتی ہے؟

والیر — آپ نے میری بڑی عزت کی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا دل بہلانے کی کوشش کروں گا۔ چونکہ آپ ازراہ مہربانی یہ کہتی ہیں کہ میری صحبت آپ کو ناگوار نہیں، میں آپ کی دل جوئی کر کے ثابت کر دوں گا کہ مجھے آپ کا خیال معلوم کر کے کتنی خوشی ہوئی ہے۔

کاتو — جلدی سے کچھ اور بات شروع کر دو۔ وہ پانچندول آ رہا ہے۔

چوتھا منظر — بے بار بوئے۔ والیر۔ آنژلیک اور کاتو

والیر — بیگم صاحبہ! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو بری خبر سنانے آیا ہوں۔ لیکن آخر آپ کسی نہ کسی سے تو ضرور سنتیں، اور چونکہ آپ کے بھائی بیمار ہیں۔ ۔

آنژلیک — اس سے زیادہ کچھ نہ کہیے جناب! میں آپ کی خادمہ ہوں، اور آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میرے لیے اس قدر زحمت گوارا کی۔

(والیر چلا جاتا ہے)

بار بوئے — ہوں، ہوں! اب اس کی کیا ضرورت ہے، کہ میں اپنی بی بی کی بے وفائی کی سند عدالت سے حاصل کروں؟ اچھا! اچھا! فاحشہ عورت! میری ہدایت کے باوجود تو غیر مرد سے التفات کرتی ہے، اور میری آنکھوں میں خاک جھونکنا چاہتی ہے۔

آنژلیک — اتنی سی بات کہ یہ مجھے ملامت کرنے لگے! یہ شریف انسان تو مجھے ایک بیمار کی خبر دینے آیا تھا۔ اگر تمہیں مجھ سے جھگڑنے کا بہانہ مل گیا؟

کاتو — میں نے تو اسے دیکھتے ہی سوچا تھا کہ اب ہمیں چین نصیب نہ ہوگا۔

بار بوئے — تم دونوں عورتیں ایک دوسرے کو تباہ کرتی ہو۔ کاتو — تم میری بی بی کو بہکاتی ہو۔ جب سے تم اس کی خادمہ ہو، اس میں پہلے کی سی آدمی خوبیاں بھی باقی نہ رہیں۔

کاتو — خوب! آپ مجھ سے اچھا سلوک کرتے ہیں!

آنژلیک — اس شرابی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ تم دیکھتی نہیں کہ وہ نشے میں اتنا چور ہے کہ اس کے حواس بجا نہیں۔

پانچواں منظر :—

گورژیبو۔ ویلیبرکین۔ آنژلیک۔ کاتو۔ بار بوئے

گورژیبو — دیکھو، میرا کم بخت داماد پھر میری بیٹی کو گالیاں دے رہا ہے۔

ویلیبرکین — ہمیں دریافت کرنا چاہیے کہ معاملہ کیا ہے۔

گورژیبو — تم ہمیشہ لڑتے ہی رہو گے! اگر کبھی چین سے

نہ ہوگے ؟

باربیئے : بہت مجھے شرائط کتی ہے آنٹرلیک ، جی چاہتا ہے کہ تمہارے لوگوں کے سامنے نہیں سخت سزا دوں۔

گورڑیو شیلان کی مار ہو اگر یہ سچ ہے جو وہ کہتا ہے۔

آنٹرلیک ابتدا تو ہمیشہ وہی کرتا ہے۔

کاتو اس گھڑی کا بڑا ہو جب تم نے اس منحوس کو اپنا شوہر بنایا تھا۔

چھٹا منظر۔

(گورڑیو۔ ویسیرکیں۔ آنٹرلیک کاتو۔ مارلیے۔ ڈاکٹر)

ڈاکٹر۔ اس کا مطلب کیا ہے ! کیسی گڑبڑ کیسا جھگڑا کیسا ہنگامہ ! کیسا شور وغوغا ! ارے لوگو تمہیں ہوا کیا ہے لوگو ! آخر ہوا کیا ہے ؟ کیا آپس میں صلح کرا دینے والا کوئی نہیں ہے ؟ اچھا میں اس جھگڑے کو طے کرا دوں گا۔

گورڑیو میرے داماد اور میری بیٹی میں کچھ جھگڑا ہو گیا ہے

ڈاکٹر کیسا جھگڑا ؟ اچھا مجھے اس جھگڑے کی وجہ بتاؤ

گورڑیو صاحب !

ڈاکٹر بالکل مختصر الفاظ میں

گورڑیو ہاں ہاں لیکن اپنی ٹوپی تو پہن لیجیے۔

ڈاکٹر ٹوپی ؟ یہ تو دوسری ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہ ٹوپی کہاں سے نکلا ہے ؟

گورڑیو نہیں

ڈاکٹر یہ بونم لیبٹ سے نکلا ہے جس کے معنے ہیں یہ اچھا ہے "کوئی چیز جو اچھی ہے" کیوں کہ انسان کو سردی اور کھانسی سے بچاتا ہے۔

گورڑیو بہت خوب ! میں نہیں جانتا تھا۔

ڈاکٹر اچھا اب جلد جھگڑے کی وجہ بیان کرو۔

گورڑیو واقعہ یہ ہے کہ

ڈاکٹر مجھے امید ہے کہ تم خواہ مخواہ دیر نہ کرو گے۔ مجھے ضروری کام سے شہر جانا ہے۔ پھر بھی اگر میں تمہارے گھر میں امن قائم کر سکوں تو میں ایک منٹ ٹھہر جانے کے لیے تیار ہوں۔

گورڑیو۔ میں بہت جلد اپنا بیان ختم کر دوں گا۔

ڈاکٹر تو جلدی کرو۔

گورڑیو میں ایک منٹ میں سب کچھ کہہ دوں گا۔

ڈاکٹر مسٹر گورڑیو۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ چند الفاظ میں سب کچھ کہہ لینا بڑا کمال ہے۔ زیادہ بولنے والے کی بات کوئی نہیں سنتا کیونکہ سننے والوں کو الجھن ہونے لگتی ہے۔ "اختصار کلام از ہمہ صفات اولیٰ ست" ایماندار آدمی کی بہترین صفت خاموش رہنا ہے۔

گورڑیو تو پھر آپ کو جاننا چاہیے کہ .

ڈاکٹر سقراط اپنے شاگردوں کو تین کاموں کی ہدایت کرتا تھا اپنے کام ہوشیاری سے کرنا۔ سنجیدگی سے کھانا اور چند الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر دینا

گورڑیو اب شروع کرو۔

گورڑیو میں تو چپا بتاتا ہوں۔

ڈاکٹر محض چند الفاظ میں۔ بغیر کسی تمہید کے بغیر لمبی تقریر کیے ہوئے۔ بس ایک ہی فقرے میں سب کچھ بیان کر دو۔ جلدی، جلدی، موسیو گورژ یو جلدی کرو۔

گورژیو مجھے بولنے بھی تو دیجیے . . . .

ڈاکٹر تم بہت بولتے ہو موسیو گورژ یو۔ اب کوئی دوسرا آدمی جھگڑے کی وجہ بتا دے

ولیئرکن آپ کو جاننا چاہیے جناب کہ . . . . . .

ڈاکٹر تم بالکل جاہل، ان پڑھ اور تہذیب سے ناواقف ہو، جس کو ٹھیٹھ زبان میں گدھا کہتے ہیں۔ تم بغیر کسی تمہید کے بولنا شروع کر دیتے ہو! کوئی دوسرا شخص مجھے بتائے کہ کیا ہوا تھا۔ (آنژلیک سے مخاطب ہو کر) کیا تم اس ہنگامے کی وجہ بتاؤ گی ؟

آنژلیک۔ تم اس موٹے موذی کو دیکھ رہے ہو، یہ شراب کے پیپے جیسا شخص جو میرا شوہر ہے۔

ڈاکٹر مجھ جیسے ڈاکٹر کی موجودگی میں اپنے شوہر کا نام تمیز کے ساتھ لو۔

آنژلیک اچھا! تو جناب کا یہ خیال ہے ؟ میں آپ کی یا آپ کے خیالات کی بالکل پروا نہیں کرتی۔ جب جی چاہے میں خود ڈاکٹر بن جاتی ہوں۔

ڈاکٹر جب جی چاہے تم ڈاکٹر بن جاتی ہو! یہی ڈاکٹری ہے۔ میرے خیال میں تم ہر بات اپنی خواہش کے مطابق . . . . گر جھگڑے کا سبب تو بتاؤ۔

باربوئے جناب حضورِ عالی . . . .

ڈاکٹر تمہید تو اچھی ہے۔ "جناب عالی!" یہ فقرہ کانوں کو کیا بھلا معلوم ہوتا ہے! بڑا شاندار فقرہ ہے! "جناب عالی!"

باربوئے اپنی وصیت کے مطابق . . . .

ڈاکٹر بالکل ٹھیک . . . . "اپنی وصیت کے مطابق!" وصیت میں کسی خواہش کا اظہار ہو گا۔ خواہش کے پورا ہونے یعنی اس کی تکمیل کا ذریعہ اور ذریعے کے لیے کسی شے کا ہونا ضروری ہے۔ بڑا چست فقرہ ہے! "اپنی وصیت کے مطابق!"

باربوئے۔ میں غصے میں بھوت ہو رہا ہوں۔

ڈاکٹر اس لفظ کو اپنی گفتگو سے خارج کر دو۔ "بھوت!" یہ نہایت غیر فصیح لفظ ہے۔

باربوئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب خدا کے واسطے میری بات تو سنیے۔

ڈاکٹر اگر اس وقت قیصر زندہ ہوتا تو کہتا! "اسے پکڑ لو"

باربوئے۔ اگر میری بات نہ سنو گے تو تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ جملات کہنے سے تمہارا مطلب کیا ہے ؟

(باربوئے، آنژلیک، گورژیو، کاتو، لا ولیئرکن جھگڑے کی وجہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر یہی سمجھتا ہے کہ مل جل کر رہنا اچھا ہے۔ سب کے سب بیک وقت بولنے لگتے ہیں اور خوب شور مچاتے ہیں۔ اس ہنگامے میں باربوئے ڈاکٹر

کہ شاید میں [illegible] ان کا دین ہی پھر کے
لگا ہے۔ [illegible] شروع کرتا ہے مگر
[illegible] کو دیکھیں پاس
[illegible] گر جاتے [illegible] احساس ہو کہ
([illegible] پڑا ہوا ہے)

لنڈبرو بیٹی اب گھر واپس جاؤ اور اپنے شوہر کے ساتھ اتنی دیر ان سے رہو۔

ڈیلیکن نغمہ اب ختم ہوا چاہتا ہے۔

(ڈیلیکن لنڈبرو اور آنٹرلیک جاتے ہیں)

ساتواں منظر — والیر اور لاڈلے

والیر میں تمہارا بے حد ممنون ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ ایک گھنٹے میں اس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں تم نے بچے کو [illegible] ہے۔

لاڈلے اتنی دیر تک انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ چند منٹ میں ناچ ختم ہو جائے گا اور تم اپنی محبوبہ سے ملاقات نہ کر سکو گے۔

والیر اچھا تو چلو۔

آٹھواں منظر — آنٹرلیک (تنہا)

میرا شوہر گھر پر موجود نہیں۔ میں ایک پڑوسی کے یہاں [illegible] دیکھنے جاؤں گی۔ شوہر کے آنے سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گی [illegible] ہو گا اور [illegible] گھر سے باہر [illegible] ہوں۔ کم بخت مجھے [illegible] گھر پر تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ (آنٹرلیک جاتی ہے)

نواں منظر — بارونیے

[illegible]

حرکت کروں گا۔ اس جاہل گدھے پر شیطان کی مار ہو! میں نے اس کی ساری قابلیت کا خاتمہ کر دیا۔ اب ذرا گھر چل کر دیکھوں کہ میری خوش سلیقہ بی بی نے کھانے کے لیے کیا پکایا ہے۔ (چلا جاتا ہے)

دسواں منظر — آنٹرلیک

اپنے در کے قریب: میں بہت دیر کے بعد پہنچی۔ دعوت ختم ہو چکی تھی۔ میں اس وقت پہنچی جب لوگ واپس جا رہے تھے۔ مگر اس کی پرواہ کیا ہے؟ کبھی نہ کبھی پھر موقع ملے گا۔ میں اس طرح گھر پہنچوں گی کہ گویا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ خدا خیر کرے! دروازہ بند ہے، کاتو! کاتو!

گیارہواں منظر

اپنے بارونیے (دریچے کے سامنے) آنٹرلیک

بارونیے "کاتو! کاتو!" کاتو کو ہوا کیا ہے؟ اور تم ایسے موسم میں رات کے وقت کہاں سے آ رہی ہو؟

آنٹرلیک میں کہاں سے آ رہی ہوں؟ دروازہ کھولو تو بتا دوں۔

بارونیے یہ تو ہو چکا! جہاں گئی تھیں وہیں جا کر سو رہو۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ رات کے پچھلے پہر تمہارا پھرنا! اُف! میرا سر چکرا رہا ہے۔

آنٹرلیک صرف اس لیے مجھے گالیاں دیتے ہو کہ میں تنہا ہوں؟ آخر میں کروں کیا؟

بارونیے گھر پر رہو، کھانا تیار کرو، گھر کے کاروبار دیکھو اور بچوں کی پرورش کرو۔ مگر فضول باتیں

کرنے کا فائدہ کیا؟ اچھا اب رخصت! جہنم
میں جاؤ اور مجھے چین سے رہنے دو۔

آنٹرلیک تو کیا دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئے نہیں۔ تمہیں اندر نہ آنے دوں گا۔

آنٹرلیک میرے پیارے شوہر! دروازہ کھول دو
میرے عزیز از جان شوہر!

باربوئے اف! گھڑیال! موذی سانپ! تم مجھے
دھوکا دینے کے لیے کتنی پیاری باتیں کرتی ہے!

آنٹرلیک کھولو دروازہ کھولو!

باربوئے الوداع! جاؤ جہنم میں۔

آنٹرلیک دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئے نہیں!

آنٹرلیک تمہیں اپنی بی بی پر ذرا بھی رحم نہیں آتا؟
وہ تو تم پر دل و جان سے فدا ہے۔

باربوئے نہیں! میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم سے بے حد رنج ہو
انتقام کا جذبہ مجھے شیطان مجسم بنا دیتا ہے یعنی
یوں سمجھو کہ میں اپنی ضد پر اڑا ہوا ہوں۔

آنٹرلیک میں کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے مجھے زیادہ
غصہ دلایا تو میں کوئی ایسا کام کر بیٹھوں گی کہ تمہیں
پچھتانا پڑے گا۔

باربوئے کیا کر بیٹھو گی، میری ننھی؟

آنٹرلیک میں اعلان کرتی ہوں کہ اگر تم نے دروازہ
نہ کھولا، تو میں یہیں پر اپنا خون کر ڈالوں گی۔ میرے
والدین ضرور ہم دونوں کو دیکھنے آئیں گے، اور
مجھے مردہ پائیں گے۔ پھر تمہیں پھانسی دے دی
جائے گی۔

باربوئے ہا! ہا! ہا! ہا! ناسمجھ عورت! میرا کیا بگڑے گا؟
تم اتنی بے وقوف نہیں کہ ایسا کرو گی۔

آنٹرلیک تمہیں یقین نہیں آتا۔ دیکھو، میرے پاس
ایک چھری ہے۔ اگر تم نے دروازہ نہ کھولا، تو
میں ٹھیک دل کے سامنے چھری بھونک لوں گی۔

باربوئے ذرا ہوشیاری سے۔ چھری بہت تیز ہے۔

آنٹرلیک دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئے میں تم سے بیسیوں دفعہ کہہ چکا کہ دروازہ
ہرگز نہ کھولوں گا۔ خودکشی کرو، مر جاؤ، جہنم
میں جاؤ — مجھے کچھ بھی پروا نہیں۔

آنٹرلیک (بظاہر چھری بھونک لینا چاہتی ہے) اچھا
تو الوداع ..... آہ! میں مر گئی۔

باربوئے وہ ایسی بے وقوف تو نہیں کہ سچ مچ چھری
بھونک لے؟ میں روشنی لے کر نیچے جاؤں گا
اور اسے دیکھوں گا۔

آنٹرلیک (اپنے آپ سے) میں تم سے ضرور بدلا لوں گی
مجھے ڈھونڈتے رہو۔ اگر اس عرصے میں میں گھر
کے اندر پہنچ گئی، تو پھر میری باری آئے گی۔

(وہ باربوئے کی نظر بچا کر مکان کے اندر چلی جاتی ہے)

باربوئے — میں جانتا تھا کہ وہ بے وقوف نہیں۔ وہ
مر کر بھی یا کوے کے گھونسلے کی طرح زندہ ہے

مہ ولیئن اور آدرس کے قدیم افسانوں میں ایک لکڑی کے گھوڑے کا
ذکر ہے جو بہت تیز دوڑتا تھا۔ اس کا تعلق ... سے
مترجم

دوڑتی ہو۔ میں تو ڈر گیا تھا۔ اس نے اچانک کو بجانا کیوں شروع کیا؟ کیونکہ مرغی سے ہاتھ آتو ہوتو اس نے پکڑ لیا۔ اب مجھے سو رہنا چاہئیے۔ اچھا! ہوا سے دروازہ بند ہو گیا۔ کا تو! کا تو! دروازہ کھولو۔

آنٹر ملیک (دریچے کے سامنے) "کا تو! کا تو! کا تو! کو ہو گیا ہے؟ اور تم اس طرح نشے میں چور اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟ ابھی میرے والدین یہاں پہنچ گے اور تمہاری حالت سے واقف ہو جائیں گے۔ قرابے کے بچے! نالائق انسان! تم دن رات شراب خانہ میں پڑے رہتے ہو اور اپنی بی بی کو گھر پر چھوڑ دیتے ہو کہ بچوں کے ساتھ دن بھر تمہارا انتظار کرے۔

باربوئیے دروازہ جلدی کھول، شیطان کی ماں! ورنہ تیرا سر پھوڑ دوں گا۔

بارہواں منظر

(گورژیو، ویلبرکن، آنٹر ملیک، بے باربوئیے)

گورژیو کیوں؟ کیا ہے؟ اب تک لڑ رہے ہو؟

ویلبرکن تم کبھی میل کرنا بھی جانو گے؟

آنٹر ملیک ذرا دیکھو تو سہی۔ وہ شراب پی کر آیا ہے اور مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔

گورژیو وہ سچ کہہ رہی ہے۔ رات کو تمہیں دیر تک گھر سے باہر نہ رہنا چاہئیے۔ تمہیں لازم ہے کہ جو گھر جاتے ہی آکر اپنی بی بی کے ساتھ پرامن زندگی بسر کرو۔

باربوئیے اگر میں نے گھر سے باہر قدم رکھا ہو تو میرا ستیاناس ہو جائے۔ سامنے والے کونے پر جو لوگ ہیں ان سے پوچھیے۔ وہ تو خود ابھی گھر واپس آئی ہے۔ اف!

بے گناہوں پر ہمیشہ ظلم ہوا کرتا ہے۔

گورژیو اسے حقہ تھوک دو اور آپس میں میل کر لو۔ تم اپنی بی بی سے معافی مانگو۔

باربوئیے میں اس سے معافی مانگوں! اس کو شیطان لے بھاگتا تو بہتر ہوتا۔ میں غصے سے پاگل ہو رہا ہوں۔ ہائے اللہ! اب کیا کروں؟

گورژیو میری جان اپنے شوہر کا بوسہ لو اور رنجش کی باتیں بھول جاؤ۔

تیرھواں منظر (ڈاکٹر رات کا لباس پہنے اپنے دریچے کے سامنے)

ڈاکٹر میرے ہی ہنگامہ، شور و غوغا، جھگڑا، فساد، لڑائی طوفان بدتمیزی! ایک لحظہ بھی چین نصیب نہیں۔

ویلبرکن کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اب سبھوں میں اتفاق ہو گیا۔

ڈاکٹر کیا اتفاق کے متعلق ارسطو کی کتاب کا ایک باب پڑھ کر تمہیں سناؤں؟ اس نے ثابت کیا ہے کہ کائنات کے مختلف حصے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ہی قائم ہیں۔

ویلبرکن یہ باب بہت طویل ہے، کیا؟

ڈاکٹر بہت طویل تو نہیں ہے۔ کل ۶۰ یا ۷۰ صفحات کا مضمون ہے۔

ویلبرکن شکریہ! اب ہمیں جانا چاہیے۔ خدا حافظ!

گورژیو ہاں اب اس وقت رہنے دیجیے۔

ڈاکٹر آپ ارسطو کا مضمون سننا چاہتے ہیں؟

گورژیو نہیں۔

ڈاکٹر جب آپ کی یہی مرضی ہے تو الوداع۔

ویلبرکن چلو اب گھر چل کر کھانا کھائیں۔

(پردہ)

 (۱) میر تقی میر از ق ع ا (۲) حاتم کا سالِ وفات از ق ع ا

میر تقی میر

از ق ، ح سو

میر صاحب کب لکھنؤ گئے ، اس سوال کا جواب تذکرہ نگاروں نے مختلف طور پر دیا ہے ، میرزا علی لطف ، جو بارہویں صدی کے اواخر میں لکھنؤ میں مقیم تھے اور جن کی آصف الدولہ کے دربار میں بھی رسائی تھی ، لکھتے ہیں کہ میر صاحب میرزا سودا کی موت کے بعد لکھنؤ پہنچے ، آزاد کا بیان ہے کہ ۱۱۹۰ھ میں میر صاحب کا دہلی جانا ہوا ، ذکرِ میر کے فاضل مرتب نے میرزا علی لطف کے قول کو آزاد کے بیان پر ترجیح دی ہے ، تذکروں کی ورق گردانی سے بہت ممکن ہے کہ مزید اختلاف کا پتا چلے ، لیکن چونکہ ہم اس سوال کا جواب خود میر صاحب کی زبان سے دینا چاہتے ہیں ، تذکروں کے اختلافات کو دکھانے کی چنداں ضرورت نہیں ،

ذکرِ میر میں میر صاحب نے لکھنؤ جانے کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے مگر میر صاحب کی عادت ہے کہ بات کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو اس کا سال و قوع درج کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ لکھنؤ جانے کا سن بھی اونہوں نے نہیں بتایا ، لیکن ذکرِ میر میں میر صاحب نے صرف اپنے ذاتی حالات ہی نہیں بیان کیے ہیں بلکہ اپنے زمانے کے تاریخی واقعات بھی لکھے ہیں اور دہلی سے روانگی کے قبل و بعد کے واقعات جو اس کتاب میں موجود ہیں ، ان کا زمانۂ وقوع عہد شاہ عالم کے مورخین سے معلوم ہو سکتا ہے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد میر صاحب کے دہلی چھوڑنے اور لکھنؤ جانے کا زمانہ بہ آسانی متعین کیا جا سکتا ہے ۔

میر صاحب (ذکرِ میر ص ۱۳۸) امیر الامرا ذو الفقار الدولہ نجف خاں بہادر کے متعلق لکھتے ہیں : - " با استعمال منہیات و تماشائے زنان چناں پرداخت کہ قوت از بدن زائل شد ، آخر بہ مرض سل گرفتار شد ، اطبا کوشش بسیار در علاج او بکار بردند اما فائدہ مترتب نہ شد ، چوں مایوس شد ، بہ حسرت می گفت کہ من ہیچ نمی خواہم جز ایں قدر کہ زندہ بمانم ، در بیماری او زمانہ رنگ دیگر گرفت "

اپنے لکھنؤ جانے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں : - " فقیر کہ خانہ نشیں بود خواست کہ از شہر بدر زند ، از جہت بے اسبابی حرکت متعذر بود ، برائے نگہ داشتن عزت من در خاطر نواب آصف الدولہ . . گذشت کہ میر پیش من بیاید " (ذکرِ میر ص ۱۳۸ و ۱۳۹)

لکھنؤ پہنچ جانے کے بعد ، تحریر فرماتے ہیں ۔ " بعد از آمدن من ایں طرف آں جا کہ نجف خاں بر بستر افتادہ بود فوت کرد " (ذکرِ میر ص ۱۴۰)

اقتباسات بالا سے دو باتیں قطعی طور پر معلوم ہو گئیں ، ایک یہ کہ ابھی میر صاحب دہلی ہی میں تھے کہ نجف خان زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور معاملات حکومت میں ابتری پیدا ہو چلی تھی ، دوسرے یہ کہ ان کا انتقال میر صاحب کے لکھنؤ پہنچ جانے کے بعد ہوا ، اب ہمیں تاریخ کی مدد سے یہ معلوم کرنا ہے کہ نجف خاں کی بیماری نے خطرناک صورت کب اختیار کی اور ان کی موت کب واقع ہوئی ، میر صاحب

وہاں بھی شہنے کا ندازہ خود بخود معلوم ہو جائیگا۔

شاہ عالم اور فخر الدین محمد الہ آبادی کی کتابوں سے اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں:-

"۱۹ محرم سنہ ۱۱۹۷ھ کو بادشاہ، سیر باغ مقبرۂ صفدر جنگ کے لیے تشریف لے گئے، امیر الامرا باوجود اس کے کہ انہیں خفیف تپ تھی، ہمراہ رکاب تھے، بادشاہ نے کہا بھی کہ احتیاط لازم ہے، گھر جا کر آرام کرو، لیکن اس پر بھی تین دن حاضر خدمت رہے۔ جب طبیعت پر ماندگی کا بہت اثر ہوا، رخصت ہوئے"[۱]

"از دوم ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ از حویلی قمر الدین خان در حویلی صفدر جنگ آوردند لیکن مرض روز بروز و روز تیزاید بود۔" شاہ عالم اور فخر الدین محمد دونوں متفق ہیں کہ نجف خان نے ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۱۹۶ھ کو انتقال کیا[۲]۔ ۱۶ محرم تک نجف خان کو مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لیے میر صاحب غالباً اس کے بعد دلی چھوڑی اور ۲۲ ربیع الثانی سے قبل لکھنؤ پہنچ گئے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لکھنؤ میں میر و مرزا کی یکجائی کی جو روایتیں ہیں وہ محض مصنوعی ہیں۔

میر صاحب کے سال وفات کا عام طور پر علم ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس دن کس مہینے، کس تاریخ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس اطلاع کے لیے ہم میر احمد منشیا؟ دادا و سید انشا کے ممنون ہیں۔ ان کے کلیات فارسی میں ایک صفحے پر یہ عبارت ہے جس کے ہر فقرے سے میر کا سال وفات نکلتا ہے، ایک فقرہ جس کی داد انہیں قتیل سے ملی تھی یہ ہے: "سنہ یک ہزار و دو صد و بست و پنج ہجری" آخر کے دو فقروں سے سن کے علاوہ مہینا، دن، تاریخ سب معلوم ہوتے ہیں، "فقرۂ اول بجز فارسی صاف دل آیا ۱۲۲۵، یوم الجمعہ و بست و یکم از ماہ شعبان ۱۲۲۵، فقرۂ ثانی بزبان پاکیزہ بنیاں ہند، ۱۲۲۵ جمعہ کا اچھا روز اور اکیسویں ماہ شعبان کی ۱۲۲۵"[۳]

---

[۱] و [۲] گلشن ہند طبع دوم ص ۲۰۲، ص ۲۰۹ و ۲۱۰

[۳] آب حیات طبع نہم ص ۲۰۰، آزاد نے میر کے حالات کے لیے گلزار ابراہیم سے مدد لی ہے، لیکن علی ابراہیم یوں لکھتے ہیں۔ "بہنگام تحریر کہ ۱۱۹۶ھ است تشریف شدہ کردہ جہان آباد۔ اقامت دوزند" گلزار ابراہیم قلمی۔

[۴] مقدمۂ ذکر میر ص ۰۰۔ فاضل مرتب نے ۱۱۹۰ھ کے لیے گلشن ہند کے ساتھ گلزار ابراہیم کا بھی حوالہ دیا ہے، لیکن گلزار میں میر کے لکھنؤ جانے کے متعلق ایک لفظ نہیں۔

[۵] اصل عبارت فارسی ہے۔

[۶] عبرت نامہ جلد دوم قلمی کتابیں سب کتب خانۂ خدا بخش خان مرحوم کی ہیں۔

سال وفات حاتم

از ق - ع - و

شاہ حاتم کے سال وفات کے متعلق حسب ذیل اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں :

(١) آب حیات آزاد طبع پنجم ص ١١٩ " ٩٦ برس کی عمر پاکر ماہ رمضان ١٢٠٧ھ میں دہلی میں فوت ہوئے۔ مگر مصحفی نے تذکرہ فارسی میں لکھا ہے کہ ١١٩٧ھ میں فوت ہوئے اور ٨٣ برس کی عمر پائی "

(٢) تذکرہ ہندی مصحفی ص ٨١ " عمرش قریب بہ صد رسیدہ بود و سہ سال ہست کہ در شاہجہان آباد ودیعت حیات سپرد "

(٣) عقد ثریا مصحفی ص ٢٢ و ٢٣ " بقولش تاریخ تولدش صرف ظہور باشد ۔ ہشتاد و سہ سال عمر داد ۔ در یک ہزار و یک صد و ہفت در ماہ رمضان رحلت کردہ۔ (قطعۂ تاریخ وفات کے آخری دو شعر یہ ہیں) :

سال تاریخ از خرد جستم ٭ ناگہ این مصرعہ بگوشم خورد ٭ کہ بگو مصحفی چو پرسیدت ٭ آہ صد حیف شاہ حاتم مرد '

(٤) تاریخ شعرائے اردو مولفہ فیلن و کریم الدین ص ١٣٣ " وہ درمیان ١٧٩١ء دہلی میں فوت ہوا "

(٥) تذکرہ بیجگر قلمی دفتر ہند لندن ' فارسی عبارت کا ترجمہ " سو سال کے قریب عمر پائی ' ١٢١٠ھ میں مرے رنگیں نے تاریخ کہی : ؎

نہیں کہنے میں کچھ آتا ہے افسوس جہاں سے اُٹھ گیا اُستاد حاتم مرے تن میں رہیگی جان جب تک
نہیں ہونے کا دل سے دور یہ غم گیا دنیائے فانی سے یکایک جسے استاد کہتا تھا اک عالم
تمامی ہند میں اس سال یارو ہوا مرنے کا اس کے سخت ماتم لحد پر اس کی سب شاگرد مل کر
ہوئے جب فکر میں تاریخ کی ہم کہا ہاتف نے رنگیں ریختہ کی میاں حاتم سے تھی بنیاد محکم

میں نے ' آہ حاتم برفت از دنیا ' سے تاریخ نکالی ' لیکن لالہ کندن سنگھ فارغ بریلوی کے دیوان میں جو خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ایک قطعہ ملا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاتم کی وفات ١١٩٧ھ میں ہوئی :

' فارغ چو بہ جستجوئے تاریخ ٭ گشتم بہ تلاش و فکر ہمدم ٭ بانالہ و آہ ہاتف از غیب ٭ گفتا ز جہاں برفت حاتم '

١١٩٦ھ : آزاد نے محض سہو سے ١١٩٦ لکھ دیا ہے۔ مصحفی کے تذکرہ فارسی ' عقد ثریا ' کے دو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں ' دونوں میں ١١٩٧ھ ہے ' اور قطعۂ تاریخ کے مصرع آخر سے بھی یہی نکلتا ہے۔

١٢٠٧ھ : کریم الدین نے سال وفات ١٧٩١ء لکھا ہے جو ١٢٠٦ھ کے مطابق پڑتا ہے۔ ١٢٠٧ھ کی سند چونکہ کہیں اور نہیں ملتی ' خیال ہوتا ہے کہ آزاد نے اسے تذکرہ کریم ہی سے لیا ہے ' لیکن حساب کرنے میں ایک سال کی غلطی ہو گئی۔ آزاد نے کریم کا حوالہ نہیں دیا ' یہ کوئی تعجب کی بات نہیں آزاد نے بکثرت ایسا کیا ہے۔

۱۱۹۱ھ مطابق ۷۷ء تک لکھا گیا ہو۔ قاسم کی کتاب کا بیشتر بیانات کا ماخذ ہے اور یہ یقینی ہے کہ گردیزی نے حاتم کا سال وفات اسی سے نقل کیا ہے۔ قاسم کا ماخذ تذکرۂ ہندی مصحفی ہے، جس میں لکھا ہے " ۔ سال ہست کہ ۔۔ ودیعت حیات سپرد" اور[1] قاسم بھی تذکرۂ ہندی کے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پورا تذکرہ ایک ہی سال (۱۲۰۹ھ) میں لکھا گیا ہے، حالانکہ اس تذکرے کا آغاز ۱۲۰۰ھ میں ہوا تھا[3] ۱۲۰۹ھ سال تکمیل ہے۔ مصحفی نے حاتم کا حال ۱۲۰۰ھ میں لکھا[2] اس حساب سے سال وفات ۱۱۹۶ھ ٹھہرتا ہے اور عقد ثریا اور تذکرۂ ہندی کے بیانات کا ظاہری اختلاف دور ہو جاتا ہے۔

۱۲۱۰ھ: رنگین کے قطعۂ تاریخ کی بیت آخر سے سال تاریخ نکالنے کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہاتف کا یہ قول "ریختہ کی بیان حاتم سے گئی بنیاد حکم" بغیر خط و ترجمہ مادۂ تاریخ قرار دیا جائے۔ اس صورت میں ۱۲۰۰ سے زائد نکلتا ہے اور یہ صریحاً غلط ہے؛ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف لفظ "ریختہ" کے اعداد لیے جائیں اور اس کی بنیاد یعنی "ہ" کا عدد اس سے خارج کر دیا جائے، اس صورت میں ۱۲۱۰ برآمد ہوتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ صرف مصرع آخر کے اعداد شمار کیے جائیں۔ اس سے بھی ۱۲۱۰ھ نکلتا ہے۔ دیوان رنگین مدت ہوئی ہماری نظر سے گزرا تھا، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قطعہ دیوان میں ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس حد تک صحیح نقل ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یگانہ نے اسے نقل کرنے میں غلطی ضرور کی ہے اور اسی بنا پر ہم ۱۲۱۰ھ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

۱۱۹۶ھ: اس کی تین سندیں ہیں: عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور قطعۂ فارغ۔ مصحفی ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ گئے ہیں، ۱۱۹۶ھ میں دہلی ہی میں موجود تھے۔ حاتم سے ان کے تعلقات عقیدت مندانہ تھے۔ مصحفی کا سال وفات میں غلطی کرنا بالکل خلاف قیاس ہے۔ فارغ بھی حاتم کے شاگرد تھے۔ اور اس معاملے میں ان کی شہادت بھی کافی وزن رکھتی ہے۔ رہا رنگین کا قطعۂ تاریخ، اگر وہ صحیح بھی نقل ہوا ہو تو مصحفی اور فارغ کی شہادتوں پر رنگین کی شہادت کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور جب تک رنگین کی تصدیق اور فارغ سے ذرا ۱۱۹۶ھ ہی کو حاتم کا صحیح سال وفات سمجھنا چاہیے۔

---

[1] مصحفی نے لکھا ہے کہ ہشتاد و سہ سال عمر داد و حسب ۸۳ سال عمر پائی، یہ مختلف ہے۔ اصل یہ ہے کہ عقد ثریا کئی سال کی مدت میں لکھا گیا ہے۔ مصحفی نے حاتم کا حال ان کی وفات کے قبل تحریر کیا تھا۔ تذکرے کی تکمیل سے پہلے ہی حاتم مر گئے تو مصحفی نے ان کی موت کا حال بڑھا دیا، لیکن اوپر جو کچھ لکھ چکے تھے اسے علیٰ حالہٖ رہنے دیا۔

[2] جو کچھ لکھا ہے اپنی یاد سے لکھا ہے۔ اس وقت تاریخ ادب کی طرف رجوع مشکل ہے۔

[3] تذکرۂ ہندی تذکرۂ فارسی کی تکمیل کے بعد شروع ہوا، تذکرۂ ہندی ص ۳، تذکرۂ فارسی کا سال تکمیل (۱۱۹۹ھ ہی) اس کے بعد بھی اضافے ہوئے ہیں) اس لیے تذکرۂ ہندی کا سال آغاز ۱۲۰۰ھ ہونا چاہیے۔ اس امر کا قطعی ثبوت کہ ۱۲۰۰ھ میں اس تذکرے کی ابتدا ہو چکی تھی یہ ہے کہ مصحفی دہ کے متعلق جن کی وفات ۱۲۰۰ھ میں ہوئی کہتے ہیں "یک سال ہست کہ در جمیع اشیش شفا یافتہ" ص ۹۳۔

صوبہ بہار
ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد

ماخوذ از مراۃ الاحوال مصنفہ آقا بہبہانی

از جناب یوسف الدین احمد بلخی، باطن

۰، ذی قعدہ سنہ مذکور یعنی ۱۲۱۳ھ[1] میں ہم لوگ عظیم آباد پہنچے، چند دوستوں نے استقبال کیا۔ میرزا غلام حسین[2] خاں کے بھائی امیر علی خاں کی شادی مہاراجا جھاؤ لال (اردلی خاص نواب آصف الدولہ) کی بیٹی ہوئی تھی اس تقریب میں ان کے ہمشیرزادے بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کی خواہش سے میں یہاں ٹھہر گیا۔ یہ صوبۂ بہار کا سب سے بڑا شہر ہے اور اس کا نام پٹنہ ہے ... عظیم الشان نے اپنے نام پر ایک شہر بسانا چاہا تھا، اخراج کا اندازہ ایک کروڑ سے زیادہ ہوا۔ بادشاہ نے عظیم الشان کے نام پر عظیم آباد نام رکھا۔ یہ شہر آباد ہوا تو محل بہار ویران ہو کر محض ایک دہات ہو گیا۔ عظیم آباد اب تک پٹنہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر فقرا پرور اور بہت پر لطف ہے، یہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے، اور ہر قسم کے کپڑوں اور کھانے کی چیزوں کی اس قدر افراط ہے کہ لوگ یہاں سے باہر لے جاتے ہیں۔ بنگالے بلکہ ہندوستان میں اس جامعیت کے شہر کم ہیں۔ اسے جنت الہند اگر کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کا طول ڈیڑھ فرسنگ کے قریب ہے اور عرض نصف فرسنگ ہے یہ شہر گنگا کے کنارے واقع ہے جس کی لطافت[3] و شیرینی مشہور ہے۔ یہاں بڑی بڑی عمارتیں اور پرشکوہ بازار بہ کثرت ہیں۔ دریا کے کنارے مسجد اور مدرسے کی عالی شان عمارت ہے جسے زمانہ سابق میں نواب سیف خاں بہادر نے جو تو لباشی حکام سے تھے بنوایا تھا۔ اس کے خرچ کے لیے چند مکانات بھی تھے عمارات ابھی تک مضبوط و مستحکم ہیں اگرچہ کچھ کچھ خرابی کے آثار مرمت نہ ہونے کی وجہ سے نظر آنے لگے ہیں، تاریخ بنا بہ قاعدہ جمل اس آیت سے نکلتی ہے "ان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا[4]"

آج کل سراج الدولہ شہید کی اولاد دختری میں سے بعض نا سیاہ بختاں نے اراضی وقف کے ایک حصے پر قبضہ کر کے مکان بنا لیا ہے، اور مومنین کو اتنی قدرت نہیں کہ مخالفت کر سکیں۔ المختصر میں چند روز اس شہر میں رہا، یہاں کے اعزہ اور اعیان، مقدسین و مومنین ملاقات کے لیے آتے رہے اور مسائل شرعی کی تحقیق کرتے۔ میں نے عظیم آباد کو اس مطلے

[1] یہ سن ایک نسخے میں ہے، دوسرے میں نہیں، لیکن دونوں نسخوں میں اس سے قبل جو گزرا ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۳ھ میں عظیم آباد آئے۔ [2] اصل عبارت فارسی "بسبب خواہش اولاد ہمشیرہ جناب میرزا غلام حسین خاں سابق الذکر کہ بہ تقریب وصلت خال شان امیر علی خاں، برادر خود، با صبیہ اردلی خاص نواب آصف الدولہ بہادر مشہور بہ مہاراجہ جھاؤ لال بہ اینجا بودہ، رفتہ بودند، منزل کردم"۔ [3] حذف ملاحظہ ہو۔

میں بنگالہ کے کل شہروں میں مخصوص دار الشرب مرشد آباد سے ممتاز پایا۔ خاندان تولباش کے کچھ افراد بھی اس شہر میں آسودگی کے ساتھ سکونت پذیر ہیں۔ از آں جملہ عالی جاہ ... عمدۂ امرائے عظام، نواب ۔ مقرب السلطانی مبارز الملک امیر الدولہ خان خانان عباس قلی خاں بہادر نصرت جنگ، دام اقبالہٗ خلف، ... نواب ۔ منیر الملک، منیر الدولہ رضا قلی خاں بہادر، نادر جنگ خراسانی، گزیدہ و نبیل احمد جام کی اولاد سے ہیں۔ جیسا کہ میں نے سنا ہے ان کے آباد اجداد سلاطین صفویہ کے امرا میں تھے، اور نواب منیر الدولہ مرحوم خود شاہ طہماسپ کے دربار میں کسی عہدے پر تھے۔ طہماسپ کے زوال کے بعد کچھ دنوں حق نمک کا خیال کر کے گوشہ نشین رہے۔ نادر شاہ کو جب ان کی عقل اور ذہانت کی خبر ہوئی اس نے انھیں بلا کر اپنے امیروں کی جماعت میں داخل کیا، اور کچھ عرصے کے بعد سفیر بنا کر محمد شاہ کے پاس بھیجا۔ اُس وقت سے ہندوستان میں ہی سلاطین بابریہ کے یہاں معزز و محترم رہے۔ شاہ عالم ان کی بڑی عزت و حرمت کرتے تھے۔ منیر الدولہ اس کے دربار کے مشہور امیروں میں تھے اور آخر تک اسی کے وکیل مطلق تھے۔ نواب (یعنی عباس قلی خاں) روشن ضمیر، بلند ہمت، عالی مرتبت، نیک خصلت، باوقار، دیندار، خجستہ کردار، صاحب ذوق سلیم و طبع مستقیم ہیں۔ علوم درسیہ سے بھی ناواقف نہیں اور ان کی تحصیل کے بہت شائق ہیں۔ مجھ سے محبت فرماتے ہیں وہ برادری کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے، ملاقات کو برابر آتے اور اپنی پرلطف صحبت سے میرے دل حزیں کو مسرور کرتے تھے۔ ان کی اولاد بھی صاحب کمال، نجات کی طالب اور ابنائے جنس سے ممتاز ہے۔

- .... عالی جناب ۔ سید کاظم علی خاں بہادر خلف ارشد .. غفراں مآب نواب فخر الدولہ سید تقی علی خاں بہادر ظفر جنگ خلف مرحوم بخشی الممالک نصیر الدولہ سید ہدایت علی خان بہادر اسد جنگ ابن سید علیم اللہ ابن سید فیض اللہ طباطبائی ان کی عالی خاندانی مشہور ہے اور بیان کی محتاج نہیں وہ ایک عالی مرتبہ بزرگ اور خوش گفتار سید ہیں ان کے مزاج میں انکسار، تواضع، اور بے نفسی بہت ہے، اور انھیں علما و اہل کمال کی صحبت کا شوق حد سے زیادہ ہے۔ اداب دوستی و محبت کے برتنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی بہت آرام اور عافیت سے گزرتی ہے۔ اور مجھ سے بے حد محبت ہے اکثر اوقات اپنے رشتہ داروں اور متوسلین کے ساتھ ملاقات کو آتے اور میری طبیعت کو مسرور فرماتے ان کی والدہ ماجدہ نواب اسمعیل قلی خاں بہادر کی بیٹی ہیں جو مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ کے بھائی حاجی احمد کی منجھلی بیٹی منجھلی خانم کے بطن سے ہیں۔

نژاد از دو کس دارد این نیک پے + ز بہرام گور و ز کاؤس کے

ان کے چچا مرحوم و مغفور سید غلام حسین خاں مصنف سیر المتاخرین۔ اور مرزا غلام حسین خلف حاجی اسمعیل مرحوم بن آقا علاء الدین محمد (جن کا ذکر ملا محمد صالح مازندرانی کے حالات میں ہو چکا ہے) ان کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ ان کے اجداد میں میر فیض اللہ قم میں سو نہایت مقدس اور صالح تھے۔ اور مشہور ہے کہ حضرت عباس علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے

اس شہر میں میر محمد مومن خلف میر محمد یوسف بہبہانی سادات طبا طبائی سے ہیں از مدت دراز گزری کہ دارالایان ایران سے آکر اس ملک میں مقیم ہیں۔ اب سے پہلے کچھ سامان معاش تھا مگر اب مفلس ہو گئے ہیں اور افلاس اور تنگدستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی کئی اولادیں ہیں۔

اسی شہر میں عالی حضرت . . . . .. آقا سید زین العابدین کل کلاب خلف حاجی محمد ناصر قزوینی ہیں۔ جو ایک خوش خلق مہذب اور خوش صحبت جوان ہیں۔ مجھ سے انھیں بہت انس تھا اور حاجتمندوں کی خدمت میں وہ کبھی کمی نہ کرتے حقیقت میں ان کا وجود دینی کاموں کی انجام دہی میں بہت مغتنم ہے جن دوستوں سے فیض آباد سے واپسی پر ملاقات ہوئی ان کا نام اس کے بعد لکھا جائیگا۔

مختصر یہ کہ چند دنوں کے بعد فیض آباد کی جانب روانہ ہوا۔ دانا پور میں جو عظیم آباد سے تقریبًا تین فرسنگ ہے آدھی رات کو میں اور میرے تمام ہمسفر سوئے ہوئے تھے کہ راہ زنوں کی ایک جماعت کشتی پر چڑھ آئی۔ ہوشیار ہونے کے بعد ہم لوگوں نے مقابلہ کیا مگر ان کی جماعت زیادہ تھی ہم لوگ مقابلہ نہ کر سکے وہ لوگ کشتی پر آگئے اور کئی آدمی ننگی تلواریں لیے میرے اور میرے ناظر آقا محمد حسن خزانی کے سر پر کھڑے ہو گئے۔ ہم لوگوں کو قتل کا خوف ہوا رہزنوں نے تمام سامان لوٹ لیا اور بدن کے کپڑوں اور کتابوں کے سوا کوئی چیز نہ چھوڑی۔ اس کے علاوہ ڈرا دھمکا کر شراب مانگتے تھے۔ مگر کتابوں کو دیکھ کر آپس میں بولے کہ یہ سب شرابی نہیں ہیں۔ کتابوں کی برکت سے اس خطرے سے نجات ملی۔ ان لوگوں نے کشتی کو الٹ پلٹ کر دیکھا کہ شاید روپے کی قسم کوئی چیز چھپی ہوئی ہو۔ اور آقا محمد حسن کے سوا تمام ملازموں کو ننگا کر دیا۔ صبح ہونے کو تقریبًا آدھ گھنٹا باقی تھا کہ ان لوگوں نے اپنی راہ لی۔ صبح کو عازم عظیم آباد ہوا، دوستوں میں سب سے پہلے منشی رام چند نامی ایک ہندو کو اطلاع ہوئی انھیں بہت افسوس اور صدمہ ہوا۔ میرے چند روزہ قیام کے دوران میں یہ صاحب مجھ سے اخلاق ناصری پڑھتے تھے اور اپنی جماعت میں تنہا ہوش اور نیک سیرت تھے۔ ان کے بعد دوسرے دوست بھی پہنچے۔ میں نے سید کاظم علی خاں بہادر موصوف کے مکان میں جو دریا کے کنارے واقع ہے قیام کیا۔ خدا کے فضل اور دوستوں کی مدد سے تمام سامان پہلے سے بہتر مہیا ہو گیا۔

عالم ادب

(۱) مرقد غالب، خواجہ حسن نظامی صاحب منادی کے ہمایوں میں تحریر فرماتے ہیں۔

"غالب کا مزار میری درگاہ کے قریب لب سڑک (کذا) واقع ہے۔ مزار کے پائیں یعنی جنوب میں اکبر کے کوکا ... مرزا عزیز ... کا مقبرہ ہے۔ مزار کے غرب میں قبر سے ملی ہوئی بیگم صاحبہ حکیم واصل خاں مرحوم کے مکان کی دیوار ہے اور شرق میں نواب لوہارو کے خاندان کی کچھ قبریں ہیں۔ پھر ایک دیوار ہے۔ پھر تین سو گز کا ایک قطعہ زمین ہے جس کو حکیم محمد ... صاحب نے غالب ہال بنانے کے لیے خریدا ہے۔ اور شمال میں ایک دیوار ہے، اور اس کے باہر شکستہ قبرستان ہے جس کے وارث اب موجود نہیں۔ غالب سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ شمالی دیوار کو ہٹا کر شکستہ قبرستان درست کر دیا جائے، ... شمال کی طرف سڑک کے پاس ایک شاندار دروازہ بنا دیا جائے، اور جتنی زمین مرحومہ بیگم صاحبہ ... نے مزار کے غرب میں عطا فرمائی تھی اس کو شامل کر کے غالب کا مزار اتنا اونچا بنا دیا جائے جو سڑک سے نظر آنے لگے، اور شرق میں غالب ہال بنایا جائے تاکہ آئندہ جلسے اور مشاعرے مزار کے قریب ہی ہو سکیں۔ غالب کا مزار نواب صاحب لوہارو کے قبرستان میں ہے اس لیے قبرستان کے وارث غالب کا مزار بنانے میں مزاحمت کرتے ہیں۔ لہٰذا تجویز کی گئی ہے کہ صرف غالب کی قبر کو بنا دیا جائے ... لوہارو والوں کو اگر اپنے بزرگوں کی قبروں کا خیال ہوگا تو خود بنوا لیں گے۔

(۲) مرقد ذوق، خواجہ صاحب کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذوق کی قبر حکیم عبدالحمید صاحب مالک دواخانہ ہمدرد دہلی نے بنوا کر چار دیواری درست کرا دی ہے۔ اور ایک نئی لوح لگا دی ہے۔

(۳) ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب۔ ناظم دینیات کو مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں ایک قلمی کتاب **ہشت گلشت** دستیاب ہوئی ہے۔ اس کی ضخامت ... صفحات تقطیع ۹ × ۵ ½ ہے ہر صفحے پر بارہ یا تیرہ سطریں ہیں۔ شاہ حسین حقیقت نے امیر خسرو کی ہشت بہشت کا نثر فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ولیم جل مارٹن صاحب کی فرمائش سے غلام احمد نے کلکتے میں اس کا ترجمہ اردو نثر میں کیا ہو کتاب کا سال تالیف ... فصل بہار باغ و بہار سے تاریخ نکلتی ہے۔ فاروقی صاحب اس کو طبع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (رسالہ نادر سہیل)

(۴) سید حسن عسکری صاحب پروفیسر پٹنہ کالج قال بہار لبہار ہیں انہوں نے **ہمایوں بادشاہ کا دیوان** ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ دیوان عرصے سے مفقود تھا۔ حافظ شمس الدین صاحب پروفیسر پٹنہ کالج اس دیوان کے متعلق ایک مضمون معیار کے لیے لکھ رہے ہیں۔

(۵) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں۔ پٹنے سے ایک قدیم کتاب آئی ہے جو ... قبل کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا نام **خریدۃ القصر** ہے اور اس میں عراق، شام، مصر، شمال افریقہ، ہسپانیہ اور صقلیہ کے شعرا کے کلام کا

انتخاب درج ہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف بارھویں صدی عیسوی ہے، اور مصنف عماد الدین کاتب اصفہانی۔ عماد الدین ۱۱۲۵ء میں بمقام اصفہان پیدا ہوا، اور بغداد میں اس کی تعلیم و تربیت ہوی، سلطان نور الدین اور سلطان صلاح الدین اس کے سرپرستوں میں تھے ۱۲۰۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

(۶) ڈاکٹر ابو الحلم محمد نظام الدین نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے شعبۂ اسلامیات کے صدر کی حیثیت سے جو خطبۂ صدارت انگریزی میں پڑھا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ رہبر دکن میں شائع ہوا ہے۔ ذیل میں اس کے عنوانات درج ہیں، جس سے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ اس خطبے میں کون کون سے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ آخر میں ہم بعض حصے جو ہمارے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں، نقل کریں گے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی اشاعت و وسعت، مشرق قریبہ اور مشرقی ممالک میں عربی اور فارسی کی تحصیل، زبان عربی کا جدید مرکز مصر، مشرقی ممالک میں فارسی زبان کا مرتبہ، فارسی زبان کا ارتقا، افغانستان اور زبان فارسی، ہندوستان میں علمی تحقیقات کی نوعیت و مقصد، قدیم مسلک، فرائض محقق، چند تحقیقی تصانیف، ہندوستان کے ممتاز علمی ادارے، صوبۂ پنجاب کی ادبی و علمی خدمات، سر محمد اقبال، ادارہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونی ورسٹی، دیگر جامعات، شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ، دار المصنفین اعظم گڈھ، حیدرآباد جدید کی علمی فضا، علوم اسلامی کی ترویج، معجم المصنفین، مدرسہ نظامیہ۔ اسلامک کلچر، دیگر علمی و ادبی خدمات مجلس مخطوطات فارسیہ، فرہنگ نظام، اردو لغت، محکمۂ آثار قدیمہ سرکار عالی، (اس کے بعد جامعۂ عثمانیہ اور اردو کا ذکر ہے) "مغربی خیالات کے تاثر اور مصریوں کی قوت اخذ کی صلاحیت نے مصر میں ایک ادبی احیا کی صورت اختیار کی ہے۔ ادب عربی میں نثر کا ایک جدید دور جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ جیسے مصلحین اعظم، سعد زاغلول سے نجات دہندۂ مصر، احمد زکی پاشا جیسے مربی ادب، جرجی زیدان جیسے ادیب و فسانہ نگار و جریدہ نویس، احمد امین، علی عبد الرزاق، طہ حسین جیسے علم برداران حریت، رشید رضا منفلوطی، خلیل مطران، فرید وجدی، اور امین ریحانی جیسے ادیب اور رشیدائیان علم کی سرپرستی میں شروع ہوا، نظم بھی ترقی سے کچھ محروم نہیں رہی۔ شوقی اور حافظ ابراہیم کے دبستان نظم مغربی اثر کے مقابلہ میں اپنے مورچے پر قائم ہیں،

ادبیات عالیہ کی اشاعت، جدید ادبیات کی ترویج مصری اخباری دنیا کی سرگرمی عملاً تمام عربی دنیا پر قبضہ جمائے ہوئے ہے لیکن اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض اعتبارات سے کمیت کو کیفیت پر ترجیح دی جاتی رہی ہے یورپی ممالک میں جس قسم کی اعلیٰ پایہ علمی تحقیقات ہوتی ہیں وہ شاذ و نادر ہی جدید عربی میں نظر آتی ہیں۔ اور حیثیت سے قاہرہ کی چہل پہل کسی دوسرے مشرقی و مغربی تمدنی مرکز سے کم نہیں۔ اخبار، رسالے، ناول، بولتی تصویریں (ٹاکیز) اشتہارات، ڈرامے، تقاریر، رسمی خطبے دفتری مراسلت، خانگی کاروبار سب کے سب عربی زبان میں انجام پاتے ہیں۔ اسی طرح دمشق و بیروت بھی عربی زبان کے دو بڑے مرکز ہیں عربی زبان کی نشو و نما میں کافی حصہ لے رہے ہیں۔ فرانسیسی اثرات کے باوجود عربی زبان نے خرابی زبانوں میں سب سے اہم بین الاقوامی درجہ حاصل کر لیا"

فرایض محقق قدیم و جدید مسلک کے حسن و قبح سے قطع نظر اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تحقیق و تدقیق فی نفسہ صحیح تفحص و تجسس کے نتیجے حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت کا انکشاف صرف اسی طرح ممکن ہے محقق کا فرض عین ہے کہ وہ اپنے ذاتی خیالات و میلانات سے علحدہ ہو کر صرف اسی مواد پر انحصار کرے جو اس کے پیش نظر ہو اور قیاسات سے کام نہ لے۔ اسے اپنی تحقیقات کو اس مقام سے شروع کرنا ہے جس نقطے پر اس کے پیش رو نے انتہا کی تھی۔ اس کے ہاں اعادہ و تحصیل حاصل ہے۔ سب سے پہلے موضوع زیر بحث کے متعلق جس قدر مواد موجود ہو اس پر اسے عبور حاصل کرنا لازمی ہے، پھر واقعات کا تجزیہ کر کے ایک مستحکم بنیاد پر اپنے نظریہ کو قائم کرنا اس کا فرض ہے معلومات انسانی میں ایک مستقل اضافہ کرنا مقصود ہے، ایسا جو اغلاط کی رہنمائی کا موجب ہو۔ اس کے نظریے مرور زمانہ سے باطل نہ ہو سکیں۔ تحقیق و تدقیق کا یہی ایک صحیح طریقہ ہے اور یہی ایک صحیح عالم و محقق کا مسلک ہونا چاہیے حالات حاضرہ کا لحاظ، نسل و رنگ و مذہب کا امتیاز، ذہنی و مادی ترقیوں کا تفوق، یہ وہ چیزیں ہیں جو کبھی کسی محقق کے نظام عمل کا جزو نہیں بن سکتیں۔

فاضل صدر شعبہ نے مختلف اداروں اور بعض افراد کی علمی خدمات کے متعلق جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے:

پنجاب یونیورسٹی (۱) فہرست العقد ابن عبد ربہ کی عقد الفرید جیسی اہم کتاب کی تشریحی فہرست (۲) اقلید الخزانہ یعنی عبد القادر بغدادی کی خزانۃ الادب جیسی جامع تصنیف کی تشریحی فہرست۔ (۳) تتمہ صوان الحکمۃ بیہقی۔ تتمہ صوان الحکمۃ کے مصحح نسخے کی اشاعت (۴) زبدۃ التواریخ یا اخبار دولت سلجوقیہ کی تصحیح و تہذیب (۵) امیر خسرو کی زندگی اور کارناموں کا تاریخی مطالعہ (۶) میر قدرت اللہ کا مجموعہ نغز، حسب ذیل کتابیں مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں، یا آیندہ شائع ہونے والی ہیں۔ مجلس مخطوطات فارسی، نامہ امیر خسرو، شائع ہو چکا ہے برہان المآثر زیر طبع

فرہنگ نظام۔ فرہنگ نظام یا فارسی زبان کا جدید لغت بھی ایک اور بڑی مہم ہے جس کی تالیف میں آغا سید محمد علی داعی الاسلام صاحب پروفیسر فارسی نظام کالج مصروف ہیں اس وقت تک سرکاری مصرف سے اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ بقیہ حصہ زیر ترتیب ہے۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ۔ اس ادارے نے مسٹر کرنکو جیسے مشہور مستشرق کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ تذکرۃ النوادر اسلامی علوم کی اہم اور نادر کتابوں کے ذکر میں اس ادارے کی طرف سے چھپ چکا ہے اور الہرنا کا طبع الکتاب، دو سال اور عمل حال میں مرتب ہو گیا ہے۔ اسی سے زیادہ مستند تصانیف اس ادارے نے اس وقت تک شائع کی ہیں۔

محمود حسن خاں صاحب عربی زبان میں مصنفین اسلام کا تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ اس وقت تک چار جزو شائع ہوئے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ اداروں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

اردو کی تمدنی قیمت اگرچہ ناظر کا اس جامعہ کے تعلیمی لوازم، ساز و سامان، ماحول اور دیگر ذرائع کو دیکھ کر حیران رہ جانا ممکن ہے۔ لیکن کیا یہاں کی ممتحن طلبہ کی قابلیت اور صلاحیت کے بہترین حکم نہیں مزدور، انھیں غیر جانب دارانہ طریقہ پر

اردو زبان کی اہمیت اور تمدنی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ بعض منصف مزاج طلبانے اپنی رپورٹوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ خود ان کے طلبہ کو مضامین پر اس قدر قدرت حاصل نہیں اور نہ وہ اظہار مافی الضمیر کے لیے ایسے اسلوب بیان کے حامل ہیں جیسا کہ بعض فرزندان جامعہ کو اردو زبان میں اکتساب کی وجہ سے عبور حاصل ہے۔

ذرائع اکتساب جب جامعات کا اصلی مقصد ترویج علم ہے اور طالب علم سے توقع کی جاتی ہے "ہر گوشہ خرمنے" اور ہر زبان سے استفادہ اور ہر ملک میں تحصیل کی غرض سے جادہ پیمائی کرے تو پھر کیوں ایک جامعہ اور دوسری جامعہ میں ذریعہ تعلیم کی بنیاد پر حدود فاصل قائم کیے جائیں۔ ؟ کوئی زبان خواہ انگریزی ہو یا فرانسیسی یا جرمن یا کوئی اور تنہا زبان علم و حکمت کی اجارہ دار نہیں ہو سکتی۔ اسی خیال کے پیش نظر جدید جامعات میں پروفیسر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مضمون کے ادب پر زبان کی قید و بند سے آزاد ہو کر عبور حاصل کرے اور اپنے مخصوص موضوع پر خیالات کا اظہار ایسے سہل الفہم طریقے سے اور ایسی زبان کے ذریعہ کرے جو طلبہ کی ذہنیت سے بالکل قریب ہو اور تشنگان علم کی سیرابی کر سکے۔ جامعہ عثمانیہ میں اسی اعلیٰ اصول کے مطابق ملک کی عام فہم زبان کو ذریعہ علم قرار دیا گیا ہے۔

لسانی معیار یہ بات ہندوستان کے ایک اور دلچسپ لسانی مسئلے کی طرف رہبری کرتی ہے جس کا ہمیں خالص تعلیمی مدعا کے تحت حل کرنا ضروری ہے۔ کیا کسی زبان کو کسی خاص فرقے یا مذہب یا قوم کے مفاد کے ساتھ وابستہ اور علم کی مقدس دیوی کو غبار آلود کرنا چاہیے ؟ کیا کسی زبان کی پختگی سے اس کی خصوصیات کا اندازہ کرنا چاہیے یا صرف اس کے رسم الخط کے اعتبار سے ؟ کیا کسی زبان کی عمومیت اور مقبولیت پر غور کرنا چاہیے یا اقلیتوں کی مشکلات سے اس کو جانچنا چاہیے ؟ کیا کسی زبان کی سرمایہ داری اور اس کی علوم قدیمہ اور جدیدہ حکمیہ و عقلیہ کو بخوبی اخذ کرنے کی صلاحیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے یا محض جذباتی تعلق کی بنا پر مادری زبان ہونے کی حیثیت سے اس کی نسبت اظہار الفت کرنا چاہیے ؟

اردو کی عمومیت مجھے کامل یقین ہے کہ آپ مجھ سے اس معاملے میں اتفاق کریں گے کہ ہندوستان (یا ہندوستان اعظم کی صورت میں ہم سب اپنی مادر وطن کو تشکل ہوتے ہوئے دیکھنا پسند کریں گے) کا ایک کثیر حصہ اردو بولنے اور سمجھنے پر قادر ہے۔ کیا ہندوستان کے مختلف حصوں میں سوائے اردو کے کوئی اور ہندوستانی زبان اس عمومیت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اگر ہندوستان کا لسانی جائزہ لیں تو یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جائیگی کہ اردو کا میدان ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ وسیع ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم سب ایک عام زبان کی تشکیل میں یک جہتی کا ثبوت دیں اور زبان کے صوبہ داری میلانات اور اختلافات کو رفع کر کے اردو کو اظہار خیال کا واحد ذریعہ قرار دیں۔

تشکیل جدید - حضرات! اردو زبان کی تشکیل جدید اور ہندوستانی زبانوں میں اس کے مرتبے پر تقریر کو ختم کرنے سے قبل آپ کی اجازت سے اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ

انتہائی مسرت ہوگی اگر آپ بھی اس موضوع پر کھلے دل سے اظہار رائے کریں اور مفید تجاویز پیش فرمائیں۔ اس سلسلے میں آپ یقیناً منظم کوشش اور ایک مرکزی ادارے کی ضرورت محسوس کریں گے جس کا تمام ہندوستان میں یکساں احترام کیا جائے؛ جو مقامی اور صوبہ داری تعصبات و امتیازات سے پاک ہو، جو دنیائے اردو میں اپنے اقتدار علمی کو قائم کر سکے، اور زبان کی عظمت کے اضافے کا موجب ہو۔ اس خصوص میں اردو اکاڈمی، جامعہ ملیہ دہلی، دار المصنفین علیگڑھ، ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد، دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اور دوسرے ادارے جو اردو کی ترقی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں ہر طرح لائق تحسین ہیں۔ مگر مزید ترقی کے لیے ایک تمام ہند اردو وفاق کی تشکیل ناگزیر ہے جس کی سرپرستی میں اصلاح زبان، توسیع ادب اور اعلیٰ علمی تحقیقات کا کام صحیح اصول پر انجام پائے۔

صلاح زبان اصلاح زبان کے لیے اس کی ساخت، عناصر ہیئت و ترکیب اور قواعد کی خامیوں کو دور کیا جائے، ایک متفق علیہ رسم الخط ایجاد کیا جائے، ایک مشترک نام اختیار کیا جائے، ایک ایسا معیاری اصول قائم کیا جائے جس کے ذریعہ ثقیل اور نامانوس الفاظ خارج کیے جائیں اور لسانی اتحاد کی خاطر مقامی محاوروں کے جزوی اختلافات اور مختلف مسلکوں کے رجحانات بالکل نظرانداز کیے جائیں۔

توسیع ادب توسیع ادب کے لیے ضروری ہے کہ جدید اصول پر زبان سرمایہ دار بنائی جائے، مختلف زبانوں کی معیاری کتابوں کا ترجمہ کیا جائے، مختلف علوم و فنون کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی جائے۔ ایک مستند لغت اور ایک انسائیکلوپیڈیا (جامع العلوم) اجتماعی مساعی سے مرتب کیا جائے، جدید مفاہیم کے ادا کرنے کے لیے نئے الفاظ وضع کیے جائیں، علمی اصطلاحات متعین کی جائیں، اخباری و صحافتی ادب نیز طباعت و اشاعت کا معیار بلند کیا جائے، نثری طرز نگارش میں اعلیٰ علمی و فنی اسالیب اختیار کیے جائیں، حقیقی شعر و سخن کی عظمت کا اعتراف کیا جائے اور ادبی جد و جہد میں بلند ہمتی اور اعلیٰ مقاصد پیش نظر ہوں۔

تحقیقات علمی زبان و ادب کو درجہ کمال پر پہنچانے کے لیے لازمی ہے کہ عالمانہ اصول کے تحت مخصوص موضوعوں پر مبسوط مقالے اور رسالے شائع کیے جائیں، محققانہ اصول پر تنقید و تبصرہ کا کام انجام پائے، تاریخی، تحقیقی و تنقیدی تالیفات مرتب کی جائیں، مستند و جامع تصانیف تحریر کی جائیں اور بلند پایہ شہکار پیدا کیے جائیں جو ہندوستان حب الوطنی کے حقیقی جذبہ کا ثبوت، قومی یکجہتی کی یکتا نظیر اور لسانی عظمت کی لاثانی مثال دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔

روس اور انگریزی ادب انگریزی کے جدید و قدیم ادب سے روسیوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ابھی حال میں شیکسپیر کے ۶ تماشے دکھائے گئے تھے، اور ڈکسن کا پک وک پیپرس بھی تمثیل کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اہل قلم کی ایک کانگرس بہ مقام موسکو منعقد ہوئی تھی، جس میں بالشویکی مصنفوں کے علاوہ ممالک غیر کے وہ اہل قلم بھی شریک ہوئے تھے جو ان کے ہم خیال ہیں۔ اس کانگرس میں متعدد مقرروں نے اس پر زور دیا کہ ادب کے شاہکار پیش

کرنے کے لیے راسخ العقیدہ بالشوی ہونا ضروری نہیں، اور روسی افسانہ نگار اور شاعر بوژرو امصنفوں کے طریق کار کا مطالعہ کرکے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ میکسم گورکی، نکولائی بکارین اور کارل راڈک کی تقریروں سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بالشوی حکومت بھی انقلاب کے ابتدائی زمانے کے ادبی مسلک کو ناپسند کرتی ہے۔ بالشویکی نقطۂ نظر کے تغیر کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا کہ ۱۹۳۴ء میں اولڈس ہکسلے کے پوائنٹ کونٹر پوائنٹ کا ترجمہ روسی زبان میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا لہجہ مایوسانہ ہے، اور ایک لمحے کے لیے بھی کوئی یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ بالشوی عقائد کی تبلیغ میں اس سے مدد مل سکتی ہے۔ ولز کی روسی انقلاب پسند ہمیشہ تضحیک کیا کیے، لیکن ابھی حال میں اس کی ۶ کتابوں کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ انگریزی اور امریکی مصنفین کی اور کتابیں جو حال میں چھپی ہیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: دن مور ریور از گولزوردی، ہیرو کی موت، از، کرنل کی بیٹی، از رچرڈ آلڈنگٹن، سورج بھی طلوع ہوتا ہے، از ارنسٹ ہمنگوے، ایرو اسمتھ از سنکلیر لیوس، تو رڈ سکنڈ پیریلل از جون ڈوس پاسوس، افسانہ نویس کا افسانہ از شروڈ اینڈرسن۔ ؎

(۸) ابھی حال میں ممالک متحدہ امریکہ کے تین سربرآوردہ ادیب اڈورڈ ویکس (اڈیٹر اٹلانٹک منتھلی پریس) جون ڈیوی (استاد فلسفہ کولمبیا یونی ورسٹی) اور چارلس اے بیرڈ ایسی ۲۵ کتابیں منتخب کیں جو پچاس سال کے اندر شائع ہوئی ہیں اور جن کا اور سی کتابوں کے مقابلے میں دنیا کے عمل اور خیال پر زیادہ اثر ہوا ہے۔ تینوں کی فہرستوں میں سب سے آگے یہ تین نام ہیں۔ سرمایہ مصنفہ کارل مارکس، لوکنگ بیکورڈس مصنفہ اڈورڈ بلمی، دی گولڈن بو مصنفہ سر جیمس فریزر حسب ذیل کتابیں بھی کسی دکسی فہرست میں ہیں، میرڈلو از ڈاکٹر میری اسٹوپیس، دی میتھمیٹکل تھیوری آف الکٹریسٹی اینڈ میگنیٹزم از سر جیمس جین، نظریہ اضافت از آئنشٹائن، بیرک روم بلاڈز از کپلنگ، پلیز پلیزینٹ اینڈ ان پلیزینٹ از برنرڈ شا، تاریخ عالم از ولز، میری کشمکش از ہٹلر، زوال مغرب از اشپنگلر۔

(۹) عبدالرزاق الخیری صاحب اپنے والد بزرگوار مرحوم عبدالراشد الخیری کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں، مرحوم کے مضامین اور متفرق تحریریں جو اخباروں اور رسالوں میں گزشتہ ۴۰ سال میں شائع ہوئی تھیں جمع کی جارہی ہیں، اندازہ ہے کہ ان کا مجموعہ ۲۰ جلدوں میں شائع ہوگا۔

(۱۰) رسالۂ ہمایوں کے مشہور مضمون نگار فلک نما کے مضامین کا مجموعہ بہت جلد دفتر ہمایوں سے شائع ہوگا۔

(۱۱) انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ اپریل کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ اس موقع پر ایک دن صرف اُردو کے لیے مخصوص تھا، اور اس دن صدر جلسہ عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اُردو تھے، اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے زبان کو ترقی دینے کی تجاویز پیش کیں، جائزہ اُردو کی تحریک کا ذکر کیا؛ اور اردو کے ادیبوں کو رومانیت کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرکے ادب کو قوم کی ضروریات اور حالات کے مطابق بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔ اردو اور ہندی

کی تائید کے متعلق انھوں نے جو کچھ کہا اس کا ایک حصہ یہ ہے، "ہنس کے فاضل اڈیٹر اکتوبر کے رسالے میں فرماتے ہیں۔ اگر ہم نے ہندوستانی تو آپ کے سمجھنے کے لیے مترجم کی ضرورت ہوگی۔

"اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سمدار نے اسے **زندہ ملکی زبان** بننے کا مدد کر دیا ہے"۔

خود مہاتما جی کا خط ملاحظہ فرمائیے جو اُنھوں نے ہنس کے متعلق تحریر فرمایا ہے :-

"ہنس ہندوستان بھر میں ایک کا پرچہ ہے یہ ہندی اتھوا ہندوستانی کو راشٹر بھاشا بنانا ہے تو ایسے مالک کی ضرورت ہے پرنتو پرانت کی بھاشائیں جو لکھی جاتی ہیں اس کا پرچہ راشٹر بھاشا دوارا سب کو ملنا چاہیے۔ بہت خوشی کی بات ہو کہ اب ایسا پرچہ دل چاہے اُن کو ہنس دو اپر تا اس آدھے روپے میں ملا کرے گا۔"

اس ہوشیاری کو آپ نے دیکھا اب تک ملک کی زبان "ہندوستانی" تھی اور سب سے زیادہ منظم اور باوقعت کانگریس نے اسے علی الاعلان تسلیم کر لیا تھا، لیکن اب "ہندی یا ہندوستانی" ہو گئی۔ یا "ہندستانی" الفاظ خاص ذہنیت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ حذف ہو جائیں گے بلکہ یہ کہیے کہ ہو گئے جیسا کہ ہنس کے اڈیٹروں کی تحریر سے صاف ظاہر ہے۔ اب اس تحریر کا (جسے مہاتما جی ہندستانی کہتے ہیں) مہاتما جی کے اس خط سے مقابلہ کیجیے جو انھوں نے حکیم اجمل خاں کو اُردو زبان اور اُردو رسم خط میں لکھا تھا اور جس کا عکس بعض رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ان دونوں میں سے ہم کس زبان کو ہندستانی کہیں۔ زبان کو سیاسیات کے خارزار میں گھسیٹنے اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کا یہ نتیجہ ہے کہ دو طبقوں میں بجائے اتفاق کے نفاق اور بڑھتا جاتا ہے۔

اب مہاتما جی جس زبان کو ہندی یا ہندستانی کہتے ہیں اس کا ایک نمونہ تو آپ نے خود ان کے خط میں دیکھ لیا، دوسرا نمونہ ہنس کے فاضل اڈیٹر منشی پریم چند کی تحریر سے پیش کیا جاتا ہے :-

"آپ نے بہت ٹھیک کہا کہ کوتا کیول منورنجن کی وستو نہیں اور نہ کا گا کر سنانے کی چیز ہے۔ وہ تو ہمارے ہردے میں پریرنا وں کو ڈالنے والی، ہمارے ادسا و گرست من میں آنند اے اپسور تی کا سنچار کرنے والی، ہم میں کومل بھاوناؤں کو جگانے والی (استرین بھاؤناؤں کی نہیں) وستو ہے۔"

اسے مہاتما گاندھی ہی ہندوستانی کہہ سکتے ہیں ورنہ کسی اور زبان داں کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ ہم نے آسان جملہ آپ کو سنایا ہے اگر ہم اس سلسلے کے کسی مضمون کا کوئی حصہ سناتا تو آپ کانوں میں انگلیاں دے لیتے اور کہہ اٹھتے :

گر تو ہندی بدیں نمط خوانی
ببری رونق زبان دانی

اور یہ بھی یاد رہے کہ جو نمونہ ہم نے ابھی آپ کو سنایا ہے یہ ایسے شخص کی تحریر ہے جو اُردو کا بھی ایسا ہی اچھا ادیب ہے جیسے ہندی کا اور جو ان لوگوں میں سے ہے جو ہندوستانی زبان کے فروغ کے حامی ہیں۔ مجھے اس کی زبان پر مطلق اعتراض نہیں

یہ بہت صحیح اور فصیح ہندی ہے لیکن اسے ہندوستانی کہنا لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ ممکن ہے کہ مہاتما گاندھی جو توجیہ و تاویل کے فن کے اُستاد کامل ہیں لفظ "ہندوستانی" کے کچھ اور معنی پیدا کرلیں ورنہ بحالت موجودہ "ہندی یا ہندُستانی" کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہوسکتا۔ زبان کا آسان یا مشکل ہونا ایک دوسری بات ہے۔ ہر ایک کا ایک اسلوب بیان یا طرز تحریر ہوتا ہے اور خاص کر ادبی اور سائنٹیفک مضامین میں لامحالہ زبان مشکل ہوجاتی ہے لیکن جو تحریر جس زبان میں ہے اُسے اُسی زبان سے منسوب کرنا مناسب ہے۔ لفظوں کے داؤ پیچ سے غلط فہمیاں پیدا کرنا درست نہیں۔ میں یہ بھی عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے ہنس کے قابل اڈیٹروں نے اپنے رسالے کی زبان کو کبھی ہندوستانی نہیں کہا۔ یہ مہاتما گاندھی ہیں جو ہنس کی زبان کو ہندوستانی کہتے ہیں اور ایسی بڑی جسارت ایسا ہی بڑا آدمی کرسکتا ہے۔ اگرچہ ہمیں ہنس کے اڈیٹروں کے اس قول کے تسلیم کرنے میں بہت تامل ہے کہ اب ہندی زبان تمام ہندوستان کی عام زبان ہوگئی ہے۔

(۱۲) لاہور میں ایک انجمن، "انجمن اردو پنجاب" کے نام سے قائم ہوئی ہے، جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔ (۱) اردو زبان اور رسم الخط کی ترقی اور ترویج، (۲) اردو کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کی حیثیت سے فروغ دینا۔ (۳) مستند اور معیاری زبان کو جدید اور مقامی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے وسعت دینا۔ (۴) ایک شعبۂ ادب کا قیام جس میں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مقالے پڑھے جائیں اور جس کے ماتحت تصنیف و تالیف اور تراجم اور تحقیق و تدقیق کا کام کیا جائے (۵) اردو کے نشوو ارتقا کا جائزہ لیتے رہنا۔ (۶) اخبارات، رسائل سینما ریڈیو وغیرہ کے ذریعے سے اردو کی نشرو اشاعت۔ (۷) اردو زبان کی موجودہ دفتری عدالتی اور تعلیمی حیثیت کا تحفظ۔ (۸) پنجاب یونیورسٹی اور محکمۂ تعلیم میں اردو کے فروغ کی کوشش کرنا۔ (۹) درسی کتابوں کی زبان کا احتساب، انتقاد اور اصلاح۔ (۱۰) مختلف مقامات میں باقاعدہ ملحقہ انجمنوں کا قیام اور الحاق اور جہاں کہیں ایسی انجمنیں موجود ہوں ان کو الحاق کی دعوت دینا۔

انجمن کے سرپرستوں میں سر محمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو، سر اکبر حیدری، سر راس مسعود، سر عبدالقادر کے نام نظر آتے ہیں اس کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ہیں، اور معتمد میاں بشیر احمد صاحب مدیر ہمایوں۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۳ مئی کے جلسے میں ۱۲۰۰ روپے بھی جمع ہوئے، میاں بشیر احمد صاحب کا چندہ سب سے زیادہ تھا یعنی ۵۰۰ روپے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انجمن اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی۔

(۱۳) مان پوری صاحب کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ دفتر ندیم سے بہت جلد شائع ہونے والا ہے۔

ے سامنے تم آجاتے ہو جب دھیان تمھارا کرتے ہیں، اس غزل کے صرف ۴ شعر دیوان میں ہیں، بعد کا
ورق اس شعر سے شروع ہوتا ہے ۔ ص
نشے میں جب وہ کتاب کہ مجھ کو نیند آتی ہے + تو پھر اس کو اٹھا کر میں چھپر کٹ پر لٹاتا ہوں
یہاں پر سے ۱۱ ورق کسی نے پھاڑ لیے ہیں۔ نشان موجود ہے۔ غزلیات کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے،
خارجی سن کے جلے جی میں نہ کیوں اے معروف + جب کہ تو منقبتِ حیدرِ کرار پڑھے،
ورق ۲۵۸ کے خاتمے پر کاتب نے یہ عبارت لکھی ہے " تمام شد دیوان معروف بخط بے ربط بندہ لال جی پرشاد کاتب
ملازم ریاست نواب صاحبان کرنال، تحریر یافت۔ ۲ ر جون ۱۸۵۵ء۔ اس کے بعد ۲۲ ورقوں میں متفرق کلام حسب
تفصیل ذیل ہے :
غزل ناتمام ۳ ½ شعر، مصرع اول " اگر وہ خاک پا ہم دیکھ پاتے اپنی آنکھوں سے "
رباعیاں ۸، رباعی اول : کوئی پابندِ زلفِ عنبر بو ہے + اور کوئی اسیرِ حلقۂ گیسو ہے "
جوشِ انیسِ دل لئے بلائیں لیتی ہے ان سادہ رخوں کی یہ تو سادہ خو ہے "
آخری رباعی یہ دراصل رباعی نہیں، لیکن دیوان میں اس کا شمار رباعیوں میں کیا گیا ہے :
' پاس غیر رہتا ہے اس کو کچھ کہا جاتا نہیں + خواب میں بھی دور ہی رہتا ہے پاس آتا ہے نہیں '
' واقعی وہ ایک ہی ظالم ہے لیکن دوستو + کیا کروں ایسا حسیں تو دوسرا پاتا نہیں۔
متفرق اشعار ۱۰، ان میں ۴ ایک ناتمام غزل کے ہیں ۔ ص
دل کے سوز غم سے جب اپنے کو کاجل سا کرے + تب کوئی ہاں یار کی آنکھوں میں اپنی جا کرے
ہماری آنکھ سے جس نے ضیا کو دیکھا ہے + قسم خدا کی کہ اُس نے خدا کو دیکھا ہے
یہ نہیں خواہش کہ ہم ہو یا ستارے حسن کے میں + جس کے ہم محکوم ہیں وہ ہو ہمارے حکم میں
بات کیا سامنے اس کے کرے انسان درست + دیکھ کر اس کو تو رہتے نہیں اوسان درست
شعر آخر : جب تک کہ یہاں یار کی یارب خبر آئے + ہونے نہ خبر بے خبری اس قدر آئے
خاتمہ : تمام شد دیوان بلاغت عنوان نواب الٰہی بخش خاں صاحب المتخلص بہ معروف، کہین پور مرزا عارف جان،
برادر زادہ شرف الدولہ قاسم جان، امرائے نجف خانی، باشندۂ دہلی، شاگرد رشید جناب حضرت شاہ نصیر الدین
دہلوی، چشتی، صابری، المتخلص بہ نصیر، قدس سرہ البصیر۔
کتاب کے آخر میں ڈاکٹر محمد اسماعیل خاں ذبیح دہلوی کی طرف سے آزاد پر چند اعتراض ہیں مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۱۳ء
۱۰۰ ورق ؛

دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر اور ناسخ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ جرأت کے رنگ کی بھی غزلیں ہیں لیکن کم۔ درد کی طرز میں بھی غزلیں ہیں لیکن اتنی نہیں کہ آزاد کے اس قول کی تصدیق کے لیے کافی ہوں کہ آخر میں درد کی طرز میں آ گئے تھے۔ محاورہ بندی کا بھی انہیں خاص شوق ہے خیال تھا کہ ایسے اشعار یا مصرعے جن میں محاورے بندھے ہوں جمع کر لیے جائیں لیکن اس نیت سے چند صفحات سے زیادہ پڑھنے کا ہمیں موقع نہ مل سکا۔ بعض مصرعے اور اشعار ملاحظہ ہوں'
آتش دل پہ مرے ہے کوئی پنکھا کرتا + توسن فکر کو مصروف ہے کوڑا کرتا + ضلع وہ فیر سے دربار کا بولا کرتا + گر کبھی اس لب شیریں سے یہ ہوتا ردکش   تو میں شہد کو پانی سے بھی پتلا کرتا + ہو ہاتھ سے لے فلک نہ امیر کلاں گرا   اٹھتا نہیں ہے پھر کبھی ہاتھی جہاں گرا + مر ہی گئے تھے ہجر کی شب بیک بچ گئے   کیا جانے کب کا آگیا آنٹے لیا دیا + سن لیو جیلنے میں یہ آج کل پڑا + سب راز ہو گیا وا آنکھیں جو ڈبڈبائیں   لو وہ ہی پیش آیا تھا جو کہ جی میں ڈب کا۔

دو تین غزلیں ملاحظہ ہوں :-

کیا کیجیے اگر دل سے غم اس کا نہیں جاتا   گھر آئے کو تو گھر سے نکالا نہیں جاتا
پاس اب ترے بیمار کے بیٹھا نہیں جاتا   دیکھا ہے یہ حال اس کا کہ دیکھا نہیں جاتا
ہم اور نہ کہتے اسے احوال دل اپنا   باعث ہی کچھ ایسا ہے کہ بولا نہیں جاتا
مت ڈھونڈھ اسے جو گم ہے تری یاد میں ہیں   عنقا سے بھی کھوج اس کا تو پایا نہیں جاتا
ہم جان سے جاتے ہیں اگر اس کو عزیزو   لے آؤ تو کچھ اس میں تمہارا نہیں جاتا
ایسا نہ ہو وہ قبر پہ ساتھ اور کو لائے   یہ دل سے پس از مرگ بھی دھڑکا نہیں جاتا
یہ حال ہے اب تو دل پر درد کا اپنے   بیدرد سے بھی ہاتھ لگایا نہیں جاتا
کیونکر ثمر نخل تمنا کو نہ ترسیں   واں ہے کہ جہاں ہاتھ ہمارا نہیں جاتا
گو خوب رو اب خوب دکھائی نہیں دیتے   پر دیکھنے کا ہم سے یہ لپکا نہیں جاتا
قاصد جو مرا جاتے ہی لے آئے ہے پیغام   کیا جانے کہ جاتا بھی ہے واں یا نہیں جاتا
جاتے تو ہیں واں یار بہت میری طرف سے   لائے جو اسے یاں کوئی ایسا نہیں جاتا
ہے حق کی طلب تجھ کو تو جو یا ہو کہ معروف   پیاسے کو کبھی ڈھونڈنے دریا نہیں جاتا
رتبہ دیکھو اپنی نیست کا کہ اس محفل میں ہے   قرب دیکھو اپنے کینے کا کہ اس کے دل میں ہے
ہم جان سے دل نہیں اپنا لرزتا وقت قتل   ہے یہی دھڑکا کہ رعشہ پنجۂ قاتل میں ہے
خالق ارض و سما جس میں سمایا دیکھنا   دل ہے وسعت کتنی وسعت اس ذرا سے دل میں ہے
وصل گرچہ سعی سے ممکن نہیں لیکن کوئی   ہم سے پوچھے جو مزہ اس سعی لاحاصل میں ہے

تو اگر مجنوں ہے تو ہم نے خبر کر دی تجھے — دل سے مت رہ بے خبر لیلیٰ ہی محمل میں ہے
ہفت خواں کی منزلیں ہیں جس کے آگے ایک گام — ہر قدم پر نیم جاں یہ عشق کی منزل میں ہے
عشق سے کرتا ہے کیوں اتنی ملامت تو مجھے — ناصحا یہ عشق تو انساں کے آب و گل میں ہے
اس کے سایے کو اٹھائے جا زمیں سے نے فلک — مردمک درکار گر چشم مہ کامل میں ہے
ہوں گرہ کس سے مجھے چشم کشادِ کار ہو — وا ہو کب ناخن کو میرے عقدۂ مشکل میں ہے
دیں مجھے وقت شہادت بھر کے حوریں لا کے جام — لیک میری روح آب خنجر قاتل میں ہے
ہو تپ فہمے کہ میری نبض میں ہے اضطراب — یہ تپش معروف کا ہی کو رگ بسمل میں ہے

معروف نے اس دیوان کی بعض زمینوں میں سہ غزلے بھی لکھے ہیں، دو غزلوں کے مقطعے ملاحظہ ہوں۔

تیسری بھی غزل ایک اور مری سن معروف — ہوں نئی طرح سے اظہار تمنا کرتا
سنائے تیسری بھی اب غزل معروف پھر ایسی — کہ منہ تھک جائے تحسیں کرتے کرتے نکتہ سنجاں کا

ایک مطلع حضرت علی کی شان میں ہے اس شعر سے بہت ملتا جلتا ہے جو آزاد نے مظہر کی طرف منسوب کیا ہے

ہوں تو سنی پہ علی سے دوستی جانی مجھے — خواہ ایرانی کہو اور خواہ تورانی مجھے

اعظم الدولہ سرور اور حسام الدین حیدر خاں نامی کی طرف دو شعروں میں اشارے ہیں،

مکہ غزل اک اور بھی معروف سرور کے لیے — آج اس پہ نکتہ فہمی نکتہ دانی ختم ہے
حسام الدین حیدر خاں سے امید وفا مت رکھ — برنگ گل دو رنگی دوستان معروف نامی ہے

بعض اشعار جن سے معروف کے ذوق سخن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہے پسند اپنی وہی شعر کہ جس میں معروف — طرز ہو میر کی انداز ہو جرأت کا سا
ہے پسند خاطر معروف گر شعر مثال — دیکھیے دیوان تنگ کر صائب تبریز کا
سن کے معروف غزل کو ترے امکان نہیں — واہ مصحفی و میر سے نکلے آواز
معروف یوں تو سب شعرا خوب ہیں ولے — بھاتی ہے مجھ کو درد کی یا میر کی زباں
شہر کو معروف اب آگے قلم کو تھام کر — یہ غزل ہے واسطے ناسخ کے بھجوانی مجھے

دریائے لطافت حصۂ منطق نوشتہ قتیل

یہ ۱۹۰ صفحے پر شروع ہو کر ۲۰۳ ص پر ختم ہو جاتا ہے، زبان اس کی فارسی ہی ہے، لیکن بغیر کسی وجہ کے اردو لکھنی شروع کر دیتے ہیں جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہو گا۔ علمی حیثیت سے اس رسالے کی کوئی وقعت نہیں، لیکن مصطلحات علمیہ کو خالص ہندی الفاظ میں ترجمہ کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے اس باب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"بندہ سراپا گنا یعنی تمتیل روسیاہ گوید کہ چوں افصح فصحائے روزمرہ اُردو و رواج دہندۂ نقد بلاغت در ہر برزن و کو متکلم بلیغ عالی مرتبت، شاعر لئیق والامنزلت، بارندہ لآلی متلالی مضامین جدیدہ از دریائے طبع نقاد، و فروزندہ مجالس اصحاب معنی بشمع رافت ذہن وقاد، یعنی میر انشاء اللہ خاں صاحب متخلص بہ انشا کہ کمالاتش از کثرت اشتہا مستغنی از بیان عمر دراز بہت، بحسب ایمائے بندگان جناب وزارت مآب ...... صرف و نحو را بر زبان اردو تمام کرد نظر بلطف قدیم...... . خواست کہ ایں بے تشخص را نیز چند کس صاحب تشخص بدانند و از باغ عنایت حضور پرنور میوہ اشفق روزی ایں کمینہ غلام دامی گردد .. .. تنا براین راقم کثیر الاثم نخست زبان را بنطق چناں وا می نماید کہ از بعضے دانایان ہند آشنا از زبان اردو چنیں بسماعت رسیدہ کہ جاننا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں جاننا اور جاننے والا اور جانا گیا تینوں ایک ہوں اور اس کا نام عربی میں علم حضوری اور میں نے آپ گیان نام رکھا ہے، اس واسطے کہ جب جاننا اور جاننے والا اور جانا گیا تینوں ایک ہوے تب آپ کو آپ ہی جاننے گا جس طرح سے کہ خدا اپنی ذات کا آپ جاننے والا ہے اور اس کی ذات جانی گئی ہے اس صورت میں جاننے والا اور جانا گیا دونوں ایک ہوے کس جہت سے کہ ذات شخص کی وہی شخص ہے۔ جس وقت وہ شخص ہوا جاننے والا اور ذات ٹھہری جانی گئی تو ثابت ہوا کہ دونوں ایک ہیں۔ اب آئیے اس بات پر کہ جاننا کیوں کر ایک ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ جاننے والے اور جانے گئے میں تفاوت ہوگا وہیں جاننا ان دونوں کے سوا تیسری چیز ہوگا، اور جہاں یہ دونوں ایک کہے جائیں گے وہاں وہی جانا گیا جاننا بھی ہے۔ اس صورت سے کہ فلانے کو بڑا علم ہے اور فلانے کی بڑی معلومات ہے۔ دونوں ایک معنی رکھتے ہیں اور ایک مقام میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اس بیان سے یہ بات کھلی کہ جب جاننا اور جانے گئے میں کچھ فرق نہ رہا اور جانا گیا اور جاننے دونوں ایک ٹھہرا اور ہمیں اس کا یہ ہوا کہ جاننے والا اور جاننا اور جانا گیا تینوں باہم ایک ہیں، دلیل اس پر یہ ہے کہ جو دو چیزیں آپس میں سب وجہ سے باہم برابر ہو گئی تو ان دونوں میں سے ایک کی نظیر بھی دوسرے کی ہو بہو نظیر ہوگی .... آگے یہ کہتا ہوں کہ آدمی کو بھی جو اپنی ذات کا علم ہے وہ بھی حضوری ہے اور یہ علم کچھ پڑھنے پڑھانے سے نہیں آتا خود بخود اپنی روح کا علم انسان کو ہوتا ہے جو ہیں بدن کے ساتھ علاقہ ہوا وہیں یہ علم انسان کو حاصل ہوا اگر وہ علم جو حق تعالیٰ کو اپنی ذات کا ہے حضوری کہلاتا ہے اور وہ عالم حصولی جو ہمیں اپنی ذات کا ہے حضوری حادث کہلاتا ہے و نیز باید دانست کہ بعضے براں رفتہ اند کہ علم الٰہی راسوائے علم ذات خود علم اشیا موجودہ کہ آنہا را اعیان ثابتہ گویند ہم حضوری باشد......" ص ۲۰۹ تا ۲۱۳

"ازیں جا شروع کنیم قضایائے شرطیہ را و رہ دو قسم ہے، متصلہ و منفصلہ اول متصلہ کو سُنیئے کچھ چھپا نہیں کہ ایک شرطیہ دو جملوں سے بنتا ہے دلیل اس پر یہ ہے کہ جس وقت حرف شرط اور علامت جزا دور ڈالے ایک شرطیہ کے دو جملے باقی رہ جائیں گے مثال جو آفتاب نکلے تو دن موجود ہو جو کہ حرف شرط و تو علامت جزا ست دور باید کرد باقی ماند دو جملہ آفتاب کا نکلنا اور دن کا موجود ہونا و ایں ہر دو جملہ است لیکن ایں ہر دو مصدر را ماضی باید ساخت

یعنی آفتاب نکلا ہے اور دن موجود ہوا ہے وایں قضیہ متصلہ استقرار ادبیہ اند قسم دیگر از متصلہ اتفاقیہ است یعنی جسمیں اتفاق ایک دوسرے کی شرط ہے.........." ص ۳۵۱ تا ۳۵۲

ذیل میں مصطلحات اور ان کے تراجم کی مکمل فہرست دی جاتی ہے۔ بہت سی اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے ترجمے طرف انہوں نے توجہ ہی نہیں کی۔

علم حضوری - آپ گیان		موضوع - ٹھکانا		انشا	تھوڑی بات
علم حصولی - پڑھیان		عوارض ولوازم - لٹک		تقیدی	پھنسا ہوا
تصور	دھیان	معرف	بتا	غیر تقیدی	چھٹا ہوا
تصدیق	جوں کا توں	حجت	بت کہاؤ	مفہوم	سمجھ لوا
حضوری	دہری اونچ نیچ	دلالت - بات نبانا، نہ سمجھانا، پا یا جانا		کلی	سینورن
موضوع	بول	وضع	ٹھہرانا	جزئی	اچھوتی
محمول	بھرپور	مطابقت	ٹھیک ٹھیک	مصداق	سچل
رابطہ	جوڑ	تضمن	کمسر	مساوی	وہی
مذعان	مان لینا	التزام	اوپر کا لگاؤ	تباین	دو اور
قضیہ	بات	وضع	ٹھہراؤ	عموم	اکھری اونچ نیچ
نسبت	لاپ	طبع	آپ سے آپ	عین	اصل
موجبہ	پورا جوڑ	عقل	سوچ	نقیض	اکھرا انیل
سالبہ	پورا توڑ	لفظی	بولتی بولی	ضد	دہرا انیل
بدیہی	پرگھٹ	غیر لفظی	چپ چپاتی	خاصہ	اپنا اپنا کام
نظری	گپت	دال	رہبر	ماشی	چلتا جانور
تسلسل	الجا سوت	معنی	مراد کا گھر	معرف	بتانے والا
دور	ایر پھیر	مفرد	اکٹھکل	معرّف	جانا بوجھا
عام	بگھٹا	مرکب	ملا جلا	حد	اصل اصل
حادث	نیا	تام	پورا	رسم	بار بار
قدیم	پرانا	ناقص	ٹھمی	تناقض	بگاڑ

صفری　پہلی بات　گہری　دوسری بات　نتیجہ = درہندی سوائے ۔ اردو پھل
استرا　جانچنا　تشیل　پھیلاؤ　و در اُردو حصل

بعض قلیل الاستعمال الفاظ و تراکیب

کمیشا　بعضا　گنبذ　گی خال　(قسم کبوتر)
غٹ غوں غٹ غوں (آواز کبوتر)　پندرہ چوک　تین بیسی　دارمی　(قسم انار)
کھمنی　مثلث　کنوے　(جمع کنوا)　مزدور پار وداری جاوُں　نام مردان زن پیر

کلام گوپی ناتھ کائستھ ساکن شاملی با پدرِ خود کہ ذوقی رام نام داشت و بہ جوگی رام مشہور بود، "بابو جی ہیں یہ کھاپے ہم کمد کا لڈو کہیں ہیں اسے کھا لوگ کی کہیں ہیں نارُن جانے ہو روں کے کھانڈ ہی آوے ہے کہ نا نہیں سیا بابو جی ہم لوگ تو سب کمد کا لڈو کہیں ہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ بانے اس کا نا تو کچھ اور بھی کہیں ہیں کہ یونی کہیں ہیں" ص ۳۱۸

کلام مولوی نطیق اللہ پوربی با یکے از شاگردان رشید خود ش، "یہ جو ملا صدرا میر باقر کبیر اہلم معقول ما ان شاگرد رشید آہ کچھ بوجھے نانہیں پڑت کہ معقول کیری کتب کہہ سے پڑھی رہیں" ص ۳۱۹

حکایت متعلق بخان عالم نقا اللہ خاں: "روزے عزیزے بہ دراو تاق امیرے وارد شد، مادیانے بر سرِ شخصے ایستادہ دید، پرسید کہ 'ایں مادیان از کیست' جواب داد کہ 'جس کا میں نوکر ہوں' سائل باز سوال کرد 'تو ملازم کیستی' گفت 'جس کی یہ گھوڑی ہے' و بعضے گویند کہ ایں نقل نقل نوکر مادیاں نواب خان عالم نقا اللہ خاں مرحوم است، چنانچہ از ہماں روز نواب مذکور بہ گھوڑی والا مشہور شد ... ظاہر است کہ سبب مشتہر شدن او بہ ایں لقب بخل و دنائت او باشد کہ نوکران باوصف حق نمک دم صبح بے آشنا کردن معدہ بیک دو لقمہ نام اورا نمی بردند، دیگراں درچہ شمار اند" ص ۳۱۷۔

حیدرآباد کے کتبخانوں میں اردو کی بعض قلمی مثنویاں

از محمد معین الدین دردائی صاحب

حیدرآباد کے کتب خانوں میں ابھی تک بہت سی قلمی کتابیں ایسی موجود ہیں جن کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں ہے۔ ان کی بحث میں بعض مثنویوں کا ذکر کرتا ہوں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کے متعلق پہلی بار کچھ لکھا جا رہا ہے۔

(۱) **مثنوی ریاض الحسنین**[۱]۔ اس کا صرف ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے۔ اور اگرچہ اس نسخے کے کاتب نے اپنا نام نہیں دیا ہے لیکن اس کے مطالعے سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس مثنوی کا مصنف غلام علی عشرت ایک غیر معروف شاعر ہے۔ بعض جگہ مصنف نے خود اپنے تخلص کا اظہار کیا ہے:

یا ابن علی روح الثقلین ۔۔۔ آرام دل فاطمہ یعنی کہ حسین
اب عشرت غمگیں کی تمنا ہے یہی ۔۔۔ روضے پہ پڑھوں ریاض الحسنین

کہ عشرت زیادہ نہ طول کلام ۔۔۔ پہ آل نبی و محمد سلام
لکھا عشرت نے جب حال شہیداں ۔۔۔ تو رضواں نے بہ صد غیر و سعادت
قلم نرگس کی لے بر صفحۂ گل ۔۔۔ لکھی تاریخ بستان شہادت

(۱۲۲۳ھ)

اس مثنوی میں آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کے واقعات درج ہیں اور پھر شہادت کے مسلسل حالات مذہبی رنگ میں بیان کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ خود مصنف کے ایک شعر سے ظاہر ہے۔

[۱] اس مثنوی کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس قابل ہے کہ اسے گمنامی کے پردے سے نکال کر دنیائے ادب میں پیش کیا جائے۔ دردائی۔

کہ از ذکر آدم علیہ السّلام   دراں یا فتم تا بہ انجام نام

اپنے والد کے انتقال کے بعد یزید نے تختِ خلافت پر متمکن ہو کر جو ایک خط عبدالملک کو حضرت امام حسین و ابنِ عمر و ابنِ ابوبکر و ابنِ زبیر علیہم السلام سے بیعت لینے کے لیے لکھا تھا اس کا ذکر اس مثنوی میں اس طرح کیا گیا ہے ؎

یزیدِ لعیں ہو کے قائم مقام   ہوا سرگروہ لعینانِ شام
وفاتِ پدر سے ہو بس دل میں شاد   ہوا کار فرما جو وہ نامراد
رفیقوں کا سن قصہ کوتہ کلام   مدینے کو لکھے نام نام
تھا عبدالملک ابن مروان وہاں   لکھا اس کو خط شقاوت نشان
یہ ابنِ علی و یہ ابنِ عمرؓ   یہ تہدیدِ بیعت کا پیغام کر
یہ ابنِ ابوبکر و ابنِ زبیر   یہ کہدے کہ اس میں تمہاری ہے خیر
کہ چاروں بہم آکے بیعت کریں   ارادہ اطاعت کا دل پر دھریں
نہ مانیں تو چاروں جواں ہم دگر   تو پھر کاٹ کر بھیج چاروں کا سر

اس مثنوی کا سال کتابت ۱۲۲۲ھ ہے جیسا کہ ختمِ کتابت کے اس جملے سے ظاہر ہے ،

" تحریر فی التاریخ دوم در شہر رمضان المبارک ۱۲۲۲ھ "

(۲) مثنوی چندر بدن اس کا مصنف یاسینی واقف دکن کا ایک غیر معروف شاعر ہے اس کے حالات کے لیے میں نے متعدد تذکرے دیکھے لیکن کسی میں کچھ نہ ملا اپنے کلام سے یہ ایک ذی علم اور صاحبِ لیاقت شاعر معلوم ہوتا ہے تعجب ہے کہ تذکرہ نویسوں نے اس کے حالات قلمبند کرنے میں غفلت سے کام لیا۔ اپنی مثنوی میں واقف نے ایک جگہ خود اپنے دکنی ہونے کا ذکر کیا ہے :

کہ بندہ تو سراپا پُرخطا ہے   خطا کا بخشنا عین عطا ہے
اگرچہ میں بھی تو اہلِ دکن ہوں   نہیں کچھ ہند کا صاحب سخن ہوں
دلے ہندی سے اپنے حسبِ مقدور   بیان کرتا ہوں قصے اس کا مذکور

مصنف نے کئی جگہ خود اپنے تخلص کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً

اے واقف کیا اپنی ہے جو عرض   تو ہے کہ نعت کا کہنا تجھے فرض
سخن میرا جہاں میں کر تو مشہور   سدا رکھ عارفوں کے پاس منظور
یہی واقف کی ہر دم التجا ہے   تری درگاہ [illegible]
[illegible]   لے واقف [illegible]

یا حسینی واقف کی مثنوی چندر بدن دراصل مقیمی کی مثنوی چندر بدن و مہیار کا (جو دکنی زبان میں ہے) صاف اُردو و ہندی میں ترجمہ ہے جیسا کہ خود واقف کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے :

مقیمی نے گر دکنی زباں میں | لکھا ہے قصہ ایک ان کے بیاں میں
لکھا ہے فارسی کوئی رسالہ | یہ سب قصے کا ہے اس میں حوالہ
تخلص فارسی والے کا تھا عشق | سراپا عشق کا قصہ لکھا عشق
لکھے ہندی میں گر تو اس کو سارا | تو دنیا میں رہے گو آشکارا
خیال اس بات کا جب دل میں آیا | قلم تب ہاتھ میں میں نے اٹھایا

واقف کے ان اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چندر بدن و مہیار کے قصے کو مقیمی سے پہلے کسی شاعر نے فارسی زبان میں لکھا تھا اور مقیمی کی مثنوی چندر بدن و مہیار اسی سے ماخوذ ہے۔

واقف کی مثنوی چندر بدن کا صرف ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ اور اب تک اس کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ اس مثنوی کا سال تصنیف ۱۲۲۷ھ ہے۔ مصنف کے ان اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے :

پس از شکر خدا تاریخ کا فکر | مجھے لازم ہے کرناب بیان فکر
سن ہجری سے دیکھا میں نے فی الحال | تھا بارہ سو پہ ستائیسواں سال
نہیں تاریخ کوئی اس سے فائق | وہ پہنچے وصل کو معشوق عاشق

کتب خانہ آصفیہ میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے اس کا کاتب ایک ہندو پورن سنگھ نامی ہے۔ خاتمہ کتاب میں خود کاتب نے اپنے نام کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جس سے کاتب کے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

"زادہ پورن سنگھ پسر ہزاری رامن سنگھ نبیرہ ہزاری حکم سنگھ کارپرداز سرکار نواب آصف جاہ نظام الملک بہادر باشندہ شہر ... سکونت در مکان مہاراج موصوف بندہ اقامت دارد و ہیچ غرض از کسے ندارد سوائے ذات عالی صفات مہاراج دھرم مورت دھرم اوتار راجہ چندو لعل بہادر"

کتابت کرتے وقت کاتب نے چند اشعار اپنی طرف سے بھی لکھ دیے ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ کاتب بھی اردو کا شاعر تھا اس کے صرف دو اشعار اس قصیدہ میں جو درج ذیل ہیں :

الٰہی بخش دے اس خودی کے گنہ کو | تو طاقت دے مرا زیست دست و پا کو
میرے فرزند مہاجن رائے کو تو شاد رکھ | سے مہاراج ندیا دھرمی کو تو آباد رکھ (کذا)

اس کی تاریخ کتابت ۱۳ صفر المظفر ۱۲۵۰ھ ہے۔ خود کاتب کے الفاظ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے :

"بتاریخ سیزدہم ماہ صفر المظفر ۱۲۵۱ھ بنابر فرمائش مہاراج بیاد دھرم جیو پسر گنیش رائے در محلہ حسینی علم تیاری کتاب چندر بدن مہیار نمودہ شد"

اس مثنوی میں سب سے پہلے حمد ہے، پھر مناجات، نعت، منقبت حضرت علیؓ، منقبت بندہ نواز گیسو دراز۔ اس کے بعد خود مصنف نے اپنے نام اور وطن وغیرہ کے متعلق اشارہ کیا ہے۔ ان سب کے بعد قصہ کا آغاز ہوا ہے۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

حمد :-

کرم سے اپنے لے ساقی وحدت ۔۔۔ پلا مجھ کو تو صہبائے محبت
کیا تو عشق کو پیدا ازل سے ۔۔۔ نہیں کچھ عشق ہوگا آج کل سے
دیا یوسف کو ایسی حسن و خوبی ۔۔۔ زلیخا چاہ غم میں جس کے ڈوبی
سنا شیریں کی تو شیریں زبانی ۔۔۔ کیا فرہاد کے سر تیشہ رانی
دکھا چندر بدن کا ماہ رخسار ۔۔۔ کیا مہیار کو دیوانہ اک بار
کیا تو ہیر پر رانجھا کو قرباں ۔۔۔ کیا عذرا کو وامق کا پریشاں
حقیقی اور مجازی عشق باہم ۔۔۔ وہ دونوں ایک ہی معنی میں توام
تو خود معشوق خود عاشق خود عشق ۔۔۔ تو خود مشتاق تو خود مشتاق و خود عشق

آغاز داستان :-

ارے ساقی کہاں ہے آشنائی ۔۔۔ لگا منہ سے مرے کی صراحی
سنو یہ داستاں اے عشق باز ۔۔۔ سنو لے درد و غم کے جاں گداز
زمن ایں داستان عشق بشنو ۔۔۔ شنو از حرف کہنہ معنی نو
کوئی ہے ہند میں ایک شہر اچین ۔۔۔ جسے آنکھوں سے دیکھے دل کو چین
وہاں رہتا تھا کوئی ایک تاجر ۔۔۔ وہ تھا مال و منال اپنے سے فاخر

(۳) **مثنوی مرآۃ الحشر** :- اس کا صرف ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں میری نظر سے گزرا ہے۔ یہ ایک مذہبی مثنوی ہے جس کا مصنف سید محمد فراقی ہے۔ مصنف نے خود اپنے تخلص اور نام کا ایک جگہ ذکر کیا ہے۔

فراقی تخلص ہے میرا مدام ۔۔۔ ولے اصل سید محمد ہے نام

سبب تصنیف پر ایک جگہ فراقی نے خود ہی روشنی ڈالی ہے۔ نصرتی اور غواصی کی شہرت کا سبب ان کی تصانیف کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

جو دیکھا ہوں ایسے تماشے اپار ۔۔۔ مرا بھی ہوا شوق بے اختیار
پڑیا آخرت نامہ میری نظر ۔۔۔ دیکھا دل رگ میں تس کے بتر

....

اسی سے مرے دل میں گذنیا ہے تب ۔۔۔ کروں نظم میں لکوں کھنی ہیں سب

اس مثنوی کے کاتب نے نہ اپنا نام لکھا ہے اور نہ سال کتابت ہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ البتہ سال تصنیف کے

متن خود مصنف نے ایک جگہ دو اشعار لکھے ہیں جس سے اس مثنوی کے سال تصنیف کا پتا چلتا ہے وہ دو اشعار یہ ہیں:

کیا قصد تاریخ جب بونا ... یو اجمال تفصیل کر کھونا
تو بولا دل کیا اس ذوا انتخاب ... یو دیکھو جو ہے بابرکت کتاب[۱]

نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

خداوند بیچوں نرنکار توں ... ہمارے جیون کا ہے ادھار توں
ہماری مرادوں کا تو جیا ہے ... ہر امید کا توں بکا پار ہے
تِرے مغفرت کے ہیں امیدوار ... گو بل وقت کا تو بچہ پنہا ہو یار (کذا)
الٰہی مجے ذوق طاعت کا دے ... نپٹ شوق اپنی عبادت کا دے
مجے زندگی ہی تلک برقرار ... تری بندگی بیچ رکھ استوار
ترا یاد کا رات دن دھیان دے ... تجے پوجنے کا مجے گیان دے
عبادت کا قوت مجے کر عطا ... رکھ اپنی محبت مرے پر سدا

(۴) **گلشن عشق نصرتی** اس مثنوی میں شہزادہ منوہر اور مدمالت کی داستان عشق ہے۔ اس کے دو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ایک کتب خانۂ آصفیہ میں جس کا کاتب غلام احمد ہے اور دوسرا صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے ذاتی کتب خانے میں۔ کتب خانۂ آصفیہ والے نسخے کا سال کتابت ۱۱۹۴ھ ہے۔ اس کے شروع کے چند اوراق غائب ہیں اور کتابت بھی کچھ اچھی نہیں، برخلاف اس کے نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے پاس جو اس کا نسخہ ہے اس کی کتابت بہت پاکیزہ اور صاف ہے۔

(۵) **علی نامہ نصرتی** حیدرآباد میں اس کا صرف ایک نسخہ دفتر دیوانی (اعلیٰ نیتیں) کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس نسخے کا کاتب محی الدین بن سید عبدالرسول نبیرہ مخدوم اشرف جنگ ہے۔ کاتب کی تحریر کے مطابق اس نسخے کا سال کتابت ۱۱۰۰ھ ہے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے جس میں بقول مؤلف "یورپ میں دکنی مخطوطات" یہ شعر موجود ہے

لکھا شہ کا میں جس جو یو کراس ... ہزار ایک ہور ستر پہ تھے چھ برس

اس شعر سے علی نامہ کا سال تصنیف ۱۰۷۶ نکلتا ہے۔ بطور نمونہ دو اشعار درج ذیل ہیں:

حمد اوّل ہے خدا کا جس نے روز اوّل ... دیا ہے ہمت مرداں کوں جو توفیق سو بل
لکھا اس نامہ نامی کا علی نامہ ناؤں ... تا حشر جگ یو زمانی کی گلی جوڑے ہیکل

۱؎ "اس ہار بار" کا مفہوم واضح نہیں ہوتا (معیار) ۲؎ اس مصرعے سے ۱۱۲۳ نکلتا ہے (معیار)

استفسارات

(۱) مصنف مغل اور اردو نے گلزار ابراہیم مصنفہ علی ابراہیم خاں کے حوالے سے حسب ذیل باتیں لکھی ہیں۔ گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، اور اس کے تین قلمی نسخے بھی پیش نظر سے گزرے ہیں، لیکن یہ باتیں نہ مطبوعہ نسخے میں ملتی ہیں نہ قلمی نسخوں میں۔ کیا کسی صاحب کو کوئی قلمی نسخہ ایسا معلوم ہے جو مصنف مغل اور اردو کا ماخذ رہا ہو اور اس میں حوالہ ہائے ذیل ملتے ہوں؟

(ا) ص ۶۳ مغل اور اردو "نواب شجاع الدولہ اور بکسر کی لڑائی تک اردو کا وہ مکتب اودھ میں کھلا رہا" اردو کے مکتب سے مراد وہ ادبی انجمن ہے جو امیر خاں انجام نے بہ قول مصنف مغل اور اردو دہلی میں قائم کی تھی، اور جس کا دفتر ان کے مقتول ہونے کے بعد صفدر جنگ کے قبضے میں آیا تھا۔

(ب) ص ۸۵ "فدوی"۔ مسلمان ہونے پر محمد حسن ہو گئے"۔۔ احمد شاہ کی تعریف میں انھوں نے ایک قصیدہ عرض کر کے گزرانا ۔۔۔ حضور نے ہزار روپے نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی"

(ج) ص ۱۱۵۔ ۱۱۶ "صاحب عالم نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا تھا جو ان کی وفات کے سبب پورا نہ ہو سکا۔۔ وہ ناقل ہیں کہ وارن ہیسٹنگز۔۔ بنارس آئے تو صاحب عالم نے اپنے شعروں کی بیاض بہ طور تحفہ انھیں دی جو ان کے ساتھ ولایت گئی الخ"۔ صاحب عالم سے مراد جہاندار شاہ ہیں اور "وہ" سے علی ابراہیم خاں۔

(د) ص ۱۱۲ "شاہ صاحب نے ۱۱۷۶ھ میں رحلت کی" شاہ صاحب سے شاہ ولی اللہ صاحب مراد ہیں۔

(ہ) ص ۱۳۱ مراد شاہ ۔ ایک مشہور پنجابی اردو گو ۔۔ جب پورب کے سفر سے لوٹ کر دلی آئے ہیں تو بادشاہ انھیں انعام واکرام دیتا ہے" مراد شاہ وہی ہیں جن کا ذکر پنجاب اور اردو میں ہے اور بادشاہ اکبر ثانی ہیں جو ۱۲۲۱ھ میں تخت پر بیٹھے ہیں۔ مصنف گلزار کا انتقال ۱۲۰۸ھ میں ہوا ہے، اور کتاب کی تکمیل اپنی زندگی ہی میں کر چکے تھے، اکبر ثانی کے زمانے کا واقعہ گلزار میں کیوں کر درج ہو سکا، سخت حیرت ہے

(۲) میر امامی ہروی میر حسن کے اجداد سے تھے، حسن نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ عالم و فاضل، خطاط اور شاعر تھے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ وہ عہد شاہ جہانی میں ہندوستان آئے اور شاہ جہاں کے منصبداروں میں تھے۔ اگر ایسا ہو تو عہد شاہ جہاں کی کسی نہ کسی کتاب میں شاعر، خطاط، عالم یا منصبدار کی حیثیت سے ان کا ذکر ہونا چاہیے۔ مجھے باوجود تلاش کسی کتاب میں تذکرہ میر حسن کے سوا میر امامی ہروی کا حال نہیں ملا۔ میں نے ایک صاحب سے جن کا یہ دعوی تھا کہ میر امامی عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے، دریافت بھی کیا کہ اس دعوے کی کون سی سند ہے، لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اگر کسی صاحب کو میر امامی کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ میں نہایت ممنون ہوں گا۔

قاضی عبدالودود

محاکمہ

(۱) دیوان معروف، دیوان جوشش وغیرہ، از ق ع ع (۲) خمسہ مصحفی وغیرہ، از ڈاکٹر شادانی، ق ع ع
(۳) گوری، از ڈاکٹر شادانی (۴) انداز لسنوی (۵) معیاری زبان، از ڈاکٹر شادانی۔

دیوان معروف

ص ۸۵ شعر خاصے سن رسیدہ ہے معروف ، یہ تو بیشیں تھا جس پر میرا ۔ بیٹھن ، دو گیرا جس میں گوٹا کناری یا قیمتی کپڑے
رکھ کر لپیٹتے ہیں۔

ص ۲۹ سے نہ کہی جب کہ تیرے تبسم کا آپا ۔ گلشن میں خفل غنچہ گل کھل کھلا پڑا = غنچہ کا دل ؟

ص ۷۵ سے یوسف او کان ملاحت حسن کے مانے ہوئے ۔ دیکھتا تجھ کو تو پھر تیری سی صورت مانگتا ۔ ؟

ص ۲۹ سے گرچہ واحد ہیں ہوں ادیب دیدہ پر دونوں کی ایک ۔ دیکھنے میں دو ہیں آنکھیں ہے نظر دونوں کی ایک ۔ واحد بیں ل دوبیں

ص ۸۵ سے سمجھ کر کبوتر مک اس دل کو چاک شل پایا ؟ ۔ بجائے دانہ ہم اس میں ثبت اور کھتے ہیں ۔ انار

ص ۸۶ سے قسم دیکر اوروں کے آدمی سے میں نے جو پوچھا ۔ کہ سچ بتلا وہ مجھ کو قید میں بھی یاد کرتے ہیں ۔ کہا اس نے کسی کے دل
کی کیا معلوم ہے لیکن ۔ تمہارا ذکر اکثر آہ کرتے ہیں ۔ بھرتے ۔ قطعہ بند اشعار میں بالخصوص جب ان کی
تعداد بہت کم ہو قافیے مختلف ہونے چاہییں۔

ص ۹۱ سے تحقیق ہی پڑ جائے ہے کل جن کو تو پھر وہ ۔ معذور ہیں نظارہ دیدار سے آنکھیں ۔ ہے ، گل ۔

ص ۹۲ سے اوزیر پہنچی ہے وسنگ ہم پہ اس کی عشق نے ۔ دم بدم کرتا ہے خوں دل طلب غم ان دونوں ۔
روز ہی پہنچے ہے وسنگ ہم پہ اس کے عشق کی ؟

ص ۹۲ سے شاخ نرگس کے قلم سے اس کی یاد چشم میں ۔ برگ گل پر میں لکھا کرتا ہوں صاحب ان دونوں ۔ صباحت
قافیہ طاقت ، طلاوت ،

ص ۹۶ سے نہ ست کر مجھ کو ہمدم روز تو مستی دکھا ۔ بھید یہ ہے راز عشق اس میں عیاں ہوتا نہیں ۔ ؟

ص ۹۷ سے تم کو پاس غیر سے کب پاس جا دو گے ہمیں ۔ دور ہی بیٹھ کے گر ہم کو اٹھا دو گے ہمیں ۔ دور بھی بیٹھیے
گر ہم تو ۔

ص ۹۹ سے کیوں نہ تاب دھوپ سے ہوئے مہوش خط کی بہار ۔ یعنی رہتا ہے ترا اکثر جوانسا دھوپ میں ۔ جوانسا
یہ ایک درخت ہے جو دھوپ ہی میں شاداب رہتا ہے ۔ مصحفی اپنی مثنوی گرما میں لکھتے ہیں : سادہ سبزے
سے دشت صحرا ہے ۔ سبز ہے سو وہ اک جوانسا ہے ۔

ص ۱۰۲ سے عشق بری جان تیز دستی ہے ۔ جب چڑھائی ہے ہوں حاجت کمان نہیں ۔ مرحبا تیر دستی

ص ۱۰۰ سے یہ اگر زاہد ہو نشہ پی کر کہیں لائے نہ خلل + تو ابھی تم ساتھ اپنے مرے پلا کر دیکھو تو ۔ خلل
ص ۱۰۰ سے ایسا نہیں ہوا غم غضنفر کارگر + جس سے جگر میں کاسۂ چینی کی چو نہ ہو ۔ کے ، مو
ص ۱۰۹ سے عبث ہے کعبے کے جانے کا ریخ اے زاہد + نہیں جو ہو وے پیدا تم اس سے راہ کرو ۔ ۹
ص ۱۱۱ سے برگ گل توڑے ہے اور دعویٰ عشق اے بلبل + دیکھ تو بھولی ہوئی آنکھوں سے منقار کو تو ۔ پھولی
ص ۱۱۲ سے گرچہ سب باتوں سے ثابت ہوے لیکن معروف + دیکھ لیتے ہیں کن آنکھوں سے طرحدار کو تو ۔ تا سُپ انکھیوں
ص ۱۲۰ سے دل میں یوں یاد ہے اک پردہ نشیں کی ہم دم + جیسے ذاکر ہو پڑھا ذکر خفی کا کوئی ۔ پڑا
ص ۱۲۲ سے جو سوز غم کی لکھوں اپنے داستان ساری + تو بیخ شانہ میں جل جائیں انگلیاں ساری ۔ تذکرۂ باطن میں [illegible]
تو بیخ شانہ بنیں جل کے الخ ، میں کی جگہ ہو بھی ہو سکتا ہے یعنی اس طرح تو بیخ شانہ ہو جل جائیں الخ
ص ۱۲۴ سے لگا ہے اُس بت سفاک سے دل اپنا جدا + کہ جس سے مانگتی ہے خلق الاماں ساری ۔ خدا ، یا ، خود آ ؟
ص ۱۲۷ سے زلفوں ہی میں پھنسا ہے بلا سے یہی سہی ۔ پھنسائے
ص ۱۴۰ سے مضطراب تیرے توپی کے اہل بزم کو دیکھ + جو قصد قتل ہے تیغ نگہ کو آب تو دے ۔ تیز ، سی
ص ۱۴۰ سے تو بلا شوخ طبع ہے اسے رحم + غم زدوں کو ہنسا دیا تونے ۔ زخم
ص ۱۴۵ سے کیونکر ایسے سے ملاقات کی تدبیر بنے + جیسے بدخوئی کے مانی سے نہ تصویر بنے ۔ جس کی کی
ص ۱۴۹ سے جب سے پہچانا الف تب سے وہ قامت یاد ہے + راستی ہو یہ کہ رہتی بھی قیامت یاد ہے ۔ اپنی
ص ۱۶۲ سے کیا کرے اس میں شنا کوئی غواص آہنگ + دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ۔ شنا کا کوئی غواص
ص ۱۶۵ سے کیا اے عزیزو تنے تھے تم عدم سے + اس گلشن جہاں کو جائے تفنا سمجھ کر ۔ تم یہاں ، فنا
ص ۱۶۸ سے یوں تپ غم میں جوانی گئی ہیہات شتاب ۔ ہیہات ۔
ص ۱۶۸ سے کشتۂ چشم مغنی کو لو یا دام نہ بھیج ۔ کشتۂ تو ۔
ص ۱۶۹ سے دیکھ کر محفل میں سب کو عارض جانانہ شمع + کرکے داشعلہ کی بال و پر ہوئے پروانہ شمع ۔ شب کو بھیکا
ص ۱۷۱ سے طفل اشک کو مژگاں پہ چشم تر نکالے ہے + یہ چور اب تیلیوں کی نلج میں ہاں سر نکالے ہے ۔ جو طفل تیلیوں
ص ۱۷۱ سے جو رات بام پر اپنے وہ اشک ما چڑھے + چہار رہم کس کے پھر نگاہ چڑھے ۔ مہہ چہار دہم
ص ۱۶۹ سے کہا فقیر نے جو خش ہیں تم یہ سارے لوگ + تو ہنس کے بولے کہ اگر خدا کے پیارے لوگ ۔ اگر
کوئی صاحب اس شعر کا مطلب بیان فرمائیں ۔
سے عکس ستمہ پانی میں دیکھے ہے تو وہ یار پلیح + منہ کو دھوتا ہے کہ صورت مری گوری ہو جائے ۔
گلشن بیخار میں ایک مطلع اور ہے جو مطبوعہ دیوان معروف میں نہیں ۔

سے کے پینے سے تو ہر چند تنا ہی خوش ہو ٭ پر مغاں سے وہ خجل ہوں کہ الٰہی توبہ ،

علاوہ ازیں شعر سے شعر کی کمی تھا کہ اس دیوان غزلوں کے کل اشعار کی تعداد ۲۷۵۰ اور ۱۵۰ اشعار ایسے ہیں جنھیں کاتب نے کہ کر قلم زد کر دیا ہے ان اشعار میں ۲ ایسے ہیں جو مکرر ہونے کی بنا پر کاٹ دیے گئے ہیں اس لیے در اصل ایسے اشعار کی تعداد ۵۵ ہے۔ شعروں کی ایک غزل ایسی بھی ہے جو قلم زد نہیں لیکن حاشیے پر اس کے متعلق لفظ خارج لکھا ہوا ہے۔ مطلع یہ ہے :

محبت ابھری ہو گئی ہوا ہوا ہوا ٭ ہمارے خانۂ دل میں نہیں ہے جانے ہوا ،

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کاتب دیوان نے محمد تقی خاں مشتاق کا نام غلطی سے محمد علی خاں مشتاق لکھ دیا ہے۔

ایچ کی اشاعت میں دریائے لطافت مطبوعہ مرشد آباد کے سرورق کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کا سال طبع ۱۲۶۶ھ ہے، لیکن تمہید کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے اس کا آخری مصرع یہ ہے " گفتا این است دریائے لطافت " (ایچ کی اشاعت میں این است کی جگہ این ست چھپ گیا ہے۔ اس غلطی کی اپریل کے پرچے میں تصحیح کر دی گئی ہے)۔ اس سے ۱۲۶۰ نکلتا ہے۔ جناب خیال فرماتے ہیں کہ این ست ہی صحیح ہے۔ الف کا اضافہ کاتب نسخۂ مرشد آباد کی غلطی ہے۔ اس صورت میں صحیح آخر سے بھی ۱۲۶۶ ہی نکلیگا، اور اختلاف دور ہو جائیگا۔

دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ سال تکمیل ہے کتاب کا آغاز شاہ عالم کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا ملاحظہ ہو ص ۱۴ نسخۂ مطبوعہ ۱۹۱۶ء " شاہ عالم بادشاہ غازی۔ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ " شاہ عالم کا سال وفات ۱۲۲۱ھ ہے تذکرۂ بیجگر کا حال فہرست طہارت میں صفحہ ۳۰ پر درج ہے نہ کہ ص ۳۲ پر جیسا کہ کاتب کی غلطی سے درج ہو گیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تذکرۂ باطن کا نام اشپرنگر نے گلشن بے خزاں لکھا ہے، یہ صحیح نہیں۔ اس کا ایک نام گلستان بے خزاں ہے اور دوسرا نغمۂ عندلیب۔

مخمس مصحفی وغیرہ

از ڈاکٹر عندلیب شادانی و قاضی عبد الودود

(۱) مخمس مصحفی " تا بسا لکھیں کہ نہ بھی ہے یہ بات بے حساب " آپ کا خیال ہے کہ موجودہ صورت میں مصرع غلط ہے، میرے نزدیک اس میں کوئی غلطی نہیں۔ " بے حساب بات ہے " کے معنی ہیں لغو بات نا معقول بات، فارسی میں بھی ایک محاورہ ہے ' حرف حساب ' زدن یعنی معقول بات کہنا۔ عجب نہیں کہ اردو میں یہ محاورہ فارسی سے آیا ہو۔ اب اپنے مطلب کی طرف۔ آپ نے لکھا ہے کہ " کسی نے جرأت یا کسی شہزادے کے کان میں پھونک دیا کہ مصحفی نے آپ کی ہجو کہی ہے، اس الزام سے بچنے کے لیے مصحفی نے اپنا مشہور قصیدہ و رائیہ ... لکھا۔" مطلب شعر کا یہ ہے کہ اے بادشاہ تو

یہ انصاف کرتا کہ حقیقت حال دنیا پر روشن ہوجائے اور سب کہیں کہ یہ بات کہ مصحفی نے سلیمان شکوہ کی ہجو کہی محض لغو ہے، اس لیے مصحفی تو کسی کی ہجو نہیں کیا کرتا وہ تو مدح گو ہے۔ +

دوسری چیز اس میں قابل لحاظ "نہ" کا املا ہے۔ میرے نزدیک "نا" لکھنا چاہیے۔ امروہے کے لوگ آج بھی ناہی بولتے ہیں، نہ صرف امروہے میں بلکہ پورے ضلع مراد آباد میں (امروہہ مراد آباد کا سب ڈویژن ہے۔) عوام الناس "نا" ہی بولتے ہیں۔ ہائے مختفی شورٹ وودل کے اظہار کے لیے لکھی جاتی ہے اور لونگ وودل کے لیے الف ضروری ہے۔ جو لوگ نا بولتے ہیں وہ کھینچ ہی کر بولتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مصرعے میں وزن کا لحاظ کرتے ہوئے بھی نا ہی چاہیے۔

(۲) غزل آصف الدولہ "پڑے راستہ صبح دم دیکھتے ہیں" اس کی جگہ "پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں" ہونا چاہیے، ورنہ مصرع بے معنی ہو جائیگا۔ شمس النسا بیگم کی غزل میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے۔

(۳) مثنوی میر حسن، "عیش کی ہر طرف بچھتی تھی بساط" میر حسن نے امید نہیں کہ طرف بہ سکون را نظم کیا ہو۔ غالباً انھوں نے سمت لکھا ہوگا۔ کیا میر حسن کے کلام میں کہیں اور بھی یہ لفظ اس طرح استعمال ہوا ہے؟ اسی مثنوی کے اس مصرعے میں یہ لفظ صحیح تلفظ کے ساتھ نظم ہوا ہے "مشعلوں کے ہر طرف روشن تھے جھاڑ"۔

"شعر کا بھی غرض طرفہ ہے یہ فن، جب تک غرض کو بہ سکون را نہ پڑھیں مصرع موزوں نہ ہوگا۔ میرے نزدیک حسن نے مصرع اس طرح لکھا ہوگا" "شعر کا بھی ہے غرض طرفہ یہ فن"

(۱) تا سب کہیں الخ اس مصرعے کے متعلق میں نے صرف اپنے شبہے کا اظہار کیا تھا کہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کوئی قطعی رائے نہیں دی تھی۔ اس کی صحت میں شبہے کی کئی وجہیں تھیں، ایک تو مصرعے کی بندش چست نہیں دوسرے یہ کہ "بے حساب بات" لغو یا نامعقول بات کے معنی میں نہ لغت میں ہے اور نہ کسی شاعر کے کلام میں آیا ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے خود مصحفی نے بھی کسی دوسری جگہ لفظ بے حساب اس معنی میں استعمال نہیں کیا۔ تیسرے یہ کہ شعر میں نہ کی جگہ نا پڑھنا کانوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم یہ خوبی ممکن ہے کہ مصحفی نے اسی طرح لکھا ہو۔ رہا لفظ نہ کو نا لکھنا، اس کے متعلق گزارش ہے کہ کسی لفظ کو ہائے مختفی سے لکھنا اور اس طرح پڑھنا کہ گویا الف سے لکھا ہوا ہے اردو اور فارسی میں کثرت سے رائج ہے۔ دیوان کے قلمی نسخوں میں بھی اسی طرح درج ہے جیسا کہ معیار میں ہے۔

(۲) پڑے رستہ الخ یہ مصرع دیوان جہاں نسخۂ لندن میں اسی طرح ہے، لیکن جناب شادانی کا یہ خیال صحیح ہے کہ رستہ صبح دم کی جگہ، راہ تا صبح دم ہونا چاہیے۔ ابھی حال میں یہ بات بھی میں نے دریافت کی ہے کہ یہ شعر دیوان مصحفی اول یا سوم میں بھی خفیف اختلاف کے ساتھ موجود ہے، اور صرف یہی نہیں ایک اور شعر بھی جو آصف کی غزل میں ہے مصحفی کے دیوان میں پایا جاتا ہے۔ دو نوں شعر حسب ذیل ہیں:

تم آتے نہ آئے ولے ہم تو ہر شب		تری راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے		بھلا یہ بھی تیری قسم دیکھتے ہیں

"میاں" یا "یہاں" سے "ولے" بہتر ہے۔ اور پہلے "راہ پر تری راہ" کو ترجیح ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں شعر غلطی سے جہاں سے آصف کی طرف منسوب کر دیے ہیں، اور دراصل مصحفی کے ہیں۔

(۳) طرف کو حسن نے دوسری جگہ بھی بہ سکون "ر" نظم کیا ہے، مثال یہ ہے:

سب طرف سے ہاتھ اُٹھا کے آکر ام ' سر بر قدمت نہادہ بودم ' افسوس کہ روزگار نگذاشت

شیخ محمد عابد دل معاصر حسن کا مطلع ملاحظہ ہو:

"نہ دیکھ اس طرف وہ ظالم مبادا دیکھتا ہی ہو + دل اپنی جان کا دشمن تو مت خواہی نخواہی ہو"

لفظ طرف میں حسن نے بہ سکون "ر" لکھا تھا یا نہیں اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن جب طرف بہ سکون "ر" استعمال ہو سکتا ہے تو فرض بھی ممکن ہے کہ اسی طرح حسن کی زبان پر ہو۔

گوتمی

(۱) از ڈاکٹر عندلیب شادانی (۲) از اعجاز نستوی

(۱)

"اور اگرچہ آنکھوں میں سرمہ اور چہرے پر غازہ مل کر الخ۔ سرمہ اور غازہ دونوں کے لیے فعل "مل کر" استعمال کیا گیا ہے، حالاں کہ سرمہ لگانا محاورہ ہے سرمہ ملنا نہیں لہٰذا انھیں ایک ہی فعل کے تابع نہ ہونا چاہیے تھا۔

(۲)

اس قصے میں ایک بات بالکل سمجھ میں نہ آئی گوتمی شہزادے کے محل میں بچے کو لے کر واپس جاتی ہے، اس موقع پر لکھا ہے کہ "اگرچہ گوتمی شاہزادے کو بہت عزیز تھی۔۔ لیکن یہ الفاظ اس سے کسی نے نہ کہے "گوتمی' میرا جذبۂ دل تجھے پھر کھینچ لایا ہے" " آگے کی یہ ایتس کے بعد گوتمی نے نہایت صبر کے ساتھ۔۔ شہزادے کی سرد مہری کو برداشت کیا" گوتمی اگر شہزادے کو بہت عزیز تھی تو پھر شہزادے کی سرد مہری اسے کیوں برداشت کرنی پڑی؟

[معیار: اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اصل قصہ ہماری نظر سے نہیں گزرا اس لیے ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ غلطی مصنف کی ہے یا مترجم کی]

معیار کی زبان

از ڈاکٹر عندلیب شادانی

صحت زبان کا جہاں تک تعلق ہے آپ کو زبردست کامیابی ہوئی ہے عموماً اردو کا کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں

کی

زبان کی دو ڈھائی سو غلطیاں نہ ہوتی ہوں۔ معیار میں زبان کی غلطیاں بہت ہی کم ہیں اور جو ہیں ان میں سے بھی اکثر نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن معیار چونکہ زبان کے معیار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اس لیے ہر وہ چیز جو مجھ کھٹکی آپ کو بتا دوں گا عام اس سے کہ اس کی اہمیت کم ہو یا زیادہ۔

ص ۱۹ 'سانپ کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے' اتنی زبردست کہ باوجود خواہش اور ارادے کے انسان اس کے زیر اثر آجاتا ہے" باوجود غالباً 'ان اسپائٹ اوف' کا ترجمہ ہے' یہ اس جگہ بالکل غلط ہے۔ برعکس یا خلاف ہونا چاہیے ورنہ مطلب بالکل الٹا ہوجائے گا۔

ص ۲۰ کراہیت صحیح نہیں کراہت چاہیے

ص ۲۲ "میں اتنا بڑا بزدل نہیں کہ خود اپنے نزدیک خوف زدہ معلوم ہونے سے ڈروں" اس کا کیا مطلب ہے؟

ص ۲۲ "یکایک یہ پر اسرار' دلکش منظر تیزی اور آہستگی سے اوپر اُٹھتا ہوا معلوم ہوا۔ تیزی اور آہستگی متضاد صفتیں ہیں بیک وقت تیزی اور آہستگی سے اُٹھنا کس طرح ممکن ہے؟

ص ۲۳ "ایک لمحے کے لیے اسے سکتہ سا ہوگیا' اور آنکھیں بند کیے چہرہ زمین پر رکھے وہ پڑا رہا"۔ وہ 'آنکھیں' سے پہلے آنا چاہیے۔

ص ۲۳ "کیوں! خدا کی پناہ! الخ" یہ 'کیوں' 'دہائی' کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے' مگر اس محل پر جب کہ حیرت و استعجاب کا اظہار مقصود ہے استفہامیہ 'کیوں' درست نہیں' اس کی جگہ 'خوب! اچھا! ماشاءاللہ' سبحان اللہ وغیرہ میں سے کوئی کلمہ ہونا چاہیے

ص ۲۴ "وہ دو دو سیڑھیوں کو تڑپتا ہوا دہلیز میں آیا" سیڑھیوں کو تڑپنا کیا معنی؟ ایک ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں طے کرتا ہوا۔ یا دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اس مفہوم کو ادا کرسکتا ہے (تڑپنا پھاندنے کے معنی میں لغت میں موجود ہے۔ معیار)

ص ۲۴ "ہونسا' یوپی میں ہوسا بولتے ہیں۔ ہیس بھی کہتے ہیں' بلکہ ہوسا ہیس ہی کا مزید علیہ ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ن کا اضافہ درست نہیں۔ شاید یوپی کے باہر اسی طرح بولتے ہوں (اعتراض صحیح ہے' بہار میں بھی اعلان نون کے بغیر ہی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ن کے ساتھ بولتے ہیں۔ معیار)

ص ۵۰ "میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب نہیں آیا" ص ۵۱ "کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا" ص ۵۱ بہتر ہے کہ ص تنہا 'ہیں' ہو' 'نہیں' کی جگہ 'نہ' چاہیے۔

ص ۵۰ "میں ہیج و خم کی سراپا تصویر بن کر رہ گیا" 'سراپا' میں کے بعد آنا چاہیے' بصورت موجودہ 'سراپا تصویر' کی صفت معلوم ہوتا ہے۔

ص ۵۰ "اجنہ کی بستی" جن کی جمع اجنہ بالکل غلط ہے' 'جنوں کی بستی' لکھنا چاہیے۔

ص ۵۰ "صدائے برنخواست" 'برنہ خاست' چاہیے (یہ کتابت کی غلطی ہے جس کی تصحیح نہ ہوسکی۔ معیار)

ص ۶۰ "اور میں اس کو چھوڑ کر وہاں چلا گیا" - "اگر میں اس خیال سے تم کو خط لکھنا چاہتی" ضمیر جب مفعولی حالت میں ہو تو اس کے ساتھ 'کو' کا استعمال متروک ہوچکا ہے۔ اسے 'تمہیں' بولتے ہیں۔ جلیل اور ریاض کے کلام سے ایسے موقع پر 'کو' کے استعمال کی سند دی جاسکتی ہے' ممکن ہے کہ 'اسکو' کی جگہ 'اسے' اور 'تم کو' کی جگہ 'تمہیں' بہتر ہو لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کو 'تم کو' بھی جائز ہے: وعدہ حشر میں اللہ کرے تم مجھ کو اور پھر ڈھونڈنے گھبرائے ہوئے تم کو (ریاض)

اقتباس

خسرو کی ہندی شاعری

خسرو کی ہندی شاعری (ماخوذ از حالات و تصانیف خسرو مصنفہ ڈاکٹر وحید مرزا پی۔ ایچ۔ ڈی) زمانۂ حال کے مصنف ان ہندی اشعار کو جو خسرو کے نام سے قدیم تذکروں میں ملتے ہیں خسرو کی طرف منسوب کرنے میں تامل کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اشعار جس زبان میں ہیں وہ کھڑی بولی سے بہت ملتی جلتی ہے اور قدیم ہندی کے جو مسلم الثبوت نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے مشابہ نہیں۔

خسرو ہندوستان میں پیدا ہوئے ان کی ماں ہندوستانی تھیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھی طرح ہندی جانتے تھے، چنانچہ خود فخریہ لکھتے ہیں:

" ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب ✤ شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن " (دیباچۂ غرۃ الکمال)

ان کے فارسی اشعار میں ہندی الفاظ مثلاً باجرہ، پان، مار، کنار وغیرہ ملتے ہیں۔

" سر آں دو چشم گردد کہ چو ہندوان ابرش ✤ ہمہ را بہ نوک مژگاں بہ مژہ زند کنارہ "

یہ سچ ہے کہ ایسے الفاظ فارسی کلام میں کثرت کے ساتھ نہیں ملتے، لیکن اس کی وجہ جیسا کہ وہ خود دیباچۂ غرۃ الکمال میں لکھتے ہیں یہ ہو کہ فارسی میں خواہ مخواہ ہندی الفاظ داخل کرنا انھیں پسند نہ تھا

رہا یہ سوال کہ خسرو نے ہندی میں اشعار کہے یا نہیں۔ اس کا جواب خود خسرو کی زبان سنیے:

"جزوے چند نظم ہندی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است، ایں جا بہ نثر کے بسندہ کردم" (دیباچۂ دیوان سوم)

خسرو کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں، جن میں ایسے الفاظ ہیں جو ہندی فارسی دونوں میں بامعنی ہیں۔

آری آری ہمہ بیاری آئی   ماری ماری رہ دکہ ماری (آئی)

رباعی ذیل بھی خسرو کی طرف منسوب ہے لیکن کسی قلمی نسخے میں مجھے نہیں ملی:

" رفتم بہ تماشائے کنار جوئے   دیدم بہ لب آب زن ہندوئے

گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود   فریاد برآورد کہ در در موئے "

موجودہ مواد کی مدد سے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ خسرو کا ہندی کلام کس قدر تھا۔ بعض اصحاب کا یہ قول کہ ہندی کلام مقدار میں فارسی اشعار سے زیادہ تھا۔ مبالغے سے خالی نہیں۔ کیونکہ خود خسرو کے قول (دیباچۂ دیوان سوم) سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ خسرو نے جزوے چند۔ لکھا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مقدار میں

زیادہ نہ تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دیباچۂ مذکورہ کی تحریر کے بہت بعد تک خسرو زندہ تھے اور انہوں نے اپنے ہندی کلام میں ضرور اضافہ کیا ہوگا۔ قیاس کا یہ قول بھی صحیح نہیں کہ خسرو بڑھاپے میں ہندی گوئی کی طرف مائل ہوئے اس لیے کہ غرۃ الکمال کی تدوین کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی، اور ہندی گوئی کی اس سے قبل ابتدا ہو چکی تھی۔

بد قسمتی سے خسرو نے اپنے ہندی اشعار کی قدر نہ کی اور ان کو جمع کرنے کی کوئی فکر کی۔ خسرو ہندی محض تفنن طبع کے لیے کہتے تھے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، میرزا غالب کے زمانے تک فارسی گو عموماً اپنے ہندی کلام کو خیال خاطر میں نہیں لاتے تھے، چنانچہ میرزا غالب جن کی شہرت کا دار و مدار ان کے دیوان اردو پر ہے کہتے ہیں۔

”فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ ✤ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است“

یہ تیقن ہے کہ خسرو نے ہندی اشعار کا دیوان مرتب نہیں کیا، اور غالباً قریب العصر اشخاص میں سے بھی کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہی اشعار باقی رہ گئے ہیں جو زبانی نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے چلے آئے ہیں یا بیاضوں میں نقل ہوا کیے ہیں۔ کچھ دوہے، کچھ پہیلیاں، ایک غزل جس کے اشعار میں یہ التزام ہے کہ ایک مصرع فارسی ہے، اور دوسرا ہندی، ایک مخمس جس کا ہر پانچواں مصرع فارسی ہے، چند رباعیاں اور رسالۂ خالق باری یہی چیزیں ہیں جو آج کل خسرو کی طرف منسوب ہیں، ان کا بیشتر حصہ تذکروں میں نقل ہوتا چلا آیا ہے اور قدیم تذکرہ نگار بلا تامل انہیں خسرو کی ملک سمجھا کیے ہیں۔ لیکن آج کل یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ اشعار اس زمانے کی زبان میں ہیں۔ خسرو تیرھویں صدی عیسوی میں کیوں کر اس زبان سے آشنا ہو سکتے تھے جو آج کل نواح دہلی میں بولی جاتی ہے، اور کسی قدیم ہندی مصنف نے یہ زبان کیوں نہیں استعمال کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اول تو یہ علم نہیں کہ خسرو کے زمانے کی ہندی کیسی تھی، خسرو کے اشعار کے علاوہ کوئی اور نمونہ موجود نہیں، گو یہ علم ہمیں ضرور ہے کہ خسرو کے زمانے میں ہندی یا ہندوی نام کی ایک بولی دہلی اور نواح دہلی میں رائج تھی، اور یہ اس قدر ترقی یافتہ تھی کہ نظمیں اس میں لکھی جاتی تھیں (نہ سپہر و عشیقہ) یہ باور کرنے کی کیا وجہ ہے کہ خسرو کے زمانے کی زبان آج کل کی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ زبان جب ایک شکل اختیار کر لیتی ہے تو بہت کم بدلتی ہے، ہندوستان میں اس کی اور بھی کم وجہ ہے کہ اجنبی زبانوں کے اثر سے یہ ملک بہ نسبت دوسرے ممالک کے زیادہ محفوظ رہا ہے، جب ہندوستان کے باشندوں کی جسمانی حالت، لباس، رسم و رواج اور معاشرت اب بھی وہی ہے جو تیرھویں صدی عیسوی میں تھی تو کیوں مان لیا جائے کہ ان کی زبان ان کے اجداد کی زبان سے بہت مختلف ہے۔ ان وجوہ سے یہ کہنا قرین عقل نہیں کہ یہ اشعار جعلی ہیں گو یہ بخوبی ممکن ہے کہ لوگوں نے ان میں۔ دو جعل کر دیا ہو اور کچھ اپنی طرف سے بھی ملا دیا ہو [illegible]

[illegible]

افسانوں کی شبیہ کھینچتا ہے، اُس کی طرف تشبیہیں منسوب کی جا سکتی ہیں۔ لیکن مناظرِ قدرت کی تصویریں اس کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ ان اشعار کی ذاتی خوبی۔ اور اسلوبِ بیان کی جدت کو دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ضرور کسی بڑے استاد کے کہے ہوئے ہیں۔ اور اس قدیم روایت کو کہ خود خسرو ان کا مصنف ہے مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتے۔ چوں کہ ان اشعار کی تعداد کم ہے، یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ الحاقی اشعار زیادہ ہوں،

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خسرو کے اشعار کھڑی بولی میں ہیں اور قدیم ترین نمونے ہندی ادب کے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ ابتدائی ہندی کے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ خسرو کی سب سے بڑی خصوصیت جدت طرازی ہے، وہ قدما کے نقشِ قدم پر چلنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی راہ خود نکالنا چاہتا ہے۔ ہندی میں اس نے تفنن طبع کے طور پر کہی۔ اور اس کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ اس زبان میں کوئی ایسی نظم لکھے جس سے اس کی یاد قائم رہے۔ اور جو عبارت کی طرح سست سمجھی جائے۔ اس لیے اس نے سادہ بول چال کی زبان کو شعرگوئی کے لیے منتخب کیا، اور جب تک معترض کوئی خاص ثبوت پیش کرے، خسرو کے یہی اشعار سرمایہ سمجھے جائیں گے

(مصنف نے خالق باری کے متعلق مخالف اور موافق رائیں نقل کر کے یہ لکھا ہے کہ قطعی فیصلہ موجودہ مواد کی مدد سے نہیں کیا جا سکتا، اور کتاب اس پایہ کی ہے بھی نہیں کہ اس کے متعلق مناظرے میں وقت صرف کرنا سعید ثابت ہو سکے

معیار)

مُراسلت

"بھارتیا ساہتیا پرشد کی اصل حقیقت"

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنے نہیں سمجھیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر انہیں الجھن ہوگی۔ اس لیے سب سے اول یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنے ہیں "ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن" اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انہیں تاریخوں میں "ہندی ساہتیا سمیلن" کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے۔ اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی "شان نزول" سے مختصر طور پر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کاکا کالیکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیا ساہتیا پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں اس کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں کیوں کہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹ ساہتیا سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجا بڑودہ نے بھارت ساہتیا پرشد کا خاکہ بہت پر زور طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنھیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیا سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی، جسے عمل میں لانے کے لیے مسٹر کنھیا لال منشی، ہری ہر شرما اور گردھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیا سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹ ساہتیا سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لیے ہندی ساہتیا سمیلن سے تبادلہ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیا سمیلن نے کاکا کالیکر، ہری بھاؤ اپادھیائے اور بابا راگھو داس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹ ساہتیا سمیلن نے اپنی ساہتیا پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیا کے لیے ایک مہاراشٹ کمیٹی قائم کی جائے جو ہندی ساہتیا سمیلن کو بھارتیا ساہتیا سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیا سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اس قرارداد سے ظاہر ہے جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

" اس پرشد کا ادیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبیوں)

(ا) ساہتیہ کاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرانا اور اس نام سے بھارتیا ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا
(ب) اس سبھا کا کام ہندی یعنی ہندوستانی میں ہوگا ـ

اس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی تھی پہلا کام یہ کیا کہ ماہانہ "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی ایڈیٹری میں جاری تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اب اسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنہیا لال منشی بھی اس کی ایڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں ـ

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیا ساہتیہ پرشد کی پیدائش اور مقاصد کے متعلق تھی میں آپ کو اس کے پہلے جلاس کی رُوداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو تقریباً ۱۰ بجے دن کے اس کا پہلا جلسہ شروع ہوا۔ سب سے اول مسٹر کاکا کالیکر نے اپنا ایڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ ایڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے وہ آپ خود پڑھ لیں گے، زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے ـ

پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولیوشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی ـ اس کے پہلے جزو سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جزو پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پرشد (انجمن) کی ساری کارروائی " ہندی ہندوستانی " میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگرس نے اپنے ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شایع کی اس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندوستانی ہوگی۔ اس کے کیا معنے۔ فرمانے لگے کہ کانگرس کا ریزولیوشن بھی میں نے ہی " بنایا تھا " میں نے عرض کیا یہ صحیح ہے لیکن اس وقت ہندوستانی کے معنے ہم ہرگز ہندی نہیں سمجھے تھے۔ کہنے لگے کہ اب میں نے اس کے معنے بتا دیے ہیں جو ہنس کی تحریر میں آپ نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہے۔ انھوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے یعنی " ہندی ہندوستانی " جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پرشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیکر صاحب نے اپنے ایڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا " تاکہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم " اردو " لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ " ہندی ہندوستانی " سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی ہونے والی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی یہ تو آپ کی خواہش یا منشا ہے۔ اس سوال کے

جواب میں کہ ہندی کون سی زبان ہے اور ہندوستانی کون سی مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے اور عام لوگ کہتے ہیں اور ہندوستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا اپنے مطبوعہ ایڈریس میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں ان فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اس پر ختم ہو گیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

تیسرے پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ ریزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رہنے دیجیے یا ہندوستانی کا، ہندی ہندوستانی کے کوئی معنی نہیں۔ تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے۔ اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے، لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھ دیے۔ اس پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ ریزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی۔ کیوں کہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں۔ اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں اور اس لیے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہوگا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھیے اور میں اس کی تائید کروں گا اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنہیا لال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہیے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں، فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا جو اس وقت اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف تھی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی جس کا انہیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ گو مہاتما گاندھی بھارتیہ ساہتیہ پریشد کو ہندی سمیلن کا بچہ سمجھتے ہیں اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پاتیں، حالانکہ بقول منشی پریم چند یہ خیال صحیح نہیں۔ پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہو گئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن تیسرے پہر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رخ بدلنا چاہیے۔ بار بار پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دہرانا موجودہ [illegible]

کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہیے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا اور ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنہیا لال منشی اور دو ایک اور اصحاب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہارشوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت ریزولیوشن پیش نہ کر دیں، رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا ریزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے اسے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کر لیا گیا۔ لیکن یہ ریزولیوشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا۔ اس لیے ان صاحبوں نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مصر تھے۔ ایک ایک بیان شائع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا۔ ان میں سے چند تو ہندی ساہتیا سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کیے اور کچھ مہاراشٹ ساہتیا سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیا ساہتیا پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی اور ہندی کے معنی ہندوستانی بتائے ہیں، پھر "ہندی ہندوستانی" کے جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو دیے ہیں۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کر کے ہندوستانی اختیار کیا گیا تھا۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروک میں داخل ہو گیا اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لیے ان کے پاس جواب موجود ہے۔ وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی ہندوستانی" گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی، تو اہندوستانی فرمایا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے تو انہیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے ایڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے دسے ندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں۔" اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبہ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ہندی ساہتیا سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے بھارتیا ساہتیا پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیا شاہتیا پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی اور اس کا پہلا اجلاس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی۔" کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے ایڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیا ساہتیا پرشد) کی ابتدا کی ہے انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا

(قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے۔ تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں۔"

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیا ساہتیا پرشد کا یہ مقصد بے شک قابل تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے، لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہہ ہندی زبان کا پرچار ہے۔ جس میں وہ اور ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر اسے انھیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا۔ تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے۔ غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے سلسلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آ گئی ہے اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحاد عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بددل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ ــــ

اس گفتگو میں بنگال، بہار، مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمایندوں نے یہ کہا (اور غالباً ان کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے) کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ ان سنسکرت لفظوں کا سمجھنا ہمارے لیے زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں اس لیے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ ان زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے اس خیال کی تائید کاکا کالیکر کے ایڈریس سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں اہل دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنی شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لیے عام فہم ہو گی مگر ہمارے لیے کٹھن ہے۔۔ .... وہ ہندی بھی جو دلی لکھنؤ کے بازاروں میں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں ٹھیٹھ ہندی ہے لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں... ... کانگرس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی کہ دیہات سے آنے والے نمایندوں کے لیے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں"ــــ

اس دوران میں لغت کی بحث نکلی یعنی ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں عام فہم الفاظ کے علاوہ وہ تمام الفاظ جمع کیے جائیں جو ہندی بنگالی گجراتی مرہٹی وغیرہ میں مشترک ہیں اور ان تمام الفاظ کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہو اس میں دو مشکلیں ہیں، ایک تو یہ کہ ہندی اور خاص کر فارسی الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ بگڑا کر ایسی ہو گئی ہیں کہ

ایک لفظ ہونے پر بھی ان کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظ تو ایک ہی ہے لیکن مرہٹی میں اس کے معنے کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور۔ علاوہ اس کے ایسی ڈکشنری ان ہندیوں کے لیے کسی قدر کارآمد ہو سکتی ہے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں لیکن ادبی ضروریات کے لیے بالکل کارآمد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوا تھا، یہ تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی ادب اور زبان کو پڑھ کر اردو فارسی عربی الفاظ اور محاورے چن لیے جائیں اور اسی طرح اردو ادب اور زبان کا مطالعہ کرکے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لیے جائیں اور ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترکہ سرمایہ کیا ہے۔ اس کے بعد جن الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہو یا جو اصطلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمائندے ہوں۔ لیکن موجودہ حالات دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔

میں ایک بات کہنی بھول گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندوستانی" قرار دی ہے۔ انہوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز "ہنس" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن میں ہندی یا ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے معنے ہندوستانی قرار دیے ہیں۔ جو درست نہیں۔ اردو یا ہندوستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیا ساہتیہ پرشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان کے بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے لیکن ہنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہے۔ مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے بیاتہ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیوں کہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستان ہوتا ہے اور اس لیے اس سے نہ صرف مسلمان اور ان کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کیے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھارت کی بجائے ہندوستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہیے۔ عربی اگر غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے، تلفظ کی سہولت نے ان کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ مثلاً گرام کا گاؤں ہو گیا۔ درشٹ کا دیٹھ ہو گیا۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا تو اظہارِ شیخیت ہے

یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہے بلکہ انہیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے۔ مجیب صاحب نے اس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو مسٹر کنہیا لال منشی نے عاقل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مرہٹوں، بنگالیوں اور کرانیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے ان میں اردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے۔ مجیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور "میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ انہیں آپس میں ایک دوسرے نیز مسلمانوں سے قریب تر نے کے لیے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے صرف خالص اردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے۔ اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ (مسلمان) اور ان کی تمام خدمات جو انہوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں' ناقابل لحاظ ہیں۔ ان حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہے"۔

اس کے بعد انہوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اور جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا۔ یعنی وہ زبان ہندی ہو گی کیوں کہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لہذا ہندوستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں۔ یہ فرقہ دارانہ تصفیہ کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتما جی کے غور کے لیے پیش کیے ہیں اور ان سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں وہ امور یہ ہیں:۔

۱۔ ہماری مشترکہ زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہو گی نہ کہ ہندی کے نام سے۔
۲۔ ہندوستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات سے مطلق کوئی تعلق نہ ہو گا۔
۳۔ لفظ کا معیار اس کا رواج ہو گا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔
۴۔ تمام وہ الفاظ جو اردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کیے ہیں صحیح تسلیم کیے جائیں۔
۵۔ اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ اردو، ہندی اور سنسکرت کی اصطلاحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجائش رکھی جائے۔
۶۔ دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلم خیال کیے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندوستانی کے

کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو' دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

میں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ یہ اصل خط پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور خط فائل و ختم ہو گیا۔ البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ عبد الحق صاحب جیسے تعلیم یافتہ شخص کا گاندھی جی صاحب کے بیان پر اعتراض ہے' ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ ان کا کیا مطلب تھا یہ سمجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور امید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما جی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی ان کے اور ان کے رفقا کے رویہ سے پیدا ہو گئی ہے اسے دفع کرتے۔ لیکن افسوس انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اجلاس کے دوران میں جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم' مولانا ابو الکلام آزاد' ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سر تا سر غلط بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہر چند یہ توجیہ کر کے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے میں نے ایک آدھ بار ٹوکا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں، بلکہ بحث ہندی اردو یا ہندوستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اردو ہے' وہ اردو کے ادیب ہیں' اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس لیے اس بحث کو فرقہ داری رنگ نہیں دینا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں۔ یہ سن کر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے اس پر خوب غور کیا ہے اور میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہوا۔ میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے جو اس وقت بولی جاتی تھی اور اس لیے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آ گئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہے۔ عوام کی بولی سے اسے بہت کم ساتھ دیا ہے۔ اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنی اردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے

حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آگیا ہے کہ اُردو تو اُردو وہ تنہا ہندوستانی کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں جو بعد اجلاس ہوئی تھی ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ اگر ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائے گا۔ لیکن ان کو نیشنل کانگرس کے ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیئت Change of Heart کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر وتبدل، توڑ جوڑ اور داؤ پیچ کا باعث ہمارے ملک کی بدنصیب پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائے گا اس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے جو تھپک کر سلانے کے لیے اچھی خاصی لوری تھی۔ لیکن جب انہیں اس کی توقع نہ رہی یا انہوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریا کی چادر تار تار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں۔ وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اردو نہیں چھوڑ سکتے ان کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی اشاعت و ترقی کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق ہم ایک مفصل تجویز منقریب پیش کرنے والے ہیں۔

عبدالحق

آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو

۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

سالنامہ سہیل ۱۹۳۶ء علی گڈھ۔ مرتبۂ رشید احمد صدیقی صاحب و آل احمد صاحب سرور۔

اردو اور اس کے بعض تاریخی ماخذ از محمد ابواللیث صدیقی ص ۵ تا ۱۱۵۔ (۱) تمہید میں اردو کی ابتدا کے متعلق چند اقوال نقل کرکے خسرو کے ہندی اشعار لکھے ہیں۔ ایک غزل یہ بھی ہے:

"تو ار شدم زار نشدم لٹ گیا + دم عشق تو کر ٹوٹا (کذا) ہے۔

مضمون نگار نے اس مصرع کی قدامت کو مشکوک قرار دیا ہے۔ "چمن میں آئی ہے کیسی یہ رت مرغِ کوئی ضابطہ" اس مصرع کے متعلق حضرت شاہ عظیم آبادی مرحوم کا قول ہے کہ خسرو سے سیکڑوں برس قبل کا ہے۔ (۲) مغل اور اردو، اس عنوان کے تحت وہ اشعار نقل کیے ہیں جو خیال مرحوم نے اکبر، نورجہاں اور زیب النساء کی طرف منسوب کیے ہیں۔ پانچھی جو گھڑی مجھ سے بہ راہ عادت الخ اس رباعی کے متعلق م کی تحقیق ہے کہ اصلی رباعی فارسی میں ہے جو تزک جہانگیری میں موجود ہے۔ مترجم تزک جہانگیری نے فارسی رباعی کا نظم ہی میں ترجمہ کردیا۔ اور اسی طرح غلطی سے اردو کی رباعی اکبر کی طرف منسوب ہوگئی۔ نورجہاں والے اشعار خفیف اختلاف کے ساتھ تذکرۂ حسن میں مبین بدایونی کے نام درج ہیں۔ (زیب النساء کی طرف جو تین شعر منسوب ہیں، م انھیں بھی مشکوک سمجھتے ہیں لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کس کے ہیں۔ پہلے دو شعر کے متعلق تو ہم بھی سر دست کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن تیسرے کے متعلق یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حکیم دہلوی کا ہے:- آکر ہماری لاش پہ کیا یار کرچلے + خواب عدم سے فتنے کو بیدار کرچلے۔ معیار) (۳) دکن اور اردو، دوسرا عنوان ہے، ضمناً رسالۂ تصوف و اخلاق مصنفہ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (۷۰۶ تا ۸۰۸ھ) کا ذکر بھی سالنامہ، سالہ یادگار، سنہ کے حوالے سے آگیا ہے۔ (م نے عمر ۱۲۰ سال، سال تصنیف ۷۰۰ھ بتایا ہے، لیکن سال ولادت صریحاً غلط ہے۔ معیار)۔ گلشن عشق مصنفۂ نصرتی کا ایک نسخہ نواب حیدر یار جنگ کے کتبخانے میں ہے اور قصیدہ رضوان شاہ و روح افزا کا ایک نسخہ سنوک لال لائبریری گیا میں ہے (اس کے علاوہ بھی معلومات فراہم کی ہیں، لیکن وہ دوسروں سے ماخوذ ہیں۔ معیار) (۴) تیسرا عنوان اردو کے قدیم نمونے ہے۔ م چند کوئی کے اشعار کی قدامت کے قائل ہیں۔ انھوں نے اردو سروے، پورٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وسیل دیوا اسو (مصنفہ نرپت لال، سال تصنیف ۱۱۵۵ء شائع کردہ ناگری پرچارنی سبھا) میں حسب ذیل عربی فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں کلاہ (کلاہ) کبائی (قبا) جرہ (ذرہ) وہما (واہمہ) تاجی (تازی) کسمت (قسمت) وغیرہ۔ تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء برنی میں حسب ذیل ہندی الفاظ ملتے ہیں، ٹیکہ بند داں، منڈل، گھٹی، بہی پٹواریاں، ڈھولک، چبوترہ، مٹھ، منڈلی غلہ، ماش موٹھ، دیوٹی، تھانہ، موڑا (مونڈھا) چودھری، بی بی، بھٹی، تاریخ فیروز شاہی مصنفۂ عفیف سراج میں

حسب ذیل الفاظ لت (لات) گھڑیال، درخت سنبھل، چوٹ، گھڑیال خانہ، ٹانک اور کبیر کے اشعار نقل کرنے کے بعد ہم نے عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۵ء کے حوالے سے یہ شعر لکھے ہیں جو بہ قول مضمون نگار عالمگیر تاریخ داؤدی میں درج ہیں۔ تو سے اوپر تھا بتیا پانی پت میں بھارت دیسا، آکھیس رجب سکودار بابر جیتا براہیم ہارا۔ ہم نے کانھوبے راجے کے اشعار کا ذکر کیا ہے جو محمود کا معاصر تھا۔ اور اردو کی ابتدا کے متعلق بعض مستشرقین کے اقوال کی تردید کی ہے (۵) ہم نے سید سلیمان صاحب ندوی کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات۔ اور نواب صدر یار جنگ کے مضمون مندرجہ مقالات ۱۹۰۰ مرتبہ انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حوالوں سے یہ لکھ کر کہ اردو کی داغ بیل مسلمانوں کی آمد یعنی فتح سندھ کے زمانے میں پڑی، یہ اعتراض کیا ہے کہ طلوع اسلام سے قبل عرب اور فارس کے ہند سے تعلقات تھے تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اردو کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی۔ (اہل عرب و فارس کے ہند سے تجارتی تعلقات اور اردو کی داغ بیل اولین مسلمان اور اردو، سندھی اور اردو، پنجابی اور اردو، دکن میں اردو کی داغ بیل ان عنوانات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سرسری ہے اور کافی تحقیقی کام نہیں لیا گیا۔ معیار) (۶) آخر میں حسب ذیل تذکروں کا ہم نے ذکر کیا ہے

(الف) تحفۃ الشعرا مصنفہ محمد افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی، آزاد بلگرامی نے "تحفہ اصحاب شعر" سے تاریخ نکالی ہے۔ ۱۱۶۵ھ۔ اس کے دو نسخے ہیں پہلا چھوٹی تقطیع کے ۱۰۱ صفحات کا جس کا سال کتابت نامعلوم ہے، دوسرا ۱۱۸۹ھ کا لکھا ہوا (یہ تذکرہ فارسی گو شعرا کے حالات میں ہے۔ لیکن فارسی گو شعرا کا اردو کلام بھی انتخاب میں آگیا ہے چمنستان شعرا کے ساتھ اس کتاب کے وہ اجزا جن کا تعلق شعرائے ریختہ گو سے ہے عبدالحق صاحب نے شائع کر دیے ہیں۔ اس تذکرے کے ذکر میں ہم نے ضمناً تین عجیب باتیں لکھی ہیں ایک تو یہ کہ نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ ہے، دوسرے یہ کہ میر حسن کا اپنے تذکرے کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ سب سے پہلا تذکرہ ہے تیسرے یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میر حسن کا تذکرہ میر کے تذکرے کے بعد سب سے پہلا تذکرہ ہے معیار۔)

(ب) بہار و خزاں مصنفہ میر بہاء الدین عروج اورنگ آبادی" صاحب تذکرہ نے اس کی ترتیب کے وقت ہی ۱۲۴۱ھ میں انتقال فرمایا، اور عرصے تک پڑا رہا۔ مرحوم کے صاحبزادے نے اس کو ترتیب دیا" چھوٹی تقطیع کے ۱۲۶ صفحے ہیں جو کم و بیش ۹۷ شعرا کا حال درج ہے غالباً صرف ایک ہی نسخہ اس وقت موجود ہے۔ (ہم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۲ سال تصنیف ہے، لیکن اس کی ترتیب کا زمانہ اس کے بھی بعد ہے۔ سید عبدالولی عزلت کا ترجمہ جو ہم نے اس تذکرے سے نقل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی تصنیف کے وقت عزلت زندہ تھے۔ عزلت کا انتقال بارہویں صدی ہی میں ہو چکا تھا، مضمون نگار نے کتاب کے سال تصنیف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ معیار)

(ج) ریاض حسینی مصنفہ عنایت اللہ فتوت، مصنف نے اس نام سے تاریخ نکالی۔ دوسری بیت سے "از دور ... سر در بذل ہاتف بگفت گلدستۂ ریحان بہار معنی" اصل نسخے میں ۱۱۷۵ھ ہے مگر اس میں ...

صرف ۱۷۳۰ نکلتے ہیں، پہلے مصرعے کے بذل کی ب کا تعمیہ ہو کر ۱۱۶۲ھ نکلتا ہے۔ (دوسری بیت کا پہلا مصرع معلوم ہوتا ہے کہ صحیح نقل نہیں ہوا۔ مصرعے کے بذل کے کیا معنی؟ معیار) تعداد صفحات ۲۲۱، ہر صفحے میں تقریباً ۱۲ سطریں، کم و بیش ۱۰۲ شاعروں کا حال درج ہے۔ کاتب جس کی فرمائش سے یہ کتاب تصنیف ہوئی خواجہ اکرم۔ غالباً صرف ایک نسخہ وجود میں ہے۔

(د) طبقات الشعرا مصنفہ قدرت اللہ سبھلی۔ (م کا یہ قول کہ یہ تذکرہ دکن میں تصنیف ہوا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اور نہ یہ قول کہ سال تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اس لیے کہ اس تذکرے کے بہت سے اندراجات اس کے بعد کے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اس کی ابتدا ۱۱۸۸ھ میں ہوئی ہو۔ معیار)

مضطر خیرآبادی از سید جان نثار حسین اختر علیگ ابن مضطر صفحہ ۱۳۳ تا ۱۵۴ (مضطر کے متعلق من جملہ اور باتوں کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوائل میں اصلاح اپنی والدہ سے لی، اور امیر مینائی کی شاگردی برائے نام ہے۔ خطابات خان بہادر اعتبار الملک اقتدار جنگ ریاست ٹونک سے ملے تھے ان کی نظمیں "نغمہ دیکھی محبت" "نیکی کا بدلا بدی" "اللہ بس باقی ہوس"۔ اور "دکھی کی پکار" کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ متصوفانہ شاعری کا مختصر سا مجموعہ بھی "یادگار الہامات" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں مضطر کے کلام کا عمدہ انتخاب بھی ہے۔ مضطر کے حالات سے جن اصحاب کو دلچسپی ہو اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ معیار)

(مضمون نگار نے سوز کا یہ مطلع سے دعویٰ کیا تھا گل نے اُس رخ سے رنگ و بو کا الخ غلطی سے مصحفی کے نام سے لکھ دیا ہے۔ معیار)

بہار اور اردو شاعری از معین الدین دردائی صاحب صفحہ ۲۲۱ تا ۲۸۰ (ابتدا سے لے کر اس زمانے تک کے شعرا کے حالات اس مضمون میں ملیں گے۔ بعض باتیں ضرور اس سے معلوم ہوتی ہیں لیکن اغلاط سے بھرا ہوا ہے اور بہت بے پروائی سے لکھا گیا ہے۔ مطبوعات جدیدہ کے تحت سہیل کے تبصرے میں اس کے اغلاط ملاحظہ ہوں۔ معیار)

(۱) فالنامہ حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری از بیاض سید شاہ نجم الدین صاحب نجم ہو سچار کچھ اگم آوے + آٹھ پانچ بہل مانگے پاوے + تین گیارہ پہنچے راج + نو سو سترہ کرے اکاج + (کذا)

(۲) حضرت شاہ احسان اللہ چشتی نظامی المتخلص بہ فخری حضرت مخدوم فرید طویلہ بخش کی اولاد میں تھے، اور بہار شریف محلہ چاند پورہ میں رہتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں کہتے۔ اردو کلام نایاب ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سے مضمون نگار کو حضرت فخری کی ایک اردو نظم دستیاب ہوئی۔ قلمی بیاض میں اس کی شان نزول یوں لکھی ہے۔ حضرت فخری اور حضرت شاہ علیم الدین سجادہ نشین حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری

سے گہرے تعلقات تھے حضرت شاہ علیم الدین کے کوئی اولادِ ذکور نہ تھی اور یہ ان کے ملال کا باعث تھا۔ حضرت فخری نے آستانۂ مخدوم صاحب پر حاضر ہونے کی صلاح دی، اور خود یہ نظم لکھ کر انھیں اپنے ساتھ وہاں لے گئے اور سوز و گداز کے ساتھ اسے پڑھا۔ دعا کی برکت سے حضرت شاہ ولی اللہ عالمِ وجود میں آئے۔ سال تصنیف ۱۱۸۵ھ۔ ۱۷ کل بند ہیں، اول و آخر کے بند درج کیے جاتے ہیں۔ معیار

یا شرف دیں تجھ شرف ہے جملہ عالم پر شرف
جملہ عالم پر شرف ہے تجھ شرف ہے ہر طرف
ظلم کرنا چاہتا ہے حاسد نادان حرف
مشکلیں آسان کرو میری پئے شاہ نجف

رات دن ہو ورد فخری یا مظفر شاہ دیں
یا مظفر شاہ دیں حاجت روائے سرزمیں
آرزو کو تم سے پوچھوں دل کو ہو میرے یقیں
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہ نجف

(۲) حضرت شاہ امیر الدین بہاری، ظلوم و وجد تخلص، فارسی دیوان مطبوعہ، اردو کا ضخیم دیوان جس میں متعدد مثنویاں بھی ہیں، اب تک بہار شریف میں محفوظ ہے سال ولادت ۱۲۱۰ھ ۔

(۳) حضرت سید شاہ امین احمد تخلص بہ ثبات و شوق خلف حضرت وجد۔ ولادت ۱۲۴۸ھ وفات ۱۳۲۱ھ ۔ گل بہشتی، گل فردوس، روضۃ النعیم، شجرات طیبات سلسلۃ اللآلی، عبرت افزا، شہد و شیر مثنویاں آپ کی تصنیف سے ہیں۔ کل تصانیف دیوان اردو کے سوا مطبوعہ ہیں، فارسی اردو دونوں کہتے تھے (اشعار ۱۱)

(۴) صاحب مضمون نے شاہ مرحوم کا ایک قطعہ بھی نقل کیا ہے اس میں بہت سے بہاری شعرا کے تخلص آگئے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے :

فلک کیوں کر نہ روئے اب عظیم آباد کے اوپر
نہ اب باقی بلاغت ہے نہ یاں شور فصاحت ہے

حسب ذیل شعرا کا اس قطعے میں ذکر ہے۔

بیدل، تحقیق، راسخ، سوزون، عشق، شیفتہ، شیدا، کاہش، کیفی، مفتوں، ذبیح یاس، تسکین، شرر، احمد، منشا الفتی، ضمیر، وحشتی، عبرتی، قمر، ضیا، تسلیم، مائل، فیض مہدی، مہدوی، آشفتہ، مجنوں ۔

حالی ایک محبِ وطن کی حیثیت سے: از ڈاکٹر ذاکر حسین، پی ایچ ڈی، صفحہ ۲۴۷ تا ۲۵۸۔

ادبِ لطیف۔ لاہور، فروری۔ اردو کی تاریخ اور حالت، (ایک محققانہ مقالہ) از میر محمد عامر عباس ایم اے۔ ص ۹ تا ۱۲۔ [اردو سے ہندوؤں کا تعصب دکھایا گیا ہے، مناظرانہ مضمون ہے۔ معیار]

ادبِ لطیف مارچ " اردو شاعری پر ادبِ انگریزی کا اثر" ص ۹ تا ۱۰، از ساغر جعفری

بلاملے۔ اسرسری ص۔ پر کھا گیا ہے۔ معیار)

میرانیس و فردوسی۔ ص ۲۰ تا ۳۰۔ از مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب بی اے ایل ایل بی (مرزا صاحب نے انیس کے بہت سے اشعار ایسے دکھلائے ہیں جو فردوسی کا ہو بہو یا بعض ترجمہ ہیں "یا تھوڑے ردوبدل کے ساتھ" مضمون نے اہل نظر سے سوال کیا ہے کہ کیا میر صاحب کی رزمی شاعری محض فردوسی سے استفادے کا نتیجہ ہے۔ معیار)

اردو کی تاریخ و حالت پر ایک متعلمانہ نظر ص ۳۰ تا ۴۲۔ از عبدالرشید صاحب منشی فاضل (میر محمد عارف عباسی صاحب کے مضمون پر اعتراض ہے معیار)

ادب لطیف۔ اپریل **چغتائی صاحب کا ایک استفسار**، ص ۴ تا ۶۔ از محمد اسحاق صاحب ایم اے

تنویر کراچی۔ مئی۔ **منور خاں غافل لکھنوی**، از حضرت افسر صدیقی۔ ص ۹ تا ۱۳۔ (۱) ان کے والد کا نام صلابت خاں یوسف زئی افغان تھے۔ ان کے بزرگ سپاہی پیشہ تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں شاعر نہیں کر فخر کیسے شاعری پہ وہ ٭ غافل سپاہی جانے کیا شاعری سے کام "

شاعری میں مصحفی کے شاگرد تھے ۔۔ با شاعران ہمچیں غافل مرا چہ کار است ٭ خوش کردہ ایم طرز استاد مصحفی را (۲) غافل گویا کہ رفیق تھے اور ان کے فیض صحبت کے خود معترف تھے، ۔۔ منو دا اتنی کہاں تھی شاعری میں میری اے غافل میں اس شہرت کو فیض صحبت گویا سمجھتا ہوں" (۳) مصحفی نے ۱۲۳۶ھ میں غافل کی عمر ۳۵ سال بتائی ہے، سراپا سخن ۱۲۶۹ھ کی تصنیف ہے، اس میں ان کا ذکر اس طرح ہے کہ گویا اس وقت زندہ تھے۔ شمیم سخن ۱۲۸۸ھ کی تصنیف ہے اس میں ان کا شمار مرحومین میں کیا ہے۔ قیاساً ان کی وفات ۱۲۶۹ اور ۱۲۸۸ھ کے درمیان ہوئی۔ (۴) اولاد میں ایک جمو خان ملازم منشی نول کشور تھے۔ اس سلسلۂ ملازمت کی وجہ سے مطبع نول کشور نے دیوان غافل کو چھاپ دیا۔ جمو خاں کا ایک لڑکا عبد اللہ خاں عظمت تیمور خان پورش رحمت بنارسی و بالکرشن قمر لکھنوی تھا۔ غافل کے ایک بھائی امجد علی خاں تخلص واجد کا ذکر تذکرہ گلدستہ سخن میں آیا ہے۔ (۵) تذکرہ روز روشن سے پتا چلتا ہے کہ فارسی میں بھی کبھی کبھی کہتے تھے۔ (غافل کا حال مصحفی نے تذکرہ ریاض الفصحا میں لکھا ہے، اس تذکرے کا سال آغاز ۱۲۲۱ھ اور سال تکمیل ۱۲۳۶ھ ہے۔ صاحب مضمون کا یہ لکھنا کہ مصحفی نے ۱۲۳۶ھ ہی میں غافل کا حال لکھا، ثبوت کا محتاج ہے معیار)

شاعر آگرہ مارچ مرتبہ جناب اعجاز صدیقی **متغزلین اردو**، ص ۱۵۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ نجم اکبر آبادی، مرزا عباس بیگ کے بیٹے اور مرزا جعفر علی فصیح لکھنوی کے پوتے ہیں۔ علی حسین قیصر ان کے حقیقی ماموں تھے (غیر ان کے والد کے ماموں تھے معیار)

ندیم گیا۔ اپریل۔ **مصنف سیر المتاخرین کی آل و اولاد**۔ از سید مرتضیٰ حیدر صاحب نقاد، ص ۴۴ تا ۴۴ (۱) "غلام حسین خاں کے اہل و عیال کا مقبرہ حسین آباد (جیلا) میں موجود ہے، اس کی بہت سی اولادیں تھیں"

تاکتخدا بیٹی واصلہ بیگم کی وفات غلام حسین خاں کی زندگی میں ہوی، اور اس کی قبر پر جو کتبہ نثر فارسی میں ہے وہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ اس لڑکی کو مذہبی مشاغل کے سوا کسی دوسرے کام سے دلچسپی نہ تھی " اپنی حیات میں شاید اس نے اپنا ترکۂ دختری لے کر وقف کر دیا تھا جس کا سلسلہ اب تک حسین آباد میں باقی ہے" (بقیہ مضمون حیات فریاد، مصنفہ میر علی محمد شاد مرحوم کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ معیار)

ندیم گیا مارچ۔ **'میر صاحب کی اصلاحیں'**، از حکیم سید احمد اللہ صاحب ندوی، ص ۰ تا ۱۰۱ (نکات الشعرا سے ماخوذ ہے، معیار) **اردو کے یوروپین شعرا**، از سید رضا قاسم صاحب، ص ۲۴ تا ۴۶ (۱) شائق، واکر، فلاطوں، اسفان، شور، جمیت (؟) صاحب، صاحب سنی بہ جورج فانوم، شکر، اسیر، خفی، ایرن کے مختصر حالات ہیں (۲) صاحب مضمون نے ذکا کے متعلق یہ صحیح نہیں لکھا کہ نصیر اس کے آقا تھے۔ اس کے تذکرے کا سال تالیف بھی انھوں نے غلط لکھا ہے۔ معیار) (۳) (اعظم الدولہ سرور کا سال وفات صاحب مضمون نے ۱۲۲۵ھ لکھا ہے، یہ صحیح نہیں، ۱۲۲۵ کے بہت بعد کی باتیں تذکرۂ سرور میں درج ہیں۔ صحیح سال وفات کے لیے گلشن بیخار ملاحظہ ہو۔ معیار)

ادبی دنیا فروری **کلیات دعا**، از آرزو جلیلی صاحب۔ ص ۶۰ تا ۷۰ (۱) علی بخش دعا عظیم آباد کے رہنے والے تھے یا کم از کم عظیم آباد سے انھیں گہرا تعلق تھا، ایک فارسی قطعے میں عظیم آباد کی تعریف ہے، جنت الہند عظیم آباد است۔ (صاحب مضمون نے دعا کو بہاری شعرا میں شمار کیا ہے لیکن اس کا کوئی قطعی ثبوت ان اشعار سے نہیں ملتا جو انھوں نے نقل کیے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ غالباً دعا تفضیلیہ فرقے کے شیعہ تھے، تفضیلی در اصل ان سنیوں کو کہتے ہیں جو حضرت علی کو دوسرے خلفا سے افضل سمجھتے ہیں۔ معیار) (۲) کلیات کا قلمی نسخہ کتب خانۂ خدا بخش میں ہے جس میں عربی فارسی اور اردو کی غزلیات اور متفرق کلام کے نمونے ہیں۔ حصہ اردو پر منتخب از دیوان ہندی، لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اردو علٰحدہ مرتب ہوا تھا، کتابت ۱۲۴۶ھ میں شروع اور ۱۲۴۸ھ میں تمام ہوی کاتب کا نام مہدی بخش ہے۔ (۳) دیوان میں خلفائے اربعہ کی تعریف موجود ہے اور انشا کو بھی جابجا یاد کیا ہے: حضرت انشا تلک تھی ساری بات + رہ گیا ہے اب دعا نام سخن، (۴) دیوان میں ۴۸ غزلیں ۹ رباعیاں اور ۹ فردیات اور ۳ مثنویاں ہیں حکایت عشق، مبارک البیان، شیر و شکر۔ اس کلیات میں دیوان ریختی بھی شامل ہے جس میں ۲۱ غزلیں، ۱۱ رباعیاں ۱۹ مختلف اشعار اور ۱۵ قسبنیں ہیں۔ ہجری کی فارسی غزل پر ایک مخمس ہے: ؎

ہوتی ہو آن کے آتو سے تم آیا گستاخ + دیکھ کر تم کو تو کہہ بیٹھے گی انا گستاخ
چھوڑ غفلت یہ سنو اور نہ ہو تھینا گستاخ (کذا) رفت دوشینہ چو آہم بہ ثریا گستاخ

بہ دعا دست بر آورد مسیحا گستاخ

دو مخمس اور ہیں جن میں سے ایک انشا کی غزل پر ہے۔ نسبت کا نمونہ یہ ہے: ؎

تلوا ہے دیا ہے بھلا کون سی نسبت ٭ گر پوچھے تو اتنا میں ہوں ترے قربان

کیا سمجھے گی تو میں تجھے سمجھاتی ہوں سن لے ٭ ان دونوں میں ہے بار ہزار، سمجھی تو نادان

کلیات کے آخر میں ایک واسوخت اور حسن کے شعار کی تضمین ہے۔ ایک قطعے میں ۷ زبانوں کے اشعار ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے اردو، فارسی زبان ہے، لہجہ بنگالیان، زبان سرکار سارن، لہجہ انگریزان زبان عربی (صاحب مضمون کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ گجرات ... ضلع در بھنگہ کا قصبہ ہے تو علاقے وہاں کی صحیح زبان نہیں لکھی۔ علاقے جو زبان لکھی ہے وہ جے پور کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جے گڑھ جے پور کا بھی نام تھا۔ معیار)

جاڑا جو ہوا آپ کیا یہ مکار ام جاڑی ہے ٭ چاہوں ہوں تم کو پچھاڑ کے پچاس کام آج، بہ لہجہ گجرات

ندیم مارچ تعلیم اردو ص ۴۴ ۱۹۳۶ء اور نوابہ عشرت لکھنوی (۱) آصف الدولہ جب حکمراں ہوئے شاہ عالم آلہ آباد میں تھے ... ماشہ میں میر مہدی سوز لکھنو آئے نواب نوازش کی شاگردی اختیار کی شاہ عالم شجاع الدولہ کے زمانے میں ہی جا چکے تھے۔ سوز کا نام محمد میر تھا۔ آصف کب سوز کے شاگرد ہوئے اس کی تحقیق علم نہیں۔ معیار) (۲) صاحبقران توسل امیر الدولہ ۵۰ روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ جرأت ظفریاب خاں کے ملازم تھے (یہ دونوں باتیں کسی تذکرے میں نہیں ملتیں۔ معیار) ۳ مصطفیٰ قلی خاں یکرنگ بھاندار کے ہمراہ لکھنؤ گئے (صحیح نام مصطفیٰ خاں ۱۱۶۵ھ سے ہی قبل مر چکے تھے معیار) ۴. میر قمر الدین منت خوش حال رئیس تھے میرزا خانی نوازش اور میر ضیا ان کے ملازم تھے (منت شاعری پیشہ تھے، نوازش اور ضیا ان کے ملازم نہ تھے۔ معیار) ۵. (افسوس اور سبقت سلیمان شکوہ کے ملازم نہ تھے۔ معیار) ۶ (میر کو ملک الشعرا لکھا ہے' یہ صحیح نہیں' یہ غلط ہے کہ میر نے لکھنؤ جانے کے حالات نظم کیے ہیں اور وہاں پہنچتے ہی شریک مشاعرہ ہوئے' یہ بھی صحیح نہیں کہ سودا میر کے لکھنو پہنچنے کے بعد دہلی سے نامر الدولہ کے عہد میں فرخ آباد گئے۔ سودا اس سے بہت پہلے ۱۱۷۰ کے لگ بھگ احمد خاں کے زمانے میں فرخ آباد چلے گئے تھے' وہ فیض آباد شجاع الدولہ کے عہد میں گئے۔ نہ کہ آصف کے عہد میں معیار) ۷. "شیخ مصحفی سلیمان شکوہ کے یہاں آ گئے" (اس سے شبہ ہوتا ہے کہ سلیمان کے بلانے سے لکھنو گئے تھے' یہ صحیح نہیں ۱۱۹۰ھ ہی میں وہ لکھنو پہنچ چکے تھے۔ معیار)

مطبوعات جدیدہ :-

(۱) خطبات گارساں دتاسی از ق ۔ ع ۔ د
(۲) سالنامہ سہیل از ؟
(۳) کلیم عجم از ؟

خطبات گارساں دتاسی مترجمہ سر راس مسعود و دیگر اصحاب و مرتبہ عبدالحق صاحب، سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو ص ۳۲ + ۴۱۸ قیمت مجلد ۵ر غیر مجلد للعہ، گارساں دتاسی کا سال ولادت ۱۷۹۴ء ہے اور سال وفات ۱۸۷۸ء - وہ پیرس کے مدرسۃ السنہ مشرقیہ میں اردو کا استاد تھا، ہندوستان کی کبھی اس نے صورت بھی نہیں دیکھی، لیکن جہاں تک اردو سے دلچسپی کا تعلق ہے، وہ مغربی مستشرقین بھی جن کی عمریں ہندوستان میں گزر گئیں، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ راقم کو اس کا ذاتی علم ہے کہ یورپ میں اگر کبھی اردو کے متعلق بحث چھڑتی ہے، تو اختلافی امور کے فیصلے کے لیے اب تک دتاسی کی تصانیف کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ دتاسی استاد اردو کی حیثیت سے ہر سال کے آخر میں ایک لکچر دیتا تھا، جس میں وہ اس سال کے ادبی ارتقا پر تبصرہ کرتا تھا، یعنی اس سال ہندوستانی اور ہندی میں کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں، کون کون سے نئے اخبار یا رسالے جاری ہوئے، کتنے مطابع قائم ہوئے، کن کن مصنفین نے ادب میں اضافہ کیا؟ دتاسی مستشرقین یورپ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا کرتا، اور کبھی کبھی ہندوستان کی سیاست اور معاشرت پر بھی نظر ڈالا کرتا تھا۔ ان لکچروں کی ابتدا دسمبر ۱۸۵۰ء سے ہوئی، اور یہ سلسلہ ۱۸۶۹ء تک جاری رہا۔ اس درمیان میں صرف ایک سال یہ لکچر ناغہ ہوا۔ یہ ۲۰ سال جدید ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہم ہیں، اور اس زمانے کی ادبی، ذہنی، اصلاحی اور تعلیمی تحریکوں میں شاید ہی کوئی ہو جسے دتاسی نے ان لکچروں میں نظر انداز کر دیا ہو۔ یہ لکچر فرانسیسی زبان میں ہیں۔ اور اب انجمن ترقی اردو نے ان کا ترجمہ کتابی شکل میں شائع کیا ہے، جس کی بدولت وہ اردو داں اصحاب بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو فرانسیسی سے ناآشنا ہیں۔

فاضل مرتب بجا طور پر ان خطبات کو دتاسی کے اہم ترین ادبی کارناموں میں شمار کرتے ہیں، ذاتی طور پر ہم انہیں تاریخ ادبیات سے بھی زیادہ اہم سمجھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے، کہ تاریخ کا مواد جن تذکروں سے لیا گیا ہے، وہ ایک ایک کر کے منظر عام پر آ رہے ہیں، اس کی قدر اسی وقت تک ہے، جب تک کہ یہ تذکرے غیر مطبوعہ ہیں، ان کی اشاعت ہو گئی۔ تو اس کی اہمیت باقی نہ رہے گی لیکن خطبات کا مواد دتاسی نے سرکاری روئدادوں، اپنے زمانے کے اخباروں، رسالوں، کتب فروشوں کی فہرستوں اور ... کی اطلاعوں سے حاصل کیا ہے، اس ذخیرے کا معتد بہ حصہ امتداد زمانہ سے ضائع ہو چکا، جو کچھ باقی ہے وہ اس قدر منتشر ہے کہ اس کو از سر نو جمع

کردیا ہے شیرو نے لکھا ہے، اس کتاب سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں، اور بظاہر کوئی صورت اس کی نظر نہیں آتی کہ آئندہ بھی کوئی کتاب اس کی جگہ لے سکے۔

دتاسی نے اسی کتاب پر کہیں لکھا ہے کہ کتاب اگر حیثیت مجموعی مفید ہو تو اس کے عیوب سے چشم پوشی کرنی چاہیے لیکن ہے کہ ایسی صدی میں تبصرہ تھا۔ ورنہ اس پر عمل ہو، لیکن بیسویں صدی میں تو تصویر کا صرف ایک رخ دکھانا ادبی شریعت میں گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے، اور ہمارے لیے باوجود اس کے کہ دتاسی کی بڑی عزت اور محبت ہمارے دل میں ہے۔ اس مشورے پر عمل پیرا ہونا ممکن ہے۔

فاضل مرتب نے اپنے مقدمے میں دتاسی کے اغلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں جابجا غلطیاں پائی جاتی ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سی ایسی معلومات ظہور میں نہیں آئی تھیں، جو اس وقت ہماری دسترس میں ہیں۔ دوسرے آخر وہ غیر ملک کا شخص تھا، اور کبھی ہندوستان آنے کا اسے اتفاق نہیں ہوا تھا، اس لیے ہمارے ادب اور ہمارے حالات کے سمجھنے میں کہیں کہیں غلطی کا سرزد ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں"۔ ہماری رائے میں، اس کے اغلاط کی توجیہ کے لیے صرف اسی قدر کہنا کافی نہیں، کہ غلطیاں صحیح ہے کہ ان وجہوں سے سرزد ہوئیں جو فاضل مرتب نے بیان کی ہیں، لیکن ہمارا سب سے بڑا اعتراض دتاسی پر یہ ہے کہ اس نے اس مواد سے جو اس کے سامنے تھا اچھی طرح کام نہیں لیا، اور اس کی مدد سے جیسی کتاب اس نے لکھی ہے، اس سے بہت بہتر کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ اس کی تصانیف کے مطالعے سے جن خاص عیوب کا ہمیں پتا چلتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اردو فارسی سے واقفیت نہیں رکھتا، وہ مشرقی مصنفین کی مخصوص طرز ادا کا اسے کافی علم نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عبارت کا غلط سمجھتا ہے، اور فاحش غلطیاں کرتا ہے۔

(۲) شعرائے اردو کے حالات لکھنے کے لیے محض تذکروں کا مطالعہ کافی نہیں، ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ کا علم بھی ضروری ہے دتاسی نے ایک تو یہ کہ فارسی گو شعرائے تذکروں کی طرف بالکل توجہ نہیں کی، حالانکہ بہت سے ریختہ گو شعرا کا حال فارسی گو شعرا کی حیثیت سے فارسی کے تذکروں میں ملتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ اس ملک کی تاریخ و جغرافیہ سے مطلقاً ناواقف ہے۔ ایک تخلص یا ایک نام کے اگر دو شاعر ہوں، تو خواہ ان کے درمیان سیکڑوں برس کا بھی فرق کیوں نہ ہو، اور ایک دوسرے سے سیکڑوں کوس کے فاصلے پر کیوں نہ ہوں، وہ ضرور انہیں ایک کر دیتا ہے۔

(۳) اس کا حافظہ کمزور ہے، اس کی کتابیں متناقض بیانات سے بھری ہوئی ہیں، اور بہ کثرت حوالے غلط ہیں

(۴) دتاسی دقت نظر سے بالکل محروم ہے، اس کی ناقدانہ رائیں عجیب و غریب ہوتی ہیں، اور مختلف فیہ مسائل میں مختلف شہادتوں پر نظر کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتا

(۵) کتابیں کتنی بے پروائی سے پڑھتا ہے کہ اگر کوئی وقت زبان و بیان کی نہ ہو جب بھی مطلب غلط سمجھتا ہے۔

دتاسی کے ان نقائص کا ثبوت اس کی تصانیف علی الخصوص تاریخ ادبیات میں بکثرت ملتا ہے۔ دتاسی کا پایۂ تحقیق کس قدر بلند ہے۔ اس کا اندازہ ناظرین کو بھی ذیل کی مثالوں سے ہوجائے گا۔ مثالیں صرف خطبات سے لی گئی ہیں۔ اور یہ غلطیاں جن کی فاضل مرتب اور ان کے لائق شاگرد نے تصحیح کردی ہے، نظرانداز کردیے گئے ہیں۔

(۱) ص ۸۹ دتاسی مصنف مجمع الانتخاب کا نام فقیر محمد کمال لکھتا ہے۔ اس کو اتنی واقفیت نہیں کہ لفظ فقیر نام کا جزو نہیں بلکہ ازراہ انکسار بڑھادیا گیا ہے۔

(۲) ص ۵۸ "گروہ زہی ذات کا شیخ ہے" یہ اپنے زمانے کے مشہور صوفی تھے اور ان کی سیادت میں کبھی کسی نے شک نہیں کیا۔ دتاسی نے کہیں ان کے متعلق یہ پڑھا ہوگا کہ شیخ وقت یا شیخ طریقت تھے" فوراً انہیں سید سے شیخ بنادیا

(۳) ص ۹۱ شیفتہ کے متعلق دتاسی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں اپنا ذکر بڑے انکسار کے ساتھ کرتے ہیں، واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے جس کا جی چاہے گلشن بے خار کا دیباچہ دیکھ کر اپنا اطمینان کرلے۔

(۴) ص ۱۳۰ صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ معز اللہ خاں نے اس پر ایک مثنوی قول حسین کے عنوان سے لکھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی تذکرہ نگار مومن خاں کا نام لکھ کر دوبارہ جو ان کا ذکر آیا تو خاں معزی الیہ لکھا۔ معزی الیہ معز اللہ بن گیا، اور ایک ایسی مثنوی جس کے متعلق دتاسی کو علم ہونا چاہیے تھا کہ مومن کی تصنیف سے ہے ایک خیالی شاعر کی طرف منسوب کردی گئی۔ ایسے تذکروں میں جو دتاسی کی نظر سے گزر چکے ہیں، اس مثنوی کا ذکر ہے، اور ہر جگہ مومن ہی اس کے مصنف بتائے گئے ہیں۔

(۵) ص ۱۳۱ "ایک اور عورت شاعر جو باوجود ہندو نام کے غالباً مسلمان تھی چپا ہے" یہ حسام الدولہ کے حرم میں تھی، مولانا قاسم، شیخ محمد چاند صاحب نے یہ صحیح اعتراض کیا ہے کہ چپا کا ذکر تذکرۂ قاسم میں نہیں، لیکن دتاسی کی اس غلطی کی وجہ انہوں نے نہیں بتائی۔ تذکرۂ قاسم (جلد ا ص ۸۷) سے ایک اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے، اس غلطی کی وجہ خود سمجھ میں آجائے گی "جھبنا تخلص شخصے ست از حیش خدمتان حسام الدولہ کہ ناسخ از صفر سنا ملک شدہ" جھبنا کو چپا پڑھنا تو کوئی بڑی غلطی نہیں لیکن دتاسی کو تخلص اور نام میں فرق کرنا تھا، اور لفظ "شخص" کے بعد اسے کوئی حق نہ تھا کہ جھبنا کو عورت سمجھے تذکرۂ قاسم دتاسی کے ماخذوں میں ہے اور اس کی نظر سے گزر چکا ہے، اس لیے اس غلطی کا ذمہ دار دتاسی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

(۶) ص ۶۷ "میر نے اپنا تذکرہ مخلص کی وفات سے ایک برس قبل لکھا" مخلص کی وفات ۱۱۶۴ھ میں ہوئی، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ تذکرے کا سال تصنیف ۱۱۶۳ھ ہے، دوسری جگہ سال تصنیف ۱۱۶۵ھ بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں بیان صحیح نہیں ہوسکتے۔

(۷) ص ۷۷ "تذکرۂ شورش مصنف کی وفات کے دس برس بعد یعنی ۱۱۶۸ + ۱۰ = ۱۱۷۸ھ میں لکھا گیا" ص ۹۹ "تذکرۂ شورش ۱۱۹۳ھ میں لکھا گیا"۔ ان دونوں باتوں میں تضاد ہے

(۸) ص ۱۱ جہاں تک ہمیں علم ہے سب سے پہلا سب سے پرانا میر کا تذکرہ ہے۔ ص ۹۸ پر اس کے خلاف لکھا ہے۔

(۹) ص ۹۹ "مصنف نے شاہنامہ میں شاہ عالم کے عہد تک کے حالات نظم کیے ہیں" تذکرۂ ہندی یہاں مصحفی لکھتے ہیں کہ ایک دوعزیز

نسب نامہ شاہ عالم تک لکھا گیا۔

(۱۲) ص ۱۰۱ مصحفی کے یہ واقعہ کہ امام بخش نے ان کے تذکرے سے سرقہ کر کے دوسرا تذکرہ لکھا حقیقت سے معلوم ہوا۔ تذکرہ ہندی میں ہے کہ خود حقیقت بھی اس سرقہ میں شریک تھے۔ حقیقت سے اس واقعہ کا معلوم ہونا دتاسی نے غلط فہمی سے لکھ ہے۔

(۱۳) ص ۱۲۱ بجو نزاکت تخلص کا نام دتاسی نے مام جی پڑھا ہے اور اس کا بند دقرار دیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔

(۱۴) ص ۱۲۱ جان صاحب ریختی گو کو ایک عورت سمجھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جان تخلص کی ایک عورت کا تذکرہ عالم میں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ جان صاحب کو کریم الدین صاحب تذکرہ کا استاد قرار دیا ہے۔ کریم الدین نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے اس کا شبہ بھی ہو اور نہ کریم الدین شعر کہتا تھا۔ ریختی سے بھلا ایک مولوی کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔؟

(۱۵) ص ۱۳۰ دتاسی نے لکھا ہے کہ حیدر شاہ سے تخلص کے ہیں اور اس میں ولی سے ترقی کی ہے۔ دتاسی نے کسی کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن حیدر شاہ کا حال صرف گلزار ابراہیم میں ہے اور دتاسی نے وہیں سے لیا ہے۔ گلزار میں خلیل نے یہ لکھا ہے کہ حیدر نے دیوان ولی کی کس غزل کو مخمس کیا تھا جس کی نقارت رو از کماست آہ گیا۔

(۱۶) ص ۲۰۰ مرزا علی لطف صاحب تذکرہ کا باپ ہجری تخلص اردو میں شعر کہتا تھا۔ لطف نے ہجری کی نذری گوئی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ریختہ گوئی کا ذکر سوا دتاسی کے کسی نے نہیں کیا۔

(۱۷) ص ۲۰۰ دتاسی لکھتا ہے کہ قاسم نے ۱۰۹ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ حوالہ کریم الدین، کریم الدین نے صرف یہ لکھا ہے کہ بڑی عمر پا کر انتقال کیا۔

(۱۸) ص ۲۰۶ مصحفی کا سال وفات کریم کے حوالے سے ۱۲۱۸ھ لکھا ہے، حالانکہ کریم نے ۱۲۴۰ھ لکھا ہے، یہ غالباً کاتب کی غلطی ہے۔

(۱۹) ص ۲۰۶ مصحفی کے متعلق لکھا ہے کہ دیوان زادہ حاتم کے دیباچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاتم کے ہم عصر تھے، حاتم نے دیباچہ میں مصحفی کا بالکل ذکر نہیں کیا۔

(۱۸) ص ۲۲۵ محمد جان ساقی تخلص کے متعلق لکھا ہے "ساقی معروف بہ ساقی" اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ ساقی نام تھا اور ساقی عرف حالانکہ ساقی منان کا نام تھا، یہ تخلص اور ساقی تخلص تھا، جیسا کہ تذکرہ قاسم اور تذکرہ سرور کے مطالعے سے واضح ہوگا۔

(۱۹) ص ۲۳۵ گلستان سخن: اس نام کے تین تذکرے ہیں: جوش، مبتلا اور صابر کے لکھے ہوئے۔ مبتلا کے تذکرے کا نام گلشن سخن ہے، اور جوش نے غالباً اس نام کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا، بلکہ جہاں تک ہمیں علم ہے، جوش کسی تذکرہ نگار کا تخلص نہیں۔

(۲۰) ص ۲۴۱۔ خاص طور پر قابل ذکر شاعروں میں سودا، میر اور حسن کے بعد درد، اور یقین وغیرہ کے ساتھ ابجد دہلوی، الٰہی الدین بخاری، اور عاشق غازی پوری سے کم نام شاعروں کا نام لکھا ہے۔

(۲۱) ص ۲۴۴ "ہمارے ہم عصر شاعروں میں ذوق و آتش، ذوق، اور نظیر کے دیوان زیادہ قابل لحاظ ہیں" اگر کسی صاحب کو ذیل کے کسی ممتاز شاعر کا حال معلوم ہو تو وہ ہم سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔

(۲۲) ص ۹۲ گلشن بے خار سب تذکروں سے زیادہ صحیح ہے، یہ سچ ہے کہ شیفتہ شعر فہم اور نکتہ رس تھے لیکن یہ بالکل غلط کہ انہوں نے واقعات کے لحاظ سے تذکرے کو صحیح بنانے کی کوئی خاص کوشش کی تھی، صحت کے لحاظ سے دوسرے تذکروں پر اسے ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

(۲۳) ص ۹۳ باطن کا انتقال ۱۲۵۹ میں ہوا، ان کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۲۵۹ کے بعد ہوئی

(۲۴) ص ۱۴۵ دتاسی کے نزدیک واسوخت سوز سے مختلف نہیں، اور واسوخت کا مسدس ہونا ضروری ہے

(۲۵) غازی الدین حیدر فارسی لغت ہفت قلزم کے مولف تھے ص ۱۹۸

(۲۶) ص ۲۲۳ دتاسی نے غدر ۱۸۵۷ء کے زمانے میں یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ مرزا دارا بخت دارا تخلص، خلف اکبر ظفر قتل یا ہلاکت سے محفوظ ہیں، حالانکہ یہ غریب غدر سے بہت قبل مر چکا تھا، مرزا دوسرے ولی عہد بھی غدر سے قبل انتقال کر چکے تھے، لیکن دتاسی کو اس کی بھی خبر نہ تھی

(۲۷) ص ۲۴۲ - ۲۴۳ دتاسی مشتی عظیم آبادی صاحب تذکرہ اور الٰہی بخش عشق لکھنوی شاگرد رشک کو ایک سمجھتا ہے۔ عشق کا تذکرہ اس نے نہیں دیکھا، لیکن اشپرنگر نے جو کچھ عشق کے متعلق لکھا ہے، اس کی نظر سے گزرا ہے، اور عشق کے زمانے کے متعلق وہ رائے قائم کر سکتا ہے۔ خود اپنی تاریخ ادبیات میں عشق کا نام اس نے رحمت اللہ لکھا ہے، جو غلط فرد ہے۔ لیکن الٰہی بخش سے مختلف ہے۔ دتاسی کو علم ہے کہ تذکرہ عشق میں آخری حوالے جو ملتے ہیں وہ ۱۲۱۵ کے ہیں (یہ اشپرنگر کا قول ہے جو صحیح نہیں) اور ۱۲۱۵ میں الٰہی بخش عشق کا کیا ذکر ہے، ان کی استاذ الاستاذ ناسخ بھی منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ خود رشک کی پیدائش ۱۲۱۵ یا اس کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ یہ تمام باتیں دتاسی کو معلوم ہیں یا معلوم ہونی چاہییں، لیکن وہ بے تامل الٰہی بخش عشق اور وجیہ الدین عشق کو ایک بنا دیتا ہے

(۲۸) محسن صاحب تذکرہ دتاسی کی رائے میں اعلیٰ درجے کے شاعروں میں ہیں، اور ان کا تذکرہ اردو کے اور تذکروں کی طرح بے مزہ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ محسن کا شمار کسی نے اعلیٰ درجے کے شاعروں میں نہیں کیا، اور نہ اس کا کلام اسے اس کا مستحق ٹھہراتا ہے، اور اس کا تذکرہ اردو کے کل تذکروں سے زیادہ خشک اور بے مزہ ہے۔

فاضل مرتب اور ان کے لائق شاگرد شیخ محمد چاند صاحب نے مصنف کی غلطیوں کی کہیں کہیں حواشی میں تصحیح کی ہے، جس سے ان کی وسعت نظر کا پتا چلتا ہے، لیکن بعض مقامات پر ان صاحبوں سے خود غلطی ہو گئی ہے، جس کی طرف ہم ان کی توجہ منعطف کرانے کی جرأت کرتے ہیں :-

(۱) عبدالحق صاحب کا خیال ہے کہ علی ابراہیم کا ایک تخلص خلیل اور دوسرا علی تھا۔ دتاسی لکھتا ہے کہ ایک تخلص خلیل اور دوسرا حال تھا۔ دتاسی کا قول صحیح ہے، تذکرۂ عشق میں حال تخلص دیا ہے، اور علی کسی تذکرے میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر فاضل مرتب کے پاس اس کی کوئی سند ہو تو ہمیں آگاہ فرمائیں، تاکہ ہمیں اپنی رائے کو بدلنے کا موقع ملے۔ (حاشیہ ص ۵۴)

(۲) شیخ چاند صاحب کہتے ہیں کہ خاکسار نے اپنے تذکرے کا نام معشوق چہل سالہ خود رکھا تھا، یہ نام کسی تذکرے کا نہیں ہو سکتا بلکہ یہ قطعۂ

کو "دیباچہ" اس کا مطلب یہ ہے کہ تذکرہ اپنے معشوق کے نام معنون کیا تھا۔ پرانے زمانے میں کسی شخص کے نام پر کتاب لکھنے کو دیباچہ مطلب ہوا کرتا تھا۔ جو آج کل کسی کے نام سے کتاب معنون کرنے سے نکلتا ہے۔ حاشیہ ص ۱۰۷۔

(۳) "شیخ چاند صاحب کا خیال ہے کہ امام الدین سرو کی "رسالہ دار الاشاہی تھا" یہ صحیح نہیں۔ اس کا باپ اس عہدے پر مامور تھا۔ امام الدین کا حال گلزار ابراہیم میں دیکھیے۔ حاشیہ ص ۱۰۷

(۴) "شیخ محمد چاند صاحب لکھتے ہیں کہ طپش کا قید ہونا کسی تذکرے میں نہیں پایا جاتا" یہ قول صحیح نہیں۔ عشقی نے اس کا حال لکھا ہے "اور تعجب نہیں کہ اشپرنگر نے بھی اس سے نقل کیا ہو۔ کلیات طپش سے بھی قید ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

ترجمہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ گو بعض مقامات مشکوک ہیں۔ مصرع نقل سوا ایک کے نظر نہیں آئی۔ ص ۱۲۹ شاہزادی خالہ "یہ تخلص انہوں نے اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے عماد الملک کے محل میں اسی نام سے پکاری جاتی تھیں" دتاسی نے خالہ بیگم کو شاہزادی خالہ بنا دیا یہ غلطی سے تخلص سمجھ لیا، حالانکہ یہ تخلص نہیں، مترجم کا سہو ہے کہ انہوں نے فرانسیسی لفظ نیویو کا ترجمہ بھانجے کی جگہ بھتیجے کیا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق بھتیجے اور بھانجے دونوں پر ہو سکتا ہے، لیکن عماد الملک اگر بھتیجا ہوتا تو یہ شاہزادی خالہ بیگم کے لقب سے نہ پکاری جاتی۔ مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے بھی یہی لکھا ہے۔ طباعت کی غلطیاں زیادہ نہیں، لیکن ان کی تصحیح کے لیے غلط نامہ ہوتا تو بہتر تھا۔

سالنامہ سہیل علی گڑھ ۱۹۲۶ء

مرتبہ رشید احمد صدیقی صاحب، ص ۲۲ + ۸۴، تصاویر سرورق علاوہ تقطیع ....، قیمت تین روپیہ (۳/)۔

رشید احمد صدیقی صاحب اردو کے مقبول انشا پردازوں میں ہیں، اور سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں قسم کے مضامین اچھے لکھتے ہیں۔ ہم نے معیار کی کسی اشاعت میں یہ شکایت کی تھی کہ ان کے ایک مضمون میں سنجیدگی اور ظرافت کو جمع کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی، یہ شکایت ایک خاص مضمون کے متعلق تھی، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے کل مضامین کے متعلق ہماری یہ رائے ہے۔ صدیقی صاحب چند سال قبل سہیل نامی ایک سہ ماہی رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اردوئے معلیٰ کی طرف سے نکالا کرتے تھے۔ اس کی اشاعت بعض وجوہ سے معرض التوا میں آ گئی تھی۔ یہ رسالہ انہوں نے پھر جاری کیا ہے لیکن اب اس کی زیارت سال بھر میں چار بار کی جگہ صرف ایک بار ہوا کرے گی۔ علی گڑھ سے علمی اور تعلیمی مرکز میں ایک ایسے رسالے کی جو وہاں کے نوجوانوں کو ادب اردو کی خدمت کی طرف مائل کرے، شدید ضرورت ہے، ہم سہیل کی کامیابی کے دل سے خواہاں ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایسے اسباب پیدا ہوں کہ صدیقی صاحب اسے جلد ماہوار شائع کر سکیں۔ سہیل کے سرورق پر علی و ادبی سالنامہ لکھا ہوا ہے، لیکن سوا دو کے کل مضامین ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادب میں تخلیقی، تحقیقی اور ناقدانہ مضامین متناسب تعداد میں چھپے ہیں۔ سجاد علی انصاری مرحوم کی ناتمام تمثیل "روز جزا" قابل دید ہے، اسے پڑھ کر ہمیں اپنی محرومی پر افسوس ہوا کہ اس سے قبل ان کی کسی تحریر کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر افسوس ہمیں ان کی جوان مرگی کا ہوا۔ اگر مرحوم نے طبعی عمر پائی ہوتی تو اردو کے تخلیقی ادب کی کم مائیگی بڑی حد تک دور ہو جاتی۔ صدیقی صاحب نے اس تمثیل کی اشاعت سے اردو پر بڑا احسان

کیا ہے' اور اگر اپنے رسالے میں وہ اس کے سوا کچھ اور نہ بھی شائع کرتے' جب بھی خریدنے والوں کو یہ سودا مہنگا نہ پڑتا۔ ایک دوسری تمثیل "دیوانے"، کسی طالب علم کی لکھی ہوئی ہے' ممکن ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر ہماری سمجھ میں نہ آیا ہو' اگر ایسا ہے تو یہ خود ان کا قصور ہے، انہیں تمہیداً اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ مصنف کی مدد کے بغیر جو رائے ہم قائم کر سکتے ہیں' وہ یہ ہے کہ اس میں تخیل کی بڑی بے اعتدالیاں ہیں' اور قواعدِ فن سے بے ضرورت انحراف کیا گیا ہے۔ افسانوں میں سلطان حیدر صاحب جوش کا افسانہ قابلِ ذکر ہے۔ اور نظموں میں کوئی بھی قابلِ ذکر نہیں' ناقدانہ مضامین میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا مضمون اچھا ہے' اور تبصروں کا معیار عام رسائل کی سطح سے بلند تر ہے۔ اودھ کے متعلق جو تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہیں' ان میں ڈاکٹر عبد الستار صدیقی کے مضمون کو چھوڑ کر کسی کا پایہ بلند نہیں۔ دو مضمون مرتب کے شاگردوں کے ہیں' ایک صاحب نے "اردو اور اس کے بعض تاریخی ماخذ" کے عنوان سے چودہ پندرہ سو برس کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے، یہ ایک ایسا وسیع اور مشکل موضوع ہے کہ منتہی بھی اس پر آسانی سے نہیں لکھ سکتے، چہ جائیکہ مبتدی۔ اس کے لیے جس وسعتِ مطالعہ اور وقتِ نظر کی ضرورت ہے' اس کے واسطے ایک عمر چاہیے' دوسرے صاحب نے "بہار اور اردو شاعری" کے موضوع پر لکھا ہے اور اس مضمون میں بھی آٹھ سو برس کی ادبی تاریخ زیرِ بحث آگئی ہے۔ ان دونوں مضمون نگاروں کو اردو سے جو شوق ہے' وہ دوسرے نوجوانوں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ مضمون لکھا بھی محنت سے ہے' لیکن انہوں نے اتنا بھاری بوجھ اٹھایا ہے کہ ان کے کمزور کاندھے اس کے متحمل نہیں ہو سکے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ دونوں کسی ایک مصنف یا کسی خاص دور کے متعلق اچھے نمونوں کو سامنے رکھ کر لکھیں' تو بہت زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ذیل میں ہم مفصلاً بہار اور اردو شاعری کے اغلاط کا ذکر کرتے ہیں۔ اعتراض مقصود نہیں اور نہ ہم طالب علموں کے مضامین کو کاملینِ فن کے معیار سے پرکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ غرض ضرور ہے کہ صدیقی صاحب کو مرتبِ مجلہ اور استاذِ اردو کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو' اور آئندہ یہ مجلہ غلط معلومات کی اشاعت کا ذریعہ نہ بنے۔

(۱) "ناصر الدین اور اس کے بیٹے معز الدین کیقباد کی جنگ کے حالات کو فارسی میں حضرت خسرو سے بہت پہلے ایک بہاری شاعر نے اردو میں قلم بند کیا تھا۔ خسرو کی قران السعدین ہر جگہ مشہور ہے' لیکن غریب بہاری شاعر کا بھی ایک شعر یاد رہے۔

من کی اجڑی نگری کو تب کرنی آباداں ناصر دین کو جب ملیں معز دین کبادان"

یہ بیان سخت تعجب خیز ہے' ایک تو یہ کہ ایک ہی نظم فارسی اور اردو دونوں میں کیونکر قلم بند ہوئی! دوسرے یہ کہ خسرو کیقباد کے دربار کے شاعر تھے' قران السعدین باپ بیٹے کی مصالحت کے تھوڑے ہی دن بعد خسرو نے کیقباد کے حکم سے لکھی تھی۔ کسی شاعر کا خواہ وہ بہاری ہو یا غیر بہاری' اردو گو ہو یا فارسی گو' اس موضوع پر خسرو سے بہت پہلے نظم لکھنا قطعی ناممکن ہے۔ شعر بالا کے زمانۂ تصنیف سے قطع نظر بھی کی جائے، تو اس کا کیا ثبوت کہ یہ شعر کسی بہاری شاعر کا ہے۔ صاحبِ مضمون کو یہ ضرور بتانا تھا کہ یہ شعر انہوں نے کہاں

معیار دان کا بیان معتبر اور نہ ان تصنیف کے متعلق کہاں سے ماخوذ ہے

(۲) ذیل کے دو شعر علی الترتیب حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری اور ان کے مرید مولانا مظفر بلخی کی طرف منسوب کیے ہیں لیکن کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔

عشق فاگو رذر اودن منس ادھیاری رات ۔ واں نہ پوچھے کون تہاری جات
جی مگن ہی ہے کرائی ہی سہلی تیاں ۔ جن کے کارن تجے بہتا نے بنائی گیاں

(۳) ملا علیم تحسین کے اشعار ذیل بغیر کسی حوالے کے نقل کیے ہیں اور زمانی حیثیت سے انہیں بیدل سے بھی مقدم قرار دیا ہے۔ تحسین کا سال ولادت ۱۰۰۵ھ کے لگ بھگ ہے اور سال وفات ۱۰۷۲ھ (تذکرۂ خوشگو) اس حساب سے بیدل کی ولادت کے تقریباً ۴۰ برس قبل تحسین پیدا ہوئے اور بیدل کی گفتگو کم سے کم ۲۰ برس بعد کی ہے۔ تحسین کے زمانے میں ریختہ گوئی عام ہو چکی تھی، اور بغیر کسی معتبر سند کے ہم ان اشعار کو تحسین کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ نواے دکن کی سند (مضمون نگار نے اشعار کے لیے تو نہیں لیکن حالات کے لیے اس کتاب کا حوالہ دیا ہے) ناکافی ہوگی۔

سرجن ترے مکھڑے میں سورج کی کرن دھا ہے ۔ دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کوں نیناں مری چندھرا ہے
مجکو بانده دل ہوں سہاجا دکتا ۔ سلونو ساورے ادھر کوں آیا

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی عظیم آبادی تذکرہ نگار نے ریختہ گو کی حیثیت سے تحسین کا ذکر نہیں کیا

(۴) اشکی اور جالی درد کے شاگرد نہ تھے۔ یہ لوگ عمر کے لحاظ سے بہت بعد کے ہیں۔ اشکی کو مصحفی نے اپنا شاگرد لکھا ہے مضمون نگار کو اس قسم کی حکایتوں کو اس قدر آسانی سے قبول نہیں کرنا چاہیے۔

(۵) میر تقی میر نے میر جعفر عظیم آبادی سے فارسی پڑھی، لیکن مضمون نگار نے میر کی شاگردی کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ میر فن سخن میں میر جعفر کے شاگرد تھے، حالانکہ یہ واقعے کے خلاف ہے۔ (ذکر میر ملاحظہ ہو)

(۶) مضمون نگار کے خیال میں طالب آملی بیدل کا ہم عصر تھا، لیکن طالب کا انتقال ۱۰۳۶ھ میں بیدل کی ولادت سے کم و بیش ۲۰ سال قبل ہو چکا تھا (سرو آزاد)

(۷) مضمون نگار کی رائے میں بہار اسکول کی اردو شاعری میں بیدل کا اسکول یقیناً سب سے پہلا کہا جا سکتا ہے۔ سجاد اور فغاں وغیرہ کی شاعری بیدل اسکول سے اثرپذیر ہے۔ جس شاعر کی تصنیف سے اردو کے صرف دو شعر دستیاب ہوئے ہوں اسے کسی اسکول کا بانی قرار دینا حیرت انگیز ہے۔ ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ قدما کی تصانیف سے کوئی ثبوت اس امر کا نہیں دیا جا سکتا کہ بیدل نے اردو میں بہت سے اشعار کہے تھے اور وہ ضائع ہو گئے۔ اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ دو شعر جو میر اور قائم نے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں، دہلی میں نہیں بلکہ عظیم آباد میں کہے گئے۔ فغاں کا ذکر بہاری شعرا کے ساتھ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کے فارسی اور اردو کلام پر بیدل کا بالکل اثر نہیں پڑا۔ اس قسم کے بے بنیاد دعووں سے

اہلِ تحقیق کو احتراز لازم ہے۔

(۸) مضمون نگار کی رائے میں "بیدل و راسخ کے علاوہ ایک اسکول بلگرامی سادات کا ہے" اس اسکول میں غورشید، امامی، منیر، ید، آزاد وغیرہ داخل ہیں، لفظ اسکول سے نہ معلوم صاحب مضمون کی کیا مراد ہے۔ منیر بلگرامی اور ان کے تلامذہ کے متعلق تو یہ مسلمات سے ہے کہ وہ طرز راسخ کے پیرو ہیں۔

(۹) بیدل کے عظیم آبادی ہونے کی تائید میں آزاد کے علاوہ کسی قدیم تذکرہ نگار کا قول نہیں پیش کیا جا سکتا۔ بیدل کا بہاری ہونا ہرگز قدما کے مسلمات سے نہیں ہے۔ نصیر آبادی نے ان کا وطن لاہور، قاسم نے بخارا، خوشگو اور عشقی نے اکبرآباد بتایا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی تذکرہ نگار نے خوشگو سے زیادہ مفصل بیدل کے حالات نہیں لکھے۔ اور جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے، اسے سیکڑوں بار بیدل کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا تھا۔ رہے عشقی، ایک تو وہ خود عظیم آباد کے ہیں، دوسرے یہ کہ بیدل ان کے استاد الاستاد تھے، خوشگو اور عشقی کی شہادت اس معاملے میں آزاد کی شہادت سے مرجح ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بیدل کا وطن عظیم آباد تھا ایسی شہادت پیش کرنی چاہیے جس سے خوشگو اور عشقی کی تردید ہو سکے اور بارہویں صدی کے اکثر تذکروں کے مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ایسی شہادت موجود نہیں۔ ہم نے اس مسئلے کی تحقیق کے لیے کلیات بیدل کا بھی مطالعہ کیا۔ اس سے یہ تو ثابت ہوا کہ طفولیت اور آغاز شباب تک بہار میں رہے لیکن یہ پتا نہ چلا کہ کس جگہ پیدا ہوئے۔ یہ بخوبی ممکن ہے کہ مرزا عبدالخالق پدر بیدل کی وفات کے بعد میرزا قلندر عم بیدل جو ایک ملازمت پیشہ شخص تھے بیدل کو بہار لے آئے ہوں۔ میرزا بیدل کی طرف جو شعر منیر بلگرامی نے منسوب کیا ہے، وہ دراصل میر سوز کا ہے اور انہیں کے نام نکات الشعرا اور مخزن نکات میں درج ہے۔ شعر ذیل مضمون نگار نے سید نجیب اشرف صاحب کے ایک مضمون سے نقل کیا ہے، اس کے متعلق ان کی یہ رائے صحیح ہے کہ بیدل کی تصنیف نہیں۔ مضمون نگار نے شکایت کی ہے کہ سید نجیب اشرف صاحب نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، یہ کمی ہم پوری کیے دیتے ہیں ان کا ماخذ نوائے وطن ہے اور شعر یہ ہے :-

سر اوپر کوئی نہیں تب دشمن آپن کہیں پٹنہ نگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بہیں

شعرِ سنو:- شہرۂ حسن سے از بس کہ وہ محبوب ہوا اپنے چہرے سے جگر تابہ کہ کیوں خوب ہوا

(۱۰) جوشش کے تذکرے کا ذکر حسن کے سوا کسی نے نہیں کیا، خود حسن کو بھی اپنے بیان پر اعتماد نہیں۔ اگر انہوں نے تذکرہ لکھا ہوتا تو عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش، خلیل، عشقی میں سے کوئی نہ کوئی اس کا ذکر ضرور کرتا۔ مضمون نگار کا یہ قول دیکھ کر بھی تعجب ہوا، کہ "جوشش کے ہر شعر میں جدت پائی جاتی ہے" ایسی مبالغہ آمیزی سے احتراز چاہیے۔ دل کو جوشش کا چھوٹا بھائی بتایا ہے، یہ فاحش غلطی ہے۔ جسونت رائے ملگا کا بیٹا ہونا بھی صحیح نہیں۔ مضمون نگار کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ دل عربی کے جید عالم تھے اور فارسی میں بھی اچھے اشعار کہتے تھے؟ بجوں آئینہ یہ ستم رسیدہ الخ۔ یہ شعر دل کا نہیں، جوشش کا ہے۔

(۱۱) یہ صحیح نہیں کہ مظہر علی جذب کا حال تذکرۂ حسن کے سوا کہیں اور نہیں ملتا، تذکرۂ عشقی میں ان کا ذکر موجود ہے اور رباعی تخلص

کے تحت تو مذہبی گروشاعروں کے متعدد تذکروں میں ان کا ذکر ہے۔

(۱۱) امتحان عظیم آبادی نہ تھے، دہلوی تھے۔ ممکن ہے کہ عظیم آباد بھی آئے ہوں، لیکن دہلی چھوڑنے کے بعد ان کا قیام زیادہ تر مرشد آباد میں رہا۔ (گلزار ابراہیم و تذکرۂ عشقی)

(۱۲) مضمون نگار کو اصرار ہے کہ حسرت کا نام ہیبت قلی نہیں، بیت قلی تھا۔ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ کل قدیم تذکروں میں ان کا نام ہیبت قلی خاں درج ہے۔ یہ مصرعہ غلط نقل کیا ہے۔ "ادھر بہار ادھر ایک شیشۂ دل ہے" بہار کی جگہ پہاڑ ہونا چاہیے۔ یہ غلطی اور لوگوں سے بھی ہوئی ہے۔ "سنبھلے ہیں کیا پھر سے ہے شکی شکی" یہ رباعی دیوان مصحفی میں بھی درج ہے، غالباً حسرت کی نہیں۔

(۱۳) شورش کا سال وفات مضمون نگار نے ۱۱۹۰ بتایا ہے اور ۱۱۹۵ کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ اپنے ماخذوں میں انہوں نے گلزار ابراہیم (اس کا نام وہ گلزار ابراہیمی سمجھتے ہیں) کا نام بھی لکھا ہے، حیرت کی بات ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد بھی شیفتہ کے قول کو وہ مرجح جانتے ہیں۔

زمانہ گرچہ بہت برخلاف ہے شورش ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

گلشن بہار سے مقطع بالا نقل کرنے کے بعد مضمون نگار نے اسی زمین کے دو اور شعر شعراء الہند کے حوالے سے لکھے ہیں۔

کسی کو غم سے فرض ہے کسی کو جام سے کام قسم خدا کی ہے ساقی کی مجھ کو نام سے کام"

بہاری صبح رخ یار شام زلف نگار نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح و شام کے کام"

مضمون نگار ان دو شعروں کو رباعی سمجھتے ہیں۔ تعجب ہے کہ صدیقی صاحب نے اس غلطی کی تصحیح نہیں کی وہ سہیل کے مرتب ہی نہیں مضمون نگار کے استاد بھی ہیں۔ ان کی ذمہ داری دوہری ہے۔

(۱۴) عشق ہوئی عمر پاکر پٹنہ آئے تھے، ان کو عظیم آبادی شعرا میں شمار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

فدوی کو بھی عظیم آبادی شعرا میں نہیں گننا چاہیے۔ یہ بھی غلط ہے کہ وہ احمد شاہ کے وقائع نگار تھے۔ ان کا عرف ہجو نہیں بجو یا بچو ہے۔ ۱۱۹۰ تک ان کے قیام کی کوئی جگہ متعین نہ تھی، کبھی فیض آباد، کبھی مرشد آباد اور کبھی عظیم آباد میں رہتے تھے۔
(تذکرۂ حسن و تذکرۂ قاسم)

(۱۵) راسخ کے متعلق مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ سودا اور تاباں کے شاگرد نہ تھے۔ میر سے بھی برائے نام اصلاح لی، زمانۂ وطن میں جو حکایت راسخ کے لکھنؤ جا کر میر سے ملنے اور اپنا دیوان برائے اصلاح پیش کرنے کی لکھی ہے، اسے مضمون نگار تسلیم کرتے ہیں، انہوں نے دو غیر مطبوعہ اشعار راسخ کے نقل کیے ہیں، اور ان سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاگرد دراصل فدوی کے تھے، میر سے محض ارادت تھی۔

"شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار راسخ ہوں ایک میں بھی اُسے کس شمار میں

جو ابھوں عالم بالا میں بریں تربت راسخ اولیسیہ ارادت ہے جناب میر سے مجھ کو"

سال وفات اور شاگردی سودا و تاباں کے متعلق مضمون نگار کی رائے صحیح ہے، باقی کل بیانات محل نظر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ راسخ عظیم آباد کے رہنے والے تھے، ابتدا میں انہوں نے فدوی سے اصلاح لی، اور ان کے غیر مطبوعہ دیوان میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں فدوی کی شاگردی کا اقرار کیا ہے، لیکن یہ اشعار ان کی ہدایت کے مطابق بعد میں دیوان سے خارج کر دیے گئے، چنانچہ مطبوعہ دیوان میں جو قدیم قلمی نسخے کی نقل ہے، ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا۔ کسی روایت سے تو اس کی تائید نہیں ہوتی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ مشق کی پختگی کے بعد فدوی سے منحرف ہو گئے ہوں گے، ورنہ ایک آدھ شعر تو دیوان میں ایسا رہنے دیتے جس سے ان کی ارادتمندی کا پتا چلتا، رہی میر کی شاگردی، اس کے متعلق نوائے وطن والی حکایت تو محض سنی سنائی بات ہے، جس کا کچھ اعتبار نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ شاد مرحوم کو کوئی خاص واقفیت راسخ کے حالات سے رہی ہو، اگر واقعی انہیں راسخ کے حالات کی کچھ تحقیق ہوتی تو مشق کو جو راسخ کے استاذ الاساتذہ تھے، ان کا شاگرد نہ سمجھتے، اس حکایت کو رد کرنے کے یہ معنی نہیں کہ راسخ میر کے شاگرد نہ تھے، اس کی نہایت معتبر شہادت ہمارے پاس موجود ہے۔ عشقی عظیم آبادی معاصر راسخ لکھتے ہیں:-

"درمبادی حال مشق اشعار بہ استصلاح مرزا فدوی می نمود، چنانچہ درکم مایہ فرصتے فی الجملہ استعدادے بہم رسانید و تتے کہ شناسائے پایۂ سخن گردید، طریقۂ پیروی کلام میر پیش نہاد ہمت ساخت، آخر بہ ہاں رسوخے کہ کمون خاطر داشت بہ باریابی درصحبت میر صاحب ... فائز شد و حلقۂ انقیاد شاگردی بہ گوش جاں انداخت"

اس اقتباس سے او لیہ ارادت، کی حقیقت بھی کھل گئی اور میر کی شاگردی بھی مسلم ہو گئی۔ میرے ارادت غائبانہ راسخ کو مدت تھی، لیکن حضرت اویس قرنی کے خلاف جو عمر بھر محروم زیارت رہے، راسخ لکھنؤ گئے اور ان کی مدتوں کی آرزو پوری ہوئی۔ رہا یہ سوال کہ میر سے کس حد تک مستفید ہوئے، اس کا جواب موجودہ مواد کی مدد سے نہیں دیا جا سکتا۔ راسخ کا سال ولادت عام طور پر ۱۱۶۲ھ سمجھا جاتا ہے، لیکن کسی نے اس کی تائید میں نوائے وطن سے قدیم تر سند نہیں پیش کی۔ ہماری رائے میں قدیم روایات کی عدم موجودگی میں سال ولادت کا تعین ناممکن ہے۔ رہا ۱۱۶۲ وہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ عبرتی نے جو بقول بعض شاد مرحوم کے اساتذہ میں تھے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ راسخ نے ۶۰ برس کی عمر پائی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۱۷۰ کے لگ بھگ ٹھہرتا ہے، ہمارا ذاتی خیال ہے، کہ ۱۱۰۰ زیادہ قرین قیاس ہے۔ ہم اپنے دلائل اس موقع پر پیش کرنا نہیں چاہتے۔ سائیں کا مولد ہونا بھی کسی قدیم روایت سے ثابت نہیں۔

(۱۸) امین الدین امین کے متعلق یہ لکھنا کہ ۱۲۵۸ھ میں بہ عالم ضعیفی زندہ تھے، فاحش غلطی ہے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ امین کے زمان حیات و وفات کے متعلق مضمون نگار لالہ سری رام کے بیان کو مرزا علی لطف کے بیان پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امین کا انتقال ۱۲۰۰ھ سے بھی قبل ہو چکا تھا، جیسا کہ ایک قدیم بیاض سے ثابت ہوتا ہے، جو ہمارے پاس موجود ہے۔

(۱۹) غلام مرتضیٰ جنوں کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ہر تذکرے سے ان کا عظیم آبادی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ گلزار ابراہیم اور تذکرۂ عشقی دونوں میں اس طرح ہے "جنون الہ آبادی، اسمش شیخ غلام مرتضیٰ ابن شاہ تیمور سہرامی" "پہنچا کوئی کچھ کوئی

"دیرے پہنچا الخ" یہ شعر مضمون نگار نے غلام مرتضیٰ جنوں کے نام لکھا ہے عشقی نے سے جنوں اکبرآبادی کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۲۰) خواجہ امام بخش امامی کو عظیم آبادی لکھا ہے حالانکہ عشقی نے انہیں دہلوی لکھا ہے۔ بالفرض اگر عظیم آبادی ہوں بھی تو ان کے باکمال شاعر ہونے کا کیا ثبوت؟ یہ رائے یا تو مضمون نگار نے امامی کا کلام دیکھ کر خود قائم کی ہے، یا کسی تذکرے سے نقل کی ہو۔ ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ سوا اس شعر کے جو انہوں نے نقل کیا ہے۔ امامی کا کلام انہیں کہاں ملا، اور کس تذکرہ نگار کی لئے انہوں نے نقل کی ہے۔

(۲۱) حضور کا نام غلام بخش نہیں، غلام یحییٰ تھا۔ عشقی نے انہیں حزیں کا شاگرد بتایا ہے، اور یہ روایت گلزار ابراہیم و خلیل تجارت معاش ہی کی تھی۔ عظیم آباد کا مشہور رئیس ہونا اور بچپن ہی سے شعر کہنا صاحب مضمون نے کہاں سے لکھا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

کلیم عجم مصنفہ جناب سیماب اکبرآبادی ص ۲۰ + ۸۰۰ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶، قیمت مجلد ۵ے
پتا۔ دار الاشاعت قصر الادب، آگرہ۔

جناب سیماب کا اپنے متعلق یہ دعویٰ کرنا۔

میں نے اس خوابیدہ عالم کو بنایا تھا کبھی   گرمیٔ محفل نتیجہ ہے مرے پیغام کا

ممکن ہے تعلّی پر مبنی سمجھا جائے لیکن اس عہد کے ممتاز غزل گو شعرا کی فہرست سے ان کا نام خارج نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم عجم ان کے دیوان غزلیات کا نام ہے۔ غزلیات کے ساتھ ۱۲ خطبے بھی شامل ہیں، جو مصنف نے مختلف مقامات صدر مجلس مشاعرہ کی حیثیت سے پڑھے۔ ۸۰۰ صفحوں میں ۱۶۰ صفحے ان خطبوں نے لے لیے ہیں، ۵۰ صفحوں میں مصنف نے اپنے حالات زندگی لکھے ہیں، اور باقی ماندہ صفحات میں غزلیں، تضمینیں وغیرہ ہیں۔ کلیم عجم میں جناب سیماب صرف شاعری کی حیثیت سے جلوہ گر نہیں، بلکہ مورخ ادب اردو اور نثار کی حیثیت سے بھی دنیا کے سامنے آئے ہیں۔ ہم ان تینوں حیثیتوں پر الگ الگ نظر ڈالیں گے۔

جناب سیماب کے یہ خطبات چودہ پندرہ برس کی مدت میں لکھے گئے ہیں۔ انہیں ان پر نظر ثانی کرنے کا کافی موقع ملا ہے، اور کتابی شکل میں ان کے جمع کرانے سے یہ پتا چلتا ہے کہ جناب سیماب کی رائے میں یہ خطبے وقتی ضرورت کے لیے نہیں لکھے گئے، بلکہ ادب میں مستقل درجہ رکھتے ہیں۔ ہم نے انہیں استفادے کی نیت سے پڑھا، لیکن ہمیں بہت سے ایسے بیانات ملے جنہیں پڑھ کر ہم حیران رہ گئے۔ یا تو جناب سیماب واقعی اس صدی کے محقق اعظم ہیں یا بہ حیثیت محقق ان کا مرتبہ صفر کے برابر۔ سرسری مطالعے میں جو باتیں ہماری نظر میں کھٹکیں۔ ہم ذیل میں انہیں درج کرتے ہیں۔ شکوک کا اظہار ہے، جو ہم نے اپنی موجودہ معلومات کی بنا پر کیا ہے۔ اگر جناب سیماب نے اپنے دعووں کی تائید میں ایسے ثبوت پیش کیے جو ہمیں مطمئن کر سکیں تو ہمیں اپنی رائے بدلنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

(۱) "منشی چندر بھان برہمن اکبرآبادی تھے"۔ ہمیشہ بہار کے مصنف کا بیان ہے کہ برہمن کا وطن لاہور تھا۔

(۲) "نواب لطف اللہ خان صادق وغیرہ شعرائے دہلی کے مطلع سخن کو چمکایا"۔ نواب لطف اللہ کا لقب 'خان صادق' تھا۔

صادق ان کا تخلص نہ تھا۔ اگر کسی کتاب میں شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر ہو تو اس کا نام بتایا جائے۔

(۳) "عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر آگرے ہی کی خاک سے اُٹھے" کیا مصنف کے نزدیک ان دونوں شاعروں کا زمانۂ پیدائش عالمگیر ثانی کا عہد حکومت ہے؟ یا ان کی مراد یہ ہے کہ عالمگیر ثانی کے عہد میں آگرے سے دہلی گئے؟ دونوں صورتوں میں انہیں ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ ہمارا موجودہ علم یہ ہے کہ یہ دونوں عہد عالمگیر ثانی کے بہت پہلے دہلی میں تھے اور آرزو نے بہت تھوڑا زمانہ عالمگیر ثانی کا پایا۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ آرزو کبھی عہدۂ قضا پر فائز رہے، اور نہ وہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔

(۴) آبرو کی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزرا اور وہ عہد عالمگیر ثانی کے بہت مشہور شاعر ہیں"۔ ممکن ہے کہ آبرو آگرے گئے ہوں، لیکن کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں۔ عمر کا زیادہ حصہ وہاں بسر کرنا تو بڑی بات ہے، ایک دن بھی وہاں گزارنے کا اگر ثبوت عنایت ہو تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔ معیار کے ایک مضمون میں خوشگو کے حوالے سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آبرو کا سال وفات ۱۱۴۶ھ ہے، یہ زمانہ محمد شاہ کا تھا، محمد شاہ ۱۱۶۱ھ میں مرے ہیں، ان کے بعد احمد شاہ کا زمانہ ہے، عالمگیر ثانی کا عہد حکومت احمد شاہ کے بعد آتا ہے، آبرو ان کے زمانے کے شاعر کیوں کر ہو سکتے ہیں! جناب سیاب کا قول صحیح ہو سکتا ہے، لیکن اس کی صرف دو صورتیں ہیں: یا تو وہ خوشگو کے قول کو غلط ٹھہرائیں، یا جمہور کے خلاف یہ ثابت کریں کہ ۱۱۴۶ھ میں عالمگیر ثانی ہندوستان کا بادشاہ تھا۔

(۵) میر باقر علی مخلص ایک گمنام شاعر ہیں، کم تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اصلی وطن ان کا اکبر آباد تھا، لیکن ممکن ہے کہ خود دہلی ہی میں پیدا ہوئے ہوں۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کس سند سے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ "عہد محمد شاہ میں مخلص نے نقل وطن کیا اور دہلی کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیے"۔

(۶) "پیام اُردو میں کمتر شعر کہتے تھے"۔ میر کا قول ہے کہ اُردو میں صاحب دیوان تھے۔

(۷) "میر تقی میر میر عبداللہ کے فرزند اور ہمشیر زادۂ آرزو تھے، آگرے میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم و تربیت پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا، اور پھر باپ کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے۔ دہلی میں آپ کا قیام زیادہ نہ رہا اور وہاں سے آپ لکھنؤ چلے گئے" ذکر میر سے ثابت ہے کہ میر کے والد کا نام محمد علی اور لقب محمد متقی تھا، آرزو کی بہن کے سوتیلے بیٹے تھے، ابتدائی تعلیم ضرور آگرے میں پائی، لیکن اس کے علاوہ سب کچھ دہلی میں سیکھا، شعر کہنے کا شوق انہیں سعادت امروہوی نے دلایا۔ دہلی میں ان کا قیام کم از کم چالیس سال رہا۔ اکبر آباد میں بارہ تیرہ اور لکھنؤ میں اٹھائیس انتیس برس۔ دہلی کے قیام کے متعلق یہ کہنا کہ "وہاں قیام زیادہ نہ رہا" عجیب بات ہے۔

(۸) "عارف اکبر آبادی اپنے دوست (میر تقی) کی مفارقت برداشت نہ کر سکے اور ترک وطن کر کے دہلی چلے گئے" عارف سے میر کے تعلقات دوستانہ ضرور تھے، لیکن کسی تذکرے میں یہ نہیں لکھا کہ ان دونوں میں آگرے ہی کی ملاقات تھی اور عارف کے ترک

وطن کا سبب میرکا آگرہ چھوڑنا تھا۔

(۹) "سودا کے شاگرد، قیشاہ نصیر۔" ہمیں تو یہ علم ہے کہ نصیر، مائل کے شاگرد تھے" اور مائل بعض تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق قائم (شاگرد سودا) کے تلامذہ میں تھے۔ قائم نے مخزن نکات میں مائل کو قدرت کا شاگرد لکھا ہے۔

(۱۰) "ابراہیم علی خاں ذوق دہلوی" ذوق کا نام محمد ابراہیم تھا، کسی تذکرے میں ابراہیم علی خاں نہیں۔

(۱۱) "ابن جوہ او رشعرا کے مصنف آبرو کے متعلق بھی لکھتے ہیں (ص ۱۲-۱۵) کہ یہ آگرے ہی میں پیدا ہوئے، آگرے ہی میں پروان چڑھے، یہیں تعلیم پائی" حالانکہ دوسری جگہ (ص ۱۲) ہو دلکھ چکے ہیں کہ آبرو کا مولد گوالیار تھا۔ ان دو متناقض بیانوں میں کسے قبول کیا جائے؟

(۱۲) "میرزا غالب۔ جب کوئی نئی غزل کہتے تو جب تک حقیر اکبرآبادی کو آگرے آکر نہ سنا دیتے، انہیں چین نہ آتا" میرزا نے ہزاروں غزلیں کہی ہیں، اگر یہ بیان صحیح ہے تو ہزاروں بار آگرے جانے کا اتفاق ہوا ہوگا۔

(۱۳) "یورپ کے متعلق بھی تحقیق ہو چکا ہے کہ وہاں سب سے پہلا شاعر چاسر تھا" چاسر یورپ کیا، انگلستان کا بھی پہلا شاعر نہیں۔ اگر جناب سیاب اس دعوی کو ثابت کر سکے تو کل ممالک یورپ کی ادبی تاریخ از سرِ نو لکھنی پڑے گی۔

(۱۴) "عروض خلیل بن احمد اور ابوالحسن اخفش عربی کی ایجاد ہے۔ جو بحریں اہل عرب نے ایجاد کیں ان کا اتباع فارسی شعرا نے بھی کیا، لیکن یوسف نیشاپوری اور بزرجمہر (کذا) وزیر نوشیرواں نے ان میں بعض تصرفات کیے اور بعض عربی بحریں ترک کر دیں" عجیب بیان ہے۔ مدرسے کے لڑکے بھی اس کی تردید کر سکتے ہیں۔

(۱۵) "معلقہ اور اخفش کے ادبی کارنامے" کیا معلقہ جناب سیاب کے نزدیک کسی شاعر یا ادیب کا نام ہے؟ عربی داں سے ایسی غلطی سرزد ہونا حیرت انگیز ہے۔ ص ۲۷

(۱۶) "انشا نے اردو شعر کی تقطیع کے لیے بعض اردو ارکان وضع کیے۔ مثلاً مفاعلین کے لیے پری خانم... وغیرہ۔ "خوش وقتی کے لیے نوابی دربار میں عروض انشائی کچھ عرصے تک جاری رہی" یہ لطیفہ انشا کی نہیں قتیل کی ہے اور سعادت علی خاں کے دربار میں مقبول ہوئی یا نامقبول، اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں، مصنف نے اپنے قیاس کو روایت کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔

(۱۷) حضرت سیاب نظیری کو بڑے فارسی گو شاعروں میں گنتے ہیں حالانکہ اس تخلص کا کوئی بڑا شاعر نہیں گزرا۔

(۱۸) شاہ مبارک آبرو کا سال وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔

(۱۹) آرزو کا سال ولادت ۱۱۰۳ھ لکھا ہے، یہ بھی صحیح نہیں۔ (تذکرۂ خوشگو)

(۲۰) مظہر کا سال وفات ۱۱۹۴ھ لکھا ہے، ۱۱۹۵ھ صحیح ہے۔ (کلیات منت)

(۲۱) حاتم کا سال وفات ۱۱۹۶ھ نہیں، ۱۱۹۷ھ ہے (عقد ثریا)

(۲۲) قائم کا سالِ وفات ۱۲۱۰ لکھا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں جس کا سالِ تکمیل ۱۲۰۹ھ ہے، ان کی وفات کا ذکر نہ کیا ہوتا۔

(۲۳) تاباں کا سالِ وفات ۱۲۱۱ لکھا ہے۔ نکات الشعرا کا سالِ تکمیل ۱۱۶۵ھ ہے اور اس کی تکمیل کے قبل ہی تاباں کا انتقال ہو چکا تھا، نکات الشعرا جناب سیاب کے ماخذوں میں ہے، اس کتاب کے مطالعے کے بعد تاباں کا سالِ وفات کیوں کر انہوں نے ۱۲۱۱ھ قرار دیا، بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔

(۲۴) میر سوز اور میر حسن کے سنینِ ولادت ۱۱۳۳ اور ۱۱۴۰ لکھے ہیں، یہ بھی صحیح نہیں۔

(۲۵) جرأت کا سالِ وفات ۱۲۲۵ نہیں ۱۲۲۴ھ ہے

(۲۶) مصحفی اور رنگین کے سنینِ ولادت غلط دیے ہیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ کل خطبات کا مطالعہ کر کے ان مقامات کا جو محلِ نظر ہیں، ذکر کریں، لیکن ایسے مقامات اس کثرت سے نکل رہے ہیں، کہ اگر ہم اپنے ارادے پر قائم رہتے تو تبصرہ بہت طویل ہو جاتا، اس لیے صفحہ ۶ پر ہم اپنے مطالعے کو ختم کرتے ہیں۔

حضرت سیاب داغ کے شاگرد، آگرے کے رہنے والے، ایک دبستانِ شاعری کے بانی، اور جیسا کہ ان کے خود نوشت حالات سے معلوم ہوتا ہے، عربی فارسی کے فاضل التحصیل عالم ہیں، توقع تھی کہ ان کی نثر میں اور خوبیاں ہوں یا نہ ہوں، زبان ضرور صحیح و فصیح ہوگی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس میں صرف استدلال کی کمزوری اور خیالات کی بے ربطی ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ غلط اور اجنبی الفاظ، تراکیب اور محاورات کی بھرمار ہے، مشتے نمونہ از خروارے، ذیل میں چند مثالیں دی جاتی ہیں کہ ناظرین کو ہمارے قول کی صحت کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) ص ۲ "صدارت کا اعزاز جناب چکبست کے لیے مقدر تھا، لیکن" - مجلس انتظامیہ نے بارِ صدارت میرے کاندھوں پر رکھ دیا۔ اگر صدارت چکبست کے لیے مقدر ہوتی تو حضرت سیاب صدر نہ بنتے

(۲) ص ۳ "شاعری صرف تفریحِ خاطر کا ایک ذریعۂ مسرور سمجھی گئی" ذریعہ کیونکر مسرور ہو سکتا ہے، سمجھ میں نہ آیا۔

(۳) ص ۴ عائدین جمع الجمع قاعدۂ عربی کے خلاف ہے اردو میں بھی ثقات احتراز کرتے ہیں۔

(۴) ص ۴ "وہ ہندوستان میں سب سے پہلے قومی شاعر تھے، جن کے رشحات شاعری کو خدائے سخن نے ایک نئی قوت بخشی" یہاں پر خدا کے لیے خدائے سخن، قطعی بے محل ہے۔ (۵) ص ۴ اثر کی جمع اثرات صحیح نہیں۔

(۶) ص ۵ "جب ہندوستان کو عروج حاصل تھا، تو شاعری کا عروج بھی نقطۂ کمال کی آخری حد پر نظر آتا تھا" نقطے کی آخری حد کیا ہوتی ہے؟ کیا جناب سیاب کے نزدیک نقطے کی تعریف جو اقلیدس نے کی ہے صحیح نہیں؟

(۷) ص ۵ "اب ہندوستان زوال کے خطِ انتہائی پر آ پہنچا ہے، تو ادبیاتِ شاعری بھی اسی نسبت سے انحطاط پذیر ہیں۔ جس وقت

ہندوستان کا ستارہ چمک رہا ہے اس وقت شاعری کا آفتاب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ ضوباری کر رہا ہے گا۔

(۸) ص ۶ "اگر وہ (یعنی کا نگریس) ذرا ہمت کرتے تو ہندوستان میں اسے آج بھی وائلڈ اور شیلی مل سکتے ہیں، اگر وہ آواز دے تو اس کو بھی گنگا اور جمنا کے کنارے سے جیسوں دیباچو اور بائرن اس کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں" ایک جگہ "تو شاعری کے انتہائی زوال کا ذکر ہے" اور دوسری جگہ یہ دعوٰی کہ ہندوستان میں آج بھی وائلڈ اور بائرن کے سے شعرا موجود ہیں۔

(۹) ص ۹ جلسے برفا۔ جلسے کی صفت رضا موزوں نہیں (۱۰) ص ۱۲ شرادگاہ مولد کے معنی میں صحیح نہیں۔

(۱۱) ص ۱۵ "میں نے جو کچھ کہا ہے میں اسے تحقیقی نقطہ نظر یقین کرتا ہوں" نقطۂ نظر کا یہ استعمال محل نظر ہے۔

(۱۲) ص ۲۲ "مرزا غالب آج بھی ہندوستان کے ادبی معیار کا آخری نقطۂ نگاہ ہیں" یہاں نقطۂ نگاہ کا استعمال صحیح نہیں۔

(۱۳) ص ۲۵ "ہم اپنا محاذ شاعری واقعات و حادثات عالم کے دوش بدوش قائم کریں" محاذ شاعری کا کیا مطلب ہے؟

(۱۴) ص ۲۵ "جب کوئی سانحہ شرکیہ وقت ہو" یہ الفاظ جناب سیماب کے خیال کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔

(۱۵) ص ۲۶ "دلی کے کلام میں ۔۔۔ قدامت الفاظ باقی رہی، تاہم اس کے مشق یافتہ قلم سے بعض اشعار ایسے بھی نکل گئے جو اگر آج کہے جاتے تو غالباً ان میں کسی مزید تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی" ایک تو قلم کی صفت "مشق یافتہ" عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ لفظ مزید بالکل بیکار ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ پہلے بھی تغیر ہو چکا ہے حالانکہ مصنف کا یہ مدعا نہیں

(۱۶) ص ۲۱ "عالم غیر دلچسپ" ص ۲۲ "خیالات پیدائی" عجیب ترکیبیں ہیں۔ (۱۷) صوفیانی جذبہ "صوفیانی" نہ عربی ہے نہ فارسی نہ اردو۔

(۱۸) ص ۲۵ "کیا ہندوستان کا سواد شعر نگار نہیں" مولوی کیوں کر شعر نگار ہو سکتا ہے سمجھ میں نہ آیا۔

(۱۹) ص ۲۵ "ماحولی خصوصیات" ماحولی اگر صحیح بھی ہو تو کانوں کو بہت برا معلوم ہوتا۔

(۲۰) ص ۳۴ "تبدیلی فضا" صحیح نہیں

(۲۱) ص ۳۸ "موانع" کی جمع الجمع موانعات غلط ہے۔ (۲۲) محاورے کی جگہ "تقاد" فصحا کی زبان پر نہیں ص ۴۸۔

(۲۳) ص ۴۹ "پیغام" کی جمع پیغامات غلط ہے۔ (۲۴) ص ۵۲ "پیکر ذہنی" غلط العام کے تحت نہیں آ سکتا۔

(۲۵) ص ۵۰ "وہ اشعار جو استاد ایام سے ارژنگ سخن میں پیدا ہو چکا ہے۔ منظم و مرتب ہو جائے" انتشار بدل بہ تنظیم و ترتیب ہو سکتا ہے لیکن منظم و مرتب نہیں ہو سکتا۔

(۲۶) ص ۸۸ "تشہیر لسانی" کلیم "شہرت دادن رسوائی کے راہیاں کر کے را بر خر سوار کردہ بہ شہر گردانیدن"

(۲۷) حضرت سیماب کی زبان پر لفظ "قلم کار" نویسندہ کے معنی میں ہے، اس کی سند عنایت ہو۔

(۲۸) "مشعلہ" پڑھنا فصحا کی زبان نہیں "مجلس پڑھنا" صحیح ہے لیکن محاورے میں قیاس کو دخل نہیں،

حضرت سیماب کی اکثر کتب بدون کی نظم [illegible] کی نغمستان کی طرف آتا ہے، جہاں سبزہ بھی ہے، آب رواں بھی ہے اور ساعد و اور درخت بھی ہیں، لیکن نظم کا تبصرہ ہم آئندہ کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار

ہماری انجمن مرکزی انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی شاخ ہے۔ ہمیں اس کی اجازت ہے کہ ہم صوبہ بہار میں اپنی شاخیں قائم کریں۔ ناگپور میں حال ہی میں بھارتیا ساہتیا پرشد کا جلسہ ہوا تھا، جس میں گاندھی جی نے اپنی عجیب و غریب ذہنیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے متعلق عبدالحق صاحب کا ایک مضمون مئی کے معیار میں چھپا ہے۔ ناظرین اس مضمون کو غور سے پڑھیں۔ اب ہمیں اردو کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ اور ہندوستان کے ہر شہر بلکہ ہر قصبے میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کرکے اس کے مقاصد کی تکمیل کرنی چاہیے۔ صوبہ بہار میں جو شاخیں قائم ہوں، وہ ہمارے پاس منظوری کی درخواست بھیجیں۔ عدالتوں میں اردو رسم خط کو رائج کرنے کے لیے ہماری انجمن عنقریب ایک عملی تجویز پیش کرے گی۔ امید ہے کہ ہمدردان اردو ہماری معاونت کریں گے۔

"معتمد"

دیوان جوشش! دیوان جوشش!

عنقریب شائع ہو جائیگا

جوشش عظیم آباد کا نامور شاعر ہے۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ دنیا میں موجود ہے، جسے ہم نے بڑی کوشش سے حاصل کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کا ایک ناقدانہ نسخہ مرتب کرایا ہے، جس میں جوشش کے حالات کے علاوہ، اس کے بھائی محمد عابد دل کے حالات بھی ہوں گے۔ دیوان کی چھپائی شروع کرا دی گئی ہے۔ فہرست خریداری میں بہت جلد اپنا نام درج کرا لیجیے۔ جن حضرات کی درخواستیں ۱۵ جولائی تک آ جائیں گی، ان سے قیمت ۲۵ فی صدی کم لی جائے گی۔ رعایتی قیمت کے لیے آخری تاریخ ۳۰ اپریل مقرر کی گئی تھی، مگر شائقین کلام جوشش کے اصرار سے ۱۵ جولائی تک درخواستیں بھیجنے کا موقع دیا گیا ہے۔ قیمت عہ کے قریب ہوگی۔

منتظم معیار، بانکی پور (پٹنہ)

مطبوعات شاد بک ڈپو

مثنوی ماہ و مہر ۔ اس وقت تک جتنی مثنویاں تصنیف ہوئی ہیں ان میں سے کسی کا تعلق موجودہ سیاست سے نہیں لہٰذا یہی ایک مثنوی ہے جو ایسے اہم موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اور وہ بھی شاد عظیم آبادی مرحوم جیسے شاعر کے قلم سے۔ مزید براں مولانا نیاب اکبرآبادی اور حضرت رشید صدیقی جیسے ادیبوں کے مقدمے بھی شامل ہیں ص ۱۹۹ قیمت صرف ۱۲ر

فکر بلیغ ۔ مصنفہ شاد عظیم آبادی - اس کتاب کو ایک مرتبہ پڑھیے اور نکات شاعری سے واقف ہوجائیے ۔ شعر و سخن کا مذاق رکھنے والے حضرات ضرور منگوائیں ۔ سائز ۲۰×۲۶ ص ۱۴۰ قیمت ۸ر

ظہور رحمت ۔ یہ چھوٹی سی کتاب ڈیڑھ سو صفحات کا مجموعہ ہے جس میں حسب ذیل مضامین ہیں (۱) بیان ولادت (۲) معراج (۳) شبیہ مبارک (۴) آپ کے آنے کی ضرورت (۵) حالات بلوغ (۶) طلب معرفت (۷) آپ کا مرتبہ (۸) آپ کا اخلاق۔

داستان عجم ۔ ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی مصنف مغل اور اردو کی زندگی کا آخری کارنامہ جس میں شاہنامۂ فردوسی پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تعارف اور حضرت عباس شوستری کے مقدمے بھی ہیں۔ ص ۱۱۱۔ اس عدیم المثال تصنیف کی قیمت صرف (عہ) ایک روپیہ۔

شاد بک ڈپو چو گھڑا، پٹنہ سیٹی

معذرت

برقی مشین پریس کی مشین ٹوٹ جانے کی وجہ سے مئی کے پرچے کی اشاعت میں بہت دیر ہوئی اور ہمیں مجبوراً برقی پریس سبزی باغ میں رسالہ چھپوانا پڑا۔ امید ہے کہ جون کا پرچہ جون ہی میں شائع ہوجائے گا۔ اب سے معیار ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا کیوں کہ اس طرح ہمیں رسائل کے خلاصے اور ادبی خبریں مرتب کرنے میں آسانی ہوگی۔

"منتظم معیار"

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کا ادبی رسالہ

معیار

مرتب
قاضی عبدالودود

بانکی پور (پٹنہ)

معاون
آرزو جلیلی

جلد ۱ شمارہ ۴ | فہرست | جون ۱۹۳۶ء

شمار		صفحہ	شمار		صفحہ
۱	معروضات ۔ از ق ع و	۲۵۰	۷	محاکمہ سال وفات نجف خاں، سال آغاز تذکرۂ مصحفی و تصحیح دیوان معروف از ق ع و	۲۶۲
۲	اتفاقات	۲۵۰			
۳	آشنا، ادیب ۔ مثنوی در وصف قصر جواہر از امیر حسن	۲۵۱	۸	ہماری زبان ۔ از سید رضا قاسم تمنا و ق ع و	۲۶۴
۴	صوبۂ بہار ۔ رباعی از شیخ علی حزیں	۲۵۴	۹	عالم ادب	۲۶۹
۵	مراسلت صوبہ بہار میں قلمی کتابوں کے ذخیرے از سید حسن عسکری صاحب ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج	۲۵۵	۱۰	مطبوعات جدیدہ، سالنامۂ شاہکار سالنامۂ مساوات، افسانہ تبر اور چند دیدۂ حیرت از بیتدی	۲۷۰
۶	۱۹۳۵ء کے ادبی مضامین	۲۵۸			

تصحیح: (ہوی، بوسیا طلبیے، دیجیے، چاہیے میں ہمزہ نہیں اگر ہو تو کاتب کی غلطی ہے) [illegible] ہندوں، ہندوؤں۔ [illegible] ہوئی، نہیں ہوئی [illegible] بچا۔ بجا [illegible] مشہ۔ مشہ [illegible] خاطر ہے ان۔ ماحضر ہے یا [illegible] الدوا۔ الدولہ [illegible] نزع۔ ریز [illegible] اردو۔ اور [illegible] ہم کو۔ مجھے [illegible] نشان گمان۔ سان گمان [illegible] دوری۔ دوری [illegible] ہے۔ صوبے [illegible] کی۔ کے [illegible] جانا۔ جا [illegible] دیکریں۔ دیر [illegible] جسے۔ جیسے [illegible] طبیعات۔ طبیعیات [illegible] اونٹوں۔ انھوں [illegible] تیزابہ۔ تزاید۔ اشتداد [illegible] دل آیا۔ دل آرا [illegible] اشد۔ مشہ [illegible] ۔ [illegible] کرتے تھے۔ کرتا تھا [illegible] اس۔ اس [illegible] اور۔ انھیں [illegible] زملتے۔ زملتے تھے [illegible] مقابل۔ مقابلے [illegible] غیدر یہ۔ حیدریہ [illegible] بات۔ زبان [illegible] طریقہ۔ طریقے [illegible] ذریعہ۔ ذریعے [illegible] جذبہ۔ جذبے [illegible] سیم۔ سیم [illegible] صاحت۔ صاحت [illegible] الاطلاق۔ الا [illegible] زبان۔ زبان سے [illegible] قدرت۔ قدر [illegible] جز۔ جزو [illegible] کرائیوں۔ کرائیوں [illegible] معوجہ۔ [illegible] نقیہ۔ قصہ [illegible] حسین۔ حسنی [illegible] یہ۔ یہ [illegible] ہاں۔ جان بیگی [illegible] جلال [illegible] اقعی۔ قطعی [illegible] کرہی۔ کر [illegible] مقامات۔ مقامات میں۔

شمار کی بہ کمائیں ہندوؤں کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ [illegible]
[illegible] چھپیے۔

معروضات

اردو کو اس کے مخالفین کے حملوں سے بچانے، اسے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے حامیان اردو کا منظم ہونا ضروری ہے۔ تنظیم کس اصول پر مبنی ہو اس کے متعلق ہم اپنی رائے درج ذیل کرتے ہیں:-

(۱) انجمن ترقی اردو کو مرکزی انجمن قرار دینا چاہیے۔ جو انجمنیں اردو کی خدمت کے لیے اس وقت قائم ہیں، ان میں سب سے زیادہ خدمات اسی کی ہیں۔ اور سب سے پرانی بھی ہے۔ کسی نئی انجمن کی بنیاد ڈالنے کی قطعی ضرورت نہیں۔

(۲) ہر صوبے میں اس کی شاخ ہونی چاہیے۔ اس وقت جو انجمنیں قائم ہیں، ان کا مرکزی انجمن سے الحاق لازمی ہے۔ ہم نے بڑی مسرت کے ساتھ جانا کہ ان میں یہ خبر دیکھی کہ لاہور میں بشیر احمد صاحب سرگرم حامی اردو کی کوششوں سے ایک انجمن "انجمن اردو پنجاب" کے نام سے قائم ہوئی ہے۔ اس کے مقاصد سے ہمیں بالکل اتفاق ہے اور ہم اس کی کامیابی کے دل سے خواہاں ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ اس انجمن کو انجمن ترقی اردو سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ ناممکن ہے کہ بشیر احمد صاحب جو اس انجمن کے مدح خواں ہیں، مرکزی انجمن سے وابستہ ہونے کے فوائد سے آگاہ نہ ہوں۔ یہ بھی قیاس میں نہیں آتا کہ انہوں نے اپنی انجمن کو بالارادہ انجمن ترقی اردو سے بے تعلق رکھنا چاہا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ محض بے پروائی سے ایسا ہوا ہے اور کارکنان انجمن بہت جلد تو اعد میں لے کے انجمن ترقی اردو سے اس انجمن کا الحاق کرائیں گے۔

(۳) صوبے کی انجمنیں شہروں اور قصبوں میں اپنی شاخیں قائم کریں۔

(۴) انجمن ترقی اردو کو جلد سے جلد کسی مرکزی مقام پر منتخب اشخاص کی ایک کانفرنس منعقد کرنی چاہیے جو من جملہ اور باتوں کے امور ذیل پر غور کرے:- ۱ کیا اردو کا نام ہندوستانی رکھنا چاہیے؟ ۲ اردو، ہندی دو زبانیں ہیں یا ایک؟ اگر دو ہیں تو شمالی ہند میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو گی یا ہندی، عدالتوں اور سرکاری دفتروں کی زبان کون سی ہو گی؟ ۳ حامیان ہندی کی یہ کوشش کہ ہندی انگریزی کی جگہ لے، اس کے متعلق حامیان اردو کا کیا طرز عمل ہونا چاہیے۔ ۴ ایسے صوبوں میں جہاں کی مادری زبان اردو نہیں، اردو کی کیا حیثیت ہونی چاہیے؟ ۵ کیا اردو میں فارسی عربی کے الفاظ بہت زیادہ، اور سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ بہت کم ہیں؟ ۶ کیا اردو کے رسم خط کو آسان بنانے کی ضرورت ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟

تعارف

حسن کی مثنوی کلیات میں بہت غلط لکھی ہوئی ہے، قیاسی تصحیح میں جو مدد جناب خیال سے ملی، اس کے ہم نہایت ممنون ہیں۔ تعمیر جواہر، جواہر علی خان خواجہ سرا ناظر بہو بیگم کی ملک تھا۔ حزین کی رباعی ایک قدیم بیاض سے ماخوذ ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔ بیج نرائن، رام نرائن موزوں کے بھائی تھے۔

آثارِ ادبیہ

مثنوی میر حسن در وصفِ قصرِ جواہر

حمد و ثنائے خالقِ دنیا و دیں
و ثنائے صانعِ دیوانِ عرشِ بریں
ثنا پہلے اس خالقِ پاک کو
دیا جس نے رتبہ کفِ خاک کو
اُسی خاک سے خلقِ عالم کیا
ہوا کر کے دَم اُس میں آدم کیا
پھر آدم کی خاطر بنایا جہاں
عدم اور ہستی دو رو یہ مکاں
رکھی شرق سے غرب تک اک بنا
سراسر شمال خطِ استوا
بنا اس پہ پھر گنبدِ آسماں
احاطے میں اس کے دیا سب جہاں
عناصر کی جو کر اینٹیں لگا
زمانے کا ایوان برپا کیا
کیے برج پھر اس میں بارہ عیاں
لگا پیش رو ابر کا آسماں
شفق سے اس ایواں کو رنگیں کیا
طلائے شعاعی سے زرّیں کیا
کیے بر سرِ بام و سقف و جدار
خیالاتِ عالم سے نقش و نگار
کیا کہکشاں کا جو طاق انتخاب
دیا اس کو قوسِ قزح نے جواب
بنا جب یہ دالانِ عالی مکاں
رکھے مہر و مہ اس میں دو تابداں
زرافشان انجم کا ابرک لگا
سفیدی سے دی مہر و مہ کی جِلا
ہوا جب یہ ایوان کرسی نشیں
قرینوں سے تب سب میں بانٹی زمیں
رکھی وسعتِ صحن لا انتہا
ازل اور ابد بیچ میں کر لیا
عجب طور کھینچا سن لے آڑی کا طول
...... اس کا سب عرض و طول
کیا مخملِ اطلسی اس میں فرش
لگا دامنِ خاک سے تا بہ عرش
شب و روز آدمی ہیں اک فرشِ راہ
بہ رنگِ گلیم سفید و سیاہ
ہے سجدے کے لائق وہ یزدانِ پاک
میں صنعت گری پر ہوں اسی کی ہلاک
اسی نے دیا عقل کو یاں علاج
کہ پایا عمارت نے جس سے رواج
یہ کرنی اسی کی ہے اور کس کا کام
یہاں موم ہے کارِ سنگ و رخام
کرے کون ایجادِ بے ستوں
یہاں تیشۂ عقل ہے سرنگوں
بجا ہے جو حیران بنائے فہم
کہ اس دستکاری کو کب پائے فہم
مگر فہم میں یہ ہی آتا ہے یاں
کہ احمد کی خاطر بنا یہ مکاں

در نعت حضرت سید المرسلین

بیا ساقیا مے پرستی کنیم
محمد بگوئیم و مستی کنیم
محمدؐ ہے وہ صاحبِ دوسرا
نہیں دوسرا کوئی ایسا ہوا
خداوند معراج و لولاک ہے
سمجھ بات گر تجھ میں ادراک ہے
ہے لازم مکاں کو مکیں چاہیے
کہ انگشتری پہ نگیں چاہیے
مدینہ ہے وہ علم کا جانِ پاک
خدا اس کے در پہ کرے ہم کو خاک

در منقبت شیرِ حرم کبریا مصداق

انا مدینۃ العلم و علی بابہا

وہ اُس کا ہے در جو علی ولی
وہ ہے شیرِ حق اور وصیِ نبی

رسائی ہے اس گھر میں اس کے سبب
بجز صاحب سیدہ کوئی پہنچے کب
وہ ہے رشک تسنیم مقامِ نبی
کہ جس سے ہوئی آل کے بارہ وری
وہ ہے قبۂ نور دار السلام
درود اس گھر پہ ہو صبح و شام
تصدق ہوں میں بر سر اہل بیت
میں دل سے ہوں خاکِ رہِ اہل بیت
اسی دہ کا ہوں میں ازل سے فقیر
ہے ایماں مرا قولِ سعدی پیر
خدایا بحق بنی فاطمہ
کہ بر قول ایمان کنی خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول
من و دست و دامانِ آلِ رسول

ساقی نامہ

پلا ساقی بھر کر وہ جامِ شراب
کہ جس سے طاعت کے ہو جس میں آب
کہ مستی مری شرع کے ساتھ ہے
مرا دین و ایماں ترے ہاتھ ہے
تو ہی جب علیؑ کی خاطر من
کیا حق نے ظاہر زمین و زمن
بنا جب یہ قصرِ زمرد سرشت
بنے مکاں جس میں رشکِ بہشت
مشغول صناعِ قصرِ جواہر نگار
لکھے اس کو آباد پروردگار
نمونہ بہشتِ بریں کا ہے یہ
محل و مکاں نورِ نبیں کا ہے یہ
کہوں کس زباں سے میں اس کی ثنا
جو دیکھے سو جانے کہ ہے مسکنِ علی
شروع اس مکاں در دروازۂ عالی شان
لکھے اس کا نقشہ ہے کرنا رقم
سرے سے اُٹھاؤں ستونِ قلم
وہ دروازۂ قصرِ عالی مکاں
رہے جس کے سایے میں سارا مکاں
اگر آئے گیتا ہی واں منفعل
جہاں اس کو دیکھے تو کھل جائے دل
در دل سے از بس وہ ہم راز ہے
اسی سے در عیش یاں باز ہے
ہر اک اس کا حلقہ ہے چشم بتاں
ہر اک زلف ہے کاکلِ مہوشاں
سرافرازیوں کا رسالہ ہے وہ
بلندی کے عالم سے بالا ہے وہ
بلند اس سے کوئی نہ ہوگا مکاں
زمیں اس کی ہے ہمسرِ آسماں
چڑھے جو کوئی اس کے بالائے بام
کرے زیر سایے جو بنگلا تمام
عجب طرح کا باغچہ ہے وہ خوش فضا
کہ آتی ہے جنت کی اس میں ہوا
اور اک قطعہ گلشن کی اس میں دیکھیں میں اور
جو دیکھا اسے کھول کر چشمِ غور
جہاں تک کہ حجرے ہیں سرکار کے
وہ رہتے ہیں حجروں میں اس کے بھرے
یہ وسعت کہ دل کی یہ وسعت نہ ہو
کسی جا میں ایسی فراغت نہ ہو
یہ وہ جا ہے کان زر فیض بخش
کہ ہر در ہے اس کا در فیض بخش
رہے چشمِ بد دور اس سے سدا
کہ ہے شیعیانِ علیؑ کی دعا

ساقی نامہ

نہ کرے کے دینے میں ساقی قصور
کہ ہے قصر کی مدح اس کے ضرور
پلا مجھ کو صہبائے الفت کا جام
کہ ہے دل میں ساقیِ کوثر کا نام
عجب قصر دیکھا میں وہ پرشکوہ
کہ مستحکمی اس کی مانند کوہ
مربع، مسطح، مصفیٰ تمام
نگیں کی طرح خوش نما وہ مقام
ہوا اس کی شرحِ بیان نشاط
فضا اس کی طرحِ زمانِ نشاط
فلک سے زمیں اس کی ہم داستاں
کفِ خاک در جبہ راستاں
صفا گچ کی رشکِ صفائے گہر
چمک برق ابرک سے براق تر
کدورت سے ہونا وہاں کا بری
کہے تو چنبیلی کی جیسے کلی

ہے افشاں ابرک سے اس پر بلا
سراسر ہے موتی کا چونا لگا

ہے سرخی کی جا سرخیِ لعل واں
ہو شرمندہ جس سے لبِ گلرخاں

نظر کو نہ ہو وقتِ نظارہ تاب
بھر آتے ہے سورج کی آنکھوں میں آب

وہ ایواں پُر از طاق و محرابِ طاق
کہ ابرو نما دل ربائی میں طاق

پر از طاق واں کا جو ایوان ہے
نظر میں ہلالی کا دیوان ہے

وہ کرسی بلند اور وہ شہ نشیں
منقش گل و غنچہ اس کے یہ گلہائے چیں

وہ پردوں کی سرخی کہ لالہ ہو داغ
وہ سبزی چقوں کی کہ ہو سبز باغ

ادھر دیکھیے یا اُدھر دیکھیے
مرقع کا عالم جدھر دیکھیے

ہے بارہ دری ایک واں غرق زر
منور ہے جوں عارضِ نیک خو

کہ ہے صبح اس آستاں کو مدام
تفاوت سے خورشید اٹھ کر سلام

وہ سرخ اس کے آگے لگا سائباں
شفق جوں فلک پر ہو جلوہ کناں

بلندی میں وہ سائباں جوں سحاب
ہے قوسِ قزح اس کی رنگیں طناب

وہ استادے دو زریں بیش و بسیار
کہ جیسے دو بازوئے دستِ نگار

ہے اک حوض اس سائباں کے تلے
کہ پانی ہے اس میں کمر یا گلے

لبالب سبھی ہو وہ آئینہ وار
ہے عکسِ عمارت سے اس میں بہار

خوشا چاہ وہ جس سے ہو اس میں آب
ہر جا ہو چشمہ یہ دریا کا ناب

ہے بنگلا بھی جو ہیں وہاں ایک سو
کسی کا ہے گویا دلِ نیک خو

وہ بنگلا کہے تہ بنگلے کا دل
کنول کی طرح جس سے دل جائے کھل

ہے اک دست چپ اور بارہ دری
کہ در ہے ہر اک اس کا چشمِ پری

دورویہ وہ ایواں ہے فرخندہ فال
ادھر کو جنوب اور ادھر کو شمال

لگے واں ستونوں میں آئینے سب
وہ دالان گویا ہے شہرِ حلب

درخشندہ یا ہم مہ و مشتری
خرامندہ عکس اس میں کبکِ دری

ان آئینوں میں ہے سماں جلوہ گر
ادھر کا ادھر اور ادھر کا ادھر

ہر اک اس کے جلوے سے دیوانہ ہے
وہ آئینہ گویا پری خانہ ہے

وہاں عکس جس کا نمودار ہے
وہ حیرت سے بس نقشِ دیوار ہے

ہے اس آئینے سے دلِ شمع داغ
کہ ہے ہر ستونوں کا وہ چشمِ چراغ

مقابل بہم آئینے دو طرف
قرانِ دو اختر بہ بیت الشرف

ستون سرو آئینہ آب چمن
نظر اس کے قمری و بلبل سخن

مثالِ ستوں جو کہ ہیں راست باز
انھوں کے قدم پر ہے چشمِ نیاز

کہ ہے جب کہ فوارہ گردن بلند
اور آئینے میں عکس اس کا ہو بند

ہے اس وقت منعقد تماشا یہ کھف
کہ ساتھ اس بزرگی کے در تحف

وہ نقطہ یہ آئینہ ہے یاں کہ بس
ستوں کے الف کو کیا اس نے دس

در مدح پایئں باغ

ادھر پایئں باغ اس کے زیرِ قدم
ادھر وہ عمارات رشکِ ارم

کہوں باغ پایئں کا کیا میں بیاں
حنا جیسے ہو زیرِ پائے بتاں

وہ ایواں کا روشن ہو یاں تک جمال
کہ ہے کوکبِ قطب اس کا خال

ہوا ہو جیسے باغ و گلزار کی
ہے اینٹ ہر اک اس کی دیوار کی

گھٹا ہے نت جو برستی ہے رحمت کی واں
نہیں نام کو گرد کلفت کی واں

بجانب وہاں صحن سے جہاں تک | ہوا ایسی رطوبت ہے وہاں اس قدر | یہ ستھرائی اور یہ صفائی کہیں
دم عیسوی ہے جہاں کی ہوا | کہ ہے دھوپ میں چاندنی کا اثر | کسی صحن کی ہم نے دیکھی نہیں
گل نرگسی کہ ہے اس جا نمود | نہیں بات کچھ میری یاں بے محل | ہے صحن صفے بدن حور کا
شگفتہ ہیں گل مثل عشرت سرور | یہ سب ہے صاف اس میں آئینہ ہے مثل | سدا وقت رہتا یہ ہیں نور کا

منور ہے از بس کہ دیوار و در | برابر ہے اس جا پہ شام و سحر
ہے پتھر پسینا بھی واں ایک صاف | نظر گر نہ ٹھہرے تو رکھیو معاف

[illegible] قلمی نسخہ ق، ن میں [illegible] اور [illegible] دونوں میں [illegible] ق رنگیں بجائے زریں [illegible] ق دندارہ [illegible] ق کی جگہ [illegible] ق کی جگہ [illegible] ق [illegible] کی جگہ شو ... دوسرا مصرع جناب خیال کی رائے میں اس طرح ہو سکتا ہے [illegible] کیا اس کا سب [illegible] اونی کی جگہ دونوں ہو سکتا ہے یہ مصرع مرجع [illegible] اور لفظ ہے [illegible] ق کروں بجائے کرے [illegible] ق میں فہم اور وہم دونوں ہے [illegible] یہ بیاض میں نہیں قیاسی اضافہ [illegible] ق یہاں وہیں [illegible] ق میں [illegible] کی جگہ [illegible] ق [illegible] آنے کیا ہے وہاں مستعمل [illegible] ق میں اک نمارہ [illegible] ق میں اس کے [illegible] ق ال بجائے [illegible] ق [illegible] بجائے [illegible] ق آستاں بجائے راستاں [illegible] ق کی دندارہ [illegible] ق برق بجائے براق [illegible] ق سرخی کی جگہ صرف [illegible] [illegible] ق رنگ بجائے لب [illegible] ق گل بجائے گل [illegible] ق میں اسی طرح ہے [illegible] ق سا بجائے ساں [illegible] ق میں اسی طرح ہے [illegible] ق میں اسی طرح ہے [illegible] ؟ [illegible] ق، حال بجائے خیال [illegible] ق بت بجائے نت [illegible] مرجع غلط ہے جناب خیال کی رائے میں یوں ہوگا [illegible] یہاں گل عشرت و عیش و سرور [illegible] ق ہوائے رطوبت بجائے ہوا ایں رطوبت [illegible] ق نہیں بجائے یہ میں [illegible] ق جس بجائے اس [illegible] ق [illegible] بجائے صفائی۔

صوبہ بہار

رباعی شیخ علی حزیں

پیوستہ ز اہلال سخن راست بار | دستی نگہبان شوخ دو راست بار
در شہر عظیم زمین خواستہ | آرام تخلص است آرامت باد

یہ رباعی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی ایک قلمی بیاض میں جو بعہد عالمگیر ثانی کی لکھی ہوئی ہے اس کے متعلق یہ عبارت بھی درج ہے رباعی کہ ... [illegible] تخلص [illegible] برادر راجا رام نرائن صوبہ دار عظیم آباد ارشاد فرمودہ بودند۔

مراسلت

صوبہ بہار میں قلمی کتابوں کے ذخیرے

جناب مدیر معیار تسلیم

رسالہ معیار سے علمی اور ادبی خدمات کی توقع ہے، اُس کی بنا پر سطور ذیل کے ذریعے سے ناظرین کی توجہ صوبہ بہار کے چند علمی خزانوں کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بہار کو کتب خانہ مشرقی پٹنہ پر بجا ناز ہے، لیکن اس نادر کتب خانہ کے علاوہ بھی بعض لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں بیش بہا مخطوطات گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ علمی ذخیرے بے توجہی کے باعث کیڑوں کی نذر ہوئے جا رہے ہیں۔

جب انڈین ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن کا اجلاس ۱۹۳۰ء میں پٹنے میں منعقد ہوا تو مجھے قدیم کتب تواریخ کی جستجو میں صوبے کے مختلف مقامات کی سیر کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں، راے سلطان بہادر کے تباہ حال کتب خانے کو دیکھنے کا موقع ملا، جو دیوان محلہ پٹنہ سیٹی میں ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر سوبی ل چند رسرکار صدر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج، پروفیسر کالی کنکر دت، اور راقم الحروف نے تین دن کی محنت کے بعد کئی قدیم مخطوطات، اس علمی ذخیرے سے منتخب کیے۔ لیکن ہمیں اجازت نہ ملی کہ انھیں تاریخی نمائش میں پیش کریں۔ محلہ ہر مندر، پٹنہ سیٹی میں ایک ہندو بھائی کے پاس قلمی کتابوں کا ذخیرہ ملا، جسے انھوں نے بہ وقت تمام ہمیں دیکھنے دیا۔ اگر ان علمی ذخیروں کی حفاظت نہ کی گئی تو یہ بہت جلد ضائع ہو جائیں گے۔ پٹنے کے علاوہ، گیا اور آرہ کے اضلاع میں بھی چند نادر الوجود نسخے موجود ہیں۔ گیا میں منو لال صاحب کا ذاتی کتب خانہ نادر روزگار مخطوطات سے مالا مال ہے۔

مذکورۃ الصدر تاریخی نمائش کی مجمل فہرست، جسے مطبع حکومت ہند کلکتہ نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے مطالعے سے صوبے کی علمی دولت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس فہرست میں ۹۴۱ سے ۱۲۶۴ تک کی جو کتابیں، وصلیاں اور مخطوطات ہیں، وہ دیوان ناصر علی مرحوم کے وقفی کتب خانے سے حاصل کیے گئے تھے یہ کتب خانہ، کھجوا ضلع سارن میں بہ حالت تباہ موجود ہے۔ اس مردم خیز بستی کو شہنشاہ عالمگیر نے ایک سیدہ کو "بہ تصدق فرق مبارک" بہ طور معافی مدد معاش عطا فرمایا تھا۔ دیوان سید ناصر علی انھیں سیدہ کی اولاد سے تھے۔ اور شاہ عالم ثانی کے ہم عصر تھے جیسا ان کی مہر اور عالی شان عمارتوں کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے۔ موصوف نے لاکھوں کی جائداد چھوڑی جس میں اٹھارہ ہزار سالانہ کا وقف بھی شامل ہے۔ موصوف نے اپنے وصیت نامے میں جو فارسی میں ہے، سب سے محبوب چیز جسے وقف کیا ہے وہ کتب خانہ ہے جس میں شاہی کتب خانوں کے چند مخطوطات ابھی تک موجود ہیں۔ دیوان موصوف نے وصیت نامے میں اپنے اخلاف سے بار بار تاکید

کی ہے کہ کتب خانے کے تحفظ اور اس کی بقا کا سامان کریں۔ افسوس یہ ہے کہ گو موصوف کی اولاد میں فرسٹ کلاس۔ ایم ایس سی۔ انگلستان کے تعلیم یافتہ گریجویٹ، ڈپٹی مجسٹریٹ، اور سابق ایم ایل سی بھی ہیں لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے جد اعلیٰ کی وصیت نامے کی سب سے اہم ہدایت پر عمل کریں۔

دیوان ناصر علی کے کتب خانے سے چند کتابیں بطور مشتے نمونہ از خروارے، تاریخی نمائش میں لائی گئی تھیں۔ تاریخی نمائش کی فہرست کے مطالعے سے ان کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مرتب نے چند ضروری باتیں نظر انداز کر دی ہیں، بلکہ کہیں کہیں حقیقت سے بھی دور پڑ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر فہرست مذکورہ کے صفحات ۴۷، ۴۸، ملاحظہ ہوں:

(۱) مخطوط نمبر ۶۴۳، دیوان ہمایوں کے لیے صرف دو الفاظ "منقش" اور "خوش خط" کافی سمجھے گئے۔ حالانکہ بقول مسٹر ہالک، بیرسٹر پٹنہ اس دیوان میں جو نقاشی ہے، وہ سولھویں صدی عیسوی کے کشمیر آرٹ کا نمونہ ہے۔ مسٹر ہالک مغل آرٹ کے ماہر ہیں اور ان کے پاس مغل آرٹ کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ تاریخی نمائش کی فہرست سے دیوان ہمایوں کی اہمیت نہیں ظاہر ہوتی۔ دیوان ہمایوں کا یہ واحد نسخہ ہے جو دیوان ناصر علی کے کتب خانے میں ہے۔ کتب خانۂ مشرقی کے دیوان کا مصنف ہمایوں اسفرائینی ہے، اور دیوان موصوف کے کتب خانۂ قلمی کے دیوان کا مصنف کا [illegible] بھائی اور ہندوستان کے سب سے بڑے بادشاہ کا باپ ہمایوں ہے۔

(۲) مخطوط نمبر ۶۴۲، "دلکشا" کے متعلق شکر ہے کہ فہرست میں چند سطریں لکھ دی گئیں ہیں: "مصنف بھیم سین کایستھ، سال تصنیف ۱۱۲۰ھ — ۱۷۰۸ء۔ عہد اورنگ زیب میں دکن کے حالات کے لیے یہ کتاب بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ بہت کمیاب"۔ ہندوستان میں دلکشا کا شاید یہی ایک نسخہ ہے۔ ناچیز اس کتاب پر ایک مقالہ سپرد قلم کرنے کا ارادہ کرتا ہے، جو رسالہ معیار کی کسی اشاعت میں شائع ہوگا۔

(۳) مخطوط نمبر ۶۴۴، منتخب الوزراء یہ بھی ایک نادر الوجود نسخہ ہے جس پر متعدد مہریں ہیں، اور پانچ مقامات پر "عرض دیدہ شد" مع تاریخ لکھا ہوا ہے۔ کتب خانۂ مشرقی کا نسخہ "آثار الوزرا" اس سے مختلف ہے۔ منتخب الوزرا کا مصنف قاضی احمد الابراہیمی حسینی ہے۔ سال کتابت ۱۰۲۸ھ ہے مصنف نے جا بجا اپنے ماخذوں کے حوالے دیے ہیں، اور دوسری جلد لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

(۴) مخطوط نمبر ۶۴۶، مآثر الاقبال "تاریخ اسلام تا عہد امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ"۔ اوراق ۳۱۰، سطریں ۱۷ فی صفحہ خوشخط نستعلیق، دو مہریں ہیں ایک دیوان ناصر علی کی اور دوسری میر معصوم خاں کی۔ کتابت روز چہار شنبہ شہر رجب المرجب ۱۰۹۲ھ۔ قدرے کرم خوردہ۔ دوسرا صفحہ کرم خوردہ ہے۔ مصنف کے نام کا پتا نہیں چلتا۔ آغاز کتاب "ذکر احوال سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم" سے ہوتا ہے۔ کتب خانۂ مشرقی اور برٹش میوزیم میں اس کا کوئی نسخہ نہیں۔

(۵) مخطوطہ نمبر ۶۵۲، بیان واقع۔ اس کی اہمیت کے لیے ایلیٹ کی تاریخ ہند کی آٹھویں جلد، صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۶، ملاحظہ ہو۔

(۶) مراۃ الاسرار، ایک مشہور کتاب ہے، جس کا ایک نسخہ کتب خانہ مشرقی میں بھی ہے۔ لیکن کھجوا کا نسخہ قدیم ترین معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بیشتر صفحات کے حاشیے پر جو تحریریں موجود ہیں ان کے متعلق کتاب میں یہ عبارت درج ہے: "نسخۂ مسطور در نظر مبارک حضرت ملا شیخ عبدالرحمن حسینی رسیدہ ہست و اکثر بہ دستخط خاص ......"۔ اس کے بعد کاغذ پھٹا ہوا ہے۔ شیخ عبدالرحمن مذکور اس کتاب کے مصنف ہیں۔ تاریخ کتابت ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) ہے۔

میں انجمن ترقی اردو، صوبہ بہار سے گزارش کرتا ہوں کہ صوبہ بہار میں جتنے خانگی کتب خانے ہیں، ان کے مخطوطات کی فہرست بنانے کی کوشش کرے۔ دیوان ناصر علی کا کتب خانہ خصوصاً قابل توجہ ہے۔ یہ کام بے شک بہت مشکل ہے، لیکن اگر کتب خانوں کے مالک انجمن کی معاونت کریں تو فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ میں آگے بیان کر چکا ہوں کہ صوبہ بہار میں مختلف مقامات پر نادر الوجود مخطوطات موجود ہیں، جن کی حالت بہت خراب ہے اگر جلد توجہ نہ کی گئی تو یہ بیش بہا مخطوطات ضائع ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کے پاس مخطوطات کے ذخیرے ہیں، ان سے میری یہ مستدعا ہے کہ ان علمی خزائن کو برباد نہ ہونے دیں، لوگوں کو اجازت دیں کہ ان کتابوں کو دیکھ سکیں اور اگر ضرورت ہو تو بعض کتابیں انجمن ترقی اردو صوبہ بہار، یا کتب خانہ مشرقی کو عطا کر دیں، تاکہ یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچیں، اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔ کتابوں کو کیڑوں کی نذر کر دینے کا کیا فائدہ ہے؟ اگر انجمن ترقی اردو تمام مخطوطات کی فہرست شائع کر دے تو یہ بڑی کارآمد چیز ہوگی۔

سید حسن عسکری
شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج

(قلمی کتابوں کو ذاتی ملک نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ مال امانت ہے جو ہمارے پیش رو چھوڑ گئے ہیں، ہم اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، لیکن اسے ضائع نہیں کر سکتے۔ اپنے جانشینوں کے لیے اسے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ کتابوں کا گھروں میں محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کتبخانہ خدا بخش یا انجمن ترقی اُردو کے حوالے کی جائیں۔ قلمی کتابوں کی فہرست بھی ضرور مرتب ہونی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے بہت روپے کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ اگر بلا معاوضہ اس کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں، تو انجمن ترقی اردو فہرست کو چھپوا دینے کا ذمہ لیتی ہے۔ معیار)

سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

سالنامۂ شاہکار لاہور:- اردو کے آغاز اور ماخذ کے متعلق بعض غلط فہمیاں' از ڈاکٹر سید محی الدین قادری ص ۳۰ تا ۴۴ (۱) ہگر یرس کی کتاب کو تس وسی تا کر مضمون نگار موصوف نے اس کی اصولی غلطیاں دکھائی ہیں' اور ناظرین کو ارسایل ٹرز کے' مقدمہ لغت ہیالی' ڈاکٹر بیلی کی تاریخ ادب اردو' پروفیسر سنتی کمار چیٹرجی کے مقدمہ آغاز و ارتقائے بنگالی' اور پروفیسر ویبر اور پروفیسر پریوس ڈک کی تصانیف کے مطالعے کی دعوت دی ہے۔ معیار)
(۲) اردو مغربی ہندی یا برج بھاشا سے نہیں نکلی بلکہ اس وسیع زبان سے مشتق ہے جو عہد ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمالی مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان یعنی سے ہوا جو صدی عیسوی میں پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ لیکن اس بیان سے یہ نہیں ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی، کیونکہ جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے اطراف کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔

جدید اردو شاعری کی خصوصیات۔ از احمد حسین صاحب ایم اے۔ ص ۴۹ تا ۵۷۔

دیوان افسوس۔ از سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ص ۱۲۰ تا ۱۳۲ (۱) دیوان افسوس کا انتخاب ۱۹۰۳ء میں نواب عماد الملک نے چھپوایا تھا۔ دیوان کے قلمی نسخے بہت کم ہیں (دو نسخے لندن میں اور دو کلکتے میں موجود ہیں' ہندوستان میں اور نسخے بھی ہیں۔ معیار) دیوان زیر نظر کے آخری صفحوں پر شاہان اودھ کے کتبخانے کی تین مہریں لگی ہیں۔

خوش است مہر کتب خانۂ سلیمان جاہ	بہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ (نصیر الدین حیدر)
تاریخ ہر مہر ستہ چہ شد مزین ہر کتاب	خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب
خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب	ثابت دیر روز باد اچوں فروغ آفتاب

تاریخ کتابت کہیں درج نہیں (۲) تعداد اشعار غزل تقریباً ۴ ہزار' رباعیاں ۵۵' تخمیس غزل میر حسن ۱۴ بند' مخمس ترجیع بند ۹ بند' مثمن ۱۴ بند' قطعہ ۹ اشعار قصیدہ ۲۴ اشعار (۳) موصوف نے افسوس کی زبان اور ان کے عہد کے املا سے بحث کی ہے اور منتخب اشعار بھی نقل کیے ہیں' مضمون ناتمام ہے دیوان کا یہ نسخہ کلام پر حاوی نہیں معلوم ہوتا معیار)

جامعۂ دہلی مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب و پروفیسر محمد عاقل صاحب فریدی "نظام الملک کے آباؤ و اجداد" ص ۱۱۲ تا ۱۲۹۔ از ڈاکٹر یوسف حسن خان صاحب استاذ تاریخ جامعہ عثمانیہ (مضمون ناتمام ہے۔ معیار)

جامعہ "ہندوستانی ڈراما" ص ۲۰۴ تا ۲۶۹، از پروفیسر محمد مجیب صاحب (۱) "یہ ضروری ہے کہ ڈراما کو جو شکل دی وہ جانی بوجھی ہو، ہندوستانی ڈراما میں صرف ہندوستانی زندگی پیش کی جاسکتی ہے، اگر ہم یورپ یا کسی خیالی دنیا کا نقشہ اُتارنا چاہیں گے، تو وہ بہت ٹیڑھا ہوگا اور شائد اسے ٹھیک دیکھنے کے لیے ہمیں سر کے بل کھڑا ہونا پڑے، اپنی زندگی کی تصویر دکھاتے وقت ہمیں ہر طرح سے مناسبت کا خیال رکھنا چاہیے، مکان، رہنا سہنا، لباس ہر چیز کو ایسا ہونا چاہیے کہ ڈراما لکھنے والے کا مطلب، قصے کا رنگ اور قصے کے اشخاص .. کی کیفیت اس سے جھلکتی ہو۔ (۲) آجکل ہم نے چند ٹائپ آدمیوں کی چند قسمیں بنائی ہیں اور ڈرامے میں دکھایا جانا انہیں کا حق سمجھتے ہیں .. وہ خوبصورت لڑکی جسے کوئی بدمعاش پکڑلے جاتا ہے، وہ شریف ڈاکو جو اسے چھڑاتا ہے، وہ لڑکی جو باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرنا چاہتی ہے اور وہ بیچارہ جو اس کارروائی میں اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی چند قسمیں ہیں، مسخرہ، افیونی، سڑی سودائی، ظالم باپ، بوتا اور جھاڑو چلانے والی بی بی اور اس کے حسب حال بوتا کھانے والا شوہر۔ اب ان میں ایک نئی قسم دیس سیوک کی شامل کردی گئی ہے ...... اس تقسیم کو چھوڑ کر ہمیں بیچ بیچ کے ہندوستانیوں اور گھڑے ہوئے کیرکٹروں کے بجائے جیتے جاگتے آدمیوں کی تصویر اتارنی چاہیے۔ ڈراما لکھنے والے کو اس کا حق نہیں کہ وہ کیرکٹر کو خاص مطلب کے لیے بنائے، کیونکہ وہ خدا کی طرح نئے نئے آدمی نہیں پیدا کرسکتا اور ایسے کیرکٹر لکڑی کے کھلونے یا گرموفون کے ریکارڈ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ڈراما کھلونوں کی دکان یا اسکول کا کلاس روم بن کر رہ جائیگا، اصل زندگی کی اس میں بوباس نہ ہوگی"۔

نظام الملک کے آباواجداد (بسلسلۂ گذشتہ ۲۳۵ تا ۲۵۲) (اصل مضمون انگریزی میں لکھا گیا تھا، جامعہ میں ترجمہ شائع ہوا ہے۔ معیار)

ہمایوں

لاہور اپریل "ذوق کا حلیہ" ص ۲۰۵ (ماخوذ آزاد)

"غالب کا حلیہ" از خواجہ حسن نظامی صاحب ص ۶ تا ۱۱

"ذوق وغالب" از بشیر احمد صاحب بی اے آکسن ص ۲۷۸ تا ۲۸۰ (ذوق وغالب کے کلام کا مختلف زبانوں میں صاحب مضمون پر جو اثر ہوا۔ اس کا ذکر ہے، آخر میں ان دونوں کے مزاروں کی موجودہ حالت کا بیان ہے۔ معیار) (۱) غالب کی قبر پر یہ اشعار کندہ ہیں:۔

یاحی یاقیوم

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد — اسد اللہ خان غالب مرد
کل میں غم و اندوہ میں باخاطرِ محزوں — تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح — ہاتف نے کہا "گنج معانی ہے تہ خاک"
۱۲۸۵ھ

(۲) ذوق کی قبر پر یہ عبارت مرقوم ہے:۔

۰۰۰ | مرقد | خاقانیِ ہند ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوقؔ
قطعۂ تاریخ قدیم:- شبِ چہار شنبہ بہ ماہِ صفر | بحکمِ خداوندِ جاں داد ذوقؔ
خرد بہرِ سالش بہ ناخن زد غم | خراشید و فرمود استاد ذوقؔ
قطعۂ تاریخ جدید:- کیا اس کو جو دور نے آشکارا | یہ شہرِ خموشاں سے آئیں صدائیں
سنِ حالِ تعمیرِ مرقد جو پائی | محمد ذوقؔ استاد کی آپ کہہ دیں

مئی: عشق و محبت کا مشرقی تصور، اردو غزلوں کا تمدنی پس منظر ص ۲۰۰ تا ۲۰۴ از حمید احمد خاں صاحب ایم اے۔

ادبی دنیا

ا ء پ غالب کی شخصیت اور اردو ادب میں اس کا رتبہ ص ۲۹ تا ۳۱ از جناب برجموہن دتاتریہ کیفی۔ (۱) "غالب اول درجے کا رواداری، وضعدار اور سچا دوستدار تھا۔ ہرگوپال تفتہ، جواہر سنگھ جوہر، منشی بہاری لال مشتاق اور پنڈت شنکر ناتھ نادر کے ساتھ جو تعلق غالب کا تھا وہ ایسا ہی تھا جیسے پرانے زمانے میں گرو چیلے... کا ہوا کرتا تھا ۱۸۶۵ء میں... رائے بہادر ماسٹر پیارے لال۔ دہلی سے بدل کر لاہور جانے لگے۔ شہر کی طرف سے ان کو الوداعی ایڈریس دیا گیا، دہلی کے معزز انگریزوں اور ہندوستانی شرفا کے اس ایڈریس پر دستخط ہوئے، میرزا غالب نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ لفظ اپنے قلم سے لکھے "فقیر اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم و اندوہ ہوا ہے وہ میرا جی ہی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں" میرزا کا خلوص اور تعلق مذہب و ملت سے نہیں بلکہ انسانیت اور انسان کی ذاتی خوبیوں سے تھا" (۲) "غالب جس جوہر کی وجہ سے مانا جاتا ہے وہ اس کی تخیلی صناعی ہے.. غالب پہلا شخص تھا جس نے اردو میں یہ بات پیدا کی، وہ سہل ممتنع کا استاد مانا جاتا ہے"۔ (۳) "غالب کا فلسفۂ شاعری اخلاقی اور عالمگیر تھا، جن چیزوں کو وہ اچھا اور افضل جانتا تھا، وہ جہاں کہیں بھی ملتیں اور جس مذہب کے انسان میں بھی پائی جاتیں، غالب کی ممدوح تھیں"

اپریل و مئی: اردو کا پہلا گلدستہ جسے ایک خاتون نے جاری کیا ص ۹ تا ۱۱ از جناب تمکین کاظمی (۱) اس گلدستہ کا نام "گلدستہ نازنین" ہے، اس کی مالکہ ملقیس جہاں بیگم نازنین اور وہی اس کی مرتب بھی تھیں۔ مقام اشاعت تھا نگی بمبئی، اس کے نمبر جناب تراب علی خاں باز کے پاس ہیں۔ ان میں سے چھٹا نمبر ۵ اجون ۱۸۸۴ء کا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلا نمبر ۱۵ جنوری ۱۸۸۴ء کو نکلا ہوگا۔ مائل سائز کے ۲۲ سطری مسطر پر ۲۴ صفحے ہوا کرتے تھے اور طرحی غزلوں کے علاوہ غیر طرحی غزلیں بھی درج کی جاتی تھیں، ہر گلدستے کے آخر میں وہ تبصرے بھی جو معاصرین نے کیے تھے شائع ہوا کرتے تھے (مضمون نگار طوطی ہند میرٹھ، اودھ پنچ، گزٹ لکھنؤ، جام جمشید مراد آباد، اخبار آصفی حیدر آباد دکن کے تبصرے نقل کیے ہیں، اور مہر منور، مہر نیم روز، مفید ہند، منشور محمدی، خورشید آفاق، پیام عاشق کے تبصروں کا ذکر کیا ہے۔ معیار) (۲) یہ گلدستہ اخباروں اور گلدستوں اور کتابوں پر خود بھی رائے زنی کیا کرتا تھا، چنانچہ ۱۵ نومبر ۱۸۸۴ء کے گلدستے میں قصہ مہتاب بیگم، افسانۂ ایام، گلدستۂ افسون، زاد السالکین، اخبار نظم ہند

وسفیر گورنمنٹ لاہور وغیرہ پر تبصرے کیے گئے ہیں (افسوس کا تبصرہ اس مضمون میں نقل کیا گیا ہے۔ معیار) اس رسالے کی مالی اعانت کرنے والوں میں بابو تلسی رام اور بھیا نریندر سنگھ بھی تھے۔ پہلے کا عطیہ پانچ سو اور دوسرے کا دو سو چندہ سالانہ شائد ایک روپیہ تھا۔ لکھائی چھپائی بری نہ تھی۔ لیکن کاغذ بہت گھٹیا استعمال ہوتا تھا (۴) اس گلدستے میں اسیر، امیر، داغ ریاض، مضطر، جلال، کمال وغیرہ کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں (مضمون نگار کا خیال ہے کہ میرزا داغ کی دو مشہور غزلیں 'تو صد حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو' اور 'جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں' اسی کے لیے لکھی گئی تھیں کیونکہ یہ غزلیں گلدستے میں موجود ہیں۔ معیار) (۵) ایک غزل دانیال کا رڈز صاحب لشکر خلف اکبر مسٹر سلیمان شکوہ جو گارڈز صاحب (؟) تھا رئیس کاس گنج ضلع ایٹہ کی بھی ہے: معلوم یہ دانیال اور سلیمان شکوہ گارڈز کون صاحب تھے؟ آخری پرچہ جو ہمارے پیش نظر ہے 'مارچ ۱۸۸۴ء' کا ہے۔ یہ علم نہیں کہ کب تک جاری رہا (کرنیل گارن [یہ گارڈز کی خرابی ہے] کا ذکر کمال الدین حیدر مورخ اودھ نے کیا ہے' ان کی پوتی سلیمان شکوہ برادر حقیقی اکبر ثانی کے بیٹے سے منسوب تھی' نصیر الدین حیدر شاہ لکھنؤ سلیمان شکوہ کے داماد تھے' جب داماد کی بدسلوکیوں کی وجہ سے انہیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو سلیمان شکوہ کاس گنج جاکر مقیم ہوئے تھے' اسی خاندان کے کسی فرد نے اپنا نام خاندانی تعلقات کی بنا پر سلیمان شکوہ رکھا ہوگا۔ معیار) (۶) ملقیس جہاں بیگم کا ایک قصیدہ جو مہاراجہ پدمانند سنگھ والی منیلی و کھڑک پور ضلع بھاگل پور کی مدح میں ہے اور کئی غزلیں گلدستے میں موجود ہیں۔

نمونۂ کلام:- کیوں ہم اٹھائیں خواہش آغوش یار کا ۔۔۔ ہم بیکسوں کو خوب ہے کو نامزار کا

سمجھے ہو جس کو حضرت موسیٰ چراغ طور ۔۔۔ اک ذرہ تھا وہ خاک دل بیقرار کا

اٹھی شمشیر جب نیچی نظر کی ۔۔۔ بلائیں میں نے لیں اپنے سر کی

مطلع قصیدہ:- رواں بزم دیدہ دولت سے بحر آب گوہر ہے ۔۔۔ جدھر دیکھو ادھر اک کشتی درویش لنگر ہے

ندیم گیا مئی، قصۂ رضوان شاہ مں، ۶ تا ۱۶ از زین العابدین صاحب (۱) یہ مثنوی قدیم دکنی زبان میں ۱۰۹۴ھ کی تصنیف ہے' اصور قلمی نسخہ کتبخانہ منولال گیا میں موجود ہے' تعداد میں ۲۶ مثل اسکول سے تعلق رکھتی ہیں' اور فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ برٹش میوزیم اور کتبخانہ آصفیہ میں بھی اس مثنوی کے قلمی نسخے ہیں 'نسخۂ گیا' کے کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں (۲) مصنف کا نام (یا تخلص؟ معیار) فائق یا بہ قول بعض فائز ہے۔ فائق کو ترجیح ہے' نسخۂ گیا میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ (۳) (مضمون نگار نے مثنوی کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں' اس کے املا اور اس کی زبان سے بحث کی ہے اور قصے کا خلاصہ بھی درج کیا ہے جو اس خلاصے سے زیادہ مفصل ہے جو یورپ میں دکنی مخطوطات کے مصنف نے دیا ہے' اس کتاب میں نسخۂ عجائب خانہ برطانیہ کا حال درج ہے' جس کا سال کتابت ۱۲۰۰ھ ہے' اور مصنف نے فائق کو بالالتزام فائز لکھا ہے' مضمون نگار نے مصنف اردوئے قدیم کے اس قول کی بھی تردید کی ہے کہ فائق نے یہ مثنوی دوستوں کی فرمائش سے لکھی تھی' انہوں نے بعض شعر نقل کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فائق کا مقصد اپنے نام کو زندہ رکھنا تھا نہ کہ دوستوں کو خوش کرنا۔ معیار)

جہان عالم، از خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت مں ۱۸ تا ۲۰ واجد علی شاہ کے ابتدائی حالات۔ اس مضمون میں کل ادبی زندگی ... [illegible]

محکمہ

(۱ تا ۲) تاریخ وفات نجف خان، سال آغاز تذکرہ ہندی مصحفی، تصحیح دیوان معروف، از ق ع اد

(۱) نجف خان کا سال وفات تاریخ فرخ آباد مصنفہ ولی اللہ میں ۱۱۹۶ھ درج ہے۔ ولی اللہ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ فرخ آباد ہی میں گزارا ہے، اور گو اس نے نجف خان کا زمانہ پایا ہے بشیر الدین محمد اور شالال کے بیان پر اس قول کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ "آثار الصنادید" مصنفہ سر سید احمد خان سے معلوم ہوتا ہے کہ نجف خان کے مزار کے کتبے پر ایک قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔ "ای تربت نجف" مادۂ تاریخ ہے' اس سے بھی ۱۱۹۶ نکلتا ہے۔ کمال الدین حیدر مصنف سوانحات سلاطین اودھ نے اس قطعے کو اپنی کتاب کی جلد اول میں نقل کیا ہے۔ بیت آخر یہ ہے:۔ "زد کلک وحی تو ام عالی بجاک تاریخ سال او رقم ای تربت نجف"۔ طبع ۱۰۹۹، مطبع نول کشور لکھنؤ۔

(۲) مصحفی نے تذکرۂ ہندی کے دیباچے میں تصریح کی ہے کہ اس کی ابتدا تذکرۂ فارسی کی تکمیل کے بعد ہوئی۔ "چون این فقیر... از تصنیف دیوان فارسی وہندی وتالیف تذکرۂ فارسی فراغت حاصل کردہ' ہم تالیف تذکرۂ ہندی درپیش آمد"۔ تذکرۂ ہندی مطبوعہ ص ۲۔

عقد ثریا یعنی تذکرۂ فارسی نے کتابی شکل ۱۱۹۹ھ میں اختیار کی۔ زہے "باغ باصفا" سے تاریخ نکلتی ہے (عقد ثریا ص ۲) اس تذکرے میں مصحفی ۱۱۹۹ھ کے بعد بھی اضافے کرتے رہے، چنانچہ مضطر کا حال ۱۲۱۲ھ میں لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سال تالیف تذکرۂ فارسی سے مصحفی کی مراد ۱۱۹۹ھ ہے۔ نہ کہ ۱۲۱۲ھ، اور اس بنا پر تذکرۂ ہندی کا سال آغاز ۱۱۹۹ھ یا اس کے کچھ بعد قرار دینا چاہیے۔

(۳) ۹۴ سیاہ کاری معروف نے سیاہ درون	جو جو سیاہ درون اس بشر کا منہ کالا = کار ہے
۹۵ ناز بھر رکا گو تھا نہیں مفہوم خوب	دیدۂ خونبار جب تک ترجمان ہوتا نہیں = ہوتا
۹۷ چشم ترے ایک پی پیاں آنکھیں اٹھتی نہیں	پھر ادھر کیوں تیری چشم سرگیں اٹھتی نہیں = سرگیں
۱۰۱ دیدار اب خدا کا مجھے ہوچکا نصیب	یعنی ہوا ہوں اک نگہِ سرگیں سے میں = ہوا، سرگیں
۱۰۵ یادِ مژگاں گر بت غم میں دلا کے ہی تو رد	یعنی فیر از آب پاشی کچھ نہیں خاروں کی چھاؤں =
یادِ مژگاں گر تپ غم میں دلا کی ہے تو رد	
۱۰۷ مستی میں ہم کو تلقل مینا خوش آئے ہے	تا اک حیات بادہ گرہ در گلو نہ ہو = لے حباب
۱۱۱ گر نہ عاشق عشق میں ہو کو بکن ہو کا حباب	لیک مر تو جائے تیشہ مار کر اتنا تو ہو = ہوں
۱۱۶ اپنے سینے کے گل جو دکھلاؤں	بلبلیں ہوں گلے کے ہار ابھی = گل، کا؟
۱۲۰ جب دیکھی ہے تصویر سی صورت تیری	ہوش کھوئے ہوئے منہ تکتے ہیں دوچار کئی = تیری

۱۴۸ پیرہن میں نمودِ تن سے ترے بجلی اک تہ شباب کی سی ہے = شہاب

۱۴۵ بیٹھ نہ چپ چاپ یوں ہجر میں مصحفیؔ یا تیرے حق میں اور سوا نہ ہو ہے = تیرے حق میں کچھ اور

۱۴۶ کہے ہے دشت میں ہر نقش پائے ناقۂ مجنوں بھٹکنا مت کہ جانے آج لیلیٰ یوں نہیں واں ہے =

ناقہ لے مجنوں، جاتی۔

۱۵۰ کہیں یں دل کا شب خانہ معروف = سب ۱۵۰ ایسی روتا ہے تو طوفان خطر کیونکر نہ ہو = کا خطر

۱۵۲ رہتی تھی عاشق سے تجھ کو کس قدر بیگانگی = تجھ کو

۱۵۴ نہ پوچھ مجھ سے غم درد صدمہ ہائے فراق = غم درد

۱۵۵ ایک عالم تجھے کوٹھے پہ کھڑا دیکھے ہے مرگیا شب ترے عارض کی صفا دیکھے ہے

ہم تو ہم ماہ بھی حیران رہا دیکھے ہے مہ جبیں روئے عرقناک ترا دیکھے ہے

غرق دریائے خجالت ہوے اختر لاکھوں" = مخمس کا ایک بند ہے۔ چاروں مصرعوں میں ہے کی جگہ سے ہے

۱۵۸ تو سب کو قتل کیا اور مجھی کو ترسایا گلے یہ تشنہ کے میرے تجھے نہ رحم آیا = گلوئے تشنہ پہ میرے؟

۱۷۰ یہ زندگی کی ہو صورت گر اشتہار کریں کریں ایسے آئینہ کو گر تو سنگسار کریں = گر کو تو

۱۷۵ اس کی کھودے ہے یہ بیخ و بن ہیزم خشک کو جوں کھائے گھن = کی یوں، گھن

۱۷۸ تجھ کو اپنے دل بے غم کی قسم + حلقۂ دام تغافل کی قسم = تغافل اور بے غم کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔

۱۷۸ وحشتِ شوق کے تمکیں کی قسم = تمکیں ۱۷۸ رشتۂ نازِ رگِ گل کی قسم = تار

۱۸۲ تیغ بردار آپ کا بلالی ہے = تیغ دار ۱۸۳ کیا ہی تعریف اب لکھوں پس فیر = بس

۱۸۴ اس طرف بھی کرم کیا کیجیے گاہ گاہے خبر کیا کیجیے = لیا

۱۸۵ کوئی خواہاں بھی ہو شاید تیرا دور ہی سے دیکھ کے پوتا ہوا = کوئی جو، ہوتا

۱۸۷ واں سے جب آگے بڑھیگا تو پھر = تو تو ۱۸۷ آپ نظر آئیگا ان کا مکاں = آپ

۱۸۸ میں بہت آنے کو چاہا کیا = میں تو ۱۸۸ بھیجیے اس کا جواب آپ بھی = اب اس

۱۸۸ جس کی دو دیکھیے گا رقم طبعزاد = جن کے ۱۸۸ چھوڑ قلم کو گئی تھک قلم = کو کر

۱۹۱ اے برادر قصہ خوں پیمانہ است معنی اندروے بیان واد است = چوں، بسان

۱۹۱ گوش روا اپنے ہے یہ اس طور سے = گوش نہ ۱۹۲ پاس نام ننگ دل بے صبر تھا = نام و

۱۹۹ اپنا نفس دعا کہنے لگا + تھا جو قسمت کا لکھا لکھنے لگا = کہنے

۲۰۲ کیا کہوں مستی عجب ہنگامہ تھا مرگ کا آیا نوازش نامہ تھا = تم سے

ہماری زبان

(۱) از سید رضا قاسم صاحب (۲) از ق ع د

(۱) نورچشمی: کیا لفظ نورچشمی مخصوص عورت ہی کے لیے ہے یا مرد کو بھی کہہ سکتے ہیں؟ میرزا قتیل کا تو خیال تھا کہ مرد کو بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ حرف ی اس لفظ میں نسبتی ہے یعنی وہ نور جو منسوب ہے آنکھ کی طرف دوسری صورت اس ی کی متکلم ہو سکتی ہے یعنی میری آنکھ کی روشنی۔ جیسے عزیز سے عزیزی۔ لیکن میرے اکثر ذی علم احباب کا خیال ہے کہ لفظ نورچشمی میں سوائے یائے تانیث کوئی دوسری ی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ نورچشم فارسی زبان کا مرکب لفظ ہے اس کے ساتھ یائے متکلم یا یائے نسبت کی ترکیب درست نہیں ہو سکتی۔ مگر میرے خیال میں تو قتیل کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس قسم کی ترکیب غلط ہے تو پھر قبلہ گاہی کا لفظ بجائے عورت کے مرد کو کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے، جو عام طور پر مرد ہی کے لیے مستعمل ہے:

"نوید نورچشمی آفتاب آں صفحہ ۱۰۰ — بہ نو قبلہ گاہی گو یہ آں محراب ابرو ۱۰۰"

(۲) نورچشمی اہل اردو کی بول چال میں داخل نہیں، گو اس میں شک نہیں کہ بعض اہل اردو اور چند ہندوستانی فارسی داں خطوں میں لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اسے استعمال کرتے ہیں، فارسی الفاظ کے ساتھ عربی کی یائے متکلم کا استعمال قطعی ناجائز ہے۔ اگر نورچشمی میری آنکھ کی روشنی کے معنی میں صحیح ہے تو راحت جانی، سرو دلی بھی جائز ہونا چاہیے۔ رہی یائے نسبتی۔ اس کے متعلق گزارش ہے کہ اول تو اس کی کوئی ضرورت نہیں، نورچشم سے وہی مطلب نکلتا ہے جو نورچشمی (بہ حالت اضافۂ یائے نسبتی) سے نکل سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نورچشم میں ترکیب اضافی ہے، ایسی صورت میں یائے نسبتی کا اضافہ قاعدے کے خلاف ہے۔ قتیل نہ اردو میں مستند ہیں نہ فارسی میں۔ مطلع جو نورچشمی اور قبلہ گاہی کے جواز کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، اس میں نورچشمے اور قبلہ گاہے ہے۔ ہماری رائے میں نورچشمی میں یائے تانیث ہے یہ ہندی ی ہے، لیکن اردو والوں نے جس طرح صاحبزادہ سے صاحبزادی، شاہزادہ سے شاہزادی بنالیا، ہندوستانی فارسی دانوں نے نورچشم سے نورچشمی بنالیا۔ اس کا استعمال ہمارے نزدیک مناسب نہیں، اور نہ اردو کو اس کی کوئی ضرورت ہے، اگر نورچشمی ہمارے روزمرے میں داخل ہوتا تو اور بات تھی۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بعض الفاظ و محاورات پر جو معیار کے مضمون نگاروں نے استعمال کیے ہیں اپنے خط میں اعتراض کیے تھے۔ ہم ذیل میں ان کے خط کے اقتباس اپنی رائے کے ساتھ درج کرتے ہیں:

خوشنشۃً: "خوش فارسی لفظ ہو، عربی الفاظ کی طرح تنوین کے ساتھ اس کا استعمال ناجائز ہے" اعتراض صحیح ہے۔

کراہیت: کراہیت صحیح نہیں، کراہت صحیح ہے کراہیت کراہت دونوں عربی لغات میں موجود ہیں۔ کراہیت ہمارے ہاں لوگوں کی زبان پر بکثرت ہے ممکن ہے بعض جماعت متعدد میں لوگ کراہت کو ترجیح دیتے ہوں لیکن کراہیت جب لغت میں ہے تو اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔

ترجمہ ۔ آبرو کا ترجمہ تذکرہ خوشگو سے کر رہے ہو۔ ترجمہ فارسی میں اسی معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اردو میں اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ اردو والوں کے لیے لفظ حال اس سے زیادہ قریب الفہم اور مانوس ہے" بایں ہمہ اگر یہ لفظ کل زندگی کا مفہوم ادا کر سکتا ہے ہمیں تو ترجمہ سے بہتر لفظ نہ مل سکا۔ اردو دانوں نے شبلی اور مصنف تذکرہ شعرائے دکن نے بھی اس مفہوم میں اسی لفظ کو استعمال کیا ہے تلاش سے اور لوگوں کی تصانیف میں بھی ملیگا۔ لفظ حال اس موقع پر بھی استعمال ہو سکتا ہے، اگر کسی کتاب میں ضمنی طور پر کسی کا ذکر آجائے، اور دو چار باتیں اس کے متعلق لکھ دی جائیں، لیکن لفظ ترجمہ صرف اسی موقع پر استعمال ہوگا جب مصنف نے کسی کا حال باقاعدہ طور پر لکھا ہو اور وہ کتاب کا لازمی جزو ہو۔ مثلاً یہ کہ ماثر الامرا میں جن جن لوگوں کے نام بطور عنوان موجود ہیں ہم ان کے حالات کو تراجم کہیں گے، لیکن جن لوگوں کے حالات دوسروں کے حالات کے تحت میں درج ہیں، ہم انہیں تراجم نہ کہیں گے لفظ حال دونوں صورتوں میں مستعمل ہو سکتا ہے، تاہم ہمیں اس لفظ کے استعمال پر اصرار نہیں۔

تبادلہ ۔ صحیح لفظ مبادلہ یا تبادل، مگر تبادلہ اردو میں لکھا اور بولا جانے لگا ہے، بلکہ مرکبات میں بھی لوگ اسے استعمال کرنے لگے ہیں۔ مثلاً "تبادلہ خیالات" کیا آپ کے نزدیک اس لفظ کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب اس سے ترس نہ کرنا چاہیے؟ تبادلہ ایک خاص معنی میں اصطلاح کا لفظ بن چکا ہے، ہم زندگی بھر سے سنتے آئے ہیں کہ فلاں شخص کا وہاں سے یہاں کو تبادلہ یعنی ٹرانسفر ہو گیا"۔ تبادلہ اردو والوں کی ایجاد ہے۔ عربی لغات در کنار فارسی لغات میں بھی نہیں ملتا، اس کے استعمال میں ہمیں بھی تامل تھا۔ لیکن جب آرزو لکھنوی کو نظام اردو کی بنیاد میں تبادلہ خیالات لکھتے ہوئے دیکھا تو اس کے جواز کا قائل ہونا پڑا، تاہم اگر ایکسچینج کے معنی میں مبادلہ استعمال کیا جائے اور ٹرانسفر کے معنی میں تبادلہ حسب سابق رہنے دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سونچنا یا سوچنا "راستے میں یہ سونچتا تھا کہ اگر میں اکیلے اندر جاؤں" مصدر سوچنا ہے نہ کہ سونچنا، اور اگر کبھی آتا تو اب متروک ہے اکیلے کی جگہ اکیلا چاہیے ص ۲۳ اعتراض صحیح ہے
افعال مرکب اور حرف نفی مسی چاہیے ویسا مقبولیت نہیں حاصل ہوئی" ص ۹، اخلاقی جرات کا نتیجہ نظر آتا ص ۲۸ "میں نے ابھی وقت مقرر نہیں کیا تھا" ص ۳۲ "اور ہمیں بہت غمگین نہیں نظر آنا چاہیے" ص ۳۰ ان مثالوں میں حرف نفی کو پورے فعل کے پہلے استعمال کیا گیا ہے، لیکن مرکب افعال میں حرف نفی فعل کے ہر دو اجزا کے درمیان آنا چاہیے مثلاً "مقبولیت حاصل نہیں ہوئی" "نتیجہ نظر نہ آتا" اعتراض صحیح ہے۔

قبلہ گاہی یائے معروف کے ساتھ یہ آہنگ غالب میں موجود ہے۔ نظم طباطبائی مرحوم رسالہ اردو سے جنوری ۱۹۲۱ء ص ۸ میں لکھتے ہیں "یہ بعض بندیوں کا تصرف ہے ۔۔۔ اسی طرح منہ الحمد اشرف ۔۔۔۔ مخدوم الانامی ۔۔۔۔ و قبلہ گاہی وغیرہ میں شوخی قلم کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں"

عالم ادب

(۱) **ادارہ کلیم دہلی** کی طرف سے کتب ذیل جلد شائع ہونے والی ہیں۔ خمارستان، جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی کی نثر، جناب جوش ملیح آبادی کی نظم و نثر، جلدوں میں، آتش کدہ، شعر و حکمت، بادہ سرجوش روح ادب، محل بانگ فطرت، افکار، نقش و نگار۔

(۲) **لطیف الدین احمد صاحب** اکبرآبادی کے مختصر افسانوں اور شاعرانہ نثر کا مجموعہ، نغمات کے نام سے جلد شائع ہونے والا ہے

(۳) آرزو جلیلی صاحب شیخ غلام علی راسخ کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں۔ وہ حالات کے ساتھ کلیات کا انتخاب بھی شائع کرنا چاہتے ہیں۔

(۴) بابو راجندر پرشاد نے، ہندی ساہتیا سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ناگپور میں جو خطبہ پڑھا تھا، ہم اس کے ضروری اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

ہندی قومی زبان ہونے کی مدعی ہے، صوبجات متوسط، گجرات، برار، مہاراشٹر اور بنگالے میں بڑی تعداد ہندی سمجھنے والوں کی ہے، لیکن مردم شماری کی رپورٹ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان صوبوں میں ہندی سمجھنے والوں کی تعداد کیا ہے، شمالی ہند کے مسلمان سب کے سب ہندی بولتے اور سمجھتے ہیں جنوبی ہند میں بھی مسلمان ہندی بولتے اور سمجھتے ہیں، پنجاب کی زبان پنجابی ہے، لیکن وہاں زیادہ تر لوگ اپنی ضروریات کے لیے ہندی کو برتتے ہیں، لفظ ہندی کو میں نے وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے، اگرچہ خود ہندی زبان کے عالموں میں اس مسئلے کے متعلق اختلاف ہے کہ اردو، ہندی، الگ الگ زبانیں ہیں، یا ایک، پنڈت گو بند نرائن مشر نے دوسری ساہتیا سمیلن میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا، اس میں اس امر کا ثبوت پیش کیا تھا کہ دونوں الگ الگ زبانیں ہیں بابو رادھا کرشن داس نے اپنے اس مضمون میں جو "ہندی کیا ہے؟" کے عنوان سے لکھا گیا تھا، فرماتے ہیں کہ "ہندی" ہندوستان کے باشندوں کی زبان کا نام ہے، اگر کوئی زبان عام طور پر ہندوستان میں برتی جاتی ہے تو وہ ہندی ہے۔ اردو، ہندی سے بالکل الگ نہیں ہے لفظ ہندی مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے، زمانۂ سابق میں امیر خسرو، میر تقی، انشا اور ملک محمد جائسی کے سے شعرا نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ ملک محمد جائسی پدماوت میں لکھتے ہیں ۔۔

"تُرکی، عربی، ہندوی، بھاشا جیتی آہی   جا میں مارگ پریم کا سبھائے سراہیں تاہی

[میر نے زبان اردوئے معلیٰ بھی لکھا ہے، اور انشا کی دریائے لطافت میں لفظ اردو سینکڑوں جگہ آیا ہے، قدما نے لفظ ہندوی یا ہندی ہر اس زبان کے لیے استعمال کیا ہے جو ہندوستان میں بولی جاتی تھی۔ یہ لفظ، اس زبان کے لیے مخصوص نہ تھا جو پرانے زمانے میں مع دہ اردو اور ہندی کی جگہ مروج تھی۔

۲۰ ۱۱۱۱ھ میں ایک مسلمان شاعر حقیقت شاہ نے امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کے قصے کو منظوم کیا تھا وہ اپنی زبان کو ہندی کہتا ہے

" طوطیٔ ہند کا میں خوشہ چیں
ہندی میں اب لکھوں ہوں اس کے تئیں" ۔ ہشت گلزار مٰ

اس مثنوی میں اشعار ذیل ملتے ہیں، بابو راجندر پرشاد انہیں ہندی سمجھتے ہیں یا نہیں ؟

"ہے وہ لبِّ لباب مغزِ سخن
خار بن ہے یہ اور وہ گلبن

بس کہ بے حد شمار سے تھے قشوں
سرکشانِ جہاں تھے اس کے زبوں

فیلسوفِ زمان و دانشور
راست کار و امیں و نیک سیر

سینۂ باز خوابگاہ تدرو
چنگ شاہیں کا پناہ تدرو

معیار]

قواعد زبان یا لسانیات کے رو سے اردو و ہندی ایک ہوں یا نہ ہوں، ہم کاروباری نقطۂ نظر سے ان تمام لوگوں کو جو بالعموم اس زبان میں بات چیت کرتے ہیں، جسے ہم ہندی ملتے ہیں ہندی بولنے والا قرار دیں گے ۔ خواہ ان کی ہندی قواعد کے لحاظ سے کتنی ہی غلط ہو ، اور ان کی زبان پر ایسے الفاظ کیوں نہ ہوں جو کسی ہندی لغت میں نہیں ملتے ، ہندی قومی زبان اسی وقت ہوگی جب ہم ان کو شامل کرلیں، ورنہ کتابی ہندی سمجھنے والوں کی تعداد کئی صوبے کی زبان بولنے والوں کی تعداد سے بھی کم ہے ۔ بہار کو لیجیے جو ہندی بولنے والا صوبہ سمجھا جاتا ہے، یہاں بہت سی بولیاں بولی جاتی ہیں بھوجپوری ، مگدھی ، میتھلی وغیرہ ، ان بولیوں کے بولنے والے اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوں تو کتابی ہندی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ۔ یہی حال صوبہائے متحدہ اور دوسرے صوبوں کا ہے ، جب میں ہندی کا تصور قومی زبان کی حیثیت سے کرتا ہوں تو ان تمام لوگوں کو جو ہندی کو برت سکتے ہیں، ہندی بولنے والوں میں شمار کرتا ہوں قومی زبان سے ہماری مراد وہ زبان ہے جو مختلف صوبوں کے درمیان تجارتی ضروریات اور دوسری اغراض کے لیے استعمال ہوتی ہے اور جو سارے ہندوستان کے لوگوں کے لیے مبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہو سکتی ہے ۔

طرح طرح کے اختلافات ہوتے ہوئے بھی ہندی ان شرطوں کو پورا کرتی ہے ، تیلگو ، تامل ، ملیالم اور کنڑی زبانیں ہی صرف ایسی ہیں جن کو ہندی کے ساتھ کوئی سیدھا ناتا نہیں ہے اور جن کے بولنے والے نہ ہندی سمجھ سکتے اور نہ جن کی بولی ہندی بولنے والے سمجھ سکتے ہیں ، ان میں بھی سنسکرت لفظوں کی کثرت رہنے سے تھوڑی ہی کوشش سے کامیابی ہو سکتی ہے ۔ پھر بھی اُتر پچھم میں جہاں آریائی بھاشائیں بولی جاتی ہیں ہندی کا پرچار آسان ہے اور دکن کے علاقوں میں جہاں دراوڑ بھاشائیں رائج ہیں یہ کام بلاشبہ کٹھن ہے ، قومی زبان ہونے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت ہندی میں آنی چاہیے ، اس کے پرچار کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرنا چاہیے ۔ ہندی کی خامیوں کو دور کر کے اسے مکمل بنانا چاہیے ۔ اس لیے ہندی کی شکل پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے ۔

زبان کے دو حصے ہیں ۔ الفاظ اور صرف و نحو ، یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایک عبارت کس زبان کی ہے اس پر اتنا منحصر نہیں ہے کہ اس جملے کے لفظ کس زبان سے لیے گئے ہیں یعنی ان کا رواج کہاں سے اور کیونکر ہوا ہے بلکہ اس کا فیصلہ جملے کی ترتیب حروف علت اور افعال پر منحصر ہے ، مثال کے طور پر ایک چھوٹے جملے کو لیجیے ۔

"رام نے حکم دیا موڑ لاؤ"

اس چھوٹے جملے میں رام نام ہے۔ حکم عربی لفظ ہے۔ دیا فعل ہے۔ اس میں ہندی عربی اور انگریزی کے لفظ آئے ہیں مگر انگریزی عربی کے لفظ رہتے ہوئے بھی یہ ہندی ہی کا جملہ ہے۔ اس لیے اگر ہندی میں ایسے لفظ آ جائیں جو کسی دوسری زبان سے لیے گئے ہیں تو وہ ہندی ہی رہے گی۔ جتنی زندہ زبانیں ہیں وہ اپنے لغات کو برابر بڑھاتی جا رہی ہیں اور ان کے شاعر اور مصنف دوسری زبان کے نئے نئے لفظوں کا استعمال اپنی تصنیفوں میں کرتے ہیں۔ باہر کی بات جانے دیجیے ہندوستان کی بھی بنگلا، مرہٹی، گجراتی وغیرہ سبھی زبانوں میں دوسری زبانوں کے لفظوں کا استعمال دھڑلے سے ہو رہا ہے۔ اردو والے بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اردو کے بڑے شاعر اکبر ہندی لفظوں کو بڑی آسانی سے لے لیا کرتے تھے۔ جیسے :-

"سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں"

"آغوش سے سدھارا مجھ سے یہ کہنے والا"

حالیؔ نے ایک جگہ "انچھا" اور "جالا پورنا" استعمال کیا ہے۔ ہندی زبان کی خوبیوں میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ہندوؤں کی زبان ہوتے ہوئے بھی اس نے عربی، فارسی ہی کے نہیں بلکہ ترکی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے لفظوں کو بھی اچھوت نہیں سمجھا۔ اگر ایسا نہیں کیا ہوتا تو کتنے ہی لفظ جو ہمارے گھروں میں پہنچ گئے ہیں آج نہ ہوتے اور ان کے ہم معنی لفظ ہمارے پاس شاید اتنے موزوں نہ ہوتے۔ اس طرح کے لفظ انسانی زندگی کے سبھی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا۔ مثلاً :-

سوغات، قالیچہ، بہادر، چلا، قلی، قینچی، چاقو، لاش، داروغہ، توپ، چک وغیرہ ترکی سے۔

الماری، اچار، بوتل، کمرا، آلپن، گملا، گرجا، گودام، چابی، مستری، میز، تمباکو، نیلام، تولیا، پرات، پوما، سنترہ وغیرہ پرتگالی سے۔

حد، بالغ، حلوائی، جہیز، اطلس، آتشک، تکیہ، حقہ، اسباب، بخار، بحث، بلوہ، غلہ، جیب، دلال وغیرہ عربی سے۔

چوزہ، فلیل، اخبار، نوکر، پیل، دنگل، سنار، جلیبی، زندہ، دوات، سیاہت، بے باق، ریک، چشمہ، وکیل، لالہ، بیمہ، بابا، پاپی، داماد، تالاب، بخیہ، حلوا، پچ وغیرہ فارسی سے۔

ہندی کے پرانے مشہور شاعروں کی شاعری میں بھی بہتیرے لفظ ایسے ملتے ہیں جو بدیشی زبانوں کے ہیں یا بدیشی زبانوں سے مشتق ہیں۔ مثلاً :-

جایسی :- شیر شاہ دلی سلطان۔

سورداس :- اسا ہری سب بپتی کہا ایک۔
کوکری سکے بابری میری آتے دان کو لائق

تلسی داس :- گئی بہوری غریب نوازو - سرل سبل صاحب رگھوراجو

بہنی بخشش جا چکن دنھی
بہا بازار نہ جائے بچھانا
جتواسے گونے مورت سکل جھوپ سرتاج
کم کھکن کہی وزیر بڑاری
اُکپ جاکے بندی خانہ
جو کچھ چھوٹہ مسخری جانا
بیٹھے بجاج، صراف، بنک، اینک منھ کو بیرے
غنی غریب گرام نرناگر
کوئی کنگورن چڑھی گئے کوئی کوئی رندھیر۔

بودھا :۔ ہوئے مغرور تو بے دونی مغروری کیجیے۔ لگھ جلے دبے جو تاسوں لگھ تا نو لیئے۔

پدماکر :۔ اپنے گجھ بخشے حبیب رگھوناتھ راؤ یا ہی گجھ دھوکے کبوں کا ہوجیہے ڈارنا۔

بھوشن :۔ دوم روندٹی ڈاسے خراسان کھوندی مارے خاک کھا درلوں جھاہے ایسی سا ہو کی بہار ہے ؛ راجا سورلج کے لنگارن کی داک سن کیتے پادشاہن کی چھاتی درکتی ہے۔

متی رام :۔ سوبکو مولی دلی دل دیبے کو جو سوبھٹ سوہن سوا کی اُمہتی ہے
کہے متی رام تاہی، دکھے کو سنگویں کا ہوکے نہ ہمتی ہیے میں اُلہتی ہے
ستر و سال نند کے پرتاپ کی لپٹ سب گرب غنیم دگن کو دہتی ہے
پتی بادشاہ کی امتی امرادن کی راکھی رلبا راؤ بھاوسنگھ کی رہتی ہے

بہاری :۔ لکمن بیٹھی جاکی مبیبی گہی گہی گرب غروب
بھے : کیتے جگت کے چتر چتیرے کوب
نیچے : بڑی سبیل ہوں چپل گھونسو اماس

تلسی داس اور ہندی کے قدیم شاعروں کی تصنیفوں میں عربی فارسی کے لفظوں کا ہی نہیں، اُردو میں آج کل کے تاریخ محاورہ کا بھی استعمال ملتا ہے۔ جیسے ۔

" بالم باسی اودھ کا بوجھیے نہ خاک "

مطلب :۔ اودھیا کے رہنے والے خاک بھی نہیں سمجھتے۔

" کیو دار کہی پیے ابھوں نہ آئے باج مطلب :۔ اے سوامی میں نے کئی بار کہا تم ابھی تک باز نہیں آئے۔

(جاری ہے)

مطبوعاتِ جدیدہ

(۱) سالنامۂ شاہکار از مبتدی (۲) سالنامہ مساوات از مبتدی (۳) ادب لطیف افسانہ نمبر از مبتدی (۴) بیدۂ حیرت از مبتدی۔

سالنامۂ شاہکار (لاہور)

مرتبہ جناب تاجور، ص ۱۵۶، جہازی تقطیع، تصاویر ۱۲، قیمت ۸؍

جناب تاجور نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان کی زبان و قلم ہمیشہ اردو کی خدمت کے لیے وقف رہے ہیں، نوجوانان پنجاب میں ادبی خدمت کا جو ذوق پایا جاتا ہے، اس کے پیدا کرنے میں ان کا بھی حصہ ہے، اردو سے انہیں جو محبت ہے وہ مصلحت اندیشی کی حدود سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہے، اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں، ادبی دنیا نکال کر انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا کوئی دوسرا ہوتا تو عمر بھر کے لیے اس شغل سے باز آجاتا، لیکن تاجور صاحب اور مصلحت بینی میں تطبیق کا اختلاف ہے اور وہ اسی شان کا ایک دوسرا پرچہ نکال رہے ہیں، تاریخ کو بھی یہ معلوم ہے کہ اسے کو دہراتی رہتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہی سال میں ، ہزار روپے کا خسارہ انہیں برداشت کرنا پڑا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ ان کی جیب کی گہرائی کیا ہے، لیکن ان کی ہمت بہت بلند معلوم ہوتی ہے، شاہکار مفید اور دلچسپ رسالہ ہے، میری آرزو ہے کہ یہ کامیابی کے ساتھ مدتوں زندہ رہے۔

اس کا سالنامہ مارچ اور اپریل کے پرچوں کو ملا کر نکالا گیا ہے، تاجور صاحب نے اپنے مشیروں کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "سالنامۂ شاہکار رسالوں کا شاہکار ہے"۔ جناب تاجور اس رائے سے نہ اتفاق کرتے ہیں نہ اختلاف۔ وہ صرف اسی قدر کہتے پر قانع ہیں کہ "میرا جو فرض تھا اور جو نہ تھا، میں نے دونوں کی ادائیگی میں کسر نہیں کی ۔۔۔ بازی اگرچہ لے سکا سر تو کھو سکا"۔ انصاف مجھے بھی اس اعتراف پر مجبور کرتا ہے کہ انہوں نے اپنا فرض بہت اچھی طرح انجام دیا ہے۔ اور سالنامے کو مفید اور دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں کی، یہ سالنامہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اس قابل ہے کہ وہ اصحاب بھی جو شاہکار کے مستقل خریدار نہیں بن سکتے، اسے منگوا کر پڑھیں۔

طبعزاد افسانوں میں خواجہ غلام السیدین صاحب کا "قانونی جرم" خصوصیت کے ساتھ قابل داد ہے، خواجہ صاحب نے غالباً افسانہ نویسی کے میدان میں پہلی دفعہ قدم رکھا ہے، لیکن ان کا انداز کہنہ مشقوں کا ہے، میرزا فرحت اللہ بیگ کا افسانہ "سفر زیر دفعہ ۱۰۹ بضابطۂ ملازمت" ان کے خاص رنگ میں لکھا گیا ہے۔ "مظہر العجائب اور گیان" بھی قابل ذکر افسانوں میں ہیں۔ حصۂ نظم میں فانیؔ، جوشؔ، اخترؔ، شاعرؔ، رواںؔ، جمیلؔ، آرزوؔ، محرومؔ، فاخرؔ، حسرتؔ، سیمابؔ، کے اشعار ہیں۔ حضرت اخترؔ کی نظم "نظم ہستی" کا یہ مصرع مجھے کھٹکتا ہے: "نہ جانے کون سے عالم میں رو رہا ہوں" کہہ رہا ہوں، بہ رہا ہوں، سہ رہا ہوں، میں تامل نہیں، رو رہا ہوں، محل نظر ہے۔ "تاروں کا گیت" جناب آغا شاعر کی نظم ہے۔ اس کے کئی مصرعے نظر ثانی سے بظاہر محروم رہے ہیں "بیل شبِ سہاگ میں کیا بن گئی دلہن" "یا آسماں کے چاند سے ہم دو براتی ہیں" "کالا لباس پہنے شبِ تار تار ہے" "شبِ سہاگ" کی ترکیب پرانے زمانے میں جائز رہی ہو، لیکن اب متروک ہے، "براتی" کی "ی" بری طرح دبتی ہے، "شبِ تار" کا قافیہ "تار تار" کیا

کیا ضرورت ہے؟ شاکق کی نظم کا یہ مصرع ناموزوں ہے " ذوقِ طلب کا آغوش ٹوٹا طلسم شوق " آغوش دامنے سے متروک بھی ہے۔

تحقیقی مضامین میں کئی قابلِ داد ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کرنے کی جگہ نہیں۔ (بعض کا خلاصہ معیار میں درج کیا گیا ہے۔ معیار)

سالنامہ مساوات

سنہ ۱۹۳۶ء مرتبہ محمد منیر الدین صاحب ص ۱۴۴ علاوہ تصاویر تقطیع معیار قیمت ۲ الر

رسالہ مساوات پھلواری نے اب اپنی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھا ہے۔ اس رسالے کے مقاصد حسب ذیل ہیں " (۱) مسلمان خود ساختہ نسبی بتوں کو توڑ کر صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں (۲) مسلمانوں سے آپس کی فرقہ بندیاں دور ہو جائیں (۳) مسلمانوں میں تحصیل علم کا سچا شوق پیدا ہو جائے (۴) مسلمان اقتصادی و معاشرتی زندگی کا بہترین نمونہ بن جائیں (۵) مسلمان بیکاری کی زندگی کو چھوڑ کر محنت و مشقت کے عادی ہو جائیں " سالنامۂ زیر نظر کے مضامین سے مقاصد بالا کے حصول میں مدد مل سکتی ہے۔ بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں :- " خاندان پرستی "۔ " اسلامی مساوات پر ایک نظر "۔ " اچھوتاں کا مسئلہ اور ملت اسلامیہ کا نصب العین "۔ " اسلام اور طلاق "۔ " اسلام کا پیغام اخوت "۔ " موتی اقبال "۔ حصۂ نظم میں غزلوں کی کثرت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی مصلحت پر مبنی ہو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزلوں کی اشاعت کس طرح مسلمانوں کی اصلاح میں معاون ہو سکتی ہے۔ ایک مشہور استاد کے چند شعر ملاحظہ ہوں، حیرت ہے کہ بیسویں صدی میں بھی ایسے اشعار لکھنے والے اور ان سے لطف اٹھانے والے موجود ہیں ا۔

" جال زلفوں کا ہے بچھا دل پر ۔۔۔ کیوں نظر بار بار جاتی ہے "
" بزم میں تیرے روئے روشن پر ۔۔۔ جان پروانہ وار جاتی ہے "

ادب لطیف لاہور

افسانہ نمبر ص ۱۴۲ تقطیع معیار، تصاویر اس کے علاوہ قیمت ۱۲ار

اس رسالے کو نکلے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے، لیکن " سالے کہ نکوست از بہارش پیداست "۔ جنوری میں اس کے کارکنوں نے سالنامہ نکالا تھا، اور چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ افسانہ نمبر شائع کر دیا۔

افسانے تعداد میں ۱۴ ہیں، ان میں سے ۲ انگریزی سے ماخوذ ہیں اور ان کے مصنفوں کے نام بھی بتائے گئے ہیں۔ تین افسانوں کے متعلق یہ اعتراف تو کیا گیا ہے کہ دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ لیکن مصنفوں کے نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی، تو افسانوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ طبع زاد ہیں۔ ان میں کم از کم ایک انگریزی سے ماخوذ ہے، اسلم صاحب نے ایک تمہید اپنی جانب سے بڑھا دی ہے، کل نام بدل دیے ہیں۔ اور ایسی باتیں جو خاص انگریزی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں حذف کر دی ہیں، لوگ اسے سرقہ کہیں گے لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی کو اسلم صاحب پر اعتراض کرنے کا حق نہیں، کیا ہمارے یہاں ابتدا ہی سے یہ رسم جاری نہیں، کیا شاہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ ریختے میں فارسی کے مضامین باندھو، اور کیا ہمارے

شعراکا آج تک اس ہدایت پر عمل نہیں ہے؟ افسانہ نگاروں کے لیے ایک دوسرا معیار کیوں قائم کیا جائے؟ مگر نجت کے علاوہ جو چھ نو افسانے ہیں، ان میں بحیثیت مجموعی "دلہن کا سلام" سب سے بہتر ہے، اگرچہ اس کا پلاٹ ذرا پامال سا ہے۔ دوام میں سب سے بہتر "جواری" ہے، جو ہندی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ڈوکنس اگرچہ جدید دکٹوریا کے برگزیدہ افسانہ نگاروں میں ہے، لیکن اس کے مختصر افسانے چنداں بلند پایہ نہیں۔ سر کونن ڈوائل ایک خاص طرز افسانہ نویسی کے بانی فرد ہیں، اور انہیں حیرت انگیز مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے، لیکن جو سراغ رسانی کی بنیاد علمی نہیں۔ اس قسم کی سراغ رسانی اگر ہے تو وہ اگرہ تھورن ڈائک میں ہے، جو آسٹن فریمین کے افسانوں کا ہیرو ہے۔ ڈوائل کے بہت سے افسانے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں، مترجمین کو اب فریمین وغیرہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ناقدانہ مضامین میں ایک بہت دلچسپ ہے، اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ فیثاغورث دنیا کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ ایسی باتیں کسی رسالے میں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے، لیکن ادب لطیف کے اڈیٹر صاحب نے غضب کیا کہ اسی پرچے میں ایک کہانی "دنیا کی قدیم ترین کہانی" کے عنوان سے چھاپ دی، اور ایک دوسرا مضمون شائع کر دیا جس میں دنیا کے سب سے پہلے افسانہ نگار لقمان حکیم بتائے گئے ہیں۔ اڈیٹر صاحب کو اپنے مضمون نگاروں کی دل شکنی اس طرح نہیں کرنی چاہیے۔ رسالے کی ظاہری حالت قابل تعریف ہے، لیکن طباعت کی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک صفحے کے اغلاط ملاحظہ ہوں۔ ص ۱۰۲ "جس کی ضرب تاکوں کے ہاتھ نہ رک سکی تھی" "روک" ہر چند اس نے حوصلہ کرنے کی لیکن دل تھا کہ "؟" تھی وہ چیزیں جو اس کی بے چینی کا باعث ہی ہوئی ہیں "تھیں"۔ "اتنے میں ٹن ٹن باہر گھڑی نے کچھ بجا دیا جسے وہ پھر کبھی نہ سکیگا۔ "سُن سکے گا"۔ اس صفحے میں املا کے اغلاط کے علاوہ چار غلطیاں ہیں، اگر اوسط فی صفحہ ۲ بھی رکھا جائے تو اغلاط کی تعداد ۲۰۰ ہوتی ہے۔ رسالے کا صحیح چھپوانا اگر ممکن نہیں، تو غلط نامہ ہی شامل کر دیا ہوتا، پڑھنے میں اتنی الجھن تو نہ ہوتی، یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غلطنامے کی صورت دیکھتے ہی بھڑک اٹھتے ہیں۔ لیکن سننے میں آیا ہے کہ اب اس کا علاج آسانی ہو جاتا ہے۔

دیدۂ حیرت

ایسے مقامات میں جو اردو کے مرکز سے دور ہیں مشاعروں کے منعقد کرنے سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ نئے لوگوں کو اردو سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے اور پرانے لوگوں کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ دیدۂ حیرت ایک گلدستہ ہے جو ڈھاکے سے وقتاً فوقتاً جناب خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب ذبیح کی نیاز مندی کی بدولت شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس میں خاص ڈھاکے کے باشندوں کے کلام کے علاوہ ان بیرونیوں کا کلام بھی چھپتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے آج کل وہاں مقیم ہیں۔ ذیل میں ہم ایک مشاعرے کی طرحی غزلوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں، کہ ناظرین کو ڈھاکے کی زبان اور وہاں کی طرز گفتار کا اندازہ ہو سکے۔

تم نہیں ہو گر وہ بُرا جانے	بیدآر	گر اپنا ہی مبتلا جانے
کہہ پڑھتے ہیں سب اس بُت کا	"	اس میں کیا بھید ہو خدا جانے
رام کر لو نگا دو ہی باتوں میں	"	دیکھیے ان کو جو تنک آ جانے
تم سے اظہار شان قدرت ہے	ذبیح	لے بر ترم ہو کیا خدا جانے

انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار کا ادبی رسالہ

معیار

(بانکی پور، پٹنہ)

مُرتب: قاضی عبدالودود

مُعاون: آرزو جلیلی

تصویر:- ڈاکٹر ابوالعلم نظام الدین پی ایچ ڈی صدر شعبۂ فارسی جامعۂ عثمانیہ

جلد ا شمارہ ۵ و ۶ — جولائی و اگست ۱۹۳۶ء

فہرست

شمار	مضمون	صفحہ
۱	معروضات ———	۲۶۵
۲	تعارف ———	۲۶۶
۳	یادرفتگاں — میکسم گورکی از آرزو جلیلی	۲۷۷
۴	وش گیاو کی ———	۲۸۰
۵	افسانے — ایک ہونہار نوجوان، از تماشائی	۲۷۹
۶	واپسی، از ولیم گراہارڈی (مترجمہ جناب محمد ادیب صاحب ایم اے)	۲۸۳
۷	عیاریاں، از و۔ و۔ جیکبس (مترجمۂ عطارد)	۲۸۸
۸	تمثیل — کیتھرین پارکر از موریس بیرنگ (مترجمۂ متعلم)	۲۹۰
۹	نظم — انقلاب روزگار، از پریم پجاری	۳۰۴
۱۰	اماناوریہ — مثنوی میرحسن در وصف قمر جواہر	۳۰۵
۱۱	کلام سلیمان ورقت وطالب	۳۱۱
۱۲	اوراق پارینہ — دیوان ہمایون از جناب حافظ شمس الدین احمد صاحب ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج	۳۱۳
۱۳	دریائے لطافت حصۂ عروض مصنفۂ قتیل از ق ع و	۳۱۶
۱۴	دیوان راسخ، از ق ع و	۳۱۷
۱۵	غالب — پنج آہنگ، از ق ع و	۳۲۱
۱۶	غالب کے دو لطیفے، از ق ع و	۳۲۳
۱۷	سراپا سخن اور غالب، از ق ع و	۳۲۴
۱۸	تذکرۂ سرور اور غالب، از ق ع و	۳۲۵
۱۹	بہار و بنگالہ — ایک ایرانی مجتہد عظیم آباد، از آقا بہبہانی (مترجمہ جناب ملک سعد الدین احمد لمعی صاحب ایم اے)	۳۲۶
۲۰	بنگالہ کا پہلا گلدستہ، نتیجۂ سخن از جناب حکیم حبیب الرحمن خان صاحب	۳۲۹
۲۱	مقالات — ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات از جناب ڈاکٹر ابوالعلم محمد نظام الدین پی ایچ ڈی (مترجمہ جناب مجیب اللہ صاحب بیل ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج)	۳۳۴
۲۲	سکندر اور ضحاک، از ق ع و	۳۴۴
۲۳	اندرسبھا کی متعلق چند غلط فہمیاں، از آرزو جلیلی	۳۵۰
۲۴	۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین ———	۳۵۴
۲۵	محاکمہ — دیوان حزین، از جناب یامین خان صاحب خیال	۳۶۰
۲۶	تبصرۂ سہیل از ؟	۳۶۱
۲۷	دریائے لطافت، از ق ع و	۳۶۱
۲۸	ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد، از ق ع و	؍؍
۲۹	شرف جہاں کا ایک شعر، از ق ع و	؍؍

محمد ظہیر الدین پرنٹر اور پبلیشر نے برقی پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر معیار واقع انجمن اسلامیہ ہال بانکی پور سے شائع کیا۔

شمار	عنوان	صفحہ	شمار	عنوان	صفحہ
۳۰	ہماری زبان ۔ جز اور جزو کی بحث از جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی صدر شعبہ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی	۳۶۳		صدیقی و جناب یاور حسن خان صاحب ندیال	
			۳۲	عالم ادب ———	۳۶۷
			۳۳	مطبوعات جدیدہ ۔ دیوان تاباں، از ن۔ م۔ ر	۳۶۹
۳۱	ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں "کو" کا استعمال از جناب ڈاکٹر محمد شہید اللہ ایم اے پی ایچ ڈی، استاذ ڈھاکہ یونیورسٹی و جناب ڈاکٹر عبدالستار	۳۶۶	۳۴	کلیم عجم از ؟	۳۷۵
			۳۵	استفسارات ——— از انبیکا پرشاد صاحب مولوی فاضل صدر شعبہ فارسی و اردو ہندو یونیورسٹی و قنطہ	۳۷۴

معذرت :- معیار کی پہلی جلد مکمل ہوگئی، اس میں ۴۴ صفحوں کی کمی ہے، جو اسی سال پوری کردی جائیگی، ہمیں افسوس ہے کہ معیار ابتداے اشاعت ہی سے وقت پر شائع نہیں ہو رہا ہے، ہم پوری کوشش کریں گے کہ ستمبر کا پرچہ ستمبر ہی میں نکل جائے اور آیندہ سے رسالہ ہر ماہ وقت مقررہ پر شائع ہو۔ اکتوبر، ستمبر کا معیار ۱۱۲ صفحات کے بجائے ۱۴۴ صفحات پر شائع ہوگا۔

شملہ کی برکھا :- ہمیں افسوس ہے کہ کاتب کی غلطی سے جس کا علم پرچہ کے تیار ہو جانے کے بعد ہوا، اس نظم کے بندوں کی ترتیب غلط ہوگئی، پانچویں بند "ہر ایک شکل برنگال، رکھتی ہے ندرت میں کمال" کے بعد یہ بند درج ہے "یعنی تہ آتش دھواں، حیرت کدہ اے مرداں" لیکن اس کے بند ہاے ذیل ہونے چاہئیں چھٹا بند: "چھپتے ہوے خورشید کی، افسونی جلوہ گری" ساتواں بند: "یہ سحر یا اعجاز ہے، یا اور کوئی راز ہے" آٹھواں بند: "فطرت کی نادر کاریاں، کیا کیا کرے کوئی بیاں" ان بندوں کے بعد نواں بند "میلا الٰہی تھا آسماں" دسواں بند "لو پھر برس کر کھل گیا" گیارہواں بند "کچھ طور والی بجلیاں" بارہواں بند "مستم تماشا کے لیے"۔

تصحیح :- ص ۳۰۵ "چمن گلے" درت میں مصور ہے۔ ندرت ص ۳۳۲ س ۱۰ اشاذہ = تلامذہ ص ۳۳۵ س ۱۱ "کا آخری" کی آخری س ۱۱ زمانے کی = زمانہ کی تعداد میں ص ۳۴۶ س ۱ لے لے کر = لے لے کے ص ۳۴۲ س ۲ یقین = تعین۔

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کی شاخ ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ چھپرا ضلع چلاموں میں سید رضا قاسم صاحب اور دوسرے اصحاب کی کوششوں سے انجمن کی شاخ قائم ہوئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اور مقامات سے بھی لوگ انجمنیں قائم کر کے صوبے کی مرکزی انجمن سے ملحق کرالیں گے۔

معروضات

معیار نے اپنی زندگی کے چھ مہینے پورے کر لیے۔ معاصرین نے اس کے متعلق حسن خیالات کا اظہار فرمایا ہو وہ نہایت حوصلہ افزا ہیں اور ہم اُن کے نہایت ممنون ہیں۔ بعض معاصرین نے معیار کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کے نقائص کی طرف بھی ہمیں توجہ دلائی ہے۔

ایک معاصر کو شکایت ہے کہ معیار کے اغلاط کتابت کی تصحیح کے لیے غلط نامہ شامل کیا جاتا ہے اور اغلاط کی تعداد بہت زیادہ ہے اس کے متعلق ہماری گزارش یہ ہے کہ ہمیں اس کا افسوس ضرور ہے کہ معیار اتنا صحیح نہیں چھپتا، جتنا ہم چاہتے ہیں لیکن، یہ خیال صحیح نہیں کہ اور رسالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں، ہم فخریہ نہیں، لیکن بیان واقعہ کے طور پر کہنا چاہتے ہیں کہ دو تین رسالوں کو چھوڑ کر، معیار سب سے زیادہ صحیح چھپتا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ دوسرے رسالے غلطیوں کی تصحیح کے لیے غلط نامے نہیں شائع کرتے، اس لیے سرسری نظر سے پڑھنے والوں کو غلطیوں کا علم نہیں ہوتا، اپنی غلطی کا اعتراف اور اعلان اگر جرم ہے، تو ہم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں۔

لاہور کے ایک انگریزی روزنامے کو، معیار کی زبان پسند نہیں، اس کی دانست میں ثقیل عربی اور فارسی الفاظ معیار میں بہت استعمال ہوتے ہیں، یہ امر قابل غور ہے کہ اردو کے کسی رسالے یا اخبار نے معیار پر یہ اعتراض نہیں کیا، بظاہر اس روزنامے کا تبصرہ نگار، اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جو اردو کی جگہ ہندوستانی کو رواج دینا چاہتی ہے، اور زبان سے، سوا ان عربی اور فارسی الفاظ کے جو عوام کی زبان پر ہیں، کل عربی فارسی الفاظ کو خارج کرنا چاہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سلیس و فصیح اردو نظم و نثر، عربی فارسی کا ایک لفظ داخل کیے بغیر لکھی جا سکتی ہے، لیکن، ہمارا دعویٰ ہے کہ بغیر ان دونوں زبانوں کی مدد کے، اردو میں سنجیدہ علمی اور ادبی مباحث پر ایک سطر لکھنا بھی ناممکن ہے، یہ بات دوسری ہے کہ عربی فارسی الفاظ کی جگہ، سنسکرت کے اجنبی الفاظ استعمال کیے جائیں۔

ایک رسالہ جس نے معیار کی خوبیوں کی، دل کھول کر، داد دی ہے، لکھتا ہے کہ بعض تبصروں میں تبصرہ نگاران معیار حد سے تجاوز کر گئے ہیں، مثال میں دیوان معروف، کا تبصرہ پیش کیا گیا ہے جس کے آخر میں، صفحے اغلاط کی تصحیح کی صرف ہو گئے ہیں۔ ہم اس رسالے کے فاضل مرتب کے نقطۂ نظر کا احترام کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ، معروف ایک مسلم استاد ہے جس کے کلام سے سند بھی دی جاتی ہے، اور جس کے اشعار اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے بھی ناقابل التفات نہیں، ایسے شاعر کے کلام کی تصحیح بے دیدہ ریزی کے تو نہیں ہو سکتی، لیکن ان لوگوں کے لیے جن کے پاس مطبوعہ دیوان موجود ہے، یا جو اس سے استناد کرنا چاہتے ہیں، ہرگز فائدے سے خالی نہیں اور یوں تو کتابوں کی تصحیح کیا، خود تمام کتابوں کے متعلق، اناتول فرانس کا قول ہے کہ کتابوں کے لکھنے سے کرم کلے کی کاشت کرنا زیادہ فائدہ مند ہے، اور اقبال کے نزدیک، ذوق سخن، کار بیکاراں ہے۔

"جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انھیں مذاق سخن نہیں ہے"

تعارف

میرحسن کی مثنوی جو ابکے شائع ہو رہی ہے، اس کے ابتدائی اشعار جون کے پرچے میں چھاپے گئے ہیں۔ میرحسن نے چھوٹی بڑی دس مثنویاں لکھی ہیں، ان میں چار اب تک غیر مطبوعہ ہیں، معیار کو تین مثنویوں کی اشاعت کا فخر حاصل ہوا ہے، لیکن ان کی صحت کا انتظام جیسا چاہیے نہ ہو سکا۔ کلیات کا صرف ایک نسخہ ہمارے پاس تھا اور وہ بھی بہت غلط لکھا ہوا، تصحیح کے لیے ہمیں مجبوراً محض قیاس پر بھروسا کرنا پڑا۔ کلیات حسن کے کئی قلمی نسخے ہندوستان میں موجود ہیں، کیا کوئی صاحب ان مثنویوں کی تصحیح کی طرف توجہ فرمائیں گے؟

طالب، سلیمان اور رقت کے اشعار دیوان صنعت سے ماخوذ ہیں، صنعت نے ان اشعار کی تضمین کی تھی، انہوں نے اس امر کی تصریح نہیں کی کہ یہ اشعار کن شاعروں کے ہیں، لیکن مقطعوں میں تخلص موجود ہیں اور قرائن کہتے ہیں کہ طالب، حافظ طالب رام پوری ہیں، سلیمان شہزادہ سلیمان شکوہ، اور رقت، قاسم علی شاگرد جرأت۔

بنج آہنگ کے جس نسخے کا ہم تعارف کرا رہے ہیں وہ ہمارے خیال میں پہلا اڈیشن تھا، لیکن مضمون کی کتابت کے بعد ہمیں مہیش پرشاد صاحب سے معلوم ہوا کہ اس سے قبل کا بھی ایک اڈیشن ہے اور یہ اس قدر کمیاب ہے کہ خود مہیش پرشاد صاحب کی نظر سے بھی نہیں گزرا ہے۔ اگر کسی صاحب کے علم میں اس کا کوئی نسخہ کہیں ہو تو براہ مہربانی ہمیں اطلاع دیں۔

آغا اصفہانی نے عظیم آباد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی ایک قسط ابھی باقی ہے، انہوں نے فیض آباد، لکھنؤ، مرشدآباد وغیرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی قابل دید ہے۔

حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب کے مضمون کی کتابت ہو چکی تھی کہ انہوں نے اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہا، معیار کی طرف سے جو نوٹ ہے، وہ اسی وجہ سے ص ۲۶۳ کی جگہ ص ۲۶۸ کے آخر میں آ گیا ہے۔ حکیم صاحب نے ان بہاری شعرا کی فہرست بھی بھیجی ہے جن کا کلام انہیں تیجۂ سخن میں ملا ہے، یہ فہرست ستمبر کے معیار میں شائع ہوگی۔

ڈاکٹر ابوالحلم نظام الدین نے اپنا مضمون انگریزی میں لکھا تھا، ہم جناب بیدل کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر اس کا ترجمہ کر دیا۔

اندر سبھا کے متعلق جو مضمون ہے اس میں نام کے تذکرے کی عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں ایک جگہ یہ الفاظ آئے ہیں "مثنوی میرانیس" ہماری رائے میں یہ کاتب کی غلطی ہے، "مثنوی میرحسن" ہونا چاہیے۔

"کیتھرین پارکر" اسی نام کی تمثیل کا ترجمہ ہے "عیاریاں" اور واپسی کے انگریزی نام "فرنڈز ان نیڈ" اور "دی مین ہو کیم بیک" ہیں۔

کلیم عجم کا تبصرہ بہت طویل ہو گیا، اس پر بھی تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ بہت سی باتیں لکھنے سے رہ گئیں۔

یادِ رفتگاں

میکسم گورکی

روس کے شہرۂ آفاق افسانہ نویس گورکی نے ۱۸ جون ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ اس کی پیدائش شہر نزنی نوگوروڈ میں ۲۸ مارچ ۱۸۶۸ء کو ہوئی۔ اس کا باپ رنگریز تھا۔ گورکی کے بچپن ہی میں اس کے والدین انتقال کر گئے۔ نو سال کے سن میں اس نے ایک جوتے کی دکان میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس نے باورچی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں تک جہاز پر کام کیا اور پھر مالی کا کام کرنے لگا۔ جب اس کا سن پندرہ سال کا ہوا، تو شہر قازان کے ایک اسکول میں اس نے نام لکھوایا۔ لیکن مجبوریوں کے باعث اسے اسکول سے علاحدہ ہو جانا پڑا۔ اب وہ نان بائی کا کام کرنے لگا۔

غرض گورکی نے ہمیشہ اسی قسم کی زندگی بسر کی۔ اسے باورچیوں، مالیوں، بھنگیوں، فقیروں، چوروں اور بدمعاشوں کے حالات پر غور کرنے کا کافی موقع ملا۔ گورکی نے اپنے ناولوں میں اسی قسم کے لوگوں کی زندگی کی مصوری کی ہے۔ اس نے اپنے کرداروں کے حالات اس فطری طریقے سے بیان کیے ہیں۔ اس کی تصانیف پڑھنے سے روس کے گنڈوں، بھنگیوں اور گنواروں کی زندگی کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

گورکی نے اس عہد میں جنم لیا جب روس میں ادبی اور سیاسی جد و جہد کا فقدان تھا۔ ترگنیف اور دوستووسکی کے انتقال کے بعد روسی ادب کا میدان سنسان ہو گیا۔ یہ کیفیت جنگ روس و جاپان کے زمانے تک قائم رہی۔ اسی بے حسی کے عہد میں روس نے چیخوف اور گورکی جیسے ادیب پیدا کیے۔ چیخوف اور گورکی کے افسانوں میں بہت نمایاں فرق ہے۔ چیخوف نے متوسط طبقے کے حالات لکھے ہیں۔ اس کے کرداروں میں ہمیں عموماً طلبہ، مدارس کے اساتذہ، تجار، مجسٹریٹ اور حاکم وغیرہ نظر آئیں گے۔ اس نے روس کے عہد بے حسی کا خاکہ کھینچا ہے، اس زمانے میں روسیوں کی یہ حالت تھی کہ انہیں کسی بات کی مطلق پروا نہ ہوتی تھی۔ ان کی بے حسی عروج پر تھی۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا۔ چیخوف کے افسانوں اور ڈراموں کے کردار اسی قسم کے بے حس لوگ ہیں۔

گورکی کے افسانوں میں کچھ اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔ کشمکش حیات کے فطری مناظر، سماج کے باغیوں کا حوادث سے سربگریباں رہنا! گورکی، روسی افسانے میں ایک نئے طرز کا موجد ہے۔ اس نے روسی زندگی کے ایسے پہلو پر توجہ کی، جس پر اس کے قبل کے افسانہ نگاروں نے مطلقاً غور نہیں کیا تھا۔ اسی باعث روسی ادب میں گورکی کی بہت زیادہ عظمت ہے۔

گورکی کا پہلا افسانہ "مکر چندرا" (Makar Chudra) ہے جو سارا گورکا زمانہ Kan Kaza...

میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں وہ شہر طفلس کے ریلوے کے کارخانے میں کام کر رہا تھا۔ گورکی کا اصل نام الکسی میکسیموویچ پیشکوف تھا۔ لیکن اس کا پہلا افسانہ "گورکی" کے نام سے شائع ہوا۔ اس نے اپنے افسانوں کے لیے یہی نام اختیار کر لیا تھا۔ آج تک وہ اسی نام سے مشہور رہے۔ ۱۸۹۵ء میں اس کا ایک افسانہ "چلکاش" شہر پیٹرس برگ کے ایک رسالے میں شائع ہوا۔ اس کے دو سال کے بعد اس کے مختصر افسانوں کا مجموعہ چھپا۔

گورکی کی ادبی زندگی، دو دور میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلے دور میں ۱۹۰۰ء تک اس نے صرف مختصر افسانے لکھے۔ ۱۹۰۰ء سے اس نے ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ اپنے ناولوں میں اس نے روسی زندگی کے نقشے کھینچے اور معاشرتی مسائل سے بحث کی۔ ۱۹۰۵ء میں اس نے روس کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۰۶ء میں نے اٹلی کے ایک شہر کیپری میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۱۳ء میں وہ روس واپس آیا اور پیٹرس برگ سے ایک رسالہ "لی ٹوپس" نکالا۔ تندرستی خراب ہو جانے کی وجہ سے ۱۹۲۲ء میں اسے جرمنی جانا پڑا۔ اس کے بعد اس نے سارینٹو (اٹلی کا ایک شہر) میں مستقل سکونت اختیار کر لی

اس کے چند مشہور ناولوں کے نام یہ ہیں۔ - بے خانماں (۱۹۰۲ء)، تین آدمی (۱۹۰۲ء)، ماں (۱۹۰۷ء)، ڈیکاڈنس (۱۹۲۵ء)، مقناطیس (۱۹۳۱ء)، اس کے اکثر ناولوں میں تعمیری خامیاں ہیں۔ لیکن اس نے روسی زندگی کی کامیاب مصوری کی ہے، اور اس کی ادبی عظمت محض ان خامیوں کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی مختصر افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں اس کے ڈرامے بالکل ناکام ہیں۔ اس نے اپنے حالات زندگی کئی جلدوں میں لکھے ہیں اور ایک روزنامچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دونوں اس کی بہترین تصانیف میں ہیں۔

ضمیر احمد عرش گیاوی

ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت رنج ہوا کہ ماہ جولائی میں جناب عرش گیاوی کا انتقال ہو گیا ہمیں مرحوم کے پس ماندوں سے دلی ہمدردی ہے، عرش مرحوم پرانی طرز کے خوشگوار کہنہ مشق شاعروں میں تھے، اور اس صوبے میں ان کا دم غنیمت تھا۔ نثر میں بھی رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے تھے، ابتدا میں انہوں نے چند غزلیں شمشاد کو دکھائی تھیں اس کے بعد تسلیم کے شاگرد ہو گئے ان کی تصانیف سے حیات تسلیم، حیات مومن اور دیوان عرش شائع ہو چکے ہیں بعض کتابیں اور بھی ہیں جو ابتک طبع نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

بے داغ الم دل میں پھولا نظر آیا
اس نخل میں پھول آنے سے پہلے ثمر آیا

اک تیر نکالا وہیں پیکان ستم نے
کچھ دیر کو بھی دل کا جہاں زخم بھر آیا

جی ہی تو ہے اپنا بھی چاہا اسے چاہا
دل ہی تو ہے ظالم جدھر آیا ادھر آیا

اب رات نہیں صبح کے آثار ہیں ظاہر
بیدار ہوئے عرش کہ وقت سفر آیا

افسانے

(۱) ایک ہونہار نوجوان از تماشائی (۲) واپسی از ولیم گرانڈی مترجمہ محمد ادیب صاحب ایم اے۔
(۳) حیاریان از و۔ و۔ جیکبس۔ مترجمہ عطارد۔

ایک ہونہار نوجوان

(از تماشائی)

میں جب ۱۹۲۲ء میں کیمبرج پہنچا تو وہ وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس کا دوسرا سال تھا اور میرا پہلا۔ کسی نے مجھے اس سے ملا دیا۔ اور اس نے مجھے ایک دن اپنے کالج لنچ پر بلایا۔ لنچ میں کچھ تکلف نہ تھا، وہی نفاست آمیز سادگی تھی جو کیمبرج کی زندگی کی جان ہے، میز پر شراب سپید کی ایک بوتل بھی تھی، قریب قریب پوری بوتل اسے خود ہی پینی پڑی، اس کے مہمان (تین تھے یا چار) یا تو بالکل پیتے ہی نہ تھے، یا محض رائے نام، لنچ کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ برج کھیلا جائے جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ میزبان نے یہ کہہ کر کہ میری ان کی ہار جیت ہیں، سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ اس نے کئی بار اپنے ساتھی سے اس بات کی معذرت کی کہ وہ شراب زیادہ پی گیا ہے، اور اچھی طرح نہیں کھیل سکتا، یہ معذرت مجھے اور میرے ساتھی کو قطعی غیر ضروری معلوم ہوئی، کیونکہ ہماری دانست میں اس نے نہ کبھی غلطی کی تھی اور نہ کسی غلطی کا پتا چلا، سات بجے شام کو کھیل موقوف ہوا تو میزبان اور اس کے ساتھی نے ہم دونوں سے سترہ سترہ شلنگ جیتے تھے، ہم دونوں نے جیب سے روپے نکال کر ادا کرنا چاہے، لیکن اس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ کل پھر کھیلیں گے، تم لوگوں کو انتقام کا موقع دینا چاہیے، آج تمہاری قسمت بڑی خراب تھی، یہ بات طے ہوئی کہ دوسرے دن غزنوی کے یہاں لنچ رہے اور لنچ کے بعد تاش کھیلا جائے، دوسرے دن بھی وہ رہا اور غزنوی ایک ساتھ ہو گئے، اور قسمت پھر ہمارے خلاف رہی، دونوں دن ملا کر ہم دونوں نے تیس تیس شلنگ ہارے جو ہم نے فوراً ادا کر دیے۔

اس کے بعد وہ ملنے برابر ملاقات ہوتی رہی، اس کا انداز مربیانہ تھا، لیکن وہ کوشش کرتا تھا کہ یہ بات ظاہر ہونے پائے، اس نے وہی مضمون لے رکھا تھا جو میں نے لیا تھا، وہ مجھے مشورے دیتا کہ کن لکچروں میں شریک ہوں، کن لکچروں میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں، کن سوسائٹیوں کا ممبر بنوں، لندن جاؤں تو کہاں قیام کروں، کس درزی سے کپڑے سلواؤں، کہاں جوتے بنواؤں، میں بھولا نادان سعادت مند کی طرح اس "پیر دانا" کی باتیں سن لیا کرتا تھا۔ حالانکہ عمر میں وہ مجھ سے سال دو سال کم ہی ہوگا۔

کیمبرج میں مجھے رہتے ہوئے جب کچھ دن ہو گئے اور ملاقاتوں کا دائرہ وسیع ہو گیا تو وہ لوگ جو اپنے کو مردم شناس سمجھتے ہیں، وہ ملکے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے، ایک صاحب مدتوں سے کیمبرج میں مقیم تھے، اس وقت تک کوئی امتحان انہوں نے نہیں پاس کیا تھا۔ جب ان سے کوئی ہمدرد اس بارے میں کچھ کہتا تو وہ پوپ کا مصرع پڑھ دیتے "دی پروپر اسٹڈی آف مین از مین" اور کہتے "آپ کو کیا معلوم کہ میں نے اتنے دنوں میں کیا کچھ سیکھا ہے، امتحان پاس کر لینا کوئی بڑی بات نہیں، اصل چیز مردم شناسی ہے۔" وہ ان کی نسبت میں پہلے سرے کا، خود غرض، کینہ اور اسنوب تھا۔ اور اس سے زیادہ اتحاد و عنصرے سے خالی نہیں۔

"تم نے کبھی اسے ڈسلوا کے ساتھ بھی دیکھا ہے؟ اس کے ساتھ ٹہلتا ہے تو واقعی اس کا قد ایک دو انچ بڑھ جاتا ہے۔ ایدھ سلوا ہے کہ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا، میاں ورما اگر وہ گالیاں بھی دے تو شیر مادر سمجھ کر پی لینے کے لیے تیار ہیں۔ اور سبب اس لیے کہ وہ کرکٹ بلیو ہے۔ آنگرے ورما کی ملاقات نہ تھی، ادھر اس کو آئی سی ایس میں کامیاب ہونا تھا، اور ورما کو علم ہوا کہ وہ میرٹ کی صوبے میں جانے والا ہے، اس نے اس سے جس طرح ممکن ہوا ملاقات پیدا کی اور خاطر مدارات سے اس قدر راضی کر لیا کہ اس کا سب سے بڑا دوست ہو گیا ہے، ایک بار کا تمہیں واقعہ سناؤں، آنگرے ایک دن کے لیے لندن گیا، وہاں جا کر بیمار پڑ گیا، ورما ہر دوسرے تیسرے کیمبرج سے اسے لندن دیکھنے جایا کرتا تھا اور جب نہ جاتا، خیریت کے لیے جوابی تار دیتا، مجلس میں سب لوگوں کے سامنے واڈیا نے اسے جس بری طرح ڈانٹا ہے، تم نے بچشم خود دیکھا ہوگا۔"

واڈیا ایک پارسی لڑکا تھا جو بڑے ٹھاٹھ سے رہا کرتا تھا جس واقعے کی طرف شرما نے اشارہ کیا تھا، اس کا شاہد میں بھی تھا۔ اس کا محل وقوع لائنز ہوٹل تھا جہاں اس زمانے میں انڈین مجلس کے ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے، ابھی باقاعدہ کارروائی نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ پریزیڈنٹ کی کرسی کے پیچھے واڈیا، کوسٹیلو، عزیزی وغیرہ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ورما اندر آیا، سب سے پہلے تپاک سے وہ واڈیا سے مخاطب ہوا اور بے تکلفانہ انداز میں "ہلو کیکی" کہا۔ کیکی، واڈیا کا پہلا نام تھا جس کی سوا اس کے خاص احباب کے کسی کو خبر نہ تھی۔ یہ سننا تھا کہ واڈیا نے نہایت غضب ناک ہو کر پوچھا: "سنو وھن ہیو آئی گون لوڈی رائٹ ٹو کول می بائی مائی فرسٹ نیم؟" (کب سے میں تمہیں اس بات کا حق دیا ہے کہ تم میرا پہلا نام لے کر مجھے پکارو؟) ورما تو بالکل ہکا بکا ہو گیا، ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا، لیکن کوسٹیلو کو جو واڈیا کا سب سے بڑا دوست تھا۔ یہ بات بہت ناگوار ہوئی، اور اس نے واڈیا سے کہا: "میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے اجازت کی ضرورت ہے، تمہارے بغل میں بیٹھنے کے لیے تو پہلے سے اجازت کی ضرورت نہیں! آؤ ورما، ادھر بیٹھو" کوسٹیلو واڈیا کے بغل میں بیٹھا تھا، اس نے اپنی جگہ خالی کر دی، اور ورما کو زبردستی وہاں پر بٹھایا، اس واقعے کے بہت دن بعد جب میں واڈیا سے بے تکلف ہو گیا تو اس کے واقعے کا میں نے ذکر کیا، اُس نے کہا کہ "میں اب بھی جب اسے یاد کرتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے کوسٹیلو کی خفگی بجا تھی، لیکن میرا غصہ بھی بے سبب نہ تھا، تم جانتے ہو کہ ساری دولت میرے والد کی پیدا کی ہوئی ہے، ان کا بچپن اور جوانی بڑی تنگ دستی میں کٹی ہے، انہوں نے میری تربیت خاص طور پر کی ہے، وہ بچپن ہی سے میرے کان میں یہ بات ڈالتے رہے ہیں کہ ان لوگوں کی قدر کروں جو بے غرض مجھ سے ملتے ہیں، اور غرض والوں کی دوستی پر بھروسا نہ کروں، ان کی یہ نصیحت رہی ہے کہ خوش آمد ہرگز بے وجہ نہیں ہوتی، اور ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی ڈرنے کی چیز ہے۔"

"بلشے تروپولی پوراترادنیستا" (وہ ضرورت سے زیادہ خوش اخلاق ہے، وہ ایماندار نہیں ہو سکتا) میں نے ایک فرانسیسی مقولہ اسے یاد دلایا۔

"یہ کس کا قول ہے؟ میرے دل کی بات چھین لی۔"

"مجھے مصنف کا نام یاد نہیں۔ لیکن، کیا تمہارا پہلا نام لے کر پکارنا بڑی خوش اخلاقی کی بات ہے؟"

• واقعہ تو یہ ہے کہ وہ ٹرسٹ کی بلڈنگ پر آخری ماہ سرما تھا، وہاں سے مجھ سے زیادہ ملاقات نہ تھی، سوا صاحب سلامت کے کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ ایک دن بڑے اصرار سے اس نے مجھے لنچ پر بلایا، مجھے انکار کی کوئی صورت نظر نہ آئی، میں نے قبول کر لیا۔ جس دن اس نے مجھے بلایا تھا، صبح ہی سے بڑی برف باری ہو رہی تھی۔ جی میں آیا کہ گھر سے باہر نہ نکلے، لیکن بادلِ ناخواستہ نکلنا ہی پڑا، میں نے اس کے یہاں پہنچ کر گھنٹی بجائی، لینڈ لیڈی کے بجائے تو وہ خود دروازہ کھولا، میرا اوور کوٹ اتار کر کھونٹی پر رکھا، اور کمرے میں لیجا کر سب سے آرام دہ کرسی پر آگ کے سامنے مجھے بٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے اور لوگوں کو بھی بلایا ہوگا۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے کھانا لانے کا حکم دیا۔ کھانا آیا، اتنا کھانا اور ایسا کھانا کیمبرج میں تو مجھے کبھی کسی نے نہیں کھلایا تھا، اس پر طرہ یہ کہ شیمپین کی بھی ایک بوتل تھی۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "سم پیپل آر بورن ود اے سلور اسپون ان دیئر ماؤتھ" (کچھ لوگ قسمت کے بڑے دھنی ہوتے ہیں)

"جی ہاں! دن کا وقت اور شیمپین! میں نے بہت منع کیا کہ بھئی دوپہر کا وقت ہے، لیکن وہ نہ مانا، اور مجھے بھی اس کی خاطر سے تھوڑی سی پینی پڑی۔ لیکن تم یقین کرو کہ شیمپین اور لنچ کی اس کی گفتگو کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہ تھی، تعجب نہیں کہ اسے سن کر میرا وزن بڑھ گیا ہو، یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن جب گفتگو میں بار بار یہ جملہ آنے لگا کہ "یو آر دی اونلی فرینڈ آئی ہیو"۔ ممکن ہے کہ یہ شیمپین کا اثر ہو، لیکن میں بھی تو آخر آدمی ہوں۔ اس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا، اور قہوے کی پیالی ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس سے رخصت ہو کر چلا آیا، اجازت اس نے بڑی مشکل سے دی تھی، لیکن میری طبیعت کا انداز یہ تھا کہ اگر وہ اجازت نہ بھی دیتا تو اُسے میں چھوڑ کر چلا آتا، مجھے چاہیے تھا کہ میں اسے اپنے یہاں بلاتا، لیکن بلانا تو بڑی بات ہے اس کے سلام کا جواب بھی بڑی رکھائی سے دیا کرتا تھا، اس کے بعد اس کا اس قدر بے تکلف ہونا میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے نہایت ناگوار معلوم ہوا اور مجھ سے وہ حماقت سرزد ہوئی جس پر اب تک شرمندہ ہوں۔"

دوما کی حمایت کرتے ہوئے میں نے شرما کو یہ جواب دیا "آخر تمہارا اعتراض کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ دوما کی دوستیوں میں غرض کا پہلو شامل ہوتا ہے اور ان کی بنیاد اتحادِ ذوق پر نہیں، یہ کوئی بڑی بات نہیں، آگے چل کر تم، ہم سب یہی کریں گے، دوما اگر سچ پوچھو قابلِ مبارکباد ہے کہ اسے اس کم سنی ہی میں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ چڑیوں کا شکار ایک ہی پتھر سے ہو سکتا ہے، دوستی کو اگر اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے تو اس میں کیا مضائقہ کیا ہے؟ یہ انسانوں کی عام کمزوری ہے۔"

شرما کی نصیحت کے باوجود میں دوما سے ملتا رہا۔ اس نے وقتاً فوقتاً مجھ سے روپے بھی قرض لیے اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا۔ زمانہ جوں جوں گزرتا گیا مجھے بھی اس کا احساس ہوتا گیا کہ دوما بددیانت نہیں، لیکن پرلے سرے کا کائیاں اور خود غرض ضرور ہے۔ ایک بار تعطیل میں قطعی فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ علیم اور میرے ساتھ ویسٹ بورن چلے گا لیکن عین وقت پر اس نے انکار کر دیا کہ "میں سومرز لینڈ جا رہا ہوں" انگریز سے میں نے لاکھ کہا کہ میں تم سے اور علیم سے ویسٹ بورن جانے کا وعدہ کر چکا ہوں، لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے جرم کے استخفاف میں یہ دلیل پیش کی "تم جانتے ہو انگریز نیاب جا رہا ہے اور مجھ پر سرپرستی کرتی ہو۔ اس کی دوستی میرے لیے بڑی منفعت کی

میں جانتا ہوں کہ تمہارا اور حلیم کا مجھ پر زیادہ حق ہے۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں"۔ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ تھا، لیکن اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ میرا اس کا ساتھ لندن میں بھی رہا۔ پہلی بار جو میں اس کے ساتھ تھیٹر گیا، تو میری ٹکٹ بھی اسی نے خریدی۔ دوسری بار میں اسے اپنے خرچ سے تھیٹر لے گیا۔ تیسرے مرتبہ، اس نے ٹکٹ خریدنے کی آمادگی تو ظاہر کی، لیکن اس کا ہاتھ جیب کی طرف اتنا آہستہ آہستہ جا رہا تھا، کہ سنیما کی سلو موشن پکچرز کا لطف آ رہا تھا، جب تک وہ بٹوا نکالے میں نے ٹکٹ خرید لی تھی۔ چوتھی بار غلطی سے وہ بٹوا گھر ہی بھول آیا تھا، پانچویں مرتبہ جو اس نے تھیٹر ساتھ چلنے کی تحریک کی تو میں نے کہہ دیا کہ میرے پاس کافی روپیہ نہیں۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "تم بہت تکلف کرتے ہو، تمہارے پاس نہیں ہیں تو کیا ہوا، میرے پاس تو ہیں"۔

ورما کو کیمبرج سے ڈگری مل گئی، لیکن قانون کے امتحان باقی تھے۔ اس نے کہا تھا کہ دو برس اور رہوں گا، لیکن اس نے امتحان جلد ختم کر لیا اور ایک برس کے اندر ہی ہندوستان واپس چلا گیا۔ اس کو پانچ چھ مہینے گزرے تھے کہ ایک دن پٹی کوری میں شرما سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہنٹر کی دکان سے باہر نکل رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جو بعد میں معلوم ہوا کہ ہیرالڈ لوسکے ڈراموں کا انگریزی ترجمہ ہے۔ شرما مجھے پٹی کوری ہی کے کسی قہوہ خانے میں لے گیا، اور ملازمہ کو قہوہ لانے کا حکم دینے کے بعد یوں گویا ہوا۔

"تمہیں ورما کا آخری کارنامہ بھی معلوم ہے؟" میں نے جواب دیا کہ ہندوستان جاتے وقت وہ مجھ سے ملا بھی نہیں۔ شرما نے دریافت کیا کہ میرے روپے تو اس کے ذمے نہیں نکلتے تھے۔ یہ صاف بات تھی کہ شرما کو ورما کی ایمانداری میں شک تھا۔ اور میں نے اس کے شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کی۔

"وہ بات نہیں، ورما میں اور جو کچھ برائیاں ہوں، وہ معاملہ تھا، مجھ سے اس نے بارہا قرض لیا، اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا"

"تم نے کبھی انگریزوں کا یہ مقولہ بھی سنا ہے۔ "آنسٹی از دی بسٹ پالیسی"۔ ایمانداری کسی اخلاقی اصول پر مبنی نہ تھی، وہ محض اپنی ساکھ قائم کرنا چاہتا تھا کہ بعد میں اچھی طرح لوٹنے کا موقع ملے، تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ چلنے کے وقت کیمبرج کے مختلف دکانداروں سے اس نے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ کی چیزیں خریدیں، اور ایک پیسا ادا کیے بغیر ہندوستان روانہ ہوگیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسے موقع ملا ہوگا تو اس نے لندن کے دو چار دکانداروں کو بھی چرکے دیے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی دکانداروں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ قرض کا بیوپار نہ کیا جائے۔ مجھے یہ بات چھ سات روز ہوئے پہلی بار ایک ٹیلر کے یہاں معلوم ہوئی۔ میں نے وہاں پندرہ سولہ شلنگ کی ٹائیاں اور موزے خریدے تھے اور تین قمیصوں کا آرڈر دیا تھا، ڈیمس نے میرا آرڈر تو لکھ لیا، لیکن نہایت ادب سے کہنے لگا کہ "قیمت آپ اسی وقت ادا کریں گے یا جس وقت چیزیں آپ کے یہاں پہنچ جائیں گی؟" میں نے کہا کہ "میں کوئی نیا خریدار تو ہوں نہیں، آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" میری آواز ذرا بلند ہوگئی تھی۔ منیجر قریب ہی تھا، وہ اور قریب آگیا، اور اس نے مجھ سے کہا کہ "مسٹر شرما ذرا تکلیف کر کے آپ میرے آفس میں چلیں"۔ میں منیجر سے اچھی طرح واقف تھا، اس کے ساتھ آفس میں گیا تو اس نے ورما کا قصہ بیان کیا: "ورما تین برس مسلسل اس دکان سے چیزیں خریدتا رہا، اور کبھی اس نے بل کے ادا کرنے میں ایک دن کی بھی دیر کی

کیمبرج سے ڈگری لینے کے بعد اس نے ان لوگوں کو کہہ دیا تھا کہ ابھی قانون کے امتحانات میں شریک ہونا ہے اکیمبرج میں ابھی دو سال قیام اور رہیگا۔ باوجود اس کے کہ اب یونیورسٹی کا ممبر نہ تھا، اس کا اعتبار اتنا تھا کہ یہ لوگ برابر اسے اُدھار دیتے رہے ہندوستان جانے سے قبل ورما نے تیس پونڈ کی چیزیں کچھ بنوائیں اور کچھ بنی بنائی مول لیں۔ بل جب اس کے مکان پر بھیجا گیا تو لینڈ لیڈی سے معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان چلے گئے ہیں۔ ورما کے بتائے ہوئے پتے سے اس وقت تک تین چار خط بھیجے جا چکے ہیں، لیکن وہ خط اس وقت تک واپس آچکے ہیں، ڈاکخانے والوں کو مکتوب الیہ کا پتا نہیں ملتا۔ میں نے خود رجسٹر منگوا کر دیکھا، ورمانے رہتک کا پتا دیا تھا، حالانکہ رہتک سے اس کو کوئی تعلق نہیں، میں نے منیجر سے کہا کہ تم حق بجانب ہو، اور آج سے میں تو عہد کرتا ہوں کہ بھولے سے بھی کسی دکان سے کوئی چیز ادھار نہ منگواؤنگا۔ منیجر نے مجھ سے بہت معذرت کی اور یہ کہا کہ یہ حکم آپکے لیے نہیں، آپ دکان سے حسب دستور چیزیں منگوا سکتے ہیں، لیکن میں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھانا منظور نہ کیا، اس کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہارڈوک، پلنڈریتھ، بیز، ایڈمس، ہرسل، ولکسنز، ہنفرا، شرٹ سب کے ساتھ ورمانے یہی سلوک کیا ہے، ان کے علاوہ اور دکانداروں کو بھی اس نے لوٹا ہے، کہاں تک سب کا نام لوں، میری تحقیقات ابھی مکمل نہیں، ہنفرا کا تو ابھی پتا چلا ہے، اب آپ فرمائیں کہ ورما کی ایمانداری کے متعلق، آپ کی کیا رائے ہے" ؟

میں نے ایک لمبا چوڑا خط ورما کو لکھا، ورمانے فوراً جواب دیا جو ذیل میں درج ہے۔ بعض فقرے حذف کر دیے گئے ہیں:۔

" تمہاری شکایت بجا ہے، ہندوستان 'جنت نشان' جو لوگ اسے جنت نشان کہتے ہیں میں ان کے تخیل کی مسرت پر حیران ہوں، کی فضا ہی ایسی ہے، جسمانی اور ذہنی دونوں حیثیت سے یہاں آکر انسان بالکل پل پلا ہو جاتا ہے ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور حوصلے پست ہو جاتے ہیں، تم میرے والد صاحب سے نہیں ملے، بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، لیکن ذرا سی کسر ہے کہ قوت متخیلہ سے بالکل محروم ہیں، انہوں نے میری تعلیم میں پچیس تیس ہزار روپے صرف کیے، واپسی پر قانون کی کتابیں منگوا دیں اور وہاں کو مٹ جاتا رہا کراد یا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ محض میری وجہ سے لاہور میں قیام اختیار کیا، اس کے بعد انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی، اور میں چھ مہینے کے اندر شادی لال، شیخ فضل حسین نہ بن جاؤں تو یہ میرا قصور ہے، تفصیل کہاں تک لکھوں، مختصر یہ ہے اگر والدہ صاحبہ کی مہربانی نہ ہوتی تو ورما کو عبداللہ کے بدلے ٹینی سگریٹ پینے پڑتے اور کلب کا خرچ نکالنا تو قطعاً ناممکن ہوتا، سن چکے میری داستان! پھر بھی شکایت کرو گے کہ میں نے خط نہیں لکھا ؟

اب اپنی اور شکایتوں کا جواب سنو:۔ دکانداروں کو دھوکا دینے کی میری نیت نہ تھی، جس وقت چیزوں کا میں نے آرڈر دیا بنک میں میرے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ موجود تھے، ایک تو والد صاحب ہی نے سفر کے اخراجات کے لیے کافی روپے بھیجے تھے دوسرے یہ کہ میں نے والدہ صاحبہ کو لکھ کر اور روپے منگوائے تھے، کیمبرج سے روانہ ہونے سے ایک دن قبل میں نے لائیڈز بنک سے کل روپے نکال لیے اور اپنا کھاتا بند کرا دیا، ارادہ تھا کہ دکانداروں کے روپے اسی وقت جا کر ادا کر دوں، لیکن گھڑی دیکھی تو یہ معلوم ہوا کہ لنچ کا وقت آگیا ہے، میں نے اس کو تیسرے پہر کے لیے اٹھا رکھا" اور لنچ پر سوار ہو کر چیری ہنٹن روڈ پہنچا۔ گھر آکر جو دیکھا

واپسی

از ولیم گرانڈی — ترجمۂ محمود ادیب صاحب

مجھے جس عورت نے چائے پر بلایا تھا وہ نہایت حسین تھی۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اس بات کو ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس کے باپ کے سامنے اس کی تصویر جو میرے ذہن میں ہے بالکل ماند پڑ گئی ہے۔ اس کا باپ غضب کا ذہین تھا اور اس کا دماغ بڑی سرعت کے ساتھ کام کرتا تھا۔ یہ لوگ ایک سفید رنگ کے مکان (ولا) میں رہتے تھے جو فاگ کے دوسرے کنارے پر سمندر سے قریب پان کے جنگل کے درمیان تھا۔ تورن سے وہاں پہنچنے میں کشتی کے ذریعے آدھ گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔

وہ میرے آنے کے دو ہی ایک لمحے کے بعد آیا۔ وہ نہایت ضعیف اور بیمار تھا۔ اس کی مونچھ نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ زیر پایاں جو خواب گاہ کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کے پاؤں میں تھیں اور اس کا گدّی دار جیکٹ گلے تک بند تھا۔

یہ معلوم کرکے کہ میں ناول لکھتا ہوں اس نے خوش اخلاقی سے ادبیات کے متعلق گفتگو کرنا ضروری سمجھا وہ اپنی معلومات کا اظہار بڑے تقنعے کے ساتھ کر رہا تھا نہ اسے کوئی چیز روک سکتی تھی اور نہ کوئی اس کی گفتگو میں مداخلت کر سکتا تھا۔ اس کی بی بی بھی شاعرہ ہونے کی مدعی تھی، اس نے کئی بار اس بات کی قابل رحم کوشش کی کہ مجھے اپنے متعلق اخبارات کی حوصلہ افزارائیں دکھائے، لیکن بالکل بے سود۔ بڈھے کو بہت کچھ کہنا تھا، اور ایک ذوقِ ادب رکھنے والے جوان کے سامنے اپنی واقفیت کی نمایش کا جو موقع اسے ملا تھا اُسے اپنی بی بی کی خود نمائی کی خاطر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بی بی کے اشعار جیسا کہ اس نے مجھے بتایا، محض ادنیٰ درجے کے تھے۔ وہ بہت سخت بیمار تھا۔ اور ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ بولنا اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود خاموش رہنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس کے بعد ہی وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر کہتا تھا: معاف کیجیے گا، میں ذرا لیٹا ہوں، میں ذرا ٹھیک ہو جاؤں گا: اس کی بی بی ایسے ہی موقع پر کود پڑتی تھی، اور اپنی نظموں کا ذکر کرنے لگتی تھی لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں بڈھا صوفے پر اپنے پاؤں کو سمیٹ کر بیٹھ گیا، اور پھر سلسلۂ گفتگو شروع ہو گیا۔ عہد ایلزبیتھ کا وہ سرا شاعر جس کا میں دلدادہ ہوں ۹۰ اس کا علم حیرت انگیز تھا، اس کے علمی وسعت کل مالک پر حاوی تھی اور بالکل ابتدا کے زمانے سے شروع ہوکر موجودہ زمانے پر ختم ہوتی تھی، انگریزی ادب میں چاؤسر کے وقت سے ڈیوڈ گھارنٹ کے وقت تک کے مصنفین سے اسے واقفیت تھی غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ انگریزی ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ پڑھنے میں وہ ایک ایک لفظ سمجھ لیتا تھا لیکن انگریزی الفاظ کا تلفظ اس کے لیے مشکل تھا، اگر اتفاقاً کوئی لفظ اس کی زبان پر آتا تو اس کا تلفظ غلط ہوتا تھا اس کا علم مجھے نہایت صحیح اور اس کی ناقدانہ رائیں منصفانہ معلوم ہوئیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ مواد

کی فراوانی کی وجہ سے وہ کسی مصنف کے کمالات ذاتی کے متعلق اظہار رائے کی بجائے یہ پتا چلانے کی کوشش کرتا تھا کہ اس پر کس کس کا اثر ہوا ہے۔

صوفیانہ شاعری کا ذکر آیا، تو میں نے اس کی رائے بقائے رُوح کے متعلق دریافت کی۔ وہ رُک گیا، جیسے وہ خود پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھا تھا، اس سے پہلے وہ ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں ہوا تھا، اس کی بی بی نے چہرے ہی کہا کہ "میں نے اپنی نظروں میں کوشش کی ہے......" لیکن بڈھے کے جوش و خروش نے اسے ٹھنڈا کر دیا: "نہیں نہیں اس کا قائل ہوں

* صدمہ ہوگا اس قدر مشقت سے جمع کی ہوئی علمی پونجی میرے مرجانے کے بعد خاک میں مل جائیگی۔ میں نے نہ تو کوئی کتاب لکھی ہے، نہ کبھی ان کے متعلق کوئی لکچر دیا ہے۔ میری عمر ملازمت میں گزری ہے: (وہ فرانسیسی کونسلر سروس میں تھا) اور مجھے شاذ و نادر ہی ایسے ذہین لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جو میرے علم سے مستفید ہو سکتے۔ مجھے ایسے مواقع بھی کم ملے کہ میں اپنا علم دوسروں کے سامنے ظاہر کرتا، اس علمی سرمایے کا ایک لفظ بھی میرے بعد نہ بچیگا اور اگرچہ مجھے اس کا صدمہ ہوتا ہے۔ مگر نوشتۂ قدرت کے مقابلے میں سوائے سر جھکانے کے چارہ ہی کیا ہے، اس پر بھی میں کتب بینی سے باز نہیں آتا۔ میں پڑھتا اس لیے ہوں کہ میں علم کا پیاسا ہوں، اور اس ضعیفی میں میرے لیے یہی ایک واحد ذریعہ تفریح ہے باوجودیکہ میری موت کے دن قریب آتے جا رہے ہیں، میں پڑھے جاتا ہوں، بلکہ یہ معلوم کر کے کہ میری زندگی اب تھوڑی ہے میں اور زیادہ کتب بینی کرتا ہوں، انتہائی عجلت کے ساتھ مجھے ان باتوں سے آگاہی حاصل کرنی ہے جن سے میں اب تک نابلد ہوں، سوتے سوتے وقت تک پڑھتا رہتا ہوں، صبح کو اٹھنے کے ساتھ ہی پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ہوں اور دن بھر پڑھا کرتا ہوں، کبھی کبھی میں اپنے آپ سے یہ سوال بھی کرتا ہوں کہ اب جب کہ میں سال دو سال سے زیادہ جی نہیں سکتا کیا کتابوں کے مطالعے سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟"

ایک برس کے بعد جب میں اس سے پھر ملا تو، اتنا بیمار تھا کہ بیٹھے بیٹھے بات چیت نہیں کر سکتا تھا، اور اس نے مجھ سے اجازت چاہی کہ لیٹے ہی لیٹے گفتگو کرے۔ دوران گفتگو میں وہ کبھی کبھی یکایک قلب پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور چپ چاپ ہو جایا کرتا تھا، افاقے کے بعد پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتا "کومیڈی آف ہیومرس (ظرافیانہ تمثیل) تو فرسودہ تھی، لیکن یہ خیال کہ سیرت کی انفرادیت امارے سے نمایاں ہو جاتی ہے، بلاشبہ صحیح تھا، اور موزوں کے سے وقت پسند مصنف جانتے تھے کہ محض کسی بات کے دہرانے سے نازک خصوصیات بھی ظاہر کی جا سکتی ہیں۔"

"اب تم سنتا، میں ہندوؤں کی ایک نظم کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے سناؤں گی، مجھے یقین ہے کہ مسٹر......"
لیکن وہ بولتا ہی رہا: "شیلی کی شاعری کا موضوع مابعد الطبیعیات ہے، لیکن میں فرانسس ٹامسن کے ہونڈ آف ہیون (آسمان کا شکاری کتا) کو میں صوفیانہ نظم سمجھتا ہوں، اور اسپنسر کی فیری کوئین (پریوں کی ملکہ......) اس نے لکھے

[illegible]

کچھ ماہ قبل یکا اور وہ منٹ تک خاموش رہا۔ جب اسے افاقہ ہوا تو اپنی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ میرا کتب خانہ مکمل ہے۔ یہ خیال کرکے بڑی اذیت ہوتی ہے کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔ ابھی ایسی کتابیں بھی ہیں جو میں نے اب تک نہیں پڑھیں اسی وجہ ہے کہ میں رات دن پڑھتا رہتا ہوں۔ مجھے وقت کا مقابلہ کرنا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی ہوس ہے۔ لیکن یہ خیال کہ میں ایسی کتابیں چھوڑ جاؤں جو میری نظر سے نہیں گذری ہیں میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ کتابیں میری نظر میں انسانوں کی طرح ہیں۔" اس نے اپنے مصنوعی دانتوں کو جو کسی سرکش چڑیا کی طرح جسے کسی نے پنجرے میں بند کر رکھا ہو، ہر وقت باہر نکلے آتے تھے۔ بڑی کوشش سے درست کیا۔ اور پھر گویا ہوا

"اگر ہماری روح موت کے بعد باقی رہتی ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنا بہشت اپنے دل کی خواہش کے مطابق بنانے کا موقع دیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو میرے بہشت میں بڑے بڑے ہوا دار کمرے ہوں گے۔ جہاں بے شمار کتابیں ہوں گی، ان گنت کتب خانے، جہاں میں ہمیشہ کتابیں پڑھتا رہوں اور تنگیٔ وقت کی کبھی شکایت نہ ہو۔"

"لیکن کس قسم کی کتابیں؟ یہی کتابیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں، بہت سی کتابیں ابھی ایسی ہیں جنہیں میں مرنے سے قبل ختم نہیں کر سکتا، وقت قریب آتا جاتا ہے۔"

میں رخصت ہو رہا تھا کہ اس نے میز پر جو پارسل رکھا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"فارسی شاعری۔"

"یہی کتابیں ہیں؟"

"ابھی تک پارسل کھلا نہیں، پھر ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔"

اس کے بعد جو میں گیا تو رات کا وقت تھا مینہ پڑ رہا تھا (میرے چند دوستوں نے جو خاکنائے پر مقیم تھے مجھے مدعو کیا تھا دعوت کی تاریخ مجھے غلط یاد تھی اور وہ آخری گاڑی جو ٹورون جاتی تھی چھوٹ گئی تھی) ملازم نے کہا کہ بیبیاں شہر کو گئی ہیں اور غالباً آدھی رات سے پہلے واپس نہیں آئیں گی۔ میں کتب خانے میں ان کے انتظار میں ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مجھے قدموں کی آہٹ نے چونکا کر دیا، یہ آنے والا وہی بڈھا تھا جو وہی لباس پہنے تھا جس میں پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا، چاند کی روشنی میں جو برآمدے کے شیشوں سے گزر کر اندر آ رہی تھی یہ ضعیف شخص بھوت کی طرح سفید معلوم ہو رہا تھا۔ یہ اپنی خواب گاہ سے کتب خانے میں کوئی کتاب لینے آیا تھا میں کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی ٹھہر کر مجھے دیکھنے لگا۔ بعد ازاں الماری کی طرف جا کر اس نے دو بڑی بڑی جلدیں نکالیں۔ اور پھر دروازے سے باہر چلا گیا۔ میں نے سمجھا کہ یا تو اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں، یا وہ خواب کی حالت میں یہاں چلا آیا تھا یا بیماری نے اس کی بینائی کو کم کر دیا تھا۔

لنچ کے وقت جب اس کی بی بی اپنی لڑکی کے ساتھ ٹورون سے واپس آئی تو میں نے اس سے کہا: "آپ کے شوہر غضب کو

کتابیں لینے کے لیے نیچے اُترے تھے، لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے، یہ سن کر وہ مجھے تعجب کے ساتھ گھورنے لگی، "وہ تو تین ہفتے ہوتا ہے جب کہ ان انتقال کر گئے۔"

"میں نے تو رات انہیں دیکھا تھا، وہ دو کتابیں کتبخانے سے نکال کر ساتھ لے بھی گئے۔"

ہم لوگ فوراً اس بات کی تحقیقات کے لیے کتبخانے میں گئے۔ اس کی بی بی نے ان جلدوں کی خالی جگہ کو فوراً دیکھ لیا۔ اور فہرست دیکھ کر ان دونوں کتابوں کے نام بھی معلوم کر لیے۔ یہ لارڈ بائرن کے خطوط تھے، پہلی اور دوسری جلد

یہ ہے سارا قصہ۔ میں اس واقعے پر کوئی رائے زنی نہیں کرتا۔ بلکہ من و عن حالت جو کچھ دیکھی۔ بیان کر دیتا ہوں، اگر آپ لوگ مجھے مخبوط الحواس سمجھتے ہیں، تو مہربانی فرما کر کسی ڈاکٹر سے میرا طبی معائنہ کرائیے، اگر ڈاکٹر دیکھ بھال کے بعد مجھے صحیح الدماغ قرار دے اور آپ اس بنا پر یہ سمجھیں کہ اس کا دماغ خود مختل ہے تو پھر اس کے لیے کسی پروفیسر کو بلائیے۔

خاتم "ہونہار نوجوان"

ہوں تو جیب میں بٹوا نذارد، کسی نے جیب سے نکال لیا۔ یا خود بخود گر پڑا۔ لنچ کھانے کا کسے حواس تھا، فوراً گھر سے نکلا اور پیرس اسٹیشن تک بٹوا تلاش کرتا ہوا گیا، لیکن نہ معلوم کہاں گرا تھا، کچھ پتا نہ چلا۔ اس کے بعد میں نے فوراً لوٹ کر ڈپٹی آفس کو اطلاع دی اور پولیس کو بھی خبر کر دی کیمبرج اور لندن دونوں جگہ کا پتہ دے دیا کہ اگر پتا چلے تو مجھے فوراً اطلاع دیجئے، دوسرے دن سخت پریشانی کے عالم میں لندن پہنچا، بجائے اس کے کہ کیمبرج میں کسی سے قرض لوں یا لندن میں کسی کو تکلیف دوں، میں نے گھر تار دیکر ۲۰ پونڈ اور منگوائے، ٹکٹ میں نے پہلے ہی سے خرید رکھا تھا، لندن میں دو چار روز اور ٹھہر سکتا تھا لیکن طبیعت بالکل اچاٹ تھی جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو گیا، پیرس میں بھی نہ اترا، سیدھا مارسیلز پہنچا اور جہاز پر سوار ہو گیا، دکانداروں کو روپے ادا کرنا خارج از بحث تھا، ڈیڑھ سو پونڈ محض کم ہو جانے سے تو آرزو جاتی رہی خیال آیا کہ چیزیں واپس کر دوں، لیکن کل سامان میں نے پہلے ہی لندن روانہ کر دیا تھا، اور وہ چیزیں جو خاص میری فرمائش سے بنی تھیں وہ دکانداروں کے لیے بیکار بھی تو تھیں، تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا کرتے؟ یہ اعتراض کہ میں نے اصلی پتا نہیں بتایا بہت مضحکہ خیز ہے، میرے والد صاحب جن کا ذکر میں نے کیا تھا کہ رنگون ہی میں تھے، اب پنشن لیکر لاہور میں مقیم ہو گئے ہیں، اور جنگ کا خطرہ اگر لاہور پہنچے تو میرا کیا قصور؟ تم میرا پتا سب کو دے دو تاکہ جس جس کے یہاں جانا ہو، میری طرف سے اطمینان دلا دو کہ جہاں تک جلد ممکن ہوگا میں روپے ادا کر دونگا۔ آنگرا بھی لکھنے میں ہے، اس کے اجلاس میں میں کئی بار کام کر چکا ہوں، لیکن اب وہ آنگرا نہیں۔ تفصیل کسی دوسرے وقت، تمہارے واپسی کے دن بھی اب قریب آگئے تمہیں اگر زیادہ تکلیف نہ ہو تو دو تصویریں لیتے آنا، قیمت میں یہاں آ جاؤگے تو ادا کر دونگا، ایک تو وہ تصویر ہے جو میں نے منی کے ساتھ کھنچوائی تھی دوسرے اس ڈرائنگ روم کی، جو میں نے ہی کیمبرج سے رخصت ہونے کے وقت آویزاں کر دیا تھا، میں یہ دونوں تصویریں ساتھ لایا تھا، لیکن راستے ہی میں وہ بکس ہی غائب ہو گیا جس میں یہ تصویریں تھیں.....؟ میں نے یہ خط شاہ کو سنایا، وہ دیر تک جنستا رہا، سب سے ہنسی سے افاقہ ہوا تو میں نے اُس سے پوچھا: "تمہارا پیر اندیلو اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟ وہ اپنا ساندہ بھائی بھائی ہیں؟" "تو مجھے علم نہیں کہ پیر اندیلو کیا کہیگا، لیکن یہ کیا خود جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کیا سمجھتا ہے، اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ علم قبی جاہل تھے، لیکن میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے۔

عیّاریاں

از ڈبلیو. ڈبلیو. جیکبس — مترجمہ عطارد

جوزف گبس نے رڈ لائن (شراب خانے کا نام) کے پرائیوٹ بار (شراب خانے کا وہ حصہ جہاں زیادہ ہجوم نہیں ہوتا) میں اپنا نصف پائنٹ اتنا ٹھہر ٹھہر کے ختم کیا کہ گویا یہ آخری گلاس ہے جو وہ پی رہا ہے اور اس کی خبر نہیں کہ آئندہ کہاں سے آئیگا۔ اس نے گلاس کو تختے پر رکھا، پڑیے سے تمباکو نکال کر پائپ بھرا اور اپنے ساتھیوں کی طرف رُخ کرکے سر ہلانا شروع کر دیا۔

"صبح دس بجے سے یہ پہلا گلاس ہے جو میں نے پیا ہے"۔ اس نے کرخت آواز میں کہا۔

"ہمت ہارنی نہیں چاہیے" جورج براؤن نے مشورہ دیا۔

"یہ حالت ہمیشہ نہ رہیگی" بوب کڈ نے ہمت بڑھانے کے لیے کہا۔

"میں کسی سے کچھ مانگتا تو ہوں نہیں، صرف یہ چاہتا ہوں کہ کام ملتا رہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ میں کام چاہتا ہوں افلاس نہیں" گبس نے زور دار لہجے میں کہا

"ان دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے"۔ براؤن نے جواب دیا۔

"بعض لوگوں کے لیے تو خاص طور پر مشکل ہے" کڈ نے اضافہ کیا۔

"کہہ لو، جو جی چاہے کہہ لو، میں بھلا مانس یا بُرا تمہیں کیا کام! لطف پائنٹ بیر پلائی ہے نہ۔ تمہارا حق ہے! کل دوبار جی میں آیا کہ زبان یہ تو دیکھوں کہ پانی میں ڈبکی لگانے میں کیا لطف ملتا ہے"۔ گبس اداس ہو کر زبان لایا۔

"بہت سے لوگ ڈوب کر جان دیدیتے ہیں"۔ براؤن نے سوچ کر کہا۔

"اور بی بی بچوں کو فاقہ کشی کے لیے چھوڑ جاتے ہیں"۔ گبس نے بڑی رکھائی کے ساتھ اضافہ کیا۔

"اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ بی بی کی حالت پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے، کچھ اور نہ سہی تو ایک کھانے والا ہی کم ہو جاتا ہے۔ چندے سے بھی کچھ نہ کچھ وصول ہی جاتا ہے۔ بڑھا بل مرا تو کنگز ہیڈ (شراب خانے کا نام) میں یاروں نے جلد کر کے سترہ پونڈ اس کی بی بی کے لیے جمع کر ڈالے"۔ اس کے دوست نے جواب دیا۔

"تمہاری بڑھیا کے لیے اس سے زیادہ بہتر حال رہیگا، بال بچے تو ہیں نہیں، بڑے آرام سے گزریگی، کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں خودکشی کی ترغیب دے رہا ہوں" کڈ نے کہا۔

گبس کی پیشانی پر بل آگیا، گلاس کو ٹیڑھا کرکے اس کے اندرونی حصے کو دیکھنے لگا۔

"میاں جو پانی میں ڈوبنے والے لوگوں میں نہیں، یہ ہوتی تو . . ." براؤن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
گبس کا قد تو صرف ۵ فیٹ ۲ انچ تھا، لیکن وہ تن کر کھڑا ہو گیا، اور اپنے دوست پر خشم آلود نگاہیں ڈالنے لگا۔
"میں یہ سوچتا ہوں کہ ڈوب مرنے کی بالکل ضرورت نہیں، صرف اس کو شہرت دے دینا کافی ہے، اس کے بعد جو چندہ ہو وہ آپس میں بانٹ لیں۔" کڈ نے یہ تجویز پیش کی۔
"ہاں ہاں، تین حصے برابر کر لیں گے، مگر اس کی صورت کیا ہو گی؟" براؤن نے سوال کیا۔
"ارے میاں تھوڑی بیر اور پیو، کوئی نہ کوئی بات سوچ ہی لیں گے" کڈ بولا جو فرطِ جوش سے پیلا پڑ گیا تھا۔ تین گلاس بیر اور منگوائی، کڈ اور براؤن نے تو اپنے اپنے کوزے اٹھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا، لیکن گبس اپنے کوزے کے دستے سے کھیلتے ہوئے بولا۔
"میں وعدہ نہیں کرتا۔ یہ نہ سمجھو کر بیر پی کر میں اپنا قول دے رہا ہوں، جو تم سب باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔" کڈ نے کہا۔
گبس راضی نہ ہوتا تھا، لیکن بیر آتی رہی، اور اپنا کام کرتی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ کل باتیں آپس میں طے ہو گئیں، دوسرے دن براؤن دو تین دوستوں کے ساتھ اسی شراب خانے میں بیٹھا تھا کہ کڈ طوفان کی طرح داخل ہوا۔ اس کے جسم سے پانی ٹپک رہا تھا۔
وہ ایک بنچ پر پڑ گیا اور زور زور سے سانس لینے لگا۔
"کیا ہوا؟ کیا بات ہے"۔ کئی آدمیوں نے پوچھا۔
"جو بیچارہ ڈوب گیا! میں اسٹمہ کے لکڑی والے گھاٹ کو اپنی جگہ سے ہٹا رہا تھا کہ جو مدد دینے کے لیے آ گیا۔ وہ اسے پانی سے دھکیل رہا تھا کہ . . کڈ بولتے بولتے یکایک رک گیا، اس پر لرزہ طاری تھا۔ وہ بیر کا ایک کوزہ جو کسی نے اس کی نذر کیا تھا، آہستہ آہستہ پینے لگا، اس درمیان میں رانڈی کا ایک گلاس آ رہا تھا، جو اس کے لیے کسی دوست نے منگوایا تھا۔
"یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا، جب تک میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر پہنچوں، وہ تیسری بار نیچے جا رہا تھا میں نے نیچے جھک کر اسے پکڑ لیا کالر اور ٹائی میرے ہاتھ میں آ گئی، میں خود گرتے گرتے بچا" کڈ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
کڈ نے کالر اور ٹائی لوگوں کو دکھائی۔ وہ سرے سے گرسٹ کوٹ کے بیچ والے بٹن تک بھیگا ہوا تھا۔ لوگوں کو یہ بات پسند آئی کہ اس نے اپنے دوست کو بچانے کی کوشش کی۔
"یہ غریب تو ابھی آدھا گھنٹہ ہوا یہیں تھا" شراب خانے کے مالک نے کہا۔
ایک گاڑی والا بولا کہ "اب اسے بیر پینا نصیب نہ ہو گا"۔
"یہ کون کہہ سکتا ہے! میں نے کبھی کوئی بات اس کے خلاف نہیں سنی، جہاں تک میں جانتا ہوں وہ اچھی زندگی بسر کرتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اب وہ بیر نہیں پیے گا" مالک شراب خانہ نے تند ہو کر جواب دیا۔

اس نے کڈ کو برانڈی کا ایک چھوٹا گلاس اپنی طرف سے دیا، اور یہ پوچھا کہ بی بی بچے تو نہیں چھوڑے؟

"بی بی کے سوا اور کوئی نہیں، اس بیچاری کے پاس یہ خبر کون لے جائیگا؟ وہ تو اس پر جان دیتی تھی، اس کی بسر اوقات کا کیا سامان ہوگا؟ مجھ سے تو جو کچھ ہو سکتا ہے کرنے کو تیار ہوں"۔ کڈ نے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں"۔ براؤن بولا۔

گاڑی والے نے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ "کچھ کرنا ضرور چاہیے"۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ پولیس کا کوئی آدمی مسز گبس کو بھی خبر کر دیگا۔ ان لوگوں کو مشاہرہ اسی کا ملتا ہے"۔ مالک شراب خانہ نے تجویز پیش کی۔

"یہ حادثہ اس قدر اچانک ہوا ہے کہ میرے تو اوسان جاتے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے گھر میں ایک دھیلا بھی نہ ہوگا جو کے دوستوں کی کمی نہیں، روپے کا کسی۔ کسی طرح سامان کرنا چاہیے" کڈ نے کہا۔

"میاں، پہلے پولیس کو تو اطلاع دو، اور باتیں پیچھے ہوتی رہیں گی"۔ مالک شراب خانہ نے ہونٹ دباتے ہوئے کہا۔

کڈ نے گرم جوشی سے شکریہ ادا کیا اور براؤن کے ساتھ تھانے میں گیا۔ پولیس نے اس خبر کو اس طرح سنا کہ گویا بالکل معمولی واقعہ ہے۔ یہ دیکھ کر ان دونوں کو بڑا اطمینان ہوا اور تیزی سے لندن برج سے گزرتے ہوئے ایک پست قامت شخص کی طرف چلے جو بورو مارکٹ میں ایک کھمبے سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا

"کہو کیا ہوا"؟

"سب ٹھیک ٹھاک ہے، ہم لوگوں نے بیج لگا دیا ہے"۔ کڈ نے جواب دیا

"کیا لگا دیا ہے؟" گبس نے دریافت کیا۔ کڈ نے سب باتیں سمجھائیں۔

"جب تک یہ درخت اُگے اور پھل پھول لائے، میرا کیا حشر ہوگا؟ سونے کا کیا انتظام ہوگا، اور کھانا کہاں سے ملے گا؟ میں گھر تو جانے سے رہا"۔ گبس نے کہا۔

براؤن اور کڈ نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، دوسری باتوں نے انہیں اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ وہ ان باتوں کو بالکل بھول ہی گئے تھے۔ گبس کی عادات کے طویل اور عمیق وہ تجربے نے انہیں سمجھا دیا کہ معاملات کا رخ کس طرف ہے۔

"تمہیں سونے کا انتظام دو ماہ کے اس بارے میں کرنا پڑیگا کسی قہوہ خانے میں یا کہیں اور جگہ مل رہیگی اور تمہارا سا چلتا پرزہ اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو اس کے لیے پیسے حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں"۔ براؤن نے دھیمی آواز سے جواب دیا۔

گبس ہنسنے لگا۔

"یہ خیال رہے کہ اس دوران میں جو روپے ہم لوگ تمہیں قرض دینگے وہ تمہیں اپنے حصے میں سے واپس کرنا ہوگا، اور یہی یاد رہے کہ

جب تک تم اپنی مونچھیں نہ منڈواؤ گے، ایک وسیلا تمہیں نہیں مل سکتا۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی تمہیں پہچان لے، اور راز طشت از بام ہو جائے۔" کڈ نے ہنسی کے جواب میں جھنجھلا کر کہا۔

گبس اپنی پیٹھ کھمبے سے اڑائے تقریباً آدھ گھنٹے تک اپنی مونچھوں کے لیے روتا رہا۔ بڑی رد و کد کے بعد وہ راضی ہوا۔ دونوں دوست اسے حجام کی دکان میں لے گئے اور بڑے غصے اور بیدلی سے اس نے داڑھی مونچھ دونوں مونڈ دینے کی درخواست کی۔ گبس نے اپنے بے ریش و بروت چہرے کو آئینے میں دیکھا تو اس کی افسردگی اور بڑھ گئی، تعجب سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، کڈ اور براؤن کی خوش اخلاقی پر ان کا تحیر غالب آگیا۔

• اب یہاں آگیا ہوں تو سر کے بال بھی کٹوا لوں"۔ گبس نے دیر تک اپنے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

• اور شیمپو بھی؟" حجام نے سوال کیا۔

• جیسی تمہاری خوشی، کچھ ہے کیا بُرا؟" گبس نے جواب دیا۔ اس کے مالی مددگار ہزار مخالفت کرتے رہے لیکن اس نے ایک نہ سنی۔

جب تک حجامت ہوتی رہی، اس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس حیرت میں ہے کہ کس عذاب میں مبتلا ہوا۔ جب اس سے فراغت ہوئی تو اس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ طبیعت بہت ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ گویا ایک بڑا بوجھ سر سے اترا۔ دوستوں نے اس اطلاع کو کامل خاموشی کے ساتھ سنا۔ تھوڑی دیر تلاش کرنے سے انہیں ایک شراب خانہ مل گیا جہاں زیادہ شور و ہنگامہ نہ تھا۔ اس کے ایک گوشے میں بیٹھ کر ان لوگوں نے مالیات کی ایک کمیٹی قائم کر لی جو انہیں تینوں پر مشتمل تھی۔

• ہر دست تمہارے لیے یہ کافی ہوگا، مگر یہ نہ بھولنا کہ یہ سب تمہارے حصے میں سے کاٹا جائے گا۔" براؤن اور کڈ نے گبس کو کچھ نقد دیتے ہوئے کہا۔

گبس نے جواب میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "میں روز شام کو یہیں ہوں گا، ملنا چاہو تو یہیں ملاقات ہوگی۔ بیئر یہاں کی بہت اچھی ہے۔ اب تمہیں مسز گبس کے پاس جانا چاہیے"۔ گبس نے کہا۔

دونوں دوست اس سے رخصت ہو کر مسز گبس سے ملنے چلے۔ جب مکان کے قریب آئے تو انہیں ایک چھوٹا سا مجمع نظر آیا۔ انہیں یہ دیکھ اطمینان ہوا اور یہ خیال گزرا کہ مسز گبس کو پہلے ہی خبر مل چکی ہوگی۔ دونوں کو تھے پر پہنچے، وہاں مسز گبس ہاتھ میں ایک بھیگا ہوا رومال لیے ہوئے نظر آئی۔ اس کے ارد گرد اس کی جان پہچان کے لوگ بیٹھے تھے۔ خفیف آواز میں اس نے کڈ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے گبس کو بچانے کی کوشش کی۔

• کوٹ ابھی تک خشک نہیں ہوا" براؤن نے کہا۔

• مجھ سے جو ہو سکتا تھا میں نے کیا، گبس کے سے دوست کہیں ملتے ہیں"۔ کڈ نے جواب دیا۔

"بیچارہ ہر وقت مصیبت زدوں کی مدد کو تیار رہتا تھا۔" براؤن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ایک شخص نے اس کی تائید کی۔

"اب ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے، اگر ہم اس غریب کی کچھ بھلائی نہیں کرسکتے، تو اس کی بی بی کی تو مدد کرسکتے ہیں" کڈ نے جوش کے ساتھ کہا۔

کڈ براؤن کے ساتھ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور وہ ایک آدمی جن سے نگاہیں چار ہوئیں، انہیں اس نے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا، رفتہ رفتہ اس کے پیچھے ایک اچھا خاصہ مجمع ہوگیا اور سب کے سب رڈ لائن کی طرف چلے۔
تین چار دن دونوں دوستوں نے بڑی محنت کی، اس مضمون کے کارڈ تقسیم کیے گئے کہ ڈلائن میں مسٹر گبس کی مدد کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوگا۔ ایسی حکایتیں جن سے مرحوم کے اوصاف حمیدہ اور اطوار پسندیدہ پر روشنی پڑتی تھی، ہر کہہ ومہ کو سنائی گئیں۔ وینیگ کو بعد از وقت احساس ہوا کہ اس کا ایک بڑا محسن جو نیکیاں کرتا تھا، لیکن خود منظر عام پر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا ہے۔
گبس اپنی عزلت گاہ میں اپنے دوستوں کی سرگرمیوں کا حال بڑے ذوق وشوق سے سنتا تھا، اس کے دوستوں کو یہ معلوم کرکے بڑی الجھن ہوئی کہ وہ خود بھی جلسے میں موجود رہنا چاہتا تھا، اور جب اس نے منہ میں کالک لگا کر حبشی مطرب کا روپ بھر کر اہل مجلس کے سامنے گانے پر اصرار کیا تو کڈ کو اسے زبردستی باہر لے جانا پڑا۔۔۔۔۔

"اس کے دماغ کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں، اس نے ضرورت سے زیادہ روپے ہم لوگوں سے وصول کیے ہیں، اب اسے ایک کوڑی نہیں دینی چاہیے۔" براؤن نے راستے میں کڈ سے کہا۔

"وہ شاہانہ زندگی بسر کر رہا ہے اور ہم لوگ غلامی کرتے کرتے مرے جا رہے ہیں۔ میں نے تو اسے کبھی اتنا موٹا تازہ نہیں دیکھا، اسے ہم لوگوں کے برابر حصہ لینے کا کوئی حق نہیں، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کے سوا، اس نے کیا ہی کیا ہے" کڈ بولا۔

اس کی بدمزاجی جلسے کی رات تک قائم رہی، جلسہ ایک ماہی گیر جس نے گھڑ دوڑ میں خوب روپے بنائے تھے اور اس کے دوستوں کی بدولت خوب کامیاب رہا، آمدنی منتظمین کی توقعات سے کہیں زیادہ ہوئی، ماہی گیر نے ابتدا ہی میں تشتری میں پانچ پاؤنڈ کا ایک نوٹ رکھ دیا، یہ دیکھ کر سامعین نے اس قدر گہری سانس لی کہ چندہ جمع کرنے والے کو اپنی ذمہ داری ایک بوجھ سی معلوم ہونے لگی۔ مسٹر گبس مرحوم کے مداحوں نے ۲۰ پونڈ ۱۲ شلنگ اور ۳ پنس کی صورت میں خراج تحسین ادا کیا۔

"ایک حصہ بارہ پونڈ سے زیادہ ہوتا ہے۔ بات اتنی اچھی ہے کہ مشکل سے اس پر یقین ہوتا ہے" کڈ نے خوش خوش رخصت ہونے کے وقت اپنے ساتھی سے کہا۔

کام ختم ہو گیا تھا۔ دونوں کو گبس سے ملنے کے لیے شام کا انتظار تھا، شام ہوئی تو کڈ براؤن کو لنڈن بر نا کے اُس پار لے گیا۔ کڈ، براؤن سے جو لطیفی مزاج کا تھا۔ گز دو گز آگے تھا۔ گبس وہیل رائٹ آرمس میں اپنی پرانی جگہ پر موجود تھا، بچ شدہ رقم سے وہ خوش نہیں ہوا، بلکہ اس نے اشارۃً کہا کہ اگر مجھے اس معاملے میں حصہ لینے دیا جاتا تو اس سے زیادہ رقم وصول ہوتی۔

"میں نے جو زحمت گوارا کی ہے اس کا یہ کافی معاوضہ نہیں"۔ اس نے اپنا سر ہلا کر کہا۔ "یہاں تنہائی میں میرا جی نہیں لگتا۔ جو رقم مجھے تمہیں دینی ہے، اس کے علاوہ جب تم اپنے حصے لوگے تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا"۔

"میں تم سے کسی دوسرے وقت گفتگو کروں گا"۔ کڈ نے کہا، اور اس کو تیز نگاہوں سے دیکھا۔ "اب تمہیں ہمارے ساتھ دریا کے اس پار چلنا چاہیے"۔

"کس لیے؟" گبس نے پوچھا۔

"قبل اس کے کہ تمہاری بی بی اس رقم کو خرچ کرنا شروع کرے جو اس کی ملک نہیں، ہم اُسے یہ خوش خبری سُنانا چاہتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔" کڈ نے کہا۔ "اور ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی ہم لوگوں کے قریب ہی کہیں پر رہو، کیونکہ شاید وہ ہماری بات کا یقین نہ کرے"۔

"یہ خبر یکایک نہ سنا دینا"۔ گبس نے کہا "ہم نہیں چاہتے کہ وہ رونا پیٹنا شروع کردے، یا اسی قسم کا کوئی اور کام کر بیٹھے میں اس کی حالت سے جس قدر واقف ہوں، تم نہیں ہوسکتے، اور میں تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ سہولت سے کام لو"۔

وہ ان لوگوں کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گیا، اور ذرا تامل کے بعد عینک لگانے پر بھی راضی ہو گیا تاکہ کچھ اس کا سوانگ مکمل ہو جائے، یہ عینک کڈ کی ساس کی تھی، وہ آٹھ بجے صبح سے اُسے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے پریشان تھی۔

"تم دس منٹ تک یہیں پر ٹھہرو"۔ کڈ نے مونومنٹ کے قریب پہنچ کر کہا۔ "اس کے بعد ہم لوگوں کے پیچھے پیچھے آؤ۔ جب تم روشنی کے کسی کھمبے کے قریب سے گزرو تو رومال سے منہ چھپا لو، اور سڑک کے کنارے ہم لوگوں کا انتظار کرو"۔

کڈ براؤن کے ساتھ تیزی سے چلنے لگا لیکن جب دونوں مسز گبس کے مکان کے پاس پہنچے تو ان کی چال حد سے زیادہ دھیمی ہو گئی۔ مسز گبس مکان پر تنہا تھی اور رسمی گفتگو کے بعد اس نے ان لوگوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔

"میں تو غریب ہو کے لیے اس سے بھی زیادہ کرتا"۔ براؤن نے کہا۔

"ابھی تک وہ ملے تو نہیں؟" بیوہ نے پوچھا۔

کڈ نے اپنا سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ ان کی تلاش بیکار ہے"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"دریا کا دھارا بہا لے گیا"۔ براؤن نے کہا اور کڈ کی افتتاحی تقریر کا مقصد فوت کردیا۔

"وہ جہاں بھی ہو، اچھی ہی حالت میں ہوگا"۔ مسز گبس نے کہا۔ "اب نہ بے کار رہنے کی پروا ہے نہ کسی قسم کا تردد ہے، نہ تکلیف ہم سب کو ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا ہی پڑے گا"۔

"ہاں" کڈ نے کہنا شروع کیا: "مگر......."

"میری خواہش یہ ہرگز نہیں کہ وہ واپس آجائے۔" مسز گبس نے کہا۔ "ایسی خواہش رکھنا ارتکاب گناہ کے برابر ہے۔"

"لیکن کو، خود واپس آجانا چاہیے۔" کڈ نے بات کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اور روپے کو خرچ کرنے میں تمہاری مدد کرے۔" براؤن نے اپنے دوست کی غضب آلود نگاہوں کی بالکل پروا نہ کی۔

مسز گبس متحیر ہو گئی۔ "روپے خرچ کرنے کا کیا مطلب ہے؟" اُس نے کہا۔

"فرض کرو۔" کڈ نے کہا "تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ وہ ڈوبا ہی نہ تھا۔ میں نے کل رات کو خواب دیکھا ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

"میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔" براؤن نے کہا۔

"وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔" کڈ نے رقت آمیز آواز میں کہا

"جب وہ کہنے لگا، جاؤ اور میری بی بی سے کہہ دو کہ میں زندہ ہوں، یہ خبر ذرا نرمی سے سنانا۔"

"حرف بحرف یہی بات اس نے مجھ کو بھی خواب میں کہی" براؤن نے کہا۔ "تعجب کی بات ہے"!

"بڑے تعجب کی بات ہے"۔ مسز گبس نے کہا۔

"میرا خیال ہے" کڈ نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا "کہ تم نے تو اسے خواب میں نہ دیکھا ہوگا؟"

"نہیں، میں کبھی شراب نہیں پیتی۔" بیوہ نے کہا۔

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا، کڈ نے معاملے کو انجام تک پہنچا دینے کا ارادہ کر لیا۔

"اگر جو اس دروازے سے مکان کے اندر آجائے تو تم کیا کرو گی؟" اس نے پوچھا۔

"میں چیخ کر مکان کی بنیاد ہلا دوں گی۔" بیوہ نے برجستہ جواب دیا۔

"چیخ چیخ کر مکان کی بنیاد ہلا دو گی؟" کڈ نے کہا۔

مسز گبس نے اپنا سر ہلایا "میں چیخوں گی، پاگلوں کی طرح چیخوں گی"۔ اس نے تیقن کے لہجے میں کہا۔

"لیکن اگر وہ زندہ ہوگا، جب تو نہ چیخو گی؟" کڈ نے کہا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ تم کیا چاہتے ہو"۔ مسز گبس نے کہا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتے، جو تو ڈوب کر مر چکا ہے، تم تو یہ جانتے ہی ہو، تم نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور پھر بھی تم مجھ سے خواب کی باتیں کر رہے ہو"

کڈ نے اس کی طرف جھک کر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔ "وہ بچ گیا" اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "وہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے"!

"کیا؟" مسز گبس نے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"یہ بالکل سچ ہے، اتنی ہی سچی، جیسی یہاں پر میری موجودگی" مسٹر کڈ نے کہا "یہ بات سچ ہے نہ جھوٹ ہے"

"سچ سے بھی زیادہ سچ ہے" مسٹر براؤن نے ایک وفادار دوست کی طرح کہا۔
مسز گبس نے گہری سانس لی "زندہ!" اس نے کہا۔ "لیکن کس طرح؟ وہ زندہ کیوں کر ہو سکتا ہے"؟
"اس قدر زور سے نہ بولو" کڈ نے اس سے گزارش کی۔ "اگر کوئی دوسرا سن لیگا تو تمہیں وہ رقم واپس دے دینی پڑے گی"۔
"اگر وہ مجھے واپس مل جائے تو میں اس رقم سے بھی زیادہ قربان کرنے کو تیار ہوں" مسز گبس نے جوش میں آکر کہا۔ "شاید تم مجھے دھوکا دے رہے ہو"۔
"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں" کڈ نے کہا۔ "وہ قریب ہی ہے۔ اگر تمہارے چیخنے کا خوف نہ ہوتا تو میں ابھی جا کر بلا لاتا"
"نہیں نہیں، وہ زندہ ہے تو میں چلانے کیوں لگی، تم اسے ساتھ ہی کیوں نہ لائے؟ وہ ہے کہاں؟ مجھے اس کے پاس لے چلو" مسز گبس نے کہا۔
"اتنی بے قرار نہ ہو، ہر بات اپنے وقت پر ٹھیک ہوتی ہے، میں ابھی اسے لے آتا ہوں، لیکن، اچھی طرح یاد رکھو چیخو گی تو سب کام خراب ہو جائیگا" کڈ نے براؤن کو مسرت آمیز تبسم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ خوش خوش کمرے سے باہر نکل کر نیچے اترا۔ مسز گبس نے براؤن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور منہ کھولے ہوئے انتظار میں دروازے کے پاس کھڑی رہی۔ تین چار منٹ گزر گئے۔
"آگئے، چیخنا چلانا نہیں!" براؤن نے سیڑھی پر آواز سن کر کہا۔
مسز گبس پیچھے ہٹ گئی، یہ دیکھ کر سب خوش ہوئے کہ وہ بالکل خاموش تھی، کڈ اس کے شوہر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، لیکن وہ منتظرانہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھتی ہی رہی۔
"وہ نہیں آئے؟" مسز گبس نے پوچھا۔
"یہی تو ہیں، تم پہچانتی بھی نہیں؟"
"سوسی، میں ہی تو ہوں" گبس نے کہا۔
"مجھے سمجھنا تھا کہ تم لوگ مذاق کر رہے، یہ بے رحمی کی انتہا ہے، تم لوگوں سے کیوں کر یہ بات ہو سکی" مسز گبس نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا اور کرسی پر گر پڑی۔
کڈ نے غصے میں گبس کو دھکیل دیا "وہی تو ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اب مونچھیں نہیں ہیں، تم سسکیاں لیکر چیخو نہیں، لوگ چلے آئیں گے"۔
"ابھی یہاں سے اسے ہٹا لے جاؤ، ایسا مذاق کسی دوسری دل شکستہ سے جا کر کرو" مسز گبس نے کہا۔
"تمہارا شوہر ہی تو ہے" براؤن بولا۔
"ابھی اسے یہاں سے لے جاؤ" مسز گبس نے چیخ کر کہا۔

کڈ نے دانت پیستے ہوئے سوچنے کی کوشش کی اور گبس سے مخاطب ہو کر اس نے دریافت کیا: "تمھارے بدن پر کوئی نشان تو نہیں؟"

"بالکل نہیں، میرا بدن ہر قسم کے داغ دھبے سے پاک ہے، میرا بدن اتنا ہی سفید...." گبس نے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"بس بس، بدن کی باتیں نہ کرو"

"میں دس تک گنتی ہوں، اگر اس درمیان میں تم لوگ یہاں سے نہیں چلے گئے، تو میں چلاؤں گی۔ ایک آبرودار عورت کے سامنے تمھیں کیوں کر جرأت ہوئی کہ اپنے بدن کا ذکر کرو اب جاتے ہو یا نہیں؟ ایک! دو! تین! چار! پانچ!" ہر بندے کے ساتھ اس کی آواز اونچی ہوتی گئی، سب سے پہلے خود گبس اٹھ کر چلا اور اس کی تقلید اس کے دوستوں نے بھی کی۔

"تھوڑی دیر میں گھر بھر کو خبر ہو جاتی، اور پھر ہماری مٹی پلید ہونے میں کوئی کسر نہ رہتی، میں پہلے ہی خیال کر رہا تھا کہ مونچھیں نہیں منڈوانی چاہییں۔ اس نے مجھے کبھی بغیر مونچھوں کے دیکھا ہی نہیں، ابھی میرا لڑکپن ہی تھا کہ مونچھیں نکلنی شروع ہو گئی تھیں، وہ میرے لڑکے...." گبس اپنی پیشانی آستین سے پونچھتے ہوئے بولا۔

"بکو نہیں!" کڈ نے چیخ کر کہا۔

"بس جناب عالی، اب میں آپ کا حکم ماننے کا نہیں۔ آج ہی مونچھیں بڑھانا شروع کر دیتا ہوں۔ وہ مونچھوں کے بغیر پہچاننے والی نہیں۔ اور اب میں زیادہ دنوں تک گھر سے باہر نہیں رہ سکتا" گبس نے اس انداز سے کہا کہ گویا اب وہ کسی کی جھاڑ پھونک سننے والا نہیں۔

"گبس ٹھیک کہتا ہے، باب" براؤن نے تیقن کے ساتھ کہا۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس کی مونچھیں نہ نکلیں ہم انتظار کریں اور اسے کھلاتے پلاتے رہیں؟" کڈ نے غصے ہو کر کہا۔

"میرے حصے سے تمھیں سب کچھ واپس مل جائیگا مگر، میں کچھ نہیں کیا جانتا، جو تمھاری خوشی ہو کرو۔ اگر اس معاملے کو یہیں پر ختم کرنا چاہتے ہو تو میں اس پر بھی راضی ہوں۔" گبس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

براؤن اپنے دوست کڈ کو جو غصے سے بھوت ہو رہا تھا، الگ لے گیا اور دونوں میں آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں۔ گبس اس درمیان میں بے پروائی کے انداز سے کھڑا ہوا سیٹی بجا رہا تھا۔

"مونچھیں کتنے دنوں میں بڑھیں گی؟" کڈ نے

گبس نے اپنے کاندھوں کو حرکت دی: "ٹھیک ٹھیک کہنا مشکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں دو یا تین ہفتے کافی ہونگے۔ اگر اس پر اس نے نہ پہچانا تو ایک آدھ ہفتہ اور سہی۔"

"تمہارے حصے میں سے کچھ باقی نہ رہیگا، اس کو یاد رکھنا۔" کڈ نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"نہ سہی، بار بار اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" گبس نے کہا۔

اس کے بعد ہفتے بھر تینوں خاموش رہے۔ دو ہفتے تک ہر شب دونوں دوست آکر یہ دیکھتے کہ کڈ کی شکل میں کتنا تغیر ہوا ہے، انہیں بڑا رنج اس کا تھا کہ تغیر کی رفتار اس قدر سست کیوں۔

دو ہفتے گذر گئے، تو کڈ نے کہا کہ "آج کی رات آزمائش کرنی چاہیے" "میں قرض دیتے دیتے تنگ آگیا ہوں"

گبس نے دانشمندانہ انداز میں یہ مشورہ دیا کہ جہاں اتنے روپے قرض دیے ہیں، تھوڑا اور سہی، لیکن کڈ اپنی بات پر اڑا رہا۔

"اب مونچھیں اتنی ضرور نکل آئی ہیں کہ تمھاری بی بی تمھیں پہچان لے۔ ہمیں دوسرے لوگوں سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ کل رات کو آٹھ بجے مونومنٹ میں ملنا اور پھر اس معاملے کو ختم کریں گے" کڈ نے سختی کے ساتھ جواب دیا۔

"جو حکم ہو"۔ گبس نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"اپنی ٹوپی خوب نیچی کر کے پہننا کہ آنکھیں اچھی طرح نہ معلوم ہوں، وہ عینک بھی لگا لینا جو میں نے تمھیں دی ہے اور ہاں خوب یاد آیا، لال فلالین کا ایک ٹکڑا بھی منھ پر لپیٹ لینا" کڈ نے سختی کے ساتھ اپنے احکام دیے۔

"رہنے بھی دو، میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، تمہاری ہدایت کی ضرورت نہیں۔ میں شرط بدتا ہوں کہ اگر کل رات کو تم دونوں میں سے کسی نے بھی مجھے پہچان لیا تو میں سب کو بیئر پلاؤں گا، ورنہ تمھیں پلانی پڑے گی" گبس نے کہا۔

شرط قبول کی گئی اور دوسرے دن آٹھ سے پونے نو بجے تک کڈ اور براؤن شرط جیتنے کی پوری کوشش کرتے رہے جب گبس نظر نہ آیا تو کڈ نے پریشان ہو کر بہت سے فاضل الفاظ کے ساتھ براؤن سے یہ دریافت کیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

"وہ اکیلا ہی چلا گیا ہوگا۔ چلو ہم لوگ بھی وہیں چلیں"۔ براؤن نے جواب دیا۔

مسز گبس کے یہاں جو پہنچے تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے، انہوں نے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ بغل کے مکان سے ایک عورت نے اپنا سر نکالا اور انہیں بتایا کہ مسز گبس چلی گئی۔

"چلی گئی! کہاں چلی گئی؟" دونوں یک وقت چیخ کر بولے۔

"کناڈا، آج ہی صبح کو تو گئی ہے"۔

کڈ کو کھڑا رہنے کے لیے دیوار کے سہارے کی ضرورت ہوئی، براؤن کا فرط حیرت سے منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور قوت گفتار سلب ہو گئی۔ "مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی، مسز گبس نے بتایا کہ میں دو ہفتے سے چپکے چپکے تیاری کر رہی تھی۔ وہ تو بہت خوش نظر آ رہی تھی، بات بات پہ ہنستی تھی"۔

"ہنستی تھی!" کڈ نے بولنا کی لہجے میں دہرایا۔

"اور جب میں نے اسے یاد دلایا کہ تمہارا شوہر ابھی مرا ہے، اس طرح ہنسنا مناسب نہیں سمجھا تو وہ زینے پر بیٹھ گئی اور اتنا زور سے قہقہے مارنے لگی کہ اس کی آنکھوں سے پانی کی طرح آنسو بہنے لگے"۔

براؤن نے عالم تحیر میں اپنے ساتھی کی طرف دیکھا: "یہ ہنس کس پر رہی تھی؟"۔ "دو۔ پیدائشی احمقوں پر"۔ کڈ نے جواب دیا۔

تمثیل

کیتھرین پار

مصنفۂ مورس بیرنگ — مترجمۂ متسلم

افرادِ تمثیل

شاہ ہنری ہشتم — ملکہ کیتھرین پار — پیج

منظر۔ لندن۔ شاہی محل میں ناشتے کا کمرا۔ شاہ ہنری ہشتم اور ملکہ کیتھرین پار، ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک میز ہے، جس پر ناشتے کا سامان رکھا ہے۔ بادشاہ ایک اُبلا ہوا انڈا توڑ رہا ہے۔)

ہنری:۔ یہ انڈا کچا ہے، بہت خراب ہے۔

کیتھرین:۔ کل تم شکایت کرتے تھے کہ انڈا بہت سخت ہے۔

ہنری:۔ کل کے انڈے یقیناً سخت تھے، میں نہ سخت انڈے پسند کرتا ہوں نہ نرم۔ انڈوں کو اندازے سے اُبالنا چاہیے۔

کیتھرین:۔ تمہیں خوش کرنا بہت مشکل ہے، یہ انڈا کھولتے ہوئے پانی میں ساڑھے تین منٹ تک رکھا گیا تھا۔ میں نے خود اسے اُبالا ہے، اگر تمہیں پسند نہ ہو تو یہ انڈا مجھے دیدو میں ایسا ہی انڈا پسند کرتی ہوں۔ تمہارے لیے دوسرا انڈا اُبال دوں گی۔

ہنری:۔ نہیں۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ سچ پوچھو تو تمہیں انڈا ابالنا آتا ہی نہیں۔ کاش یہ کام تم خادموں کے سپرد کر دیتیں کہ باورچی خانے میں انڈے ابالا کریں۔

کیتھرین:۔ باورچی خانے میں انڈے ابالے جاتے ہیں تو یہاں تک انڈے لانے میں دیر ہوتی ہے اور اگر تم قبل از وقت پہنچ گئے تو شکایت کرنے لگتے ہو کہ انڈے کہاں ہیں، اگر انڈے پہلے سے لاکر رکھ دیے جاتے ہیں تو تم اعتراض کرتے ہو کہ انڈے ٹھنڈے ہو گئے۔

ہنری:۔ میں کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کرتا۔ باورچن کو انڈے ابالنے میں کمال حاصل ہے۔

کیتھرین:۔ کل سے باورچن ہی انڈے ابالے گی۔

ہنری:۔ تمہاری جیسی تجربہ کار عورت کو کم سے کم انڈے ابالنا تو آنا چاہیے۔ مجھے کچے انڈوں سے نفرت ہے۔ (متفکر ہو کر) غریب کیٹی انڈے ابالنے میں مشاق تھی۔

کیتھرین:- کون کیتھرین؟ کیتھرین ہوورڈیا۔ کیتھرین اراگن؟

ہنری:- میں اپنی محبوب کیٹی ہووارڈ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ کیتھرین اراگن میری بی بی نہ تھی۔ اس سے جو شادی ہوئی وہ ناجائز تھی۔

کیتھرین:- کیتھرین ہووارڈ کو انڈے ابالنے میں مشاق ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس کی ماں باورچن تھی۔

ہنری:- بالکل غلط! اس کی ماں رو کنورڈ خاندان سے تھی۔

کیتھرین:- غالباً تمہاری مراد اپنی بہن سے ہے۔

ہنری:- ہاں ہاں، کیٹی کی ماں یقیناً سومرسٹ کے خاندان سے تھی۔

کیتھرین:- غالباً تمہیں جین سیمور یاد آرہی ہے۔

ہنری:- ہرگز نہیں۔ جین سیمور، سومرسٹ کی بہن تھی۔

کیتھرین:- میں تو یہی جانتی ہوں کہ کیتھرین ہووارڈ کی ماں باورچن تھی، تمہیں اس کا نام میرے سامنے نہ لینا چاہیے۔ شاید تمہاری تمنا یہ ہے کہ وہ زندہ ہوتی اور تم اس سے میرے مقابلے میں زیادہ محبت کرتے۔

ہنری:- میں نے تو یہ نہیں کہا۔ بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ اُسے انڈے ابالنے میں کمال حاصل تھا۔

کیتھرین:- تمہاری بات کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو خوبیاں اس میں تھیں وہ مجھ میں موجود نہیں۔

ہنری:- تم خواہ مخواہ یہ مطلب نکالتی ہو۔ میرے وہم میں بھی یہ خیال نہ تھا۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مجھے کچے انڈے پسند نہیں اور آج صبح کا انڈا کچا ہے۔

کیتھرین:- (اُٹھتی ہے اور غصّے میں دروازے کی طرف بڑھتی ہے) تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے طلاق دے دو۔ اور کسی دوسری عورت سے شادی کر لو، جو انڈے اُبالنا جانتی ہو۔

ہنری:- کیتھرین! ادھر آؤ۔ میں تمہیں رنجیدہ کرنا نہیں چاہتا۔ تم تو انڈے ابالنے میں ماہر ہو۔

کیتھرین:- اس قدر جاں فشانی کا یہی نتیجہ ہے؟ اب میں تمہارے لیے کبھی انڈے نہ ابالوں گی

ہنری:- اس وقت گانا سننے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے ایک گیت بنایا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اسے گاؤ، یہ گیت بیلے اور بانسری کے ساتھ گانے کے لیے ہے۔

کیتھرین:- مجھے گانے کی مہلت نہیں۔ اس گیت کا نام کیا ہے؟

ہنری:- اس کا نام ہے "محبت کی فتح" اور یہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

سنو سکندرِ اعظم کے کارنامے تم
وہ بابل آیا تھا چڑھ کر سفید گھوڑے پر
بیان اس کی شجاعت کا سن کے عقل ہے گم
نظیر اس کی زمانے میں مل نہیں سکتی

کیتھرین:- "سکتی" کا قافیہ "پر" نہیں ہو سکتا

ہنری:- میرا خیال یہ نہیں کہ "پر" اور "سکتی" ہم قافیہ ہوں۔ صرف گیت میں زور ڈالنے کے لیے میں نے ایسا کیا۔

کیتھرین:- سکندر سے مراد سکندرِ اعظم ہے؟

ہنری:- بے شک!

کیتھرین:- مگر اس کا گھوڑا تو سیاہ تھا۔

ہنری:- نہیں۔ تم غلطی پر ہو۔ اس کا گھوڑا سفید تھا۔

کیتھرین:- سیاہ! کوئلے کی طرح سیاہ!

ہنری:- مگر میں تحقیق کر چکا ہوں کہ اس کا گھوڑا سفید تھا۔

کیتھرین:- سکندر کا گھوڑا سیاہ تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا گھوڑا سیاہ تھا

ہنری:- اس کا گھوڑا سفید تھا۔ جس سے جی چاہے پوچھ لو۔

کیتھرین:- اس کے گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔ وہ سیاہ گھوڑے ہی کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس کی سیکڑوں تصویریں ہیں جس میں وہ اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار ہے۔ میرے والد ماجد کے پاس بھی ایک تصویر ہے۔

ہنری:- مصور نے غلطی کی ہوگی۔ پلوٹارک، زینوفون، ارسطو، غرض سبھوں نے اس کے سفید گھوڑے کا ذکر کیا ہے۔

کیتھرین:- سیاہ!

ہنری:- تم کس قدر ضدی ہو! میں جانتا ہوں کہ اس کا گھوڑا سفید ——

کیتھرین:- سیاہ! کوئلے کی طرح سیاہ!

ہنری:- تم نے زینوفون کی کتاب پڑھی ہے؟

کیتھرین:- تمہیں کوئی دوسری بات یاد آرہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن کے زمانے میں میرے والد مجھے وہ تصویر دکھایا کرتے تھے۔ جس میں سکندر اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار ہے۔

ہنری:- میں بہت آسانی سے اپنا دعویٰ ثابت کر سکتا ہوں۔ پلوٹارک کی کتاب یہیں پر موجود ہے۔

[کتابوں کی الماری میں سے ایک کتاب نکالتا ہے]

کیتھرین:- مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے بھائی کا ایک سیاہ گھوڑا تھا جس کا نام، سکندر کے سیاہ گھوڑے کی یاد میں بیوسیفالس رکھا گیا تھا۔

ہنری:- [کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر] اگر وہ گھوڑا سیاہ ہوتا تو اس کا نام بوسیفاس ہرگز نہ ہوتا۔ سیاہ گھوڑے کو بوسیفاس کہنا لغو ہے۔

کیتھرین:۔ اتنا لغو نہیں جتنا سفید گھوڑے کو بوسیفالس کہنا۔

ہنری:۔ اس نے سیاہ گھوڑے کا انتخاب ہرگز نہ کیا ہوگا، وہ تو وہم پرست تھا۔

کیتھرین:۔ تم خود وہم پرست ہو، دیوتاؤں کے وجود کے قائل ہو اور مورتیوں کی پوجا کرتے ہو۔ اس لیے ہر شخص کو اپنی طرح سمجھتے ہو۔ حقیقت میں سکندر وہم پرست نہ تھا اور اسی لیے اس نے قصداً سیاہ گھوڑا انتخاب کیا تھا۔

ہنری:۔ وہ عبارت گئی۔ سنو۔ "زالیوس آ ئنائے کا لی ٹی میڈے وسنر نگوس"۔ "وہ گھوڑا نہایت وحشی تھا اور اس کو سدھانا بہت مشکل تھا ـــ سچ پوچھو تو اس میں تھیسالیا کے سفید گھوڑوں کی کل خصوصیات موجود تھیں۔

کیتھرین:۔ لیکن اس عبارت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گھوڑے کا رنگ سفید تھا اور تھیسالیا کے گھوڑے تو اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے مشہور رہے۔

ہنری:۔ تم بڑی ضدی ہو۔ میں زینوفون کی کتابوں سے ثبوت تلاش کروں گا۔ اس نے صاف لکھا ہے کہ سفید رنگ کا گھوڑا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کسی نے کبھی اس بیان کی تردید نہیں کی۔

کیتھرین:۔ مگر پلوٹارک کا قول ہے کہ اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔

ہنری:۔ اس کے متعلق پلوٹارک نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ اس کے علاوہ، مجھے یاد ہے کہ میری اس موضوع پر ووِلسی سے بھی گفتگو کی تھی، جو صاحب علم تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس نے ایک دن کہا تھا "بوسیفالس جیسا سفید" یہ محاورہ فصحا کی زبان پر رائج ہے۔

کیتھرین:۔ اس نے کہا ہوگا "بوسیفالس جیسا سیاہ"

ہنری:۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔

کیتھرین:۔ میں تمہیں جھوٹا نہیں بناتی، مگر صرف اتنا کہتی ہوں کہ تمہارا خیال غلط ہے۔

ہنری:۔ مگر میں کہتا ہوں کہ غلطی کرنا ممکن ہی نہیں، میں اس حقیقت سے اسی طرح واقف ہوں جس طرح مجھے اپنے نام کا علم ہے۔

کیتھرین:۔ تمہارا حافظہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ ابھی تم نے کیتھرین ہووارڈ کی ماں کا نام بتانے میں غلطی کی تھی۔

ہنری:۔ اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟ نام تو مجھے یاد تھا۔ مگر بروقت زبان پر نہ آیا مگر گھوڑے والی بات تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور اس سے میں تمام عمر واقف رہا ہوں۔

کیتھرین :- میں جانتی ہوں کہ تمہارا حافظہ کیوں کام نہیں کرتا۔ تمہیں بہت سے نام یاد رکھنے پڑتے ہیں۔ غالباً تم نے غلطی سے شہنشاہ العزیز کے سفید گھوڑے کو سکندر سے منسوب کر دیا، حالانکہ سکندر کا سیاہ گھوڑا بہت مشہور ہے۔

ہنری :- خدا کی پناہ! اگر تم میں تعلیم کی بو باس بھی ہوتی تو تم ایسی باتیں نہ کرتیں! یہ تعلیم اور مذہب سے بے بہرہ ہونے اور لاطینی زبان نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔ تمہاری تعلیم حاصل کرنے سے جاہل رہنا بہتر ہے۔ این آف کلیوز جیسی عورت بھی لاطینی جانتی تھی۔

کیتھرین :- خدا کا شکر ہے کہ میں لاطینی نہیں جانتی! مہمل زبان! جو صرف وہم پرستوں اور متعصب مذہبی پیشواؤں کے لیے موزوں ہے!

ہنری :- غالباً تم مجھے متعصب سمجھتی ہو۔

کیتھرین :- کسی بات سے اپنی سمجھ کے مطابق مطلب نکالنا تمہارے اختیار میں ہے ——— میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ اُس گھوڑے کا رنگ سیاہ ہے۔

ہنری :- میں متعصب بننا پسند کروں گا، اگر تمہاری عقیدے کا دہریہ ہرگز نہ ہوں گا۔

کیتھرین :- تم غلط بحث کر رہے ہو اور اصل موضوع سے گریز کرنا چاہتے ہو۔ یہ ٹیوڈر خاندان کی خصوصیت ہے۔ اس خاندان کا کوئی فرد کبھی معقول دلائل سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہنری :- تمہیں میرے خاندان کا مضحکہ کرنے کا حق نہیں۔

کیتھرین :- تم نے بھی تو میرے خاندان کی توہین کی، جو تمہارے خاندان سے زیادہ قدیم ہے۔ میرے خاندان کا کوئی فرد خونی نہیں تھا۔

ہنری :- اب میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتا (اُٹھتا ہے اور دروازہ کھول کر پکارتا ہے) ڈینی، ٹبس، پیج ——— کوئی ہے؟ (ایک پیج داخل ہوتا ہے)

پیج :- شہنشاہ معظم!

ہنری :- جا، اور لارڈ چیمبرلین سے کہہ دے کہ سابق ملکہ کو ٹاور میں لیجانے کا انتظام کرے۔

پیج :- (متحیر ہو کر) بہت بہتر عالی جاہ! کیا حضور والا کا اشارہ گذشتہ ملکہ کی خاک کی طرف ہے؟

ہنری :- بے وقوف لڑکا! میں نے تو "سابق" ملکہ کہا تھا ——— ملکہ کیتھرین پار۔

پیج :- حضورِ عالی کا ارشاد بجا ہے۔

ہنری :- اور لارڈ چیمبرلین سے یہ بھی کہنا کہ ٹاور کے گورنر کو سابق ملکہ کو پھانسی دینے کا سامان کرنے کی ہدایت کر دے۔

پیج :- کیا کل رسوم اسی طرح ادا کیے جائیں گے، جس طرح ملکہ کیتھرین ہوورڈ کی پھانسی کے موقع پر ادا کیے گئے تھے؟

ہنری :- ہاں، — لیکن نقارہ صرف ایک ہی دفعہ بجایا جائے۔ اخیر میں (پیج دروازے کی طرف بڑھتا ہے) اور ڈاکٹر بٹس سے پوچھنا کہ سکندر اعظم کے گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا یا سفید۔

کیتھرین :- سیاہ! (پیج چلا جاتا ہے) اب مجھے پھانسی دی جانی والی ہے۔ اس لیے امید ہے کہ تم مجھے اجازت دو گے کہ اپنا اسباب درست کر لوں۔ تم نے کل اپنی بانسری کوٹھری میں چھوڑ دی تھی — میں اسے لانے جاتی ہوں۔

ہنری :- ابھی ٹھہرو۔ جلدی کیا ہے؟

کیتھرین :- معاف کرنا! وقت بہت کم ہے اور مجھے بہت سے خطوط لکھنے ہیں۔

ہنری :- (ہچکچا کر) میں گانا سننا چاہتا تھا۔

کیتھرین :- اب تمہیں میری شرکت کی امید تو نہ ہو گی؟ کسی اور کو تلاش کر لو تو بہتر ہو۔ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے بہت سی باتیں سوچنا ہیں۔

ہنری :- (مصنوعی ہنسی ہنس کر) میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔ کہیں تم نے سچ تو نہ سمجھ لیا؟

کیتھرین :- میں اس قسم کا مذاق پسند نہیں کرتی۔

ہنری :- اچھا، اب ان باتوں سے درگزر کرو اور موسیقی سے دل بہلاؤ۔ میں اپنا گیت سننا چاہتا ہوں۔

(پیج داخل ہوتا ہے)

پیج :- عالی جاہ! مجھے لارڈ چیمبرلین کا پتا نہ ملا۔ ڈاکٹر بٹس کہتے ہیں کہ گھوڑے کے رنگ کے متعلق حضورِ والا کا خیال صحیح ہے۔

ہنری :- (خوش ہو کر) بہت خوب! تم جا سکتے ہو۔ لارڈ چیمبرلین کو میرا پیغام پہنچانے کی ضرورت نہیں (پیج تعظیم بجا لاتا ہے اور چلا جاتا ہے) چلو اب ہم موسیقی سے لطف اٹھائیں۔ تم نے دیکھا؟ مجھے یقین تھا کہ میرا خیال صحیح ہے۔

[ہنری دروازہ کھولتا ہے]

کیتھرین :- پھر بھی اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔

ہنری :- (نرمی سے، گویا وہ کسی بچے سے بول رہا ہو) ہاں، جی، ہاں بے شک اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا مگر اب ہمیں گیت سننا چاہیے۔ (وہ چلے جاتے ہیں) پردہ

نظم

انقلاب روزگار

از پریم پجاری صاحب

چاندنی، دریا، خموشی، تیری کشتی، اور تو
مجھ کو بھی ہمراہ چلنے کا اشارہ ہوگیا

بیٹھ کر چپو سنبھالا میں نے، کشتی چل پڑی
رفتہ رفتہ دُور جب ہم سے کنارہ ہوگیا

تو نے چھیڑا ساز اور نغموں سے گونج اٹھی فضا
دل میں جوشِ آرزو ہنگامہ آرا ہوگیا

تھی کہاں لیکن مجھے عرضِ تمنا کی مجال
جانے کیونکر حالِ دل کا آشکارا ہوگیا

بیخودی میں یک بیک آنکھیں ملیں اور جھک گئیں
پھر اُٹھیں اور پھر وہی عالم دوبارہ ہوگیا

اک ذرا پہلے فقط تیری نظر تھی برق پاش
اب ترا دل بجلیوں کا گاہوارہ ہوگیا

رکھ دیا میں نے ادھر چپو اُدھر تو نے رباب
دُور اَب دونوں سے خود داری کا یارا ہوگیا

تیرے سینے میں ہوئی محسوس اک جنبش مجھے
میری جرأت کا یہی شاید سہارا ہوگیا

ہاتھ اٹھے اور تیری گردن میں حمائل ہوگئے
تو نے سر خم کر دیا، یا خود قضا را ہوگیا

جسم میں اک سنسنی سی، روح میں اک اہتزاز
لفظ کیا بتلائیں جو عالم ہمارا ہوگیا

ہاں، وہی میں ہوں، وہی تو ہے، مگر وہ دل نہیں
آہ، یکسر موم ہوکر سنگِ خارا ہوگیا

کیوں نہیں ملتا محبت سے محبت کا جواب
کس لیے قحطِ وفا پروردگارا ہوگیا

آثارِ ادبیہ

(۱) مثنوی میر حسن در وصف قصر جواہر
(۲) کلام سلیمان در رقت و حالت

مثنوی میر حسن در وصفِ قصرِ جواہر

در بہاریہ می گوید

پلا مجھ کو ساقی مے لعل فام
سو غنچہ صراحی ہو اور گل ہو جام
چمن گل سے مدت میں معمور ہے
خزاں اس گلستان سے دور ہے
یہاں تک ہے اس فصل میں جوشِ گل
کہ ہے دوشِ گل سے ملا دوشِ گل
بغیر از گل و لالہ و نسترن
درختوں نے روکا نہیں واں چمن
نہیں واں درختوں کے بر سو پہاڑ
دو جنگل نہیں کچھ جو جس میں جھاڑ
خس و خار ہوئیں نہ واں جاگیر
کہ تنکا ہے اُس آئینے پر لکیر
مرقع کہوں اس کو تصویر کا
کہ تختہ کہوں اس کو کشمیر کا
سہانی روِش اور جوشش بہار
لپکنا وہ سبزے کا مڑ دانہ وار
نہ ہو سبز کیونکر نگین فلک
کہ ہے ڈانک سبزے کی اس کی چمک
گر داں کی ہے چشم بلبل زمیں
کریں گل نہیں گوشۂ گل زمیں

صفائی حباباں کی آئینہ دار
کہ روئی روِش رہے گل کی بہار
ہر اک شاخ دبل اس خیابان کی
نظر میں ہے جدول گلستان کی
نہیں یہ بھی تشبیہ سے در کنار
یہ ہے خط گلزار دستِ نگار
کہیں ایسی داؤدی کھلتی نہیں
یہ خوبی ستارے کی ملتی نہیں
یہ صد رگ کا رنگ دکھیا یہاں
جسے دیکھ کر زرد ہو زعفراں
ہر اک فصل میں ہر اک گل کی دھوم
بہار اپنی اپنی پہ اتنا ہجوم
چنانچہ کہ شبو ہے اک رو بکار
ہے گویا سوادِ دیارِ بہار
نسیم اُس کی نورِ دلِ مشک ناب
طرح اس کی شاخِ گلِ آفتاب
مہکتا ہے خوشبو سے اس طرح باغ
کہ جوں زلف سے ہو معنبر دماغ
چمن ہے لگن اس لگن کی ہے شمع
نہیں شاخ شبو چمن کی ہے شمع
جدھر بو کو لے جائے واں سے صبا

اُدھر سے صدا ہو کہ صلِّ علیٰ
کہیں اس مکاں کا ہے فرخندہ نام
یہ خوش بوئی اس کی ہو یاد و تمام
ہر اک شب ہو اس بو سے عنبر سرشت
ہر اک روز اس رو سے روزِ بہشت
ہے رنگیں حنائے کفِ پائے یار
اسی کے قدم سے ہے ساری بہار
یہ شبو یہ داؤدی و یاسمن
یہ اُجلا مکاں اور سنہرا چمن

ساقی نامہ در سیر مہتاب

پلا ساقیا ایک جامِ ہلال
برائے شبِ ماہ چھت اُٹھی پڑال
نظر میں مجھے سیر مہتاب ہے
کہ ہم حوض دہم عالم آب ہے
بلندی عمارت کی کوٹھی کی شان
کہوں کیا میں خوبی کو اس کی بیاں
مت اوپر جو کچھ جلوۂ ماہ ہے
نہ پوچھ کہ اللہ اللہ ہے
لبِ بام سے تا زمیں سلے عزیز
عجب چشمۂ نور ہے موج خیز
کہے تو کر فرہاد روشن ضمیر

لے آیا وہاں کوہ سے جوئے شیر
شب ماہ واں کی دل افروز ہے
وہ نام خدا شب نہیں روز ہے
جھلاجھل چاندنی کا ہوں واں کیوں نہ جوش
کہ ہے ماہ اس در کا حلقہ بگوش
پڑے چاندنی پہ جدھر کو نگاہ
نہ دے کثرتِ نور آگے کو راہ
نظر کو ہے مشکل وہاں سے عبور
پڑا جوش مارے ہے دریائے نور
چمک کیا کہوں حوض و تالاب کی
لگی ہے وہاں آنکھ مہتاب کی
فرش بام و در پر ہے یہ کچھ سماں
اب آگے اس ایواں کا سُن لو بیاں
ہے اس میں وہ قالین کا فرش و فروش
کہ جس کا گل و غنچہ نکہت فروش
کبھی صاف ہموار یوں چاندنی
کہ ہے جوڑ شیشے کی ہو جوں چاندنی

در صفت شمع و فانوس

چلا ساقیا مجھ کو تو اک ایاغ
کہ روشن کروں فکر کا میں چراغ
دھرے نقرئی اُس پہ وہ شمع داں
کہ شمعوں سے جس کی ہو روشن جہاں
وہ فانوس شیشے کی مانند دل
صفا جس سے ہو آئینے کی خجل
درخشندگی شمع کی اس میں یوں
فلک سے پڑے عکس خورشید جوں
اسے اختلال ہوا سے فراغ
کہ ہے دامن دل میں اس کا چراغ
لباسِ شب اس کا ہوا پرتوا
جو ادو سرا اُس کا زلف ہوا
مرا دل ہے پروانہ اس شمع پر
کہ ہر دل کو لو اس کی ہے سربسر
نظر میں زبس ہے مرے وہ جمال
ہے فانوس کا دل کو واں کی خیال
دل و چشم ہے اس سے لبریز نور
کہ ہے وہ جگر گوشۂ کوہ طور

در صفت سقف

زبس سقف ہے آئینے کی وہاں
عجب عکس سے شمع کے ہے سماں
وہ بالا ہوا حسنِ شمع و چراغ
گیا عرش پر روشنی کا دماغ
کہوں چھت میں کیا روشنی کی چمک
لیا ہے اٹھا اس نے سر پر فلک
ادھر جلوۂ شمع اس طرف ماہ
کرے کام کس کس طرف کو نگاہ
کہاں اس طرح کی بھلا سیر ہے
تکلف ہے آگے بس اب خیر ہے
خوشا وہ کہ جس جا ہو اس کا ورود
محمد پہ بھیجا کرے وہ ﷺ درود
جو کچھ سیر کا حق ہے سو یاں ہے بس
اب آگے ہوا باغ کی ہے ہوس
نہ ہو کیوں کہ یہ باغ جنت سرشت
کہ ایسے کی خاطر بنی وہ بہشت

مدح ممدوح

مکیں اس مکاں کا ہے محکم اساس
جواہر علی خاں جواہر شناس
وہ ہے سالکِ راہِ دینِ نبی
کریں چاہیے اس کی سب پیروی
یہ عدل و سخاوت یہ جود و کرم
یہ عزم و شجاعت یہ تیغ و قلم
یہ شان و صلابت یہ حلم و حیا
یہ خلق و مروت یہ ذہن و ذکا
یہ قائم مزاجی یہ عز و وقار
یہ ایمان داری یہ طرز و شعار
یہ حسنِ سلوک و یہ علم و عمل
یہ طبعِ سلیم و یہ دل مستقل
نہ ہوگا کسی میں نہ ہے اب کہیں
یہ سب خوبیاں ختم اس پہ ہیں

در تعریف میانا مسمّیٰ بہ بیکرو

سبک رو کا اُس کے کروں کیا بیاں
روانی میں مانند طبعِ رواں
بہ صد گونہ ہے اس پہ کارِ طلا
سنہری سا بادل ہے وہ صبح کا
نہ میانا ہے وہ اور نہ ہے پالکی
وہ اک چیز ہے تخت کی نالکی
کہاں تک کروں اس کی خوبی کی بات

ہر اک چوب اُس کی ہے آبِ حیات
یہ اقبال و حشمت یہ جاہ و جلال
رہے نت ترقی میں مثلِ ہلال

فی المدح

اگرچہ ثنا غیرِ آلِ نبی
کسی کی بھی کہنی نہیں کچھ بھلی
نہ ایسے کی کیوں مدح کریے بھلا
کہ ہے دو جہاں ایچ جس کا صلا
سخن کا نتیجہ ہے مدحِ امام
دیا اس سوا جو ہوا اس کا غلام
کہ صاحب کی ہوتی ہے اس میں خوشی
جو بندے کی اس کے کہے کچھ بھلی
نہیں بے جگہ مجھ کو جوش و خروش
وہ ہے اس گھرانے کا حلقہ بگوش
موالی جو ہیں اس کے صحبت نشیں
سبھی شیعے ہیں اور سبھی مومنیں
رہیں شاد و خرم صغیر و کبیر
ستارے بھی یہ گرد ماہِ منیر
یہ ہیں دوستدارِ علی ولی
نگہبان رہیں ان کے احمد علی
جگہ یاں بھی ان کو ہے جنت سرشت
ملے گا وہاں بھی مکانِ بہشت
رہے جب تلک آباد قصرِ جہاں
سلامت رہے یہ مکین و مکاں
سدا شاد اس کے رہیں خیر خواہ
رہیں دشمن اس کے ذلیل و تباہ

یہ تحریر جو کی ہے ظاہر ہے یہ
مستی بہ قصرِ جواہر ہے یہ

تہنیت قصرِ جواہر

سُنا تو نے اے ساقیِ سیم بر
ہے تہنیت سے مجھے شادگر
شمالی کا واں اک بنا ہے جواب
کہ ہے سب مکانوں میں وہ انتخاب
ہوئے جب سے دشمن کے برج ان کے در
مٹا اس طرف کی بدی کا اثر
جہاں کے ہوا سر پہ احسان یہ
بنا نیک ساعت سے دالان یہ
عجب چو رخا وہ بنا ہے مکاں
عناصر سے خلقت کے دے ہے نشاں
کسی سر زمیں سے نہیں بے خبر
کہ رکھتا ہے چاروں طرف وہ نظر
دلوں کو ہے واں عیش و عشرت سے میل
کہ اس جا ہے چار عالم کو کھیل
محجلِ نشینوں کا مصاحب ہے وہ
ہر اک سمت سے بس کہ خوش رو ہے وہ
بجا شاہدِ چار ابرو ہے وہ
کشادہ دل و عالی ہمت ہے وہ
صفائی کا اس کی کروں کیا بیاں
کہ دیوار اس کی ہے آئینہ ساں
نظر جس کی ہو ان ستونوں میں بند
رہے راست بازوں میں وہ سربلند
ہلالی زبس اس کی محراب ہے

وہ در لمعۂ نور کا باب ہے
عجب شان سے اس کی ہے سائباں
فلک دب گیا دیکھ کر جس کی شاں
ہوا کا نہ پوچھو وہاں کی بیاں
ہوا دار کیوں کر نہ ہو سائباں
نسیمِ سحر رات دن یار ہے
ہوا بھی وہاں کی ہوا دار ہے

در تعریفِ درخت کرک

عجب کرکھوں کے ہیں واں دو درخت
کہ دونوں ہیں ہمسایۂ نیک بخت
ادھر ایک کونے پہ اور اک ادھر
مقابل قرینے سے ہیں یک دگر
مشابہ جو ہیں چتر سے وہ درخت
زمیں واں کی ہے بادشاہی کا تخت
اگر دیکھنے اس کی خوبی کو آئے
تو شمشاد بھی رشک سے زہر کھائے
رہے ہفت اقلیم میں ان کا ناز
کہ عالم کو ہے میٹھا ان کی چھاؤں
زبس اہلِ ایماں کا وہ ہے مکاں
کھڑے ہیں وہ دو سبز داری جواں
تو سایۂ نور کی وہ بہشتار
شب و روز ہوتی ہیں ان پر نثار
جسے اس کے سائے کی ہووے ہوا
لگے اس کو اندھیر ظلِ ہما
ہوا سایۂ تاک گو مہرباں
پر ایسی ہے موزونی اس میں کہاں

کہ آ کر کرم اس کا پوچھے ہے پانو
وہ نامہرباں کی کچہری ہے چھانو
اگر ذرہ چاہے کہ واں دھوپ سے
بچا پر تا اک واں کے پوتوں میں بیٹھ
میں کرسی سے ودن اس کی تشبیہ کیا
فلک سے سوا اس کا ہے مرتبہ
زبس ہے وہ جاے ثریا جناب
ہے وہ شہ نشیں مطلعِ آفتاب
دقیقے کئی جب کرے طے نگاہ
تو اس شہ نشیں تک ملے اس کو راہ
فلک رتبہ جو ہو رکھے واں قدم
کہ واں کی زمیں ہے فلک سے بہم
مجھے لے گئی میری قسمت وہاں
وگرنہ یہ معراج اپنا کہاں
زمیں دیکھ واں کی گیا ہوش ڈل
کہ اس سے صفا تھی گہر کی بھی کل
کھنچے مسندی خط وہ دیکھے کہ بس
رہی پھر نہ خوشبو کی مجھ کو ہوس
رہے اس کے سائے تلے جو بستر
نہ ہووے کبھی اس کے تئیں دردِ سر

در مدحِ فوج گوید

خبردار ہو ساقیا اور شتاب
شجاعت کے خم سے مجھے دے شراب
مفصل تو ہووے گا مجھ سے کہاں
کروں مجملاً فوج کا کچھ بیاں
ہوا سے جو در اک طرف کھل گیا
مرا جیب سے دل اس طرف ڈھل گیا
زبس تھا مشرف جلوخانے پر
جلوخانہ تھا اس طرف جلوہ گر
نظر واں کی آئی یہ شان و شکوہ
جہاں کاہ سے ہو برابر نہ کوہ
زبس سنتری تھا انھوں کا لباس
ہوئی چشم کو ردشنی بے قیاس
ہے آتش کا دریا کہے تو یہ فوج
کہ جوں موج سے شعلہ مارے ہے موج
تفنگوں کی پلٹن میں یوں تھی چمک
سیہ ابر میں برق کی جوں چمک
رہے جب تلک یہ رخ نیلی کبود
اس آتش سے جل جل مریں سب حسود

تعریفِ توپ بندوق

وہ توپ اژدہا اور جمع تفنگ
نگلنے کو دشمن کے کام نہنگ
بر آئے نہ ان سے عدوے پلشت
ازل سے ظفر ان کی ہے سرنوشت
رہے کیوں نہ واں کی سپہ سربلند
جہاں ایسا کپتان ہو عقل مند
جو کچھ اب وہاں ہے سپاہ نجیب
یہ انتظام کسی کو ہوے کم نصیب
انھوں کا سلامت رہے قدرداں
جواہر علی خانِ والا مکاں
گر آخون صاحب کی لکھوں ثنا
قلم کی زباں پر ہو جاری دعا
کسی امر میں کچھ نہ آئے خلل
جہاں ایسا ہو عالمِ باعمل
رہے کشت سے بارور ان کا نام
کہ سرسبز ان سے ہے عالم تمام
مے عیش سے جام دے ساقیا
کہ پھر اس مکاں کی ہے مجھ کو ہوا
در قبلہ رو اس کا ہووے جو باز
پڑھے اس طرف ایک عالم نماز
کھلے پر ہیں پٹ اس کے رنگیں کتاب
منڈھے پر ہیں دو مصرعے انتخاب
نہ دیکھا کوئی اس سے خوشتر مکاں
جو مدِ نظر واں ہے آبِ رواں

در صفتِ آبشار

خزانے سے مل چادرِ آبشار
کرے ہے دو رویے کے پتر نثار
اسے بھی زبس سرخوشی ہے کمال
وہ پانی بھی چلتا ہے مستی کی چال
نہ پوچھو اس کا عالم عجب آب ہے
کہے تو کہ سیماب بیتاب ہے
زبس شوق تسخیر مہ تھا کمال
لیا سنگ نے پشت ماہی کا جال
نہ ہو نور کا کیونکر واں ازدحام
کیا دام میں اس نے ماہِ تمام
چمک یوں ہے پانی کی مہتاب میں

چراغوں کا جوں عکس ہو آب میں
عجب جگمگاہٹ سے ہے جلوہ گر
کرکی ٹھہرتی نہیں واں نظر
چمک اس کی دیکھے جو کوئی دور سے
نظر اس کی لبریز ہو نور سے
کہیں بیٹھنے والے اس پاس کے
کہ جگنو ہے تختے پہ الماس کے
دیا کر تماشی کے اوپر اتو
کسی نے یہ سی ہے لہر گو گھرد
شب مہ میں عالم کہوں اس کا کیا
نہایت بھلی لگتی ہے وہ صدا
کبھی گھرنج سے اور کبھی ددن سے
کہ دادرا بجے جیسے قانون سے
زمرد کے شیشے سے بھر کر شراب
پلا ساقیا آ کے مجھ کو گلاب
اِدھر سے پھری جو نظر تک اُدھر
گیا میں سر رشتہ کی سمت پر
وہ دوں سے درختوں کا تھا رنگ یوں
کہ دیکھے مرقع کو شیشے سے جوں
تلے اس کے دیکھا تو رستہ ہے ایک
کہ چلتا ہوا شہر بستا ہے ایک
اچنبھے کا دیکھا ادھر پائیں باغ
کہ لعل و زمرد ہوا جس سے داغ
یہ ایجاد دیکھا ہے کس نے حسن
روش سرخ اور سبزے کی پھبن

نہ گل اس میں ہے اور نہ ہے واں شجر
ولیکن نظر اس سے بھی بار ور
فقط سرخی اِک خشت کی ہے وہاں
چمن کے بچھا دی ہے جو درمیاں
کیا ہی ہے تحریر اس کی تمام
تکلف نہیں اس میں کچھ والسّلام
غرض اس پہ سادہ یہ پرکار ہے
کہ رنگِ گل و لالہ انبار ہے
یہ سبزی کہ جدول ہو دیوان کی
یہ سرخی کہ سرخی گلستان کی
کروں کیں روش وصف کا میں بیاں
ہے شرمندہ جس سے خطِ گل رُخاں
یہ سرخی یہ سبزی چمن کی نہیں
بدخشاں کی سرسبز ہے سرزمیں
کسی نے یہ کہا ہے کہ دیکھی بہار
زمرد کے تختے پہ یاقوت زار
نظارے سے اس کے پڑی جس کی تو
تو سوئے نہ گل کی طرف کرکے رُو
اگر اس کو دیکھے کوئی غور کر
عجب کیا کہ ہو جائے طوطی نظر
دیا ہے یہ صنعت سے کس نے بٹھا
زمرد کے گھر پر نگیں لعل کا
نہیں باغ اور باغ کی ہے بہار
عجب ہے طلسم جواہر نگار
مجھے اس کے دیکھے سے آیا یقیں

کہ ہے فی الحقیقت میں یہ گل زمیں
دلوں کو ہے اس کے تعلق سے فرح
کہ ہے راستی میں یہ قوس قزح
کجی سے وہ کھنچی بر سر آسماں
ہوئی راست قوس قزح آ کے یاں
شفق کا ہوا دیکھ کر رنگ فق
کہ ہوتی ہے ایسی زمیں کی شفق
نہیں سبز سرخی یہ تحریر کی
یہ ہے خطِ یاقوت کی مدبھی
بھری ہے یہ جامِ زمرد میں مے
گویا شعلۂ سبز آتش میں ہے
کسی نے سلیقے سے اپنے دیا
دیے ہیں قرینوں سے مخمل بچھا
پڑے اس جگہ جس کسی کا قدم
برنگِ حنا سُرخ ہو دمبدم
کسی کی یہ سرخی نہیں درمیاں
چمن میں بھرا ہے یہ خونِ خزاں
زبس کثرتِ عیش کا واں ہے جوش
بچھائے ہیں میدان میں زین پوش
پڑے سرخ اور سبز بانات کے
یہ چشمے ہیں گویا کہ برسات کے
کھلے تو گلوں کے یہ صد برگ ساز
چمن بافیاں نے کیے ہیں نیاز
خزاں کا کبھی اس پہ وار آئے نہ
کہ ہے واں مرصع کا چار آئینہ

زمیں کھب گئی اس کی رنگیں ادا　　وگرنہ نہ ہو سبزیاں قیل وقال　　نہ آئے زباں پر سخن مبتذل
فلک نے زمیں کو دو شالا دیا　　کہ ہے اس جگہ میں زباں اپنی لال　　نئی اس کو سوجھے زمینِ غزل
گل و لالہ جو دیکھ کر جیں کو داغ　　خدائی کی ہر رنگ میں ہے نمود　　مرے سر پہ اس گھر کا احسان ہے
بجا ہے جو کہیے اسے لعل باغ　　محمد کی ہو آل پر نت درود　　کہ میرا سخن سبز ہر آن ہے
ہوا ہے فرقِ یہ عجب اختراع　　کہے شعر شاعر جو یاں آن کر　　اگر آئینہ اس کے آگے نہ ہو
ثنا لکھوں اس کی بخطِ شعاع　　وہ مضمونِ رنگیں سے بہرہ ور　　سخن کیونکر طوطی کہے پھر کہو

سخن سنج کے آگے پھرتا ہے دل　　نہیں اور ہوتا ہے جی مضمحل
خدا اس گھرانے کو رکھے مدام　　بہ حق محمد علیہ السّلام

---

۱ ق = قلمی نسخے میں اس نہیں ہے ۲ جو ہے "کہ" بہتر ہوگا ۳ مردانہ یا پروانہ؟ ۴ ق میں اپنا ۵ ق میں فرخندہ کی جگہ خندہ ۶ ق میں کی شان نہیں، یہ قیاسی اضافہ ہے؟ ۷ ق کیونکر = کیوں نہ ۸ ق کہ = ہے۔
۹ ق لی جوڑ = جلوہ ۱۰ ق کے = کی ۱۱ ق میں وہ متن میں ہے، حاشیے میں اس کے بدلے نت بھی ہے۔
۱۲ ق بھی = ہے ۱۳ ق عزم شجاعت ۱۴ ق ہی = بھی ۱۵ یہ مصرع کاتب کی غلطی سے یہاں پر درج ہوگیا ہے یہ اس مصرع کے بعد ہونا چاہیے "بجا شاد ہو چار ابرو ہے وہ" ۱۶ ق پھر = بھی ۱۷ ق میں ایک جگہ کرک، دوسری جگہ کرکھ ہے ۱۸ ق جزو = حسود ۱۹ جو ہے کہ بہتر معلوم ہوتا ہے ۲۰ ق سیہ کی = یہ سی ۲۱ آگے قیاسی اضافہ ۲۲ اور سبزے کی یہ بھی قیاسی اضافہ ۲۳ ق سخن قلمی نسخے کے کاتب نے یہ مثنوی بہت غلط لکھی ہے، جہاں قیاسی تصحیح نہ ہو سکی، اصل کے مطابق نقل کر دیا گیا ہے، کسی صحیح نسخے سے کوئی صاحب اس کی تصحیح فرمائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔
ایک جگہ "سنہرا چمن" آیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ "ستم ایجن" ہو۔

کلام سلیمان و رقت و طالب

(۱)

کیا ہاتھ لگا مصر کے بازار سے اُن کے
پوچھے کوئی یوسف کو خریدار سے اُن کے

حاصل نہ ہوا کچھ کبھی اقرار سے اُن کے
محروم رہے آج بھی دیدار سے ان کے

اُترے ہوئے ہیں چرخ پہ خورشید و مہِ نو
اعجاز رخ و ابروِ خم دار سے ان کے

کافر ہی کیا عشق بتاں نے ہمیں آخر
تارِ رگِ جاں گھٹ گیا زنار سے ان کے

ہر رات پڑا ہے مجھے کالے کو کھلانا
کیا عشق ہوا طرۂ طرار سے ان کے

خورشید قیامت نے کہاں تاب یہ پائی
ہمچشمی کرے روزنِ دیوار سے ان کے

ہے سرخیِ پان کا لب معشوق میں دھوکا
ٹپکے ہے یہ خون تیر کے سوفار سے ان کے

گل کھائے تھے بلبل نے جو چھوٹا وطنِ گل
ہوئے ستم آتی ہے چلی ہار سے ان کے

کرتے ہیں اب انساں بھی سلیمان سے کنارہ
یا فخر تھا پریوں کو کبھی پیار سے ان کے

(۲)

اس قدر بیتاب مت ہو تیغ قاتل دیکھ کر
جائیو مقتل میں نوبت اپنی آئے ول دیکھ کر

پاس دل حیراں کے درد و غم ہوئے آئینہ دار
آئینہ لے سادہ رو تیرے مقابل دیکھ کر

کہتے ہو گھر کو نہیں جانے کا یہ اس کے لیے
زور ہی للچائے کچھ تم مفت کا دل دیکھ کر

چاہیے گھر میں دلا اس مہ کے تب تو جائیو
سوچ ساعات اور کواکب کے منازل دیکھ کر

کی نظر مجھ پر تو اس نے ترس کھا کر رو دیا
ہتکڑی اور طوق پاؤں میں سلاسل دیکھ کر

عشق نے وحشت کے مکتب کا خلیفہ کر دیا
قیس اور فرہاد میں سے مجھ کو قابل دیکھ کر

کر دیا اس نے مقید جب بقید پیچ و تاب
کاکل پیچاں کا اپنے مجھ کو مائل دیکھ کر

ہم نے بھی جاگیر دشت ہرزہ گردی لے لیا
عشق کی اقلیم میں وحشت کا عامل دیکھ کر

اک غزل کی اور فرمائش ہے رقت آپ کو
فن علم شعر میں استاد کامل دیکھ کر

اپنے دل کو آہ میں مقتل میں بسمل دیکھ کر
رہ گیا کن حسرتوں سے موت قاتل دیکھ کر

کب بگولا ہے یہ روح قیس کرتی رقص ہے
رونق افزا نجد میں لیلیٰ کا محمل دیکھ کر

گل کو بلبل شمع کو پروانہ قمری سرو کو
بھول جاتے ہیں تری شکل و شمائل دیکھ کر

شکل جوزا یاں حمائل زخم گردن میں پڑا
تیغ کو قاتل کی گردن میں حمائل دیکھ کر

آہ کیا کیجیے کہ یاں دل بر میں تڑپا جاتا ہے
ابھرے رخسارے ترے بوسے کے قابل دیکھ کر

کھل گیا احوال دل کا صاف چشموں میں آہ
قطرہ ہائے اشک میں اب خوں کو شامل دیکھ کر

داغ کھایا ہے قمر نے رشک سے اے ماہرو
جلوہ گر رخسارۂ پُرنور پر تل دیکھ کر

رقت آنکھوں پر پڑے پردے ہزار دل اپنے یاں
اپنے ان کے درمیاں پردے کو حائل دیکھ کر

۳

کبھی آنسو سے کبھی لخت جگر سے برسے
اپنی آنکھوں سے تو کچھ، لعل و گہر سے برسے

اشک امڈے ہیں مرے ابر سے کہہ دے کوئی
آبرو چاہے تو ہٹ کر مرے گھر سے برسے

جی گیا زور گیا آپ کا کیا یار گیا
سینے سے، چشم سے، اور دیدۂ تر سے برسے

جس قدر ابر تو برسے ہے پہاڑوں میں اگر
اتنا پانی تو مرے دامن تر سے برسے

اس قدر ابر میں قطرات کہاں تھے یہ تو
کسی مشتاق کے ہیں دیدۂ تر سے برسے

رات بھر نالے کیے ہم نے، تو دن بھر روئے
جس قدر شام سے گرجے تھے سحر سے برسے

اس کے آنے کا ہوا وقت بھلا ابر کو دیکھ
خون دل کیوں نہ مرے دیدۂ تر سے برسے

یہ تو کہتا نہیں میں منہ یہ نہ برسے لیکن
جب وہ آجائے تو پھر جتنا یہ برسے برسے

اشک گلگوں نہیں یہ لخت جگر ہیں طالب
آج آنکھوں سے جو کچھ اپنے شرارے برسے

کل شب فرقت ہماری کیا ہی خواری سے کٹی
کچھ کٹی زاری سے، کچھ اختر شماری سے کٹی

کچھ وصال اور وصل میں اپنا نہیں ہے اختیار
زندگی اپنی بہت بے اختیاری سے کٹی

آپ نے ہم کو کیا دل سے فراموش اس قدر
اور ہمیں ہر پل تمہاری یادگاری سے کٹی

کچھ نہ پوچھو دوستو فرقت کے بیماروں کا حال
دن کٹا نالے سے اور شب بیقراری سے کٹی

ایک دن دیکھی نہ میں نے وائے حسرت شکل یار
مثل نرگس عمر اپنی انتظاری سے کٹی

مر گئے لیکن نہ کی افسوس کچھ یاد خدا
عمر کٹنے کو کٹی، پر شرمساری سے کٹی

حیف ہے صد حیف ہے افسوس صد افسوس ہے
زندگی طالب تری بے اختیاری سے کٹی

اوراق پارینہ

(۱) دیوان ہمایوں بادشاہ

(۱) دیوان ہمایوں بادشاہ، از جناب حافظ شمس الدین احمد صاحب ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج (۲) دریائے لطافت حصہ عروض مصنفہ قتیل از ق ع و د (۳) دیوان راقب از ق ع د

ہندوستان کی تاریخ میں، ہمایوں بادشاہ کی شخصیت نہایت دلچسپ ہے، بابر کی عظیم الشان سلطنت کا وارث ہونا، بھائیوں کی پیہم مخالفت اور غداری، پٹھانوں سے مقابلہ اور شکست، ہندوستان کے تخت و تاج سے دست برداری مدتوں دشت و جبل میں آوارہ گردی، شاہ ایران کے یہاں پناہ گزینی، شاہ کی مدد سے قندھار و کابل پر قبضہ، وہاں سے پھر ہندوستان پر تاخت، فتح اور بادشاہی، یہ واقعات ایسے ہیں کہ جس شخص کو بھی پیش آتے اس کے سوانح حیات کو رنگین بنا دیتے۔ لیکن ہمایوں ایک رنگین طبع شاعر تھا۔ زمانے کے سرد و گرم چکھنے اور مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کے باوجود اپنی فطری رنگینی سے کبھی محروم نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے واقعات زندگی اپنے اندر ایک ایسی جاذبیت رکھتے ہیں جو پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو تمام تر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اس رنگین مزاج بادشاہ کو مطالعۂ کتب جنگ و جدل سے اور شعر و شاعری سیر و سفر سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی، مگر جب جنگ و جدل پر مجبور کیا جاتا تھا تو میدان جنگ میں اپنے شیر دل باپ کا خلف الرشید ثابت ہوتا تھا۔ اور جب مصائب حیات کے طوفان میں گھر جاتا تھا تو اس کا عزم و استقلال ساتھیوں کی ڈوبتی ہوئی کشتیوں کی ناخدائی کرتا تھا اور کنارے لگا دیتا تھا سب سے زیادہ دلچسپ اور پر لطف بات یہ ہے کہ اس آوارگی کے عالم میں بھی سوائے چند جاں نثاروں کے دنیا میں اس کو کوئی اپنا ہمدرد نظر نہیں آتا تھا اور ہر طرف خطرات و مصائب اور فقر و فاقہ کی ڈراؤنی صورتیں دکھائی دیتی تھیں، اس کی طبعی شگفتگی اپنے جوہر دکھایا کرتی تھی اور موقع موقع سے دلچسپ لطیفے اور رنگین اشعار اس کے دماغ سے نکل کر ساتھیوں کی کلفت کو دور کر دیا کرتے تھے۔

ایسے زندہ دل بادشاہ کے کلام کی جیسی قدر، قدر ہونی چاہیے تھی، نہ ہوئی، اور آج بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ شاعر تھا اور اس کا دیوان بھی تھا۔ ہاں وہ حضرات جن کی نظر اس عہد کی فارسی تاریخوں پر ہے ضرور اس سے واقف ہیں کہ نہ صرف ہمایوں، بلکہ اس کے خاندان کے اکثر افراد شاعر تھے، اور اس فن لطیف سے خواتین بھی محروم نہ تھیں، اس کی بہن گلبدن بیگم مصنفہ ہمایوں نامہ اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی، اس کا یہ شعر:-

زہشیارانِ عالم ہر کرا دیدم مے دارد ولا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمے دارد

آج تک زبان زد خلائق ہے، اور واقعی عجیب کیف و سرور سے لبریز ہے، اس کے بھائی عسکری، ہندال، کامران سب شاعر تھے، خصوصاً کامران کی شاعری نہایت رنگین ہوتی تھی اور اپنے اندر ایک امتیازی شان رکھتی تھی، کامران کے دیوان کا ایک نہایت نایاب قلمی نسخہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور میں محفوظ ہے اور جناب پروفیسر محفوظ الحق صاحب ایم اے پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے اس کو اپنے تحشیہ اور تصحیح کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ خود اس کا باپ بابر نہایت قابل ادیب اور اچھا شاعر تھا

اور فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں یکساں طبع آزمائی کرتا تھا۔ فارسی میں اس کا یہ شعر:-

وعدۂ وصالِ دلبرے تو نوشت ۔۔۔ بازبیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست

عجب تازگی اور کیفیت رکھتا ہے۔ جس خاندان کا یہ حال ہو کہ اس کے اکثر و بیشتر افراد تیغ و قلم دونوں کے مالک ہوں اُس میں ہمایوں جیسی ممتاز ہستی کو ممتاز تر ہونا چاہیے تھا اور یہی ہوا۔ وہ نہ صرف تلوار کا دھنی تھا بلکہ قلم کا بھی بادشاہ تھا، علوم و فنون سے اس کو خاص شغف تھا۔ ریاضی اور ہیئت کا وہ ماہر تھا، زائچہ و احکام میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ ایجاد و اختراع کا مادہ اس کی طبیعت میں بدرجہ اتم تھا۔ وہ ایسی ایسی چیزیں بنایا کرتا تھا، جو عام لوگوں کے ذہنوں میں بلکہ خواب و خیال میں بھی نہیں آتی تھیں۔ اس کے مخترعات میں سے "باغ رواں" اور "خرگاہ فلکی" اپنی آپ مثال تھے، اس کی مجلس میں ہمیشہ علمی چرچے رہا کرتے تھے اور شعر و شاعری بذلہ سنجی و بدیہہ گوئی گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی، خود بابر کو اس کی ان صفات کا اعتراف تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ ہمایوں ۔۔۔ بہت اچھا رفیق و مصاحب ہے۔

ہمایوں کی شاعری کے متعلق اہلِ تاریخ و سیر کا اتفاق ہے کہ اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی۔ سام مرزا اپنے تحفۂ سامی[1] میں ہمایوں کے متعلق لکھتا ہے کہ "در نظم اشعار خسرو ارباب نظم و در حسن گفتار و حسن المقال سر دفتر ارباب فہم...... اینا مطلع زادۂ طبع شریف ایشانست۔ ؎

"آں نہ سرو است کہ در باغ سرافراختہ است ۔۔۔ شمع سبزیست کہ پروانۂ او فاختہ است"

اسی طرح صاحب تاریخ خاندانِ تیموریہ[2] اس کے متعلق کہتا ہے کہ "شعر بغایت نیکی می گفت و در انشا ید بیضا داشت" ملا نظام الدین اپنی طبقاتِ اکبری[3] میں فرماتے ہیں کہ "در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود و شعر نیکو گفتے"۔ غرض اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ ہمایوں شاعر تھا اور اچھا شاعر تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کلام کا کوئی مجموعہ بھی ہوگا، اس زمانے میں اور اس سے بہت پہلے سے دواوین کا رواج تھا۔ خود اس کے بھائی کامران کا دیوان جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے موجود ہے۔ لیکن ہمایوں کا دیوان کہیں نظر نہیں آتا۔ نہ صرف ہندوستان کے کتبخانے اس سے خالی ہیں بلکہ یورپ میں بھی جہاں ہندوستان کا بیشتر علمی سرمایہ منتقل ہو چکا ہے، اس کا پتا کہیں نہیں چلتا۔ ہمایوں کے متعلق کسی ایسی وارستہ مزاجی کی بھی شہادت نہیں ہے کہ جس سے یہ قیاس ہو سکے کہ اپنے کلام کی تدوین کی طرف اُس نے کبھی توجہ نہیں کی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی زندگی بے اطمینانی اور آوارہ گردی میں گزری اس لیے دیوان

---

[1] تحفۂ سامی مصنفۂ سام مرزا صفحہ ۱۶ نسخۂ قلمی ۶۵۲ کتبخانۂ مشرقی بانکی پور۔ پٹنہ
[2] تاریخ خاندانِ تیموریہ صفحہ ۱۹۵ نسخۂ قلمی ۵۵۱ کتبخانۂ مشرقی بانکی پور۔ پٹنہ۔ یہ نسخہ نہایت نایاب اور بے مثل ہے۔
[3] طبقاتِ اکبری صفحہ ۱۹۳ نسخۂ قلمی ۵۲۵ کتبخانۂ مشرقی بانکی پور۔ پٹنہ

مرتب نہ ہو سکا تو قریب قریب یہی حال اس کے بھائی کامران کا بھی رہا پھر اس کا دیوان کیونکر مرتب ہو گیا؟ ہمایوں بادشاہ وقت تھا اور اس کے ادنیٰ اشارے پر اس کا دیوان مرتب ہو سکتا تھا۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ اس کا دیوان بھی ضرور ہوگا اور اس کی شہادت بھی موجود ہے۔ ابوالفضل نے اکبرنامہ میں صاف لکھا ہے کہ "آنحضرت عالی بشعر و شعر انیز داشتند و از انجا کہ طبع موزوں از خصائص فطرات سلیم است در خلال اوقات ارادت قدسی داچہ از حقیقت وچہ از مجاز در سلک نظم می کشیدند۔ دیوان شعر آنحضرت در کتابخانۂ عالی موجود است"۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہمایوں کا دیوان تھا اور اکبر کے زمانے میں شاہی کتب خانے میں موجود تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ دیوان کیا ہو گیا؟ یہ یقینی امر ہے کہ بہت سے ایسے شعرا کے دیوانوں کی طرح جو باوجود حسن کلام مقبول عوام نہیں ہوئے اور ان کی نقلیں کثرت سے نہیں ہوئیں، ہمایوں کے دیوان کی بھی بہت کم نقلیں ہوئیں۔ اور جو ہوئیں بھی وہ ضائع ہو گئیں۔ چنانچہ اکثر تذکروں میں اس کے شاعر ہونے کا ذکر اور اس کے کلام کا نمونہ ملتا ہے مگر اس کے دیوان کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان کا وہ نسخہ بھی جس کا ذکر ابوالفضل نے کیا ہے، زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رہا اور جلد ہی ضائع ہو گیا۔ بہرحال یہ تقریباً مسلم ہو چکا تھا کہ ہمایوں کا دیوان مفقود ہو چکا ہے۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ راقم کو اس کے عزیز دوست سید حسن عسکری صاحب پروفیسر پٹنہ کالج کی وساطت سے مل گیا۔ یہ گوہر بے بہا، اصل سید نامر علی صاحب دیوان کبرہ ضلع چھپرہ کے موقوفہ کتب خانے میں تھا اور وہیں سے حاصل ہوا۔ اور جناب نواب سید مبارک علی صاحب نے جو دیوان صاحب مرحوم کے اوقاف کے متولی ہیں خاکسار کو بہ توسط پروفیسر حسن عسکری صاحب اس کی اجازت دی ہے کہ اس دیوان کا ایک تنقیدی اڈیشن شائع کرے۔ چنانچہ دیوان مذکور کے متعلق تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری ہے اور انشاء اللہ مستقبل قریب میں وہ منظر عام پر آ جائیگا۔

دیوان ہمایوں کا زیر نظر نسخہ کافی قدیم ہے اور ڈھائی تین سو برس سے کم پرانا نہیں معلوم ہوتا۔ پرانے دیسی کاغذ پر جو نہ صرف کرم خوردہ ہے بلکہ اپنی قدامت کی وجہ سے نہایت کمزور ہو گیا ہے روشن اور خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے حاشیے پر سنہری جدولیں ہیں اور ہر ورق پر اور مختلف اوراق کے گوشوں پر نہایت خوبصورت رنگین نقش و نگار ہیں۔ مسٹر ایم باراٹ لا بانکی پور کا جن کے پاس قلمی نوادر کا بیش بہا خزانہ ہے اور جن کو اسلامی مخطوطات اور تصاویر کے متعلق کافی معلومات ہیں۔ یہ خیال ہے کہ دیوان مذکور کشمیری فن کتابت کا نمونہ ہے اور ایرانی فن کتابت کے انداز پر ہے۔ لیکن اس نسخے میں بہت بڑی کمی یہ ہے کہ نہ تو اس پر کاتب کا نام ہے، نہ سن کتابت ہے، نہ کسی کی ملکیت کا کوئی ثبوت ہے، نہ کسی قدیم شخص کی مہر یا دستخط ہیں۔ اس اعتبار سے یہ نسخہ دیوان کامران کے نسخے سے جو کتبخانۂ مشرقی بانکی پور میں ہے، بہت کم رتبہ ہے اور قدامت میں بھی اس سے پیچھے ہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ یہ دیوان ہمایوں ہی کا ہے کسی دوسرے شاعر کا دیوان نہیں۔ راقم اپنی تحقیقات سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ دیوان بلاشک و شبہ بادشاہ ہمایوں کا دیوان ہے۔ اس کے دلائل انشاء اللہ آئندہ مضمون میں پیش کیے جائیں گے۔

ـلہ اکبرنامہ نسخۂ قلمی صفحہ ۱۳۹ جلد اول۔ کتبخانۂ مشرقی بانکی پور پٹنہ۔

(۲) **دریائے لطافت حصۂ عروض مصنفۂ قتیل** یہ حصہ ص ۳۶۶ کے آخر سے شروع ہو کر ص ۳۹۰ پر ختم ہوتا ہے، اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔ جزیرۂ چہارم در عروض (کیفیت شہر دل آویز درآں تماشائی تواں کرد، وہ ہندی خاص سرائے اردو بنگلہ نامند۔

قتیل نے عروض کی اکثر اصطلاحوں کو اپنے حال پر رہنے دیا اور ان کا ترجمہ کرنے یا ان کے بدلے ہندی الاصل الفاظ وضع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ان کا سارا زور طبیعت اس پر صرف ہوا ہے کہ تقطیع کے لیے ان الفاظ کی جگہ جو عرب عروضیوں نے تجویز کیے ہیں، جہاں تک ممکن ہو اپنے زمانے کی طوائفوں کے نام بھر دیں، چنانچہ مفاعیلن کی جگہ پری خانم کو دی گئی ہے اور مستفعلن گھسو بیگم کر چھپن پری بن گئی ہے۔ بقیہ ارکان کے نام حسب ذیل ہیں :۔

فاعلاتن = نور بائی، متفاعلن = چھوٹ بتی، مفاعلتن = بتا سی تی، فاعلن = چیت لگن، فعولن = پیازو، مفعولات = صاحب بخش

زحافات یہ ہیں :۔ قلندرو، طاگیر، گجراتی، بی جان، چیت لگن، پیازو لنگوڑ۔ (ایں لفظ نام ہیچ محبوبہ نباشد بلکہ از جملہ صفات است بر مردوزن، بردو صادق می آید) جان، بی (جان وبی ولنگوڑ ہر چند نام زنی باشد لیکن در تسمیہ جائے تکرار نیست پری خانم سہ کنیز خود را موسم بایں نامہا کرد) البیلی، انمول، چیت لگن، نور بخش، مادی، گجراتی، بیگی جان، پری، سمجھی، سمجھی جان، بی جان، مال دہی، دیدار بخش، گوری، پیازو، مراد بخش، بڑی پیازو، راج دلاری، نیری (بزبان برج بمعنی اوکھلا)

قتیل نے تغیر کا نام گھسٹ بڑھ رکھا ہے اور زحاف کا سنگار، رکن سالم کو یہ صاحب طائفہ رقاص وخانگی کہتے ہیں اور زوحاف کو کنیزان خانگی، یا زچہ،

اردو وہندی بھاشا کے تعلقات باہمی کے متعلق قتیل کے حسب ذیل اقوال قابل توجہ ہیں :۔

(۱) " وہ ہندی خاص سوائے اردو بنگلہ نامند" ص ۳۶۶

(۲) " برائے متفاعلن لفظے در ہندی بناشد در فارسی ہم نیست الا بزبان برج ایں رکن را بدو لفظ حاصل می تواں کرد مانند چھوٹ بتی بمعنی دیداں زنِ محبوبہ" ص ۳۷۲

(۳) " البیلی لفظ اردو نیست، لیکن چوں الفاظ برج در زبان اردو مستعمل است بنا بر ضرورت مثل چھوٹ بتی ایں ہم مضائقہ ندارد" ص ۳۷۷

(۴) نور بائی از و نور حسن و جمال در برج بہ انمول بروزن فعلات بمعنی بے قیمت ملقب شد ایں لفظ اردو بود لیکن از بہت فتحۂ نفاست (یعنی ن) زبان اردو نماند ص ۳۷۰ قتیل نے اس باب میں مختلف شعرا کے حسب ذیل اشعار اور مصرے نقل کیے ہیں، اور چاہ شربت کا بھی ایک جگہ حوالہ دیا ہے :۔

(۱) ہم ہیں قربان ان اداؤں کے

(۲) جہاں میں جنس مروت کا جا بجا ہے قحط — میں جانتا ہوں کہ دشمن مرا ہے یار مرا

کچھ تعجب نہیں اگر یہ شعر خود قتیل کا ہو۔

(۳) ہمارے پاس تراجب کسی نے نام لیا — (۴) کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

(۵) ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی — (۶) میں ڈھونڈھاوں ڈھیلے دلبر کو کل عالم بہ گھر یارو

(۷) در فراق او مہری فرض کن کہ شبہا را — مہری شیرازی — می تواں بہ روز آورد روز را کسے چہ کند۔

(۸) جو کوئی ہم سے ستم کشتوں کو محبت ستا کر خفا کریگا — انشا — یہی کہیں گے کہ جاؤ صاحب خدا تمہارا بھلا کریگا

(۹) نور تجلی شعلۂ روئت دود لطیفش زلف چلیپا — قتیل — صبح قیامت چاک گریباں فتنۂ دوراں قامت زیبا

(۳) دیوان راغب تذکروں میں راغب کا نام محمد جعفر خان درج ہے، لیکن کاتب دیوان نے جعفر علی خان لکھا ہو ان کے حالات زندگی کسی دوسرے موقع پر پیش کیے جائیں گے، اس وقت صرف اسی قدر کافی ہے کہ ان کا اصلی وطن پانی پت تھا۔ لیکن ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی، نواب لطف اللہ خان صادق کے پوتے تھے، خرابی دہلی کے بعد لکھنؤ جاکر فارسی میں میر فاخر کے شاگرد ہوئے تھے، وہاں سے عظیم آباد آئے تھے اور یہاں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۱۵۹ھ سال وفات ۱۲۱۲ھ ہے، علاوہ اُن تصانیف کے جو فارسی میں ہیں، اردو کا ایک بڑا دیوان اور دو چھوٹے دیوان مرتب کیے تھے، ان کی تصانیف بہت کمیاب ہیں، اُردو کے ایک مختصر سے دیوان کے علاوہ جو کتبخانۂ مشرقی بانکی پور میں موجود ہے ان کی کوئی تصنیف ہماری نظر سے نہیں گزری ہے۔ ڈناہیؔ کا یہ قول کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کے کتبخانے میں راغب کا دیوان موجود ہے، صحت سے دور ہے۔ اس کتب خانے میں راغب تخلص کے ایک شاعر کا دیوان ضرور موجود ہے، لیکن وہ ترکی زبان میں ہے، دیوان راغب چھوٹی تقطیع کے ۳۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ ابتدا کے کچھ ورق (ایک یا دو) غائب ہیں، آخری ورق موجود ہے، لیکن اس کے قبل کے کچھ ورق ضائع ہو گئے ہیں، انتیسواں ورق اس مصرع پر ختم ہوتا ہے "مست چشم بتاں تو ہی ہے" اشارۂ کاتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کا ورق 'لن ترانی' سے شروع ہونا چاہیے۔ لیکن تیسویں ورق کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ہر تار ساقہ اس کے ہے وابستہ میری جان — کاکل کا تیری ایسا گرفتار کون ہے۔

کیڑوں نے اس نسخے کو بہت خراب کر دیا ہے۔ صحاف نے بڑی محنت سے اسے درست کیا ہے، لیکن بہت سے اشعار بالکل ضائع ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے بعض الفاظ غائب ہیں۔ سطر پندرہ سطروں کا ہے، لیکن کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں ۱۵ اشعار ہوں۔ آجکل اس نسخے میں ۳۱۱، اشعار موجود ہیں کاتب نے یقیناً اس سے زیادہ لکھے تھے، کتاب کی ابتدا مصنف کے دیباچے سے ہوتی ہے جو بجنسہٖ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

" ونالۂ عشق است در سنہ یک ہزار و ... دو ہست ہجری نبوی بعد تدوین کلام فارسی کہ وہ ترتیب گلزار جعفری ' وند جعفری '

وبہار جعفری کہ ہر یک نسخہ ایست علاحدہ، مرتب ساخت، وکس شاعری مدقلمرو سخندانی باایں ہمہ نادانی نواخت۔ از جناب آفرینندہ سخن آفرینان چشم آن است کہ از چشم دیدہ بینان ونکتہ چینیاں محفوظ گرداند وقبول طبائع منصفان سخنداں رساند تا وسیلۂ یادگار ایں بدکردار شود، وایں ذرۂ بے مقدار از نگرشِ فیض خورشید نظیر اجلا.. افزہ استقبال بود۔ زیادہ سکوت بہتر وخاموشی خوشتر۔ شعر مثنی:۔

"کم خندہ و تبسم بسیار چشم تر یہ ٭ جز تعدادِ غم دوست ہر تعدۂ مستقر ہ"

والسلام احسن الکلام، تمت کلام دیباچہ

دیوان کے پہلے صفحے میں یہ شعر اور ایک مصرعہ ہے۔ پہلی غزل کے تین شعر یہ ہیں:۔

مقدور ہے انساں کو کہاں اس کی ثنا کا ٭ مطلع ہر دیوان ٭ بندے سے بھلا وصف ہو کس طرح خدا کا

روشن ہے جہاں اس کی تجلی سے سراسر ٭ خالق ہے وہی مہر و مہ و ارض و سما کا

ممنوں ہیں ترے خلق کے مشکور جفا ہیں ٭ توصیف نہیں قدر شناس اہل وفا کا

ایک غزل میں اپنے مذہبی خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے کلام کی مقبولیت کی دعا کی ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

گفتار کا میری ہو مددگار خدایا ۱ درخواست مری تجھ سے ہے یہ بار خدایا

تاثیر سخن میں ہو سحر حد سے زیادہ ۲ ہو سحر سے بالا مری گفتار خدایا

رہتا ہوں شب و روز میں تجھ سے ثنا خواں ۳ مقبول جہاں ہوں مرے اشعار خدایا

حشر میں ہو مرے ہاتھ میں داماں نبی کا ۴ کہتے ہیں جسے احمد مختار خدایا

خاکِ قیامت کے غلاموں میں کر کر ۵ شافع ہو مرا سید ابرار خدایا

ان کی تو لطف رہے حال پہ میرے ۶ وے آل پیمبر جو ہیں اطہار خدایا

ایک شعر میں اپنے استاد مکینؔ سے استفاضے کا اعتراف کیا ہے:۔

"ہوا .. مرتب شکر صد شکر ٭ مکینؔ کے فیض سے دیوان راقبؔ"

فراق دلی میں ایک شعر کہا ہے:۔

تازہ ہیں دلی کی فرقت میں ہمارے دل کے داغ ٭ .. آنکھوں میں ہماری باغ ہے ویران ہنوز

ایک مقطع میں میرؔ کے ایک مصرع کی تضمین کی ہے:۔

راقبؔ یہ مضطرب ہے نہایت بقول میرؔ ٭ "سمجھاؤں کس طرح دل خانہ خراب کو"

تغزل کا انداز یہ ہے، لیکن اس رنگ کا صرف یہی شعر دیوان میں ملا ہے:۔

راقبؔ کے تئیں کہیے گر استاد بجا ہے ٭ اس کا تو ہر اک شعر ہے دیوان کے برابر

ایک شعر میں نام کی رعایت معلوم ہوتی ہے:۔

پھولی یہ چمبیلی ہے گلستانِ عشق کی — راغب کا جو لباس ہے لے ہر پان زرد

ذیل میں ان کے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں:-

اے خوشا دل کہ مست بے پندار رہا — آکے غفلت کدۂ دہر میں ہشیار رہا
پھولتے ہی ہے ہر لحظہ گل داغ اس کے — ساحتِ سینہ مرا گلکدۂ گلزار رہا
ہنیں شاہوں کے در پر فرق ان کو جبہہ سائی کا — جنوں کو یار کے کوچے میں دعویٰ ہے گدائی کا

ان دونوں جوش پہ ہے دیدۂ تر بے اپنا — کام اب گریے ہی پر شام و سحر ہے اپنا
اگے جائیں تو کہاں جائیں ہم آوارۂ شوق — کوچۂ یار ہی تک سیر و سفر ہے اپنا
صد پارہ ہوا آہ دل اپنا جگر اپنا — اے آہ عجب تو نے دکھایا اثر اپنا
از بس کہ تر آلودہ ہی پایا اسے بھر عمر — سوکھا نہ کبھو دامنِ مژگانِ تر اپنا

ہمارا سیلِ اشک آخر ہمارے تا گلو پہنچا — ہم ایسے روئے تجھ بن پر نہ ہم تک آہ تو پہنچا
نہ جرأت ہو سکی حرف و حکایت کی حضور اس کے — رہے خاموش ہم جب آہ وقتِ گفتگو پہنچا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور اس کا اب — ہماری بزمِ عشرت میں جو تو لے کر سبو پہنچا
ہنیں کوئی گلی ایسی جہاں چرچا نہیں میرا — مری آوارگی کا شور اب تو کو بکو پہنچا
خفا ہو کر وہ بولا پھر تو آیا سامنے میرے — جو ہیں میں بعد یک مدت کل اس کے روبرو پہنچا
مجھے بخت رسا پر اس کے راغب رشک آتا ہے — حریم وصل میں جو یار کے بے جستجو پہنچا

ہے آٹھ پہر میرے تئیں دھیان کسو کا — میں محو ز خود رفتہ ہوں ہر آن کسی کا
کیا جانیے کوئی جان سو جاتا رہی تجھ بن — کہتا ہوں نہ جایاں سو کہا مان کسی کا

پردہ جو تو نے کھڑے سے لپنے اٹھا دیا — دل سے ہمارے طور کا جلوہ بھلا دیا
جب تلک میں نہ جان سے گزرا — وہ نہ یک امتحان سے گزرا

موم سمجھے تھے دلِ یار سو آہن نکلا — جانتے تھے جسے ہم دوست سو دشمن نکلا
سینہ چاکی و جگر کا وی کسے آتی تھی — ہم ہی دو چار دو داغوں سے یہ یہ فن نکلا
دو نا ہوا غرور مرے مست ناز کا — خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا
دلا صبح چمن کی مست ہوس کر — خیالِ شامِ مرغانِ قفس کر
دلِ پُر شور راغب کے تو آگے — نہ یہ ہرزہ درائی اے جرس کر
کیا ضبط اس کے ڈر سے نالۂ و زاری کو میں یاں تک — کہ آہیں لب تک آکر پھر گئیں اور اشک مژگاں تک

گہے خنداں ہوں اپنے حال پر، گہہ گریاں ہوں — عجب حالت ہے میری اے عزیزو سخت حیراں ہوں
نہ ہو آوارہ اے شورِ جرس میری تگ و دو میں — کہ میں وحشت زدہ دور آپ ہی مثلِ بیاباں ہوں
سخن کی تہ کو جو پہنچے وہی پائے مجھے راقب — کہ ہوں میں معنیِ نازک سخن میں اپنے پنہاں ہوں
منزل کبھی نہ پہنچے از بسکہ ناتواں ہوں — پس رو ہوں کارواں کا میں گردِ کارواں ہوں
میں مرغِ پرشکستہ ہوں ننگِ بوستاں کا — نہ زینتِ قفس ہوں نہ زیبِ گلستاں ہوں
تازگی ہر لحظہ ہے داغِ دلِ ناکام کو — یہ چراغ ایسا نہیں جس کو جلائیں شام کو
مثلِ گل اس باغ سے سب روتے خنداں لے چلے — شبنم آسا چشمِ گریاں ہم پریشاں لے چلے
سفر کا عزم ہے اس کو کہو اس آفتِ جاں سے — اقامت بڑھ کے کرنا حسرتِ دل کے بیاباں سے

دیوان کا آخری شعر یہ ہے:-

بجھ گلی میں پھرے ہے راقب آج — دل کے ٹکڑے بغل میں مارے ہوئے

خاتمہ:- تمام شد نسخہ دیوان راقب بہ اسم مبارک شان نواب جعفر علی بود۔ تاریخ سوم ماہ شوال روز پنجشنبہ از دست خادم احمد حسین۔

کاتب کچھ بہت خوشخط نہیں، ذی علم بھی نہیں معلوم ہوتا۔ نقارہ کو ایک جگہ نغفارہ لکھا ہے، اس قسم کی اور غلطیاں بھی ہونگی۔

راقب کی زبان وہی ہے جو مصحفی وغیرہ کی ہے۔ ان کا پایۂ شاعری چنداں بلند نہیں۔ غزلوں میں اشعار کی تعداد کم ہوتی ہے۔ بعض زمینوں میں تو صرف دو تین شعر ہیں۔ بعض زمینوں میں دو غزلے بھی لکھے ہیں لیکن ان پر بھی اشعار کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔

---

۱ گلزار ابراہیم مطبوعہ و قلمی، نشتر عشق قلمی جلد اول، تذکرۂ عشقی قلمی ۲ نشتر عشق جلد اول ۳ تذکرۂ عشقی ۴ تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی ص ۵ اس قدر تو ہیں دو ما اشعار شامل نہیں دو دو تین نغزل دیوان میں باقی رہ گئے ہیں یا ان کی جگہ پر سادہ کاغذ چسپاں ہو گئے جہاں ایک ہزار وہ معدوم سمجھا ہوگا جہاں جہاں نقطے دیے ہوئے ہیں وہاں سے الفاظ غائب ہیں۔ ۶ دہلی کا نام ایک اور شعر میں آیا ہے۔

اس شوخ نیزہ باز کی پلکوں کو یاد کر — دہلی میں گر گئیں رو دوں تو پہنچے دکن میں آب

۷ یہ غزل ہولی کی تعریف میں ہے۔ مطلع اور بعض اشعار یہ ہیں:-

ہولی میں ہو گیا ہے جو سارا مکان زرد — محفل ہر اک ہے جوں چمن زعفران زرد
دعوت میں کس طرح نہ مزعفر ہو جا بجا — مہماں سے لے کے آج ہیں تا میزبان زرد
بندہ جھنڈا پوش نہ کیوں عجب کہ ہولی میں — پہنے لباس صاحبِ والا مکان زرد

"صاحب والا شان" کوئی انگریز تو نہیں؟

غالب

(۱) پنج آہنگ غالب، از ق ع و (۲) غالب کے دو لطیفے، از ق ع و
(۳) سراپا سخن اور غالب، از ق ع و (۴) تذکرۂ سرور اور غالب

پنج آہنگ

پنج آہنگ، ۳/۴ ۸ انچ × ۵ ۱/۲ انچ تقطیع کے ۴۴۴ صفحوں کی کتاب ہے۔ پہلے صفحے پر عبارت ذیل درج ہے:-

بحمد توفیق ایزد متعال کتاب در علم قواعد فارسی و اشتقاق و تصحیح الفاظ و انشائے رشیقہ ہر قسم مصنفۂ فضلا ارباب جود و مکرم مظہر فیض اتم شہنشاہ ممالک علوم عربی و فارسی ملک الشعرائے دوران جناب فرخندہ خطاب نجم الدولہ دبیر الملک |پنج آہنگ| مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ دام اقبالہم در مطبع دار السلام دہلی خاص جبنیۂ اقل العباد عنایت حسین بتصحیح حضرت مصنف دام برکاتہم باہتمام نور الدین احمد لکھنوی در ماہ اپریل ۱۸۴۹ء حلیہ اختتام پوشید فقط

دوسرے صفحے میں ۱۶ سطریں ہیں، تیسرے سے ۲۰۵ تک ہر صفحے میں ۱۳ سطریں، اس کے بعد سے آخر تک ہر صفحے میں ۱۵ سطریں۔ پہلے صفحے کی پہلی سطر یہ ہے:- "بعد تقدیم نیایش دادار جہاں آفریں و تمہید ستایش حضرت سید المرسلین"

دیباچہ علی بخش خان خلف الٰہی بخش خان معروف کا لکھا ہوا ہے، اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے، کہیں کہیں اصل فارسی عبارت بھی قوسین کے اندر نقل کر دی گئی ہے:-

علی بخش خان، دہلی میں کم رہتے تھے، ان کا زیادہ وقت فیروز پور میں ان کے چچا فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ کے سایہ میں گزرتا تھا، ("در سایۂ رافت آں والا پایہ پرورش می یافتم") فیروز پور میں ہر قسم کا عیش و آرام مہیا تھا اور امیروں کے لڑکوں کی طرح لہو و لعب میں وقت صرف کرتے تھے، شباب کی ابتدا تھی، اور ہر قسم کی فکر سے آزاد تھے، میرزا غالب کا علی بخش خان سے دُہرا رشتہ تھا، انہیں اس کا خیال رہتا تھا کہ یہ کچھ لکھ پڑھ لیں ("ز مرسے بہ آموزگاری من دانست") علی بخش خان نے میرزا سے درخواست کی کہ چند اوراق میں ایک ایسا رسالہ لکھ دیجیے جس سے ہر قسم کے لوگوں کو خط لکھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ (حسب التماس من ورقے چند از آداب و القاب و شکر رسید خطوط و شکوۂ عدم رسید مکاتبات بر من عطا نمود") میرزا نے ان کی خواہش کے مطابق رسالہ لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد میرزا کا کلکتہ جانا ہوا اور اس کے بعد ہی احمد بخش خان کا انتقال ہو گیا۔ ("عم نامدار کہ شفقت پدری، بلکہ رحمت ایزدی از ذات بابرکاتش نمونہ ظہور داشت") ان کے بڑے بیٹے شمس الدین خان جانشین ہوئے، یہ بالکل ناتجربہ کار تھے، اوباشوں کی صحبت میں انہوں نے بُرے ڈھنگ اختیار کیے، ریاست کا انتظام بالکل ابتر ہو گیا۔ علی بخش خان کو ترک وطن کرنا پڑا۔ لکھنؤ اور بے پور گئے، لیکن وہاں کامیابی کی صورت نہ نکلی ۱۸۳۵ء کی ابتدا میں شمس الدین خان کا حادثہ ہوا۔ اس کے بعد علی بخش خان جے پور سے دہلی پہنچے اور میرزا غالب کے یہاں مقیم ہوئے۔ اسی زمانے میں میرزا کا دیوان (مسمّی بہ میخانۂ آرزو سرانجام است تازہ فراہم آمدہ) مرتب ہوا تھا، علی بخش خاں اور میر محمد حسین نے میرزا سے

اس کی نثر سبق آموز تھی، ان کے دل میں خیال گزرا کہ دیوان سے اگر نثر نکال لی جائے اور اس میں وہ رسالہ جو میرزا نے ان کے لیے لکھا تھا، اور متفرق عبارتیں شامل کر دی جائیں تو ایک کتاب مرتب ہو جائے۔ حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر اور میر محمد حسین خاں کا امداد اور یہ خیال کہ یہ کتاب غلام فخر الدین خاں کے کام آئے گی، ان کے ارادے کو پختہ کرنے کا باعث ہوا۔ اور پنج آہنگ تیار ہو گئی۔ کتاب کے پانچ باب ہیں۔ پہلے میں یہ ہدایت ہے کہ خط کس طرح لکھا جائے، کون کس طرح مخاطب کیا جائے اور اسی قبیل کی دوسری باتیں، دوسرے میں مصادر، مصطلحات و لغات فارسی درج ہیں، تیسرے میں میرزا کے اشعار ہیں جو خط لکھنے والوں کے لیے کارآمد ہیں، چوتھے میں میرزا کے لکھے ہوئے خطبے اور تقریظیں اور متفرق عبارتیں ہیں، پانچویں میں میرزا کے خطوط ہیں۔

آہنگ اوّل، میرزا کی تمہید کا خلاصہ وہ ہی یہ ہے کہ ۱۲۴۱ھ میں انگریزوں نے بھرت پور پر لشکر کشی کی تھی اور قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، میرزا اور علی بخش خاں اس یورش میں احمد بخش خاں کے ساتھ تھے۔ میرزا نے (عمر عالی مقدار تھی) علی بخش خاں نے فرمائش کی کہ ایک رسالہ ایسا لکھ دیجے جس سے خط لکھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ میرزا نے ان کی فرمائش کو منظور کیا اور مختصر سا رسالہ لکھ دیا، باوجود اس کے کہ میرزا کی روش کے یہ بات خلاف تھی کہ دوسروں کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے مطابق القاب و آداب لکھیں، اور خیریت گوئی اور عافیت جوئی کو وہ بالکل فضول جانتے تھے، میرزا کے الفاظ یہ ہیں :-

"بیگانگی این روش از شیوۂ غالب مستمند نه چندان است که بگفتن نیاز داشته باشد و دانشناس داند که هنجار من درنگارش این است که چون کلک و صدق گویم مکتوب الیه را به لفظی که فراخور حالت او ست در آغاز صفوه آواز دهم و در مسیحی مدعا گوم القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زاید است ... و نیز داناشناسد که درین شیوه گنجایش سخن گستری تا کجاست۔"

اس کے بعد میرزا نے یہ بتایا ہے کہ خط کی عبارت کس طرح کی ہونی چاہیے، میرزا کی ہدایتوں کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) لکھنے میں گفتگو کا رنگ ہونا چاہیے۔ (۲) عبارت ایسی نہ ہو جس کا سمجھنا دشوار ہو (۳) اگر خط میں کئی باتیں لکھنی ہیں تو ان پر غور کرنا چاہیے کہ کسے مقدم رکھا جائے اور کسے مؤخر (۴) بات کو پیچ دے کر نہیں کہنا چاہیے (۵) دقیق استعاروں، ثقیل و نامانوس لفظوں سے بچنا چاہیے (۶) مکتوب الیہ کے رتبے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے (۷) طوالت اور تکرار الفاظ سے احتراز چاہیے (۸) قواعد مقررہ کی پابندی ضروری ہے اور لوگوں کے مذاق کا خیال ضرور کرنا چاہیے، لیکن فارسی میں ہندوستانی فارسی نویسوں کے تصرفات کو قبول نہیں کرنا چاہیے، عربی الفاظ ضرورت سے زیادہ نہ استعمال کیے جائیں۔ (۹) معاملات کے خطوط میں خاص طور پر ان خطوط میں جو حکام کے پاس بھیجے جائیں، مبالغے اور اغراق سے بچنا ضروری ہے، تشبیہوں اور استعاروں سے کام نہ لیا جائے۔ لہجہ سنجیدہ، زبان نرم اور آسان ہونی چاہیے۔

اس کے بعد ہر درجے کے لوگوں کے القاب ہیں، گورنر جنرل کے لیے یہ القاب :-

جناب مستطاب معلی القاب، جہانیاں آب، انجم جاہ، انجم سپاہ، سپہر بارگاہ نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ وزاد افضالہ۔

القاب میں ایک آدھ جگہ قبلہ گاہی بھی آیا ہے، بظاہر ہندوستانی فارسی دانوں کا یہ تصرف میرزا کی نظر میں نامقبول تھا، دوسرے اور تیسرے ابواب میں کوئی بات قابل ذکر نہیں، ان کے متعلق اوپر جو کچھ لکھا جا چکا ہے کافی ہے، پوتے باب کے مندرجات کی فہرست یہ ہے:-

(۱) دیباچۂ دیوان فارسی (۲) دیباچۂ گل رعنا (۳) دیباچہ دیوان ریختہ (۴) خاتمۂ گل رعنا (۵) خاتمۂ دیوان فارسی (۶) تقریظ تذکرۂ اردو تالیف نواب مصطفیٰ خان بہادر (۷) نثر جو قصیدۂ مدحیہ کے عنوان کے طور پر لکھی گئی تھی (۸) نثر جو دیوان ریختہ کی پشت پر لکھ کر امام بخش ناسخ کو بھیجی گئی (۹) نو داری صبح (۱۰) ظلمت شب (۱۱) تقریظ دیوان حافظ (۱۲) دیباچۂ دیوان مرزا ابراہیم الدین بہادر (۱۳) عبارت در صنعت متقطع الحروف (۱۴) عبارت تقریظ رسالہ مولوی کلکوہ صنعت تعطیل (۱۵) دیباچۂ دیوان ہرگوپال تفتہ (۱۶) تقریظ آثار الصنادید (۱۷) دیباچۂ دیوان ریختہ نواب حسام الدین حیدر خان بہادر نامی (۱۸) دیباچۂ تذکرۂ طلسم راز مؤلفہ میر مہدی۔

لے شمس الدین خان کو پھانسی کی سزا ملی

تی لے علی بخش خاں کے بیٹے

غالب کے دو لطیفے

(۱) پرانے زمانے میں راجا بھرت پور کے یہاں ایک منشی تھا، جسے انشا پردازی کا سلیقہ تو نہ تھا۔ لیکن باتیں خوب بناتا تھا راجا کسی بات پر اس سے خفا ہو گیا، اور ایک نیا منشی بحال ہوا۔ پرانے منشی کو بہت خار گزرا اور اس فکر میں رہنے لگا کہ کسی طرح نئے منشی کو ذلیل کرے۔ ایک دن نیا منشی راجا کی طرف سے ایک سردار کو جو راجا کے دوستوں میں تھا اور جس کی خاطر راجا کو بہت عزیز تھی، خط لکھ رہا تھا۔ پرانا منشی سرہانے کو دیکھ کر مسکرانے اور منہ بنانے لگا، راجا اس وقت تو کچھ نہ بولا، لیکن جب خلوت ہوئی تو پرانے منشی کو بلا کر راجا نے اس حرکت کا سبب پوچھا۔ اس نے پہلے تو راجا کی مدح میں زبان کھولی اس کے بعد بولا کہ حضور! ہم لوگ پرانے نمک خوار ہیں۔ سرکار کا ہمیشہ بھلا چاہتے ہیں۔ نئے ملازموں کو اس کی کیا پروا۔ یہ دلی والے تو خاص طور پر نمک کا پاس نہیں کرتے ہیں سردار صاحب کو برابر از راہ تعظیم مہربان بڑی مہر سے لکھا کرتا تھا نئے منشی نے انہیں مہربان چھوٹی مہ سے لکھا ہے۔ اب جو وہ یہ فرق دیکھیں گے تو حضور کی طرف سے ان کے دل میں غبار آئیگا

یا نہیں ؟ یہ بات راجا کے دل کو لگ گئی ، منشی کو بلا کر بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ جب ہماری طرف سے برابر بڑی طرح سے مہربان لکھا جاتا ہے تو تم نے سردار صاحب کو مجھ ٹی ہ سے مہربان کیوں لکھا منشی صاحب برطرف ہوئے اور پرانے اپنی جگہ پر آ گئے " (ماخوذ از پنج آہنگ ص ۲۰ و ۲۱)

(۲) میرزا کے ایک شناسا یا دوست الف بیگ نامی تھے ۔ ان کے یہاں بڑھاپے میں لڑکا ہوا ۔ میرزا سے درخواست کی کہ نام رکھ دیجیے ۔ میرزا نے حمزہ بیگ نام رکھا اور خط تہنیت کے ساتھ یہ رباعی لکھ بھیجی ۔

چوں الف بیگ در کہن سالی — پسرے یافت سر بسر عزہ

نام او حمزہ بیگ کردہ بے — الف مستحق بود ہمزہ (پنج آہنگ ص ۱۳۵)

سراپا سخن اور غالب

سراپا سخن کا سال تکمیل ۱۲۶۹ھ ہے ۔ اس تذکرے میں میرزا کا حال اور ان کی ایک غزل درج ہے ۔

" میرزا اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ ولد عبد اللہ بیگ خان قوم ترک اولاد میں گشتاسپ کے ، مولد اکبر آباد مسکن دہلی دیوان فارسی اور ریختہ اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے ، مشاہیر شعرائے دہلی ہیں ۔ مؤلف کو یہ غزل اپنے خط میں شیخ فدا حسین فدائی قصبۂ دیبائی سے بھیجی تھی ۔

" دی سادگی سے جان پڑے کوہکن کے پاؤں — ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں "

کل ۹ شعر ہیں ۔ شعر ذیل دیوان مطبوعہ میں نہیں ۔

بیچارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی — کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں

جن صاحب کا تخلص فدائی لکھا ہے ان کے بارے ص ۱۴۸ پر لکھا ہے " شیخ فدا حسین فدا خلف شیخ کریم اللہ باشندۂ قصبہ دیبائی ضلع بلند شہر ، صاحب دیوان ، ارشد تلامذۂ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ " ۔

میرزا نے اس تذکرے کے لیے ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا تھا جو کتاب کے ص ۳۹۲ اور ۳۹۳ پر درج ہے :-

اس کتاب طرب نصاب نے جب
آب و تاب انطباع کی پائی
فکر تاریخ سال میں مجھ کو
ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو
دیے الله مجھ کو دکھلائی

اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا
باہزاراں ہزار زیبائی
سال ہجری تو ہو گیا معلوم
بے شمول عبارت آرائی
مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو
ہے جدا اگانہ کار فرمائی

سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
بہ امید سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چار دہ معصوم
جس سے ہے چشم جاں کو بینائی
اور بارہ امام ہیں بارہ
جن سے ایمان کو ہے توانائی

ان کو غالب یہ سال اچھا ہے جو ایسے کے ہیں تو للّہ

غالب مادۂ تاریخ نکالنے سے گھبراتے تھے۔ طلسم راز مسعود میر مہدی کی تاریخ بھی انہوں نے اسی طرح نکالی ہو

تذکرۂ سرور اور غالب

تذکرۂ سرور میں غالب کا ایک شعر ہے جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں، لیکن یہ شعر یا تو غلط نقل ہوا ہے یا اصل نسخے ہی میں صحیح درج نہیں (مئی کے معیار میں غالب کے اشعار اس تذکرے سے لے کر درج کیے جا چکے ہیں۔)

جگر سے ٹوٹتے ہوئے موکی سناں پیدا دہان زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

میرزا کے متعلق سرور نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ بعض الفاظ چھوٹ گئے ہوں:-

"اسد اللہ خان اسد، عرف مرزا نوشہ۔ اصلش از سمرقند، مولدش اکبرآباد، جوان قابل یار باش، دردمند، ہمیشہ بخوش معاشی بسر بردہ، ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن، عمہائے عشق مجاز، تربیت یافتۂ کم کردہ نیاز، در فن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا بیدل در ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند، الحمد موصوف مرد خود است، و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ مضامین موزوں کردہ، روزنیہ (؟) خیال بندی بیش از بیش بنا دخاطر دارد"۔ (عمدۃ المنتخبہ نسخۂ قلمی دفتر ہند لندن)

اعظم الدولہ سرور خاندانِ دہلی سے تھے، ان کا سال ولادت معلوم نہیں، لیکن قرائن سے الٰہی بخش خان معروف کے ہم عمر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا تذکرہ عمدۃ المنتخبہ سنہ ۱۲۱۶ھ یا سنہ ۱۲۲۰ھ میں شروع ہوا اور نو دس برس میں اس نے کتابی شکل اختیار کرلی مگر اس کے بہت بعد بھی اس میں اضافے ہوتے رہے۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو غالب کا حال اس میں نہ ملتا کیونکہ غالب کی پیدائش سنہ ۱۲۱۲ھ کی ہے۔ سرور اور معروف کے مساویانہ تعلقات ہوں گے، معروف نے اپنے دیوان دوم میں یاد کیا ہے:-

"لکھ غزل اک اور بھی معروف سرور کے لیے آج اس پر نکتہ فہمی نکتہ دانی ختم ہے"

غالب سے بھی باوجود تفاوتِ عمر دوستانہ تعلقات تھے، سرور غالب سے ملنے آیا کرتے تھے، اور غالب نے انہیں مرزا بیگ طپاں ابن ہادی بیگ خاں مقیم کلکتہ کا حال اور کلام بھی دیا تھا کہ اپنے تذکرے میں داخل کریں، جیسا کہ پنج آہنگ ص ۲۲۲ اور ۲۲۳ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ طپاں کا حال کسی وجہ سے تذکرۂ سرور میں داخل نہ ہو سکا۔

---

[1] طبع سوم ص ۲۲۰۔
طبع اول ۱۲۷۔

بہار و بنگالہ

(۱) ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد، ماخوذ از مرآۃ الاحوال، آقا بہبانی، مترجمہ جناب یوسف الدین احمد بلخی صاحب ایم۔ اے۔
(۲) بنگال کا پہلا گلدستہ، ایک بہاری کا ادبی کارنامہ، تحفۂ سخن، از جناب حکیم حبیب الرحمٰن خاں صاحب۔

ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد

ماخوذ از مرآۃ الاحوال آقا بہبانی۔　　ترجمہ جناب یوسف الدین احمد بلخی

آقا محمد حسن، طاب اللہ اور ... میر صفدر علی لکھنوی، خلف سید بر علی موسوی کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر عظیم آباد کی طرف چلا، میر صاحب نہایت مقدس اور صالح آدمی ہیں، راستہ خوش صحبت رفیقان سفر کی وجہ سے بہت اچھی طرح کٹا، ۱۲۲۰ھ ماہ مذکور کو رات کے تقریباً دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ہم لوگ جنت البلاد عظیم آباد پہنچے، پائین مدرسہ سیف خان کشتی باندھ دی، اور خود مدرسے میں قیام کیا ... سید کاظم علی خان بہادر اور ... امیر علی خان صاحب اور دوسرے اعزہ اسی شب ملاقات کے لیے آئے، دن کو ... مہاراجا مہاد لعل ... نواب ... عباس قلی خان بہادر نصرت جنگ ... خلف ... نواب ... منیر الدولہ بہادر ... کے ساتھ تشریف لائے۔ رمضان قریب تھا، میں یہیں ٹھہر گیا، اعزہ اور معتقدین میرے دل کو خوش رکھتے اور مسائل کی تحقیق کرتے رہتے دوستوں کی مہربانی اور محبت کی وہ دولت یہ جہاں بڑے لطف سے کٹا۔ سلالۃ السادات، علامی فہامی آقا سید حسن، داماد جنت آرام گاہ جناب مرزا محمد مہدی شہرستانی۔ قبل ہی سے اس شہر میں وارد تھے اور اب فیض آباد اور لکھنؤ کی طرف جانا چاہتے تھے انہیں تامل تھا کہ فیض آباد و لکھنؤ میں کسے ترجیح دیں، انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا، میں نے فیض آباد کے حق میں رائے دی، اسے قبول کر کے فیض آباد کی طرف روانہ ہوئے، ڈھاکے میں مجھے ان کا خط ملا جو بنارس سے انہوں نے لکھا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے بنارس سے لکھنؤ جانے کا فیصلہ کیا ہے مجھے حیرت اور پریشانی ہوئی، اس لیے کہ یہ ابن حسین ہیں اور وہ کوفہ دیکھا چاہیے کہ وہاں کے منافق ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ خدا انہیں محفوظ رکھے ..

عالی شان .. مسٹر ہنری ڈگلس صاحب بہادر کہ جج اور مجسٹریٹ یعنی اس شہر کے صاحب عدالت دیوانی و فوجداری ہیں، اپنے ابنائے جنس میں نہایت ممتاز ہیں، صفات حمیدہ اور فضائل جمیلہ سے متصف ہیں، اور ہمیشہ لوگوں کی بھلائی کی راہ نکالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جب میرے آنے کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنی سرکار سے ایک ہرکارہ مقرر کر دیا کہ میرے پاس حاضر اور میرے احکام کی تعمیل کرتا رہے۔ اس شہر کے صاحب عدالت اپیل ... ناظم الملک صمصام الدولہ مسٹر ہاکنس صاحب بہادر ہیں، جو فرقۂ انگریز کے منتخب شرفا میں ہیں، اور طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے ہیں انہیں ہر ملت اور طریقے کے ارباب کمال اور نامدار اشخاص سے ملنے کا شوق ہے۔ علوم و ادبیات عربیہ سے انہیں اتنی واقفیت ہے،

کر اپنے امثال و اقران میں سب سے آگے ہیں۔ اس شہر کے صاحبان عدالت میں سے.. مسٹر کرتے اسمت صاحب بہادر بھی ہیں، یہ بھی اپنی قوم کے اچھے لوگوں میں ہیں، اور انہیں بھی باکمال اور دانشمند... لوگوں کی ہم نشینی سے رغبت ہے یہ بھی دو صاحبوں کی طرح جن کا ذکر اوپر گزر رہا ہے، نہایت متدین ہیں کسی فریق کی پاس داری نہیں کرتے اور ذرا سی توجہ سے مشکل سی مشکل باتوں کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں۔

میں اسی شہر میں تھا کہ مرشد آباد سے محترمہ مکرمہ بہو بیگم صاحبہ حرز مہ کا خط پہنچا کہ فرح باغ.. آپ کی سکونت کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، آپ مرشد آباد آئیں تو وہیں قیام کریں۔ اس شہر کے بزرگان و اعیان علی الخصوص.. نواب عباس قلی خاں بہادر.. نے اصرار کیا کہ میں عظیم آباد سے نہ جاؤں، مجھے ذرا تامل تھا کہ کسے ترجیح دوں، دل کا میلان عظیم آباد کی طرف تھا کہ یہاں کے امرا اور اعزہ بخلاف دار الشرب مرشد آباد مقدس، متدین اور نیک کردار ہیں۔ اسی اثنا میں یہ بات سننے میں آئی کہ ... نیکی کا دروازہ اس شہر میں بالکل بند ہو گیا ہے، اور وہاں کے لوگوں میں پہلے سے بھی زیادہ خدا بیگانگی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بات اور بھی عظیم آباد کی ترجیح کا باعث ہوئی ... القصہ چند دنوں کے بعد نواب.. کریم قلی خاں بہادر خلف اوسط نواب منیر الدولہ بہادر.. ملاقات کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے بھی اصرار کیا کہ عظیم آباد میں قیام کروں۔ نواب کریم قلی خاں بہادر بڑی شان اور نام و نشان کے امیر ہیں، مدتوں شاہ عالم.. کی خدمت میں عزت، امتیاز کے ساتھ رہے، بادشاہ سے مقرب الخاقان، ضیاء الملک ضیاء الدولہ فرزند خاں بہادر تہور جنگ خطاب ملا۔ فارسی اور ہندی کے شعر کہنے اور لکھنے میں ان کی طبع رسا ہے اور گفتگو اور مجلس آرائی کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کی دوستی میں ثبات نہیں، نہ انہیں شریعت کی طرف جیسا چاہیے التفات ہے اور نہ سچائی میں استقامت ہے بزرگی اور سرداری کے بازار میں نار و احلال کے سوا کہ ایک نہایت کاسد اور بے رونق متاع ہے، کچھ اور سرمایہ ان کے پاس نہیں۔ ان کے فرزند ارشد.. مہدی قلی خاں پاکبازی اور دینداری میں ان سے بڑھ کر ہیں۔ اور کریم قلی خاں بہادر کو تعزیہ داری کے سوا جو تو سول باجے کے ساتھ ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے لوگوں کا بہت اجتماع ہوتا ہے، کوئی اور نیک کام کرتے نہیں دیکھا۔

اسی خاندان کے نیک لوگوں میں محمد صادق خاں خلف مرحوم نواب محمد شجاع خاں خلف اکبر منیر الدولہ ہیں۔ ان کے بھائیوں میں سے اکثر نیکی کی طرف مائل ہیں اور برابر مجھ سے مل کر میرے دل کو خوش کیا کرتے تھے۔ اس سفر میں.. سید یوسف علی خاں خلف مرحوم میر غلام حیدر خاں ہرائی کو انہیں ضلع مظفر پور میں کر اصلاح عظیم آباد سے بعد مسافتوں ہے کے ماندہ سید یوسف علی خاں سید ہونے کے علاوہ، رقیق القلب اور خجستہ اخلاق ہیں، اور علوم شرعیہ کے حاصل کرنے کا بہت شوق رکھتے ہیں، چنانچہ ملا محمد علی ترشیزی خراسانی کو کہ فقہ کی کتابوں کے ترجمہ ظاہر میں اس شہر کے دوسرے طلاب سے فی الجملہ بہتر ہیں، اپنے گھر نے جا کر رکھا اور ان کے کل اخراج کے کفیل ہوئے اور ان سے شرائع الاسلام کا ترجمہ پڑھتے ہیں۔ اس شہر کے علما میں.. میرزا رستم علی خلف مولوی عبد الحکیم کشمیری بھی تھے۔ مرزا رستم علی علوم معقولات میں اس شہر میں بے نظیر ہیں۔

اور ان کی گفتگو بڑی اچھی ہے۔ یہ بھی مجھ سے استفادہ کرتے رہے اس شہر کے علما میں ... اخوند ملا ابوالقاسم سمنانی بھی تھے، ان کی طبیعت سلیم اور ذہن کجی سے پاک ہے اکثر علوم متداول علی الخصوص تاریخ اقوام مختلفہ سے خوب واقف ہیں۔ دوسروں کی طرح جتنا جانتے ہیں اس سے زیادہ دعوی نہیں کرتے۔ اسی سفر میں عالی شان ... کلب علی خان ملقب بہ کرنیل صاحب خلف شیخ نصراللہ ساکن پرسہ (ضلع عظیم آباد کی ایک بستی) سے ملاقات ہوئی، یہ آدمی رقیق القلب اور سخی واقع ہوئے ہیں، علما اور سادات سے انہیں بڑا خلوص ہے۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت ..... ہے اس سفر میں ... میر خادم حسین خاں خلف میر شاہ علی خان صفوی سے ملاقات ہوئی جو میر محمد باقر خان اسلام حالی کے بھانجے ہیں یہ ایک ظریف، خوش صحبت۔ جوان ہیں اور علوم عقلیہ کی تحصیل کا شوق رکھتے ہیں، برابر ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے، دل ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس سفر میں اور بھی بہت لوگوں سے ملاقات ہوئی، لیکن چونکہ ان کا نسب اچھی طرح معلوم نہیں، ان کا ذکر نہیں کیا۔ سب لوگوں کو مجھ سے مودت و دوستی بہ درجۂ غایت تھی، لوگ برابر میرے پاس حاضر ہوکر مسائل کی تحقیق کیا کرتے تھے ... چند روز کے بعد محمد نجم الدین خاں قاضی القضات ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز بہادر وارد شہر ہوئے اور مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے، یہ کاکوری کے رہنے والے ہیں جو لکھنؤ کے قصبات سے ہے۔ میں جب فیض آباد میں تھا۔ اپنے اقربا سے ملنے کاکوری بھیجے تھے میرے بعض رسائل ان کی نظر سے گزرے تھے اور مجھ سے غائبانہ محبت رکھتے تھے، ان کا فیض آباد آنا ہوا تو میری ملاقات کے لیے بھی تشریف لائے تھے، اور دوستی درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی خدا کرے کہ ابھی سعادت دارین نصیب ہو رمضان تمام ہوا تو میں نے مرشد آباد کا عزم کیا، اور شوال کو دوستوں سے رخصت ہو کر براہ دریا بہ تقاضائے سابق الذکر کے ساتھ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔

---

[1] مصنف ہر شخص کا نہایت وجیہ ساتھ نام لیتا ہے بہت سے غیر ضروری الفاظ ترجمے میں نکال دیے گئے ہیں [2] میر حق کے ذکر کے بعد یہ عبارت ہے "مودت قربیٰ اذاہ کر محل سقیہ پارچا ہے وازاں جا بجا، باطراف می بودند بصاف وروز دوانہ تسدیم بنیہ کے دونوں نسخوں میں اسی طرح ہے [3] شیعی ترجمہ [4] یہاں پر یہ عبارت ہے جو اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ بسبب ضعیف فاحشہ فاجرہ طعونہ کردانانی مرشد آباد و از صلب برادر میران ناصبی است شوہیانئ و عبدت ہوزیباکر امثال این فقیر مادوستی با ہرکہ می خود زیادہ ازدراہ نیکی ذات مجرئہ صفات و اطوار وکردار او ست با آں کہ بہ جہت تشیت وادن امور فقرا و ذوالحاجات است، و ہرگاہ میبود نبد، بوہ و بزودکش علی السویہ نواہر بود پس درخاطر خود مقرر نمودم کہ بسبب حرکت دادن خیال و فرستادن عالی حضرت آقا محمد حسن خراسانی بہ تشیت امور ولایت بہ مرشد آباد برسوم و بزودی مراجعت کنم۔ [5] شجاع قلی خاں نام تھا، بیٹے کا نام بھی اسی طرف محمد صادق خان نہ ہوگا، لیکن دونوں نسخوں میں اسی طرح ہے [6] اصلی عبارت "خلف... میر شاہ علی خان صفوی از بطن ہمشیرۂ میر محمد باقر خان اسلام خانی۔" [7] ان کے متعلق حسب ذیل عبارت ہے جس کا ترجمہ نہیں کیا گیا "فاضلے است عالی شان بنہایت نخبۂ اخلاق و متواضع و در سرکار کمپنی بہ منزلۂ صدر الصدور است۔ قاضی القضات و الحکام عزل و نصب قضات متعلق بہ او است۔"

بنگالہ کا پہلا گلدستہ

ایک بہاری کا ادبی کارنامہ

نتیجۂ سخن

از جناب حکیم حبیبُ الرحمٰن خان صاحب

منشی محمد وزیر وزیرؔ عظیم آبادی کلکتہ میں بشغل تجارت مقیم تھے، اور سندریہ پٹی میں ان کی دکان تھی۔ دکان کیا بیٹھک تھی، ملک بھر کے رئیسوں سے شناسائی تھی، اور کلکتے سے متعلق ان کی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے، گویا اس زمانے کے کمیشن ایجنٹ یا آرڈر سپلائر کی حیثیت رکھتے تھے، شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے، اور انہیں حکیم سجاد مونہانی سے شرف تلمذ تھا۔ حکیم صاحب مرحوم آج سے پچاس برس قبل کلکتہ کے ممتاز حکیم اور بڑے قابل طبیب تھے۔ میں ان کے صاحبزادے حکیم سید بشیر حسن مرحوم سے ملا ہوں، وہ بھی قابل اور ذی علم طبیب تھے، حکیم سجاد کے اشعار میں نے نہیں دیکھے لیکن ان کا مطب شعر و سخن علم و ادب کی درسگاہ تھا اشعار بنا دیا کرتے تھے، مشاعروں میں شریک ہوتے تھے مگر خود نہیں پڑھتے تھے (مجھے یہی روایت پہنچی ہے) منشی آبدؔ مرحوم مجھ سے خود فرماتے تھے کہ میں اور وزیرؔ مرحوم نے شروع شروع میں خواجہ محمد شاہ شہرتؔ عظیم آبادی سے اصلاح لی ہے، ممکن ہے کہ قیام عظیم آباد کے زمانے میں شہرتؔ نے اصلاح دی ہو اور کلکتہ میں حکیم سجاد سے اصلاح لینے لگے ہوں، کیونکہ اس گلدستے میں آبدؔ کے نام کے ساتھ بھی تلمیذ حکیم سجاد مونہانی لکھا ہے۔ منشی عبدالرحیم آبدؔ عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۳۱۰ھ میں ڈھاکہ آئے اور برسوں یہیں مقیم رہے ایک نکاح بھی کر لیا تھا، لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ محلہ بخشی بازار میں رہتے تھے، نوجوانوں کے شعر و سخن کی پرداخت ان کے ذمے تھی اور اسی پر معاش تھی، تقریباً ۱۲ برس یہاں رہے، بی بی کے مرنے کے بعد ڈھاکہ چھوٹا۔ کلکتہ چلے گئے وہاں مچھوا بازار میں قیام تھا، میں نے دو ایک بار تلاش بھی کیا، مگر کچھ پتا نہ ملا۔ سنتا ہوں کہ سات آٹھ برس ہوئے انتقال ہو گیا، شروع سے نعت کہتے تھے، غالباً ۱۳۱۲ھ میں سمند آبدؔ کے نام سے پہلا دیوان شائع ہوا تھا۔ ان کے بعض اشعار اب تک میلاد خوانوں کی زبانوں پر ہیں۔

نتیجۂ سخن، جنوری ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے نکلا، یہ معلوم نہیں کہ کب تک زندہ رہا، لیکن فروری اور اپریل ۱۸۸۲ء کے پرچے میرے پاس موجود ہیں، طرحی اور غیر طرحی کلام شائع ہوا کرتا تھا۔ بڑی خصوصیت یہ تھی کہ طرح میں ترتیب

حروف تہجی کا خیال رکھا گیا تھا، اس میں غزلیں چھپواتے رہنے سے ہر شاعر کا دیوان مرتب ہو سکتا تھا۔ فروری [illegible] کی غزلیں ردیف شین پر اور اپریل [illegible] کی غزلیں ردیف ص پر ہیں۔ پہلے پرچے میں مصرع طرح الف پر ختم ہوتا تھا اور ہر نئے میں ش پر۔

اس گلدستے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ فارسی گو شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا، کوئی پرچہ بھی اس سے خالی نہیں مگر سوانح یا حالات بہت کم تھے، چنانچہ اپریل [illegible] کے پرچے میں حادثۂ جاں گداز و سانحۂ غم افزا کے عنوان سے نواب جاہ بن قدر انجم نواب ناظم بنگالہ کے خلف اصغر کی بیماری، علاج معالجہ رحلت کا حال اور انتقال کی تاریخیں ہیں۔
کبھی کبھی تصویر بھی شائع ہوتی تھی مگر کیسی تصویر؟ ایک صفحے میں حاشیہ بنا کر درمیان میں تصویر لگانے کی جگہ رکھی جاتی تھی اور اس میں فوٹو لگا دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں البتہ یہ بہت مشکل بات تھی، مگر مجھے جہاں تک معلوم ہے ایسی تصویریں کم ہی نکلیں۔

فروری [illegible] کے گلدستے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیّر سخن کے قدرداں دور دور کے لوگ تھے۔ افسوس ہے کہ اس پرچے کے صفحے غائب ہیں تاہم جہاں جہاں ان کے سرپرست اور مربی موجود تھے اس کی ایک ناقص فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ اس میں ٹونک، مرشدآباد، بھاگل پور، ڈھاکہ، لوہاردو، کشن کوٹ، پرتاب گڑھ، میسور، پٹنہ، حیدرآباد، بنگلور، بھوانی پور، الور، شملہ، جام نگر، کشمیر، کاٹھیاوار، مٹیابرج، ٹالی گنج، زیادہ نمایاں ہیں۔

اس گلدستے کے ہندو اردو سابھی قدرداں اور ممد تھے، چنانچہ مہاراجا پدمانند سنگھ آف بنیلی آفر تخلص، راجہ نارائن سنگھ والی سورن پرسا۔ مہاراج پیر بہادر کرشن سنگھ ولی عہد کشن کوٹ متخلص بیدار شاگرد منشی بینی رام قائم۔ رائے امرناتھ الٹ پور۔ بابو چھنو لال رئیس کلکتہ کے نام فروری [illegible] کے پرچے میں موجود ہیں۔

تعجب ہے کہ ناسخ نے وزیر کا ذکر اپنی کسی تصنیف میں نہیں کیا حالانکہ اس گلدستے کے وہ بھی مربیوں میں تھے۔ اگر اس کے سب پرچے مل جائیں تو بنگالہ و بہار کے اکثر شعرا کا نام و کلام مل سکتا ہے چنانچہ کم ہی لوگ جانتے ہونگے کہ کلکتے کے نامور وکیل مولوی محمد یوسف بھی شاعر تھے، یا مہاراجا پدمانند سنگھ شاعر تھے اور افسر تخلص کرتے تھے اور حکیم سجاد موانی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

میرے پاس جو دو پرچے موجود ہیں ان کے سرسری مطالعے سے کلکتہ، مٹیابرج، ٹالی گنج کے ان مقیم شعرا کا پتا لگتا ہے۔

حکیم سید حسن ایجاد دہلوی شاگرد داغ، مستند الشعرا خواجہ محمد تقی بقا لکھنوی، حامد الدولہ بہادر برتر شاگرد جان عالم اختر، رئیس الدولہ بہادر شاگرد مہتاب الدولہ، شیخ الٰہی بخش تبسم، کاظم حسین جوہر شاگرد مہتاب الدولہ درخشاں، منشی عبد الصمد خلیل شاگرد عابد مرزا بیگم، مہتاب الدولہ کوکب الملک درخشاں، منشی رضا شاگرد اختر، امداد حسین خان رضا شاگرد [illegible]

منشی عباس شاد شاگرد اختر ، اسماعیل خان شوکت شاگرد اتسخ منشی شرف شاگرد مولوی سید علی حید رحیدر . میرزا جان شیفتہ شاگرد بقا ، سید عبدالصمد شہباز دانا پوری ، مرزا علی شاگرد منشی بحر ، سید فرخ شاگرد سید علی حید رحیدر ، مرزا فدا حسین فدا شاگرد گلشن الدولہ ، سید مہدی تسیم شاگرد بحر ، سید عبداللطیف کلکتی شاگرد بقا مولوی صادق علی ملک شاگرد جان عالم اختر ، خواجہ محسن علی عظیم آبادی شاگرد اتسخ ، آغا مرزا انجم شاگرد مولوی حیدر ، منشی فرزند علی ناظم رئیس کلکتہ ، مولوی وقار شاگرد گلشن الدولہ بہار ، سید علی ہمایون شاگرد بہار . میر یوسف علی لکھنوی شاگرد بیتاب ، محمد حسین عظیم آبادی حنیف شاگرد آبد عظیم آبادی . شیخ محبوب نجم خلف شیخ محمد علی کلکتہ . مولوی وحید رئیس کلکتہ شاگرد فریاد عظیم آبادی ، منشی عابد مرزا بیگم ریختی گو ، حاجی قمرالدین باجی ریختی گو ، شیخ افضل حسین افضل رئیس کلکتہ ، عطارد الدولہ محسن ، صاحبزادہ احمد شاہ کیوان شاگرد حیدر . حافظ مرجان شاگرد اتسخ ، منشی نیتم . صاحبزادہ محمد اکبر شگفتہ شاگرد اتسخ ، خواجہ شاگرد حیدر . صاحبزادہ ابراہیم شاہ رسا ، شاگرد حیدر . مولوی سید علی حید رحیدر طباطبائی نظم مدرس مدرسۂ سلطانیہ مٹیا برج . منشی رضوی ، مالک الدولہ صولت شاگرد منشی بحر ، منشی عبداللہ صابر ، صاحبزادہ مرزا بخت فریدون شاگرد رضوی . فرخ شاگرد حیدر . صاحبزادہ محمد غلام یٰسین معین . منشی برخوردار علی مظلوم شاگرد اتسخ منشی نثار حسین نثار شاگرد حیدر ،

شاعرات کی بھی ایک فہرست موجود ہے . اس میں سب کی سب طوائف ہیں اور اکثر کلکتہ کی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان بیچاریوں پر شاعری کی تہمت لگائی گئی ہے اس لیے اس فہرست کو اتقط کرتا ہوں .

اس گلدستے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ٹالی گنج (کلکتہ) میں خاندان میسور یہ کی سرپرستی میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے اور وہاں کے صاحبزادے اور ان کے متعلقین سب کے سب مولانا علی حیدر نظم طباطبائی کے شاگرد تھے . نظم مرحوم اس عہد میں حیدر تخلص کرتے تھے مگر ان کی شہرت مٹیا برج سے نکل کر کلکتہ میں انہیں استاد بنا رہی تھی اور اہل لکھنؤ کی طرح مولانا نظم مرحوم بنگالی اردو والوں سے نفرت نہیں کرتے تھے .

وزیر مرحوم نے اس پرچے کے لیے رپن پریس نام ایک مطبع بھی کھولا تھا اور غالباً نیتجہ سخن کے بعد کلکتہ کا سب سے پہلا پنچ جرنل گوہر آصفی انہوں نے نکالا تھا . یہ پرچہ ہفتہ وار تھا . اور رنگین کاغذ پر چھپتا تھا . بہترین ظریفانہ مضامین شائع ہوتے تھے . یہ وہی زمانہ ہے جب لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کا اودھ پنچ ، بانکی پور سے اینچ ، مراد آباد سے کرچی نکلا کرتے تھے بلکہ ہر صوبہ سے پنچ اخبار نکلا کرتے تھے یہ اخبار بھی کئی برس تک جاری رہا اور غالباً وزیر مرحوم کے انتقال کے بعد بند ہو گیا .

ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ اس گلدستے کے شاعروں میں میرے خیال میں سوائے نواب احمد حسین صاحب رنگین پر یا ازاللہ کے اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے .

داغ کی غزلیں تقریباً ہر گلدستے میں میں نے دیکھی ہیں استاد مرحوم بھی حاضر باش ہیں ، کبھی فرصت ملی تو شاعران عظیم آباد کی فہرست بھی .

[illegible]

تکمیل مضمون کے بعد ہی مئی ۱۸۷۸ء کا پرچہ مل گیا۔ اس کے دو صفحے ابتدا کے غائب ہیں۔ تیسرے صفحے سے مارکوئس آف رپن کے حالات شروع ہوتے ہیں۔ تصویر بھی ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ کسی انگریزی مطبعے میں چھپی ہے اور کاٹ کر خالی جگہ میں جو اس مصرف کے لیے رکھی گئی تھی، چسپاں کردی گئی ہے۔ تصویر نہایت اچھی اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ پانچویں صفحے سے ترجمۂ تواریخ برقی کا آغاز ہوتا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ پہلے بھی شائع ہوچکا ہے۔ اس پرچے میں بھی یہ مضمون ناتمام ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر بندھ کے قواعد ہیں، یہی تکرار سابق مضمون کا ہے۔ بارہویں صفحے پر نثر کا خاتمہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اصل گلدستہ ہے۔ اس پرچے پر جلد ۱ نمبر ۴ درج ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جنوری نہیں بلکہ فروری میں پہلا پرچہ نکلا تھا۔ مصرع طرح ۳۸ پر ختم ہوتا ہے۔

اس پرچے سے کلکتہ اور حوالی کلکتہ کے حسب ذیل نئے ناموں کا علم ہوتا ہے:۔ حافظ انعام اللہ انعام کان پوری، و خواجہ حسام الدین حسام و عبدالرزاق شاد تاجر دہلوی، حکیم عبدالصمد صمد کان پوری منتظم گلدستہ، شیخ محمد عارف میسو گلوی تلمیذ قاسم ساقی الذکر خلف خانہ، منشی بشر، منشی مظفر علی بشر، حامد الدولہ برتر، مولوی صادق علی آلی، امداد الدولہ منظم تلامذہ جہان عالم اختر، میر اصغر علی اختر، مولوی زین العابدین وقار تلامذۂ گلشن الدولہ بہار، منشی عبدالاحد احد خلف صمد سابق الذکر، شاگرد سالم کان پوری، حافظ محمد امین امین کان پوری تاجر کتب، مولوی عزم کان پوری، مالک الدولہ صولت، خواجہ محمد عاشق عاشق لکھنوی، آقا مرزا محمد حسین شیرازی علم، منشی پیر بخش کرم، منشی آبد، محمد امین نکہت متوطن چکوال ضلع جہلم، منشی اشنع، شیخ نور محمد ندیم، منشی حافظ امین، بیگن بیگ بیگن، محمد یکی یقین، منشی نفیس کان پوری۔

غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب داغ کلکتہ آئے تھے، چنانچہ ان کی مشہور غزل "داغ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پہ لے چلا" اس پرچے میں موجود ہے۔ اس زمین میں ایک آدھ غزل اور ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ مشاعرے کی زمین ہے۔ اس گلدستے میں شاعرۂ پردہ نشین کے عنوان سے فضل النساء بیگم صاحبہ متخلص بہ مطلوب مقیم فیصل کی طرحی غزل ہے۔ بازاری عورتوں میں کلکتے کی ساری نامور طوائفیں جلوہ افروز ہیں۔

یہ گلدستہ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے تقطیع ۲۰ × ۲۶ ہے۔ مجھے روایت پہنچی تھی کہ وزیر مرحوم سندریہ پٹی میں رہتے تھے، مگر اس پرچے کی اخیر سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۳۸ کوٹھی کولوٹولہ بائی لین میں رہتے تھے اور وہیں ان کا رپن پریس تھا۔

[بعض نام مکرر ہوگئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مضمون کا آخری حصہ ابتدائی حصے کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا گیا۔ ہو۔ تحریۂ سخن کے متعلق ایک سلسلۂ مضامین جناب حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ میں لکھا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس گلدستے کی ابتدا فروری ۱۸۷۸ء سے ہوئی اور جنوری ۱۸۸۲ء کے بعد تک نکلتا رہا۔ جناب حسرت نے یہ نہیں بتایا کہ کب بند ہوا۔ اردوئے معلیٰ، جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۱۲ء ۔ معیار]

مولوی سید عبدالغفور شہبازؔ داناپوری کی غزل ملاحظہ ہو ۔ یہ غزل فروری ۱۸۹۳ء کے پرچے میں چھپی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم شہبازؔ کی طبیعت ابتدائے غزل گوئی سے نفور تھی ۔ بعض اشعار حذف کر دیے گئے ہیں ۔:-

ہمیں ہے علم کے شجر کی تلاش ۔۔۔ شجرِ علم کے ثمر کی تلاش
علم انساں کا دل ہے علم جگر ۔۔۔ تم کو ہو اس دل و جگر کی تلاش
قتل کرنے کو جہل موذی کے ۔۔۔ کیجیے تیغ کی تبر کی تلاش
ہو نہ جس شخص پاس نقدِ عمل ۔۔۔ نہ کرے علم کے ثمر کی تلاش
یاد رکھو رباعیِ وحدت ۔۔۔ ہے یہ دانش کی عمر بھر کی تلاش
قول سے پہلے ہو عمل مطلوب ۔۔۔ آہ سے پہلے ہو اثر کی تلاش
کیجیے سو کام چھوڑ کر دل سے ۔۔۔ بہرِ ترویجِ علم ، زر کی تلاش
شامِ اقبال کو ہے دیر سے یاں ۔۔۔ عز و اقبال کے سحر کی تلاش

تا اُڑیں عرشِ مجد تک شہبازؔ
اس لیے ہے یہ بال و پَر کی تلاش

خود مالک گلدستہ محمود وزیر وزیرؔ کے دو چار شعر اس زمین میں سنیے :-

شبِ فرقت پھر آنے والی ہے ۔۔۔ شام سے ہو گی پھر سحر کی تلاش
کیوں مری خاک اُڑتی پھرتی ہے ۔۔۔ ہے اسے کس کے بام و در کی تلاش
تم سے کب کے عدو کو ڈھونڈھا ۔۔۔ تم نے دیکھی مری نظر کی تلاش

غیر طرح میں ، نواب سید آسماں قدر اسد علی مرزا ثریاؔ خلف نواب ناظم مرشدآباد ۔

جاتا ہوں سر کو پھوڑنے میں کوہسار پر ۔۔۔ وحشت بڑھی ہے آمدِ فصلِ بہار سے

نواب ابراہیم علی خاں والی ٹونک متخلص بہ حافظؔ ۔

نہ پوچھو حال شبِ جدائی جو دل کو رنج و محن ہوا ہے ۔۔۔ تمہارے سر کی قسم ہے صاحب کہ صبح کرنا کٹھن ہوا ہے

نواب والا قدر سید حسین علی مرزا ، نواب ناظم بنگالہ ۔

آئیں کیونکر ہم سے بدقسمت تری محفل کے پاس ۔۔۔ ڈوبنے والے پہنچ سکتے نہیں ساحل کے پاس
پوچھے جاتے ہیں غیروں سے پتا دلدار کا ۔۔۔ لے چلی ہے جستجو سے حق ہمیں باطل کے پاس

اپریل ۱۸۹۳ء ، خواجہ ولایت علی سرورؔ شاگرد خواجہ آتشؔ ۔

نالے سے کچھ غرض ہے نہ فریاد سے غرض ۔۔۔ مجھ کو ہے چپکے چپکے تری یاد سے غرض

مقالات

(١) ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات از ڈاکٹر ابو النصر محمد نظام الدین پی ایچ ڈی صدر شعبۂ فارسی جامعۂ عثمانیہ و مترجمہ جناب عبد المنان صاحب بیدل ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج (٢) سکے اور ضامک از قاضی عبد الودود (٣) ہندوستان کے متعلق چند غلط فہمیاں از آرزو جلیلی۔

ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات

از ڈاکٹر ابو النصر محمد نظام الدین صاحب   مترجمہ جناب عبد المنان صاحب بیدل

ایران پر جب مسلمانوں کا تسلط ہوا تو اس ملک میں ایک نئی زبان وجود میں آئی جسے پہلوی کے مقابلے میں فارسی کہتے ہیں۔ اس زبان نے بے شمار شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کا تماشا دیکھا ہے اور اس کا ادب ہزار سال سے زیادہ کی مدت میں جو تغیرات ہوئے ہیں اُن کا آئینہ دار ہے۔ شاید ہی کوئی اور زبان جو ادبی حیثیت اختیار کر چکی ہے فارسی کا اس خصوص میں مقابلہ کر سکے۔

دور کی کا صد فارسی شاعری کے بچپن کا زمانہ ہے۔ فردوسی نے اسے رزم سے آشنا کیا۔ خاقانی اور نظامی کا عہد قصیدہ گوئی اور افسانہ نگاری کا زمانہ تھا۔ سعدی و رومی کی صوفیانہ اور اخلاق آموز شاعری میں تاتاری حملے کے اثر نمایاں ہیں۔ حافظ اور جامی نے تغزل کو اوج کمال پر پہنچایا، قاآنی کے ہاتھ میں فارسی شاعری ایک موسیقی کا ساز بن گئی جس سے دلکش صدائیں نکلتی تھیں لیکن یہی شاعری آج کل اصلاح معاشرت اور احیائے ملت کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔

اس زبان میں نثر کی ابتدا عربی تواریخ اور تفاسیر کے ترجمے سے ہوئی، بلعمی، ناصر خسرو، نظام الملک طوسی، نظامی عروضی سمرقندی اور سعدی نے تاریخ اخلاق اور ادب میں ایسی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کا جواب نہیں ہو سکتا۔ تاتاریوں کے فوجی کارنامے جامع التواریخ، تاریخ جہاں کشائے جوینی، تاریخ وصاف اور تاریخ گزیدہ مصنفہ حمد اللہ مستوفی کے صفحات میں ایسے الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں جو ... نہ ... محقق طوسی اور ... کاشفی نے اخلاقی رسالے لکھے، ابو الفضل و فیضی کے زمانے میں اعلیٰ درجے کے سیاسی خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھا، آخری دو صدیوں میں تصوف سے متاثر ہوئی اور اب اسی کے ذریعے سے حب وطن کی تبلیغ کی جا رہی ہے۔

فارسی ادب کے پانچ دور۔ فارسی ادب کی تاریخ پانچ دوروں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ پہلا دور ...ھ سے ...ھ تک، سامانیوں اور ... کا دور حکومت اسے محمود کی ... بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں ... فردوسی اور دقیقی جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ یہ فارسی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس زمانے میں دو بیتی، رباعی، قصیدے اور مختلف اقسام کی مثنویوں کا رواج ہوا۔



ڈاکٹر ابوالعلم نظام الدین، پی - ایچ - ڈی (کیمبرج)

دوسرا دور (۸۶۷ء سے ۱۲۱۹ء تک) فارسی ادب کا دور زریں تھا اور یہ غزنویوں، سلجوقیوں اور خوارزم شاہوں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں فارسی ادب میں ہر قسم کی نظم اور مختلف طرح کی نثر کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اس زمانے کے مشہور شعرا عنصری، فردوسی، عمر خیام، ناصر خسرو، سنائی، خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی، عطار، اور سعدی ہیں، بیرونی اور بیہقی سے مورخین، بوعلی سینا سے فلسفی، نظام الملک سے سیاست داں، غزالی سے منطقی، ابوسعید ابوالخیر سے صوفی، اور نظامی عروضی سمرقندی سے ادیب نے ادبیات ایران کو مالامال کر دیا۔

تیسرا دور (۱۲۵۹ء سے ۱۵۰۰ء تک) مغلوں کے حملۂ ایران سے شروع ہوتا ہے۔ اور تیمور کے زمانے میں ختم ہوجاتا ہے۔ اس دور کو ایلخانی تیموری دور کہہ سکتے ہیں اس دور کے مشاہیر ادب، ناصر الدین طوسی، رشید الدین فضل اللہ، عطا جوینی، وصاف، عراقی، اوحدی، شبستری، ابن یمین، خواجو کرمانی، عبید زاکانی، سلمان ساوجی، حافظ شیرازی، میر علی شیر نوائی، جامی اور واعظ کاشفی ہیں۔

مغلوں کے حملے کے بعد ہی فارس کی تمام ذہنی اور ادبی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں، لیکن تیموریوں اور ان کے اخلاف کا زمانہ اس زبان کا دور تجدد ہے، اس دور کا آخری حصے میں فارسی شاعری کے درخت میں پھر پھل پھول آئے۔ اس زمانے کی بہت ہیں لیکن کچھ زیادہ بلند پایہ نہیں، اور ان میں وہ جدت اور آزاد خیالی بھی نہیں ہے جو مغلوں کے حملے سے پیشتر ادب فارسی کی ممتاز خصوصیت تھی۔

چوتھا دور (۱۵۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک) جو ایک طویل دور ہے۔ صفویوں، مغلوں اور قاچاریوں کا دور کہا جاسکتا ہے یہ دور خاندان صفویہ کے عروج سے شروع ہوتا ہے۔ اور ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل اور حکومت مشروطہ کے مطالبے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتا ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ دور انحطاط و جمود کا دور تھا۔ صفویوں نے آزادیٔ خیال بالکل چھین لی تھی، صرف مذہبی علوم کی ترویج کے درپے تھے اور ان کے زمانے میں سارا زورِ طبیعت مذہبی مناظروں میں صرف ہوتا تھا۔ البتہ مغلوں نے جو ہندوستان کے فرماں روا تھے اس زبان کے وقار کو باقی رکھا اور فارس کے شعرا اور مصنفین کی خاطر خواہ ہمت افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی تہذیب کا ایک نیا مرکز ہندوستان میں قائم ہوگیا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کی طرزِ بیان پیدا ہوگئی جس کا معتد بہ اثر وسط ایشیا کے ادبیات پر پڑا۔

قاچاریوں کی حکومت کی ابتدائی زمانے میں شعرا اور مصنفین قدیم طرز کا تتبع کرتے رہے۔ اور کوئی قابل قدر کتاب نہیں لکھی، لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جبکہ ایرانیوں کو ان یورپی اقوام سے ملنے کا موقع ملا جو فارس میں اپنا اقتدار اور اثر قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل تھیں تو فارسی شاعری میں ایک نیا عنصر شامل ہوگیا، اور اس زبان میں نئی طرز کا ادب پیدا ہونے کی راہ کھل گئی۔

اس جدید تحریک کی ابتدا قاآنی سے ہوئی، وہ انگریزی اور فرانسیسی زبان سے واقف تھا اور اس لیے متعدد

کتابیں ان زبانوں سے ترجمہ بھی کی گئیں۔ شیبانی اور یغمائے جندقی نے بھی زبان کی صفائی میں اچھی طرح کوشش کی
اصلاحِ زبان کے لیے ایک تعلیمی ادارہ دار الفنون کے نام سے کھولا گیا جس کا مقصد مغربی علوم کی تعلیم تھی۔ اس ادارے
کا پہلا ناظم رضا قلی خان لالہ باشی مصنف مجمع الفصحا، المتخلص بہ ہدایت تھا۔

ادب فارسی کا پانچواں اور آخری دور ۱۹۰۵ء کے انقلاب فارس سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور تحریک مشروطہ خواہی اور شورش ملی کا دور ہے۔ اسی دور میں خاندان پہلوی کو جو اب تک قائم ہے عروج ہوا۔ معاشرتی اقتصادی اور ملی جنگ وجہد اور نئی طرح کی حکومت نے ایک نئے قسم کا ادب اس زبان میں پیدا کر دیا۔ اور ایک جدید تہذیب کی بنا ڈال دی۔ اس دور کے ادبی رجحانات کے تصور کے لیے ایران کے آخری تیس برس کی سیاسی اور تاریخی حالات سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر براؤن کی کتاب "انقلاب ایران" میں انقلاب فارس ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۹ء کے دورِ مجبوری کے وحشت خیز واقعات بوضاحت درج ہیں یورپ کے جنگِ عظیم کے قبل اور بعد کے چند ضروری واقعات درج کرتا ہوں۔

قاچاریوں کے عہد میں ایران کا اقتدار و وقار بہت کچھ زائل ہو گیا تھا۔ ایران انگلستان اور روس کے پنجے میں تھا، اس کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بلوچستان ہندوستان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ہرات اور قندھار برطانیہ کے زیرِ نگیں آ چکا تھا، اور آذربائیجان سلطنتِ روس کا جزو ہو گیا تھا، ایران اپنے مقبوضات کی حفاظت سے قاصر تھا۔ بیرونی حکومتوں کو طرح طرح کی رعایتیں اور تجارتی آسانیاں دی گئی تھیں۔ ایران، روس اور برطانیہ سے کڑے شرح سود پر قرضے لیتا اور شرمناک اور ذلیل معاہدے کرتا تھا مثلاً ۱۹۰۷ء کا برطانوی روسی عہد نامہ ایران سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں گھرا ہوا تھا، بادشاہ اور وطن پرستوں کی کشمکش روز بروز سخت تر ہوتی جا رہی تھی، اگرچہ پُرانی حالت ۱۸۹۶ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل کے بعد باقی نہ رہی تھی تاہم رعایا عجب پراگندگی کی حالت میں تھی، آخر کار بادشاہ کی علانیہ مخالفت شروع ہو گئی۔

سیاسی بیداری۔ اس زمانے میں اصلاحِ حکومت کی تحریک زوروں پر تھی، حاکموں کے ظلم، مذہبی مقتداؤں کے تعصب، رعایا کے افلاس، خود غرض سلطنتوں کی ریشہ دوانیوں۔ مظفر الدین شاہ کی قیادت وبے مہری اور وزرا کے اقدامات غیر قانونی نے اہل ملک کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ خفیہ انجمنوں کی تشکیل ہوئی۔ باوجود سفاکانہ طریقۂ انسداد کے اہل ملک نے جان پر کھیل کر ناصر الدین شاہ کے جانشین محمد علی شاہ کو تشکیل مشروطہ کے لیے مجبور کیا۔ تبریز میں وطن پرستوں کا ماوی تھا، سلطنت کے خلاف بغاوت ہوئی، سپہدار نے وطن پرستوں کی ایک جماعت کے ساتھ طہران پر دھاوا بول دیا اور غایت جوش میں سردار اسعد نے جو سردار انقلاب تھا اپنے ہم قوم بختیاریوں سے ملکر محمد علی شاہ کو معزول کر کے طہران پر فوج کشی کر دی۔ جب ان دونوں سرداروں نے مل کر

دارالسلطنت پر حملہ کر دیا تو بادشاہ نے حکومت مشروطہ کو از سر نو قائم کرنے کی رضامندی تو دے دی، لیکن جب مجلس کی کارروائیوں میں بادشاہ برابر رکاوٹیں پیدا کرتا رہا تو لوگوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹے احمد شاہ کے لیے تخت شاہی خالی کر دے۔ لیکن اس نے بھی اہل ملک کے ساتھ بے وفائی کی اور ملک کو اپنی حالت پر چھوڑ کر یورپ چلا گیا۔

اگرچہ جنگ کے زمانے میں ایران نے اپنے غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر لڑنے والی سلطنتوں نے جو اس کے اطراف میں قائم تھیں اس کی ذرا بھی پروانہ کی اور ایران بھی ساحت جنگ بن گیا۔ انگریزی۔ المانی روسی اور ترکی فوجوں نے ملک میں گھس کر ملک کو تباہ کرنا شروع کیا۔ طہران کی مرکزی سلطنت میں نہ اپنے کو غیر ملکی حملہ آوروں سے بچانے کی قوت تھی اور نہ ملک کے متمردین کو مطیع رکھنے کی صلاحیت تھی۔

فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں جنرل رضا خاں نے ایک دستۂ فوج کی مدد سے دارالسلطنت پر قبضہ کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ایک کبینٹ قائم کی اور خود وزیر جنگ بنا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اس نے مشہور پہلوی کبینٹ قائم کی اور ۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۵ء میں اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

رضا شاہ قوم کے ناخدا کی حیثیت سے۔ محض ایک زبردست ہستی کی آمد نے ملک کو بربادی سے بچا لیا۔ وہ مملکت جو صرف تیس برس پہلے غیر متمدن غیر منظم، بے سرمایہ او، بے حیثیت اور جو محض چند دنوں کی مہمان سمجھی جاتی تھی، حیرت انگیز طور پر ایک ایسی جدید سلطنت بن گئی جسے بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے

اس انقلاب عظیم کا سہرا رضا شاہ پہلوی کے سر ہے۔ رضا شاہ پہلوی نے ایک سپاہی کی طرح اپنی زندگی شروع کی گرانی ان تھک کوششوں، ہوشیاری، ذہانت، قابلیت، ہمت، اور اصول جنگ کی واقفیت سے آخرکار تاجدار ایران بن گیا، اس نے ترک مصطفےٰ کمال اتاترک سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے ایران کے مرتبے کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے اس کے پانزدہ سالہ دور حکومت میں ایران نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اب ایران آزاد ہے، قرضوں سے اسے نجات مل چکی ہے۔ اغیار کے پنجوں سے چھوٹ چکا ہے اور اپنی قسمت کا آپ مالک ہے، رضا شاہ کی کارروائیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ایران امتیازات اجنبی یعنی کیپی چولیشنس منسوخ ہو چکے ہیں، ایران میں منظم حکومت قائم ہے۔ جمہوری اداروں کی داغ بیل پڑ چکی ہے اور ممالک غیر سے مستقل سیاسی تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ محصولات پر اب غیر اقوام کا کوئی اختیار نہیں رہا، قوانین انصاف کی اصلاح کی گئی ہے۔ فوجی تعلیم ملک بھر میں جبری ہے۔ اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے باقاعدہ فوج موجود ہے جنگی جہازوں اور ہوائی بیڑے کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ ملک میں قومی زرعی اور پہلوی بینک قائم کیے گئے ہیں اور اینگلو پرشین آئل کمپنی سے جو نیا معاہدہ ہوا ہے اس سے توقع ہے کہ ایران کی مالی حالت بڑی حد تک ٹھیک ہو جائے، رضا شاہ نے سماج کی حالت درست کر دی ہے۔ قوم تعصب کی آلودگیوں سے پاک کر دیا ہے۔ نظام تعلیم کی تجدید کر دی ہے نئی اور مضبوط سڑکیں بنوائی ہیں۔ ریلوے تیار کی ہے۔ تار، لاسلکی، ٹیلیفون، اور فیکٹریاں قائم کر دی ہیں

ملکی صنعتوں کی ہمت افزائی کی ہے ایک پائدار سکہ رائج کیا ہے۔ درحقیقت ایرانِ جدید کا قائم کرنے والا وہی ہے اور یہ اس کی کرامت ہی کرامت ہے۔

ایرانی صنعتوں کی نمائش ۱۹۳۰ء میں لندن میں پہلی بار ایرانی صنعتوں کی نمائش ہوئی، اس نمائش کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے بین الاقوامی تعلقات کے پیدا ہونے کی ابتدا ہوتی ہے۔ ورنہ آج تک ایران دنیا سے الگ تھلگ رہنا ہی مستحسن سمجھتا تھا۔ برلنگٹن ہاؤس میں جن صنعت کاریوں کی نمائش ہوئی اس نے حسن پرست یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اس نمائش سے یورپ اور ایشیا کے صنعتی تعلقات کا بھی پتا چلا اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مغرب کی تہذیب پر ممالک سے کہیں زیادہ ایران کا اثر ہے۔ ایشیا کو بھی ایران سے بہت سی چیزیں ملی ہیں۔ ہند کی مینیچر پینٹنگ ایران کی فن کاری کے اثر کی ایک مثال ہے۔ اس نمائش سے اس بات کا بھی پتا چلا کہ ایرانیوں میں غیر ملکی تہذیب سے اخذ کرنے کی بڑی صلاحیت ہے، اور حالت زمانہ اور ماحول کے مطابق ان میں پرانی ترکیبوں کے درست کر لینے کی کافی استعداد ہے۔ ایران کی صنعت کا بیش بہا خزانہ تمام ملک سے جمع کر کے با اصول اور مرتب طریقے سے دنیا کے سامنے پہلی بار پیش کیا گیا۔ نمائش کی کامیابی بادشاہ کی اعانت اور ذوق کی ممنون ہے، شاہ ایران کے اس قابل قدر اقدام کا خیر مقدم تمام اقوام نے کیا، وتیس سلطنتوں نے اس نمائش میں شرکت کی۔ سَو سے زیادہ عجائب خانوں، یونیورسٹیوں اور کتب خانوں اور صدہا دوسرے لوگوں نے نمائش کی چیزیں بھیجکر اس میں بین الاقوامی مشارکت جسی کو کامیاب بنایا۔ برٹش میوزیم میں بھی ایران کی صنعتوں کی نمائش ہوئی۔ رضا شاہ نے پہلی بار دنیا کو دکھا دیا کہ وہ کتنا اصلاح و ترقی کا دلدادہ ہے۔ کس عمدہ اور مناسب نظم و نسق کے ساتھ کسی کام کو انجام دے سکتا ہے۔ اور ایران کے وقارِ قدیم کو از سرِ نو قائم کرنے کا کس درجہ خواہشمند ہے اور ایران کو مشرق کی قوموں کے صف اول میں لانے کے لیے کتنے بے چین تھے۔ لینن گراڈ میں جو ایران کی صنعتوں کی نمائش ہوئی۔ اس سے ایران کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں، رضا شاہ کی سیاحت یورپ سے شوکت ایران بہت بڑھ گئی سیاحت سے واپسی کے بعد رضا شاہ پہلوی نے سوسائٹی کے اصلاح کی اسکیم تیار کی اور اس اسکیم پر استقلال کے ساتھ عمل درآمد ہو رہا ہے۔

فردوسی کی ہزار سالہ برسی: ۱۹۳۴ء میں فردوسی ایران کے مشہور رزم نگار کی ہزار سالہ برسی بڑے جاہ و جلال، شاہانہ شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ کسی دوسری مشرقی قوم نے شاید ہی کسی شاعر کی عظمت کا اعتراف اس انداز سے کیا ہو۔ دنیا کے ہر حصے سے مہمان ایران اور مستشرقین اس موقع پر اپنے اپنے ملک کی طرف سے خراج تحسین ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ایرانیوں نے جس جوش اور سرگرمی کا اس موقع پر اظہار کیا اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اب بیدار ہو چلے ہیں، اور اپنی تہذیب کو مرنے نہیں دینا چاہتے۔

۱۲ اکتوبر کا دن طوس کی تاریخ کا سب سے شاندار دن ہے۔ شہنشاہ ایران نے مختلف ممالک عالم کے

نمایندوں کے سامنے فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے متعلق کارروائیوں کا افتتاح کیا۔ ہزار برس قبل شاہنامہ کو قدر شناس مربی نہ مل سکا۔ لیکن ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو فردوسی کی عظمت شاعرانہ کے آگے مشرق و مغرب دونوں سرتسلیم خم کیے تھے۔

پرشیا کی جگہ ایران: ۱۹۳۵ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ ملک کا نام ایران ہے جو قدیم سے چلا آتا ہے۔ پرشیا ایک بیرونی لفظ ہے جس کا اطلاق ملک پر نہیں ہونا چاہیے۔

۔لفظ ایران کا ماخذ پہلوی زبان ہے اور اس کا سلسلہ اوستا کے لفظ آریانا سے ملتا ہے جو لفظ آریہ کی صورت صفتی ہے۔ لفظ پرشیا مغربی الاصل ہے۔ غالباً قرون وسطی میں ایران اس نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ لفظ پرسائی جو یونانیوں اور رومیوں کی زبان پر الکیٹنڈ کے لیے تھا۔ یہ غالباً پرسس سے ماخوذ ہے جو ایران کے جنوبی مغربی حصے (جو آج کل فارس کہلاتا ہے) کا نام ہے۔ اس کا نام غالباً ایک قبیلے "پارسوا" کے نام پر رکھا گیا تھا جس کا ذکر اسیریا کے کتبات میں ہے۔ لیکن قدیم زمانے سے لفظ فارسی خاص قسم کی بولیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جیسا کہ فہرست میں لکھا ہوا ہے۔ یہ زبان نویں صدی سے ایران کی ادبی زبان بن گئی، اور اسی کو ہم فارسی کہتے ہیں۔

ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے بعد لفظ ایران بہت عام ہوگیا، لیکن انیسویں صدی سے قبل ایران کے باشندے اپنے کو ایرانی اور اپنے ملک کو ایران نہیں کہتے تھے۔

جدید اجتماعی اصلاح: ایران میں سوسائٹی کی اصلاح کے لیے اور بھی تحریکیں ہو رہی ہیں اور ان پر عمل در آمد بھی شروع ہوگیا ہے۔ مثلاً یورپی لباس کا جبریہ استعمال کلاہ پہلوی کی جگہ پر یورپی فلٹ سیٹ کا پہننا، اور پردہ کا اٹھا دیا جانا، جس سے عورتوں کو آزاد کیے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔

آج کل ایران اس دھن میں ہے کہ ایرانیوں کو جدید یورپی اقوام کے دوش بدوش کھڑا کرے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے اور دوسرے افادی اصول کی بنا پر وہ کوشش کر رہا ہے کہ جہاں تک حد امکان میں ہو مغربی بن جائے یہ تغیرات صرف فروع سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ اصل تک جاتے ہیں۔ آگے چل کر ان کا ملک پر کیا اثر ہوگا اس کا اس وقت فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ملک کا قدامت پسند طبقہ ان جدت طرازیوں کا سخت مخالف ہے، لیکن رضا شاہ پہلوی اپنی "مغرب سازی" کی کارروائی جاری رکھی ہے، ایک اور اہم کام جو اس سلسلہ میں ہوا ہے وہ مذہب و سیاست کی تفریق و تقسیم ہے، نئی روشنی کے پروانوں نے دیکھ لیا کہ قوم کا صدیوں تک اپنی ناکامیوں پر ماتم کرنا فعل لاحاصل تھا، اور صرف لاحاصل ہی نہیں بلکہ مضرت رساں بھی تھا اس لیے کہ اس ماتم گساری اور سینہ زنی نے قوم کی ذہنیت کو پست کر دیا ہے۔

ان کے خیال میں مادی ترقی کی کوشش فرض ہے اگرچہ اس کوشش میں دینی اور روحانی مفاد کو قربان کر دینا پڑے اس لیے کہ مذہب کے غلط تصور نے ایران میں سیکڑوں فتنے برپا کر رکھے تھے۔

یوم ملت ۔ قدیم ساسانی تہوار کو منانے کی رسم بہت دنوں سے ایران میں رائج تھی۔ لیکن ۳ر اسفندار ۱۲۹۹ شمسی مطابق ۲۲ر فروری ۱۹۲۱ء جو خاندان پہلوی کے آغاز کی تاریخ ہے "عید ملی" کی تاریخ قرار دی گئی۔ حال ہی میں یہ عید ملی بڑی دھوم دھام اور شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ ۲۲ر فروری ۱۹۳۶ء کو طہران میں منائی گئی۔ یہ عید کرنل رضا خاں کے طہران پر حملہ کرنے ان کے کمانڈر ان چیف بنائے جانے اس کے بعد وزیر جنگ وزیر اعظم بننے اور بالآخر ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء سریر آرائے سلطنت ایران ہونے کی یادگار ہے۔

نظام تعلیم کی اصلاحات: اب تک زبان وادب اور طریقۂ تعلیم کی درستی میں انفرادی کوششیں ہوتی رہی تھیں لیکن موجودہ دور میں حکومت نے نظام تعلیم کو اساس استوار پر قائم کرنے کی خاص کوشش کی ہے۔ پرانے مدارس توڑ دیے گئے ہیں۔ طرز جدید پر ابتدائی اور ثانوی مدارس قائم کیے گئے ہیں حال ہی میں ایک یونیورسٹی بھی سائنس اور آرٹ کے ہر شعبے کی تعلیم کے لیے قائم کی گئی ہے۔ سپہ سالار کا پرانا مدرسہ جو قدیم طرز کا مذہبی اور دینی مدرسہ تھا اب قانون، فلسفہ اور مذہب کی تعلیم کا کالج بن گیا ہے۔ نصاب تعلیم نئے اصول پر مرتب ہوا ہے۔ ہر سال طلبہ کی ایک معتد بہ تعداد اعلیٰ تعلیم پانے کے لیے سلطنت کی طرف سے یورپ بھیجی جاتی ہے۔ قلمی کتب کی حفاظت اور نئے اصول پر کتبخانوں کی تنظیم شروع کی گئی ہے۔ مذہبی اوقاف کا انتظام مفید اصول پر کیا جا رہا ہے۔ مشہد مقدس کے اوقاف کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔

فرہنگستان اور اصلاح زبان کا مسئلہ: سلطنت عالیہ ایران کے جدید ترین مساعی جمیلہ میں اس ادبی انجمن کا قیام بھی ہے جو "فرہنگستان ایران" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا مقصد زبان اور ادبیات ایران کی ترقی و توسیع ہے۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد میں زبان فارسی کی روز افزوں ضرورتوں کو پورا کرنے کی ترکیب سوچنا ہے اور اس ڈھنگ سے زبان کی اصلاح کرنا ہے کہ اس کی بین الاقوامی اہمیت باقی رہے۔

سرکاری اعلان کے مطابق اس انجمن کا مقصد ایک لغت کا مرتب کرنا موجودہ فارسی سے بعض محاورات اور الفاظ کا نکالنا، ان میں اضافہ کرنا اصطلاحات علمی کا وضع کرنا۔ بیرونی عناصر سے ملک کی زبان کو پاک کرنا، آیندہ کے لیے فارسی کے شعرا اور ادیبوں کی رہبری کرنا اور رسم خط کی اصلاح کرنا ہے۔

یہ ہدایتیں تحریر میں تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن دقت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب مفکرین، ادبا اور سیاست داں اشتراک عمل کی کوئی ٹھوس بنیاد قائم کرنا چاہتے ہیں مصنف تاریخ "تنقید جدید" مسٹر جوج سینٹسبری کا قول جدید فارسی ادب پر بالکل منطبق ہوتا ہے: "وہ قدیم بغیر جدید کے ترقی کا دشمن ہے اور جدید بغیر قدیم کے سخت

دماہل اصلاح حماقت ہے۔" مغربی تہذیب کو تمام تر اختیار کرنا، یورپ کی ہر بات کو مستحسن سمجھنا اور ان کی معاشرت کو اندھوں کی طرح قبول کرنا احساس ملی کے فقدان کے نمایاں آثار ہیں۔ جدید فارسی ادب میں تین متضاد رجحانات نمایاں ہیں۔

بعض لوگوں کا مستقل خیال ہے کہ اسلامی روایات سے علٰحدگی نہ کی جائے مگر ساتھ ہی ساتھ ان کا میلان خالص فارسی ادب وتمدن کی ترقی اور تاریخ ایران کی اہمیت کو واضح کرنے کی طرف بھی ہے۔ بعض خیال پرست لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہو سکے تو فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کرکے ساسانیوں کے زمانے کی فارسی کو، جسے وہ اصل فارسی سمجھتے ہیں، رواج دیا جائے۔

ایک معتد بہ تعداد فارسی اور عربی کے موجودہ تعلق اور اختلاط الفاظ کو روا رکھتی ہے۔ اور یورپ کی بہ نسبت قاہرہ سے الفاظ کے لینے کو زیادہ پسند کرتی ہے، ملکی مصنفین اور عربی خط تحریر کی طرف دار ہے، اس خواہش کا وہ بااثر اور باعمل طبقۂ مصنفین مخالف ہے۔ جو اپنے اہل وطن کو تقلید یورپ کا سبق پڑھاتا ہے۔ اور لاطینی رسم خط کو اختیار کرنے کا حامی ہے۔

جب سے ترکوں نے لاطینی خط اختیار کر لیا ہے اہل فارس بھی اس معاملے پر بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہے ہیں مگر قبل اس کے کہ تبدیل خط عمل میں آئے امور ذیل کو ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

رسم الخط کی حالت دونوں ملکوں میں بالکل جداگانہ ہے۔ "عربی خط" ترکی زبان کے لیے نامناسب تھا۔ یہ فارسی زبان کے لیے بالکل نہیں تو بڑی حد تک مناسب ہے۔ اس لیے کہ عربی زبان کے الفاظ فارسی کے اجزائے صحیح بن گئے ہیں۔

۔ فارسی کی ادبی زبان میں بہ نسبت ملکی اور بازاری زبان کے عربی کی اہمیت اور ضرورت کہیں زیادہ ہے۔ فارسی کا خزانہ ایسا قیمتی خزانہ ہے، جس کی نظیر کسی دوسری مشرقی قوم کے پاس نہیں، جدید حکمیات کے سوا کوئی ایسا علم و فن نہیں جس کا بہترین نمونہ۔ فارسی زبان میں دستیاب نہ ہو سکتا ہو۔ بہتر سے بہتر بلند پایہ اخلاقی فلسفیانہ تخیلی، اور مذہبی کتابیں فارسی میں لکھی گئیں ہیں۔

سیاسی شورشوں اور ہنگاموں سے فاتحانہ نجات کے بعد ایراں کو بڑے بڑے سماجی، اقتصادی، اور تعلیمی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے مسئلہ یہ ہے کہ فارس مغرب کی کورانہ تقلید کرے یا "حیات جدید" کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مشرقی قوم کی حیثیت کو قائم رکھے، اس مسئلے کا حل آسان نہیں۔ ایران اب تک ناپائدار اور بے ثبات حالت میں ہے۔ ایران کے سامنے ترکی کی مثال ہے۔ جو فی الحال ازمنۂ گزشتہ کو بھول کر اندھوں کی طرح مادی مفاد کو پیش نظر رکھ کر یورپ کی نقالی کر رہا ہے۔ لیکن ترکی اور فارس کی جغرافیائی اور ذہنی اور ملی حالت بالکل مختلف ہے۔

ایران جدید میں ہر آدمی کو مشرق و مغرب میں ایک جنگ نظر آئے گی، مدعا یہ ہے کہ بالکل مادی مفاد کے اصول کے ماتحت اور یورپی معاشرت کی طرز پر ترقی کی جائے لیکن کلچر کے لحاظ سے یہ بھی خواہش ہے کہ ساسانیوں سے قبل کی روایات کی طرف پلٹ چلنا چاہیے، موجودہ حکومت کی اُن کوششوں کے طریقوں کو جو ایران کی معاشرت کی تبدیلی کے لیے کر رہی ہے، کسی فلسفیانہ اصول یا قاعدے کی بنا پر سراہنا ناممکن ہے۔ ایران ہمیشہ سے ایک علم دوست ملک ہے، وہ اپنے قریب اور بعید کے ازمنہ گزشتہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ فارس کا منتہائے نظر ہمیشہ غیر مادی اور مذہبی رہا ہے اور یہ نظریہ سوسائٹی کے ہر طبقے میں موجود ہے۔ اسلام نے ایران میں ایک روح پھونک دی تھی جس نے ساسانیوں کے ہر جزو بدن کو نئی زندگی بخش دی تھی لیکن اگر اب وہ فتح اسلام کے قبل کی روایات کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے تو اس کی حالت اس بہتر نہ ہو گی جیسی ساسانیوں کے آخری تاجدار یزدجرد ثالث کے زمانے میں تھی۔ لیکن اسی طرح مصر کی مثال بھی مشرقی اقوام کے سامنے ہے جس نے باوجود مغربی اقوام سے براہ راست تعلق کے اپنی زبان کی امتیازی خصوصیات کو قائم رکھا اور زبان میں ایسی اصلاحیں نہیں کیں جن سے اس کا اصلی رنگ بدل جائے۔

جب ایرانیوں کو ایران کی عظمت کے خواب دکھائی دے رہے ہیں، جب وہ ساسانیوں کی روایات پر فخر کرتے ہیں۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کے معاد سے کیوں کر علمحدگی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ جس کی تہذیب اُن کی روح میں سرایت کر چکی ہے اور اسلام کے برکات کو کیوں کر بھول سکتے ہیں جو ان دونوں سب سے بڑی متحد کرنے والی طاقت ہے زمانۂ ماضی میں ایران نے اسلامی اسپرٹ کو ہر شعبۂ حیات میں ممتاز جگہ دے رکھی تھی اور اب بھی جدید قوتوں کے دباؤ کے باوجود ایران اپنی برتری اور بزرگی ثابت کر سکتا ہے اور اپنے مذہب، اپنی زبان اور اپنی قومیت کو قائم رکھ سکتا ہے۔

سکندر اور ضاحک

از قاضی عبدالودود

کلیات سودا کے بعض نسخوں میں ایک مخمس ہے جو میر ضاحک کی ہجو میں ہے، اس کی شان نزول آزاد یوں بیان کرتے ہیں۔ "سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا "یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر" تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام؟ میر مہدی حسن فراغ کو خدا مغفرت کرے، انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسب معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے، صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے، شرفا و شعرا کا مجمع تھا، مرزا رفیع اور میاں سکندر، مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے، ان کی پرانی وضع اور لباس پر... صاحب عالم مسکرائے۔ میر ضاحک آکر بیٹھے، مزاج پرسی ہوئی، حقہ سامنے آیا، اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے... سودا نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں کچھ کہا نہیں، میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انہوں نے ایک مخمس کہا ہے، سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اُٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہو گئے، سکندر بچارے حیران کہ بے واسطہ بے سبب یہ کیا آفت آگئی، سب اُٹھ کھڑے ہوئے، دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سودا کو دیکھیے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں"

مغل اور اردو کے مصنف نصیر حسین خان خیال مرحوم اس روایت کو از سر تا پا لغو سمجھتے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

"یہ فراغ بھی.. ایک عجب ستم ظریف ہیں، مگر آزاد پر عجب ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں بھی دلی کے شرفا کو دیکھا اور ان کی تیز داریوں کو نگاہ رکھا ہوگا، اس پر وہ ایک ایسا قصہ بیان کر گئے! سکندر کو میں نہیں جانتا، مگر ضاحک کو پہچانتا اور ان کے خاندان سے واقف، اور ان کے گھر کی شرافتوں سے آشنا ہوں۔ اس لیے میں کہونگا کہ یہ حکایت از سر تا پا لغو ہے۔ اول تو میاں سکندر کا لکھنؤ جانا ہی ثابت نہیں، پھر یہ کہ ضاحک کے سے بزرگ کسی صحبت میں شریفوں سے یوں ہاتھا پائی کر بیٹھیں! اس پر مزید یہ کہ یہ واردات مرزا سلیمان شکوہ کے سے مہذب شہزادے کی صحبت میں ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آزاد کے وقت میں دلی کے امرا کی صحبتوں کا کیا قرینہ ہو گیا تھا اور ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے زمانے میں کیا دیکھا، مگر جس وقت کا قصہ انہوں نے چھیڑا ہے اس زمانے کا ہمارا کوئی امیر زادہ اتنا بے قرینہ نہ تھا کہ اس کی صحبت میں دو شریف یوں گتھم گتھی ہو جائیں، ہمارے آزاد اپنی قصہ گوئی میں اکثر بہت بڑھ جاتے ہیں۔" ص ۱۴۱، ۱۴۲

اسی کتاب میں ذرا آگے بڑھ کر صاف صاف یہ الزام لگاتے ہیں کہ آزاد نے یہ روایت گھڑ لی ہے۔ "آزاد مرحوم اپنے مؤرخ ہونے کے مدعی نہیں، اس لیے تاریخی غلطیاں کر جائیں تو قابل معافی ہیں، مگر تذکرے کی غلطیاں اور اس طرح کی داستان سرائیاں لائق معافی نہیں، جہاں سودا اور ضاحک کا ذکر یوں ڈھٹائی سے بیان کر دیا گیا ہو وہاں اور قصوں

گمانیوں کے ساتھ مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں کی ایک صحبت اور ضاحک و سکندر کی اس روایت کا گڑھ دینا کیا بڑی بات ہے!
خیالی مرحوم کا استدلال زیادہ تر قیاسی ہے۔ ان کے نزدیک میر ضاحک سے شریف کا کسی دوسرے شریف آدمی سے دست و گریباں ہو جانا، اور وہ بھی سلیمان شکوہ سے مہذب شہزادے کی صحبت میں، حد درجہ خلاف قیاس ہے۔ اس کے متعلق گذارش ہے کہ میر ضاحک کی شرافت جب اس بات سے مانع نہ ہوئی کہ خود دوسروں کی ماں بہنوں کو گالیاں دیں اور اپنی ماں بہنوں کو گالیاں سنوائیں، تو ہاتھاپائی کے لیے تیار ہو جانا کون سی بڑی بات ہے۔ سلیمان شکوہ کی صحبت کے رکن رکین، انشا، رنگین، جرأت تھے، قتیل اور مصحفی ان کی بھی جیسا کہ بعض کتابوں میں ہے ان کے یہاں رسائی تھی۔ یہ لوگ ان کے یہاں ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل پر بحث کرنے کے لیے نہیں جاتے تھے، بلکہ ان کی اصلی غرض گالی گلوج ہنسی مذاق سے شہزادے کا دل خوش کرنا تھا۔ ایسی صحبت میں اگر اتفاقی طور پر لوگ زبان سے ہاتھ پر اتر آئیں، تو کوئی تعجب کی بات نہیں، ایسی باتیں اچانک ہو جاتی ہیں، ان کی اطلاع پہلے سے تو ہوتی نہیں کہ پیش بندی کی جا سکے
خیالی مرحوم کی یہ دلیل کہ سکندر کا لکھنؤ جانا ثابت نہیں، زیادہ توجہ کی مستحق ہے، اور اگر واقعی یہ ثابت ہو جائے کہ سلیمان شکوہ کے زمانے میں سکندر کا قیام لکھنؤ میں نہیں رہا، تو پھر آزاد کی روایت کو معتبر سمجھنے میں تامل کرنا چاہیے۔ سب سے پہلا تذکرہ جس میں سکندر کا حال ملتا ہے۔ تذکرۂ میر حسن ہے۔ میر حسن ان کی مرثیہ گوئی، ہندوستان کی متعدد زبانوں سے ان کی واقفیت، مہارت فن عرق کشی، اور ان کی ایک نظم کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ص ۱۲۲ =

" اگرچہ علم ندارد ولیکن بر کلام او جائے انگشت نیست۔ چوں با ہمہ مردم خوش طبعی دارد و شراب می خورد بعد نظر بعضے ایک می نماید۔ فرض مرد زندہ دلے ست۔ گاہ گاہ بطرز قدیم شعری گوید۔ طبعش مائل ایہام بسیار است، سلامت باشد "

میر حسن نے اس کی تصریح نہیں کی کہ ان سے ذاتی ملاقات تھی یا نہیں، اور نہ یہ لکھا ہے کہ ۱۱۹۲-۱۱۹۱ھ (زمانہ ترتیب تذکرہ) میں سکندر کا قیام کس جگہ تھا، تاہم ان کے الفاظ سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ جو کچھ رہے ہیں ذاتی علم سے کہہ رہے ہیں۔ میر حسن سے اگر دہلی کی ملاقات ہوتی تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ چونکہ ترتیب تذکرہ کے وقت میر حسن اور سکندر کا قیام ایک ہی شہر میں تھا، اس میر حسن نے تصریح کو غیر ضروری سمجھا۔ ممکن ہے کہ بعض اصحاب اس استدلال کو قبول نہ کریں، لیکن اتنا تو ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ میر حسن نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جو سکندر کے قیام لکھنؤ کے منافی ہو۔ یہی حال مصحفی کا ہے جو سکندر کے متعلق لکھتے ہیں: ... شخص دائم الخمر خوش طبع و ظریف مزاج و بدمعاش، و طبعش بطرف ہجا مائل است ... اکنون ہم گاہ گاہ فکر شعر بطور قدیم و جدید می کند "
مصحفی کا تذکرۂ ہندی ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوا ہے۔ مصحفی نے جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، لکھنؤ میں انہیں دیکھا، دہلی میں ان سے ملے ہوتے تو تصریح ضرور کرتے۔ میر حسن اور مصحفی کے اقوال ہم نے اس لیے نقل کیے ہیں کہ یہ تذکرے سکندر کے زمانۂ حیات میں لکھے گئے ہیں، ہم یہ نہیں کہتے کہ ان تذکروں میں سکندر کے لکھنؤ میں قیام کا قطعی ثبوت ملتا ہے، ہم صرف یہ دکھانا چاہتے

ہیں کہ ان میں کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ سکندر کبھی لکھنؤ نہیں گئے۔ اس دعوے کے قطعی ثبوت کے لیے کہ سکندر لکھنؤ گئے تھے، ہم شاہ کمال مصنف مجمع الانتخاب کے ممنون ہیں۔ یہ تذکرہ شاہ کمال نے حیدر آباد میں سکندر کی موت کے بعد مکمل کیا ہے۔ اس میں انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ لکھنؤ میں سکندر سے ملاقات ہوئی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم اس تذکرے کی عبارت اس وقت نقل نہیں کر سکتے، کیونکہ اس کا قلمی نسخہ جو ہماری نظر سے گزرا ہے وہ لندن میں ہے۔ حیدرآباد میں جو نسخہ ہے اس سے بھی فوری استفادہ ممکن نہیں، دتاسی نے اپنی تاریخ ادبیات کی دوسری یا تیسری جلد میں شاہ کمال کے حوالے سے سکندر کے لکھنؤ جانے کا ذکر کیا ہے، دتاسی کے حوالے کبھی کبھی غلط بھی ہو گئے ہیں، لیکن سکندر کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی مجمع الانتخاب سے ماخوذ ہے۔

سطور بالا کے مطالعے سے ہمیں امید ہے کہ ناظرین بھی ہماری طرح اس نتیجے پر پہنچے ہونگے کہ خیال مرحوم کو دلیلیں آزاد کی روایت کو مسترد کرنے کے لیے کافی نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ان دلیلوں سے یہ روایت غلط ثابت نہ ہو سکی، تو اس کا مطلب نہیں کہ ہم اسے صحیح تسلیم کر لیں، ہم اس روایت کی صحت یا عدم صحت سے بحث کرنے سے قبل وہ مخمس نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جس کی شان نزول آزاد نے بیان کی ہے :-

یا رب تو مری سُن لے یہ کہتا ہے سکندر　(۱)　ضاحک ۔۔۔۔۔ کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچہ بندر　　گلیوں میں نچاتا پھرے وہ ننگے کے اندر
زر دلی تو کیا کھائے کسی طرح مچھندر

گھر والی کو اس کی یہی اب فکر ہے دن رات　(۲)　بچہ کوئی بندر کا جو لگ جائے مرے ہات
سکھلا کے اسے ناچ کی بندر کے دو اک بات　　دوں بھرڑوے نکھٹو کو جو اس کی کٹے اوقات
اک ہانڈی پرانی سی کا گھیرا میں منڈھا دوں　(۳)　بکرا تو کہاں لینڈی سا کتا ہی منگا دوں
جو اس کے نچانے کی طرح ہے سو جتا دوں　　پھر کیا کروں اتنا بھی جو ساماں نہ بنا دوں
کر بیٹھو موا لوگوں کی ناحق مجھے پنو لے　(۴)　اور اپنی موی جیبھ کی گالی سے نہ شرمائے
کوئی دوست اگر اس کا جو اس بھڑوے کو سمجھا　　اس سے تو بھلا دو گھڑی بندر ہی نچالائے
گر پھر وہ دو پونی جو میں پیدا کروں چونی　(۵)　کھا جائے اسے بھوک رکھے پہل کٹے دونی
جم جم رہے آباد یہ بستی نہ ہو سونی　　بندر کے نچانے میں بھلا کیا ہے زبونی
بندر تو ہے کیا مرد ہو تو ریچھ لڑائے　(۶)　پیسا ہو اگر ملتا تو دو پیسے یہ پائے
پر میری نصیحت موا خاطر میں نہ لائے　　میں چاہتی ہوں اس سے بھلا کچھ تو بن آئے
مر جائے موا ایہ تو میں دوں بی بی کی پڑیاں　(۷)　دے روٹیاں روکھی مجھے مانگے ہے چپڑیاں

لے لے کر ٹکے پیسے کو سب شہر کی کوڑیاں — سی ہی میں اسے دوں جو بیچا کرے گڑیاں

(۸) یوں بھی نہ ہو اس سے تو ملی ٹٹا اور بتاؤں — دو چیتھڑے ہی رنگ کر حلوا خا توں بنا دوں
ٹکڑے کے لیے کھنڈری کی ایک جھوری سلاؤں — میں کل کی بی بی ہوں اسے کچھ تو سکھا دوں

(۹) چھوڑا میں اسے جو رو تو اب اس کی نہ ہو نگی — دوزخ کے لیے اس کے بیڑا تا تو کرونگی
رنگ چھاپ لے دو حلوا خاتوں میں ڈنگی — کہنا پھرے بھڑوا کہ جھنجھنیا لال لونگی

(۱۰) کہتا ہوں میں اس سے جو لے شرم جو میری — پھر ہجو نہ کرتا پھرے بھڑوا مری تیری
ان باتوں سے ہونے کی نہیں پیٹ کو سیری — لے کر حلوا خا توں یہ کرے شہر میں پھیری

(۱۱) کرلے حلوا خاتوں کو یہ کلیوں میں ہانڈی — دستہ میں جڑی بوٹیوں سے کرکے یہ ٹھانڈی
چادر کو بچھا چوک میں اور باندھ کے ماڑی — بیٹھا انہیں دیکھوں جتوں کی ست ہو . .

(۱۲) اک اور علاج اب نظر آیا مجھے اس کا — منڈواتی ہوں ڈاڑھی موے کی نائی کو بلوا
نتھ ناک میں ڈال اور پہنا ساری ولہنگا — بکواؤں گی اس بھڑوے سے کوٹے ہی پکڑوا

(۱۳) یوں بھی نہ ہو تو لے کے اک آدمی کی چادر — اوندھا ہو رہے زیر فلک . . کو رنگ کر
چھٹا ہو کرے چیل اسے جھٹ سے پکڑ کر — جا چوک میں بیچا کرے دو چار ٹکے پر

(۱۴) پایا یہ گدھا میں نے تو گانے میں نہ پورا — گاتا ہو یہ سُر سے تو لے دیتی طنبورہ
جس کام میں دیکھا تو یہ چھڈو ہے ادھورا — آخر میں بناؤں گی اسے توپ زنبورہ

(۱۵) ان باتوں میں سے اس کو اگر کچھ نہ بن آئے — اک مرثیہ کہہ کر شمر کا یہ طرح بنائے
اس طرح کو پھر مولوی ساجد کو سکھائے — بازو کر اسے جلد کیلشہر کو یہ جائے

(۱۶) گر ہجو کی لوگوں کی نہ کھائیگا یہ سوگند — تو ماں ہی پھر میں اس کی ہوں میرا ہی یہ فرزند
اب مجھ کو رکھا چاہے تو منہ اپنا کرے بند — ان کاموں سے جو کام کرے اس کو ہوں خورسند

(۱۷) آخر کہا اس نے مجھے اس پاس نہ رہنا — پھر بات نصیحت کی مجھے اس سے نہ کہنا
ان کاموں سے کب اس کے نصیبوں میں ہے کہنا — لے دوں گی میں وہ جھوکریاں بیچ کے گہنا

(۱۸) گر میں نہ کروں میں بھلا کیا کروں اگو — بھڑوائی ہر جو بھڑوے کی قسمت میں لکھی ہو
جو چیز جہیز دہ ہے مری مجھ سے کوئی لو — گر دی اسے دکھولے دو جھوکریاں لے دو

(۱۹) خاموش ہو سودا نہ زباں اپنی بہت کھول — جھگڑے میں خصم جورو کے آگے تو نہ اب بول
کچھ سیم شلوہی . گائیں گی بجا ڈھول — ڈنکا ہے وماے کا کہ یہ مصرع ہے اعول

روٹی تو کسی طرح کما کھائے مچھندر

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ فراغ کس قسم کے راوی ہیں، ان کی سیرت کے متعلق اب کچھ نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ نہ ان کی کوئی تصنیف موجود ہے اور نہ ان کے معاصرین نے کچھ اس بارے میں لکھا ہے۔ آزاد کے بیان سے ان کے زمانۂ حیات کی البتہ ایک حد تک یقین کی جا سکتی ہے، آزاد لکھتے ہیں "کہ یہ بحر کے قدیمی دوست اور ہم مشق تھے، بحر ناسخ کے شاگرد تھے" اور ان کی پیدائش ہرگز ۱۲۱۵ھ سے قبل کی نہیں تھی۔ اگر فراغ بحر سے عمر میں بڑے بھی ہوں تو ۱۲۰۰ھ سے قبل پیدا نہیں ہوئے ہوں گے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ سودا اور ضاحک کے زمانے کی باتیں یہ آنکھوں دیکھی بیان نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہو چکا تھا اور ضاحک بھی ۱۲۰۰ھ سے قبل ہی فوت ہو چکے تھے، مصنف مثل اور اردو کی رائے میں سلیمان شکوہ سودا و ضاحک کی وفات سے قبل لکھنؤ گئے تھے، لیکن کل مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ غلام قادر کے واقعہ کے بعد ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ پہنچے تھے، اور ۱۲۰۵ھ میں سودا اور ضاحک کا سلیمان شکوہ کی صحبت میں اکٹھا ہونا قطعی ناممکن ہے، سلیمان شکوہ کا ۱۲۰۵ھ سے قبل بھی لکھنؤ آنا کسی تاریخ سے ثابت نہیں، احمد ذرانی سے پہلے جب سودا اور ضاحک دونوں دہلی میں تھے، سلیمان شکوہ نے اس دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا، اس لیے مخمس کے متعلق جو روایت آزاد نے بیان کی ہے وہ بتمامہ صحیح نہیں ہو سکتی، اور سلیمان شکوہ کا اس مخمس سے کسی قسم کا تعلق نہیں، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی اس روایت کا صرف ایک جز غلط ثابت ہوا ہے، اس کا ابھی تک امکان باقی ہے کہ سودا نے یہ مخمس سکندر کے نام سے سلیمان شکوہ کے یہاں نہیں کسی دوسری جگہ پڑھا ہو، اور میر ضاحک، جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے سکندر سے دست و گریباں ہو گئے ہوں۔ مسئلے کے اس پہلو سے بحث کرنے سے قبل ہم ایک اور مخمس درج کرتے ہیں جو ہمیں کلیات حسن میں ملا ہے، اور جس کو پڑھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ۔ در اصل میر ضاحک کا ہے اور غلطی سے میر حسن کے کلیات میں شامل ہو گیا ہے:-

ضاحک نہ خوف کر تو اب کیا ہے وہ چھندر (۱) بکرے کا ہے وہ ... اور زادۂ قلندر
اندھے ہے تب نہ تب وہ بکرے کو باہر اندر لکڑی کے بل نچا تو اس کو مثال بندر
تراڑے ہے . ہے سکندر

وہ صورتِ مخنث ہے ایک مسخرہ سا (۲) تل جا ذقن پہ ڈاڑھی اور دوڑی خا سا

. . . .

پھر اس سے کام کر کر تو آگے چل ادھر کو (۳) ماں اور بہن ہوں اس کی اور بیٹی جو جدھر کو
کر حشر گاہ اس کے جا کر تمام گھر کو .... کھا کے ضاحک معجونا کہ کمر کو

اک غیب سے صدا یوں آتی ہو مجھ کو ہر دم (۴) یہ شے ہے وہ بھڑوا اس کا نہ کر تو کچھ غم
سارے قبیلے کو تو .... اور مار شوق سے غم

وہ ایک ... بجپ ہے بھڑوا (۵) باطن میں نرم ہے ظاہر میں گو ہے کڑوا

مرائی

کتر کے اپنی مونچھیں جب کئے وہ چھڑوا — ..کا رکھ بنا کر تو اس کے سر پہ گڑوا
دھینور کا چھوکرا ہے پورب کا ہے نناذ (۶) ہے مار واڑیوں کے . . . . . . ووا تا
پنجابیوں کا رکھتا ہے . . . . . . — ایسے کی بات ہرگز خاطر میں تو نہ لانا
ہر اک زباں کا ماہر اس واسطے ہوا ہے (۷) ماں نے حرام اس کی ہر جنس سے کیا ہے
سو فلفے جمع ہو کر بر بابی اک بنا ہے — کہہ اس کے منہ پہ جا کر ایسا دو شخص کیا ہے
ہے نقل اس کی اک دن جورو کا یار آیا (۸) اس ساحرہ نے بینڈھا اس کے تئیں بنایا
. . . . — ڈرنے لگا جو دھگڑا اس کے تئیں ستایا
اس نے کہا کہ گر وہ آجائے گا تو پھر کیا (۹) کہنے لگی کہ مجھ کو اس کی نہیں ہے پروا
کچھ بات میں بنالوں ہر طرح سے تجھے گیا — . . . .
. . . . . . آ گھسے ماں سے تا بہ خالا (۱۰) وہ بھڑوا سب طرح سے ہے خوب دیکھا بھالا
گر وہ چھپاتے کیا ہے ہے ایک جڑیا والا — ایسا کہاں سے آیا وہ رانی خاں کا سالا
ہمسائے میں تھی اس کے اک دن کسی کی شادی (۱۱) واں کے جا کے جورو اس کی بن بیٹھی پیرزادی
ننھے میاں کو سر پہ بٹھلا کے ماں زادی — کر آپ کو مخاطب پھر یہ مثل سنادی
ننھے میاں جب آئے تب ایڑیاں رگڑ کر (۱۲) کہنے لگی کہ . . آئیں تو کھیلوں سر پر
دیور لگا یہ کہنے بھائی کا ہے مجھے ڈر — جھنجھلا کے پھر وہ بولی تو میرے آگے لا دھر
سودا جیسا سکندر گر ہوئے کوئی کیسا (۱۳) مفلس ہو وہ جھن یا رکھتا ہو پاس پیسا
جیسا کہ کوئی ہوگا پائیگا یار و ویسا — ناحق جو ہوئے دشمن تو کیا ہے ایسا تیسا

ان مخمسوں کے مطالعے کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ یہ دونوں ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان روہیلوں کی شکست سے پہلے فیض آباد میں لکھے گئے ہیں، میر ضاحک کے تعلقات سودا اور سکندر دونوں سے خراب تھے۔ دوسرا مخمس پہلے کا جواب معلوم ہوتا ہے، پہلا سکندر کی تصنیف ہے اور دوسرا میر ضاحک کا لکھا ہوا ہے، پہلا کلیات سودا میں اور دوسرا کلیات ضمن میں، مرتبین کلیات کی غلطی سے شامل ہو گیا ہے، ہم نے اپنی رائے جن وجوہ سے قائم کی ہے وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) پہلے مخمس کے پندرھویں بند کا ایک مصرع ہے :۔ "باذو کر اسے جلد کیٹھر کو یہ جائے" یہ مصرع روہیلوں کی شکست کے بعد اگر لکھا ہوا ہو تو اس میں کوئی لطف باقی نہیں رہتا، شجاع الدولہ اور رحمت خاں کی لڑائی ۱۱۸۸ھ میں ہوئی جس میں روہیلوں کو شکست فاش نصیب ہوئی ہے۔ جس نے ان کی قوت کا بالکل خاتمہ کر دیا، اودھ والے شجاع الدولہ کی خواہش میں مصلحتاً روہیلوں کو اہل بیت کا دشمن قرار دیتے تھے۔ سودا ۱۱۸۵ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان فیض آباد آئے ہیں۔

کیٹرو جیلی گھنڈ کا پرانا نام ہے۔

(۲) اس کا ثبوت کہ مخمس فیض آباد لکھے گئے، یہ ہے کہ دوسرا پہلے کا جواب ہے اور پہلے مخمس کے ابتدائی بند میں لفظ "بنگلا" سے مراد فیض آباد ہے، بنگلا فیض آباد کا پرانا نام ہے، جس کا مصرع ہے کہ وسال ہو ہو کر بنگلے میں عید"۔

(۳) دونوں مخمس کے ابتدائی بند بہت ملتے جلتے ہیں اور چونکہ دوسرا پہلے کی بہ نسبت زیادہ سخت ہے، خیال ہوتا ہے کہ دوسرا پہلے کو دیکھ کر اور اس کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

(۴) سودا اور ضاحک کی ہجو بازیوں کا کلیات سودا کی بدولت ہر شخص کو علم ہے، لیکن دوسرے مخمس کے آخری بند سے ثابت ہوتا ہے کہ سکندر نے بھی ضاحک کی ہجو کہی تھی، ضاحک کی رائے میں سودا اور سکندر ناحق ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

(۵) پہلا مخمس کلیات سودا کے اس مطبوعہ نسخے میں جو آج کل رائج ہے نہیں پایا جاتا۔ آزاد نے اس کا ذکر کیا ہے، صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر جلد اول میں متعدد بند نقل کیے ہیں اور کلیات کے دو قلمی نسخوں میں جو اس وقت پیش نظر ہیں موجود ہے، لیکن سودا کے کلیات میں مرتب کرنے والوں کی بے پروائی سے بہت سا کلام دوسرے شاعروں کا داخل ہو گیا ہے، کیا تعجب ہے کہ سکندر نے اصلاح کے لیے دیا ہو، اور اس کا مسودہ سودا کے پاس رہ گیا ہو، مرتب کرنے والوں نے یہ سمجھ کر کہ سودا کا ہے کلیات میں شامل کر دیا اور اگر آزاد کی روایت کے مطابق یہ مخمس سودا کا ہے تو اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ میر ضاحک نے اس کے جواب میں سکندر کی ہجو کیوں لکھی۔

(۶) دوسرے مخمس کے آخری بند میں میر ضاحک کے بیٹے غلام حسن کا تخلص درج ہے۔ اور انہیں کے کلیات میں یہ مخمس ملا بھی ہے، ہماری قطعی رائے ہے کہ یہ مخمس ضاحک کا ہے اور یہ مصرع "مفلس ہو وہ حسن یا رکھتا ہو پاس پیسا"۔ اس طرح ہوگا "مفلس ہو یا وہ ضاحک" الخ" تیسرا اور چوتھا بند کبھی بیٹا باپ کے متعلق نہیں لکھ سکتا۔

۱؎ آب حیات طبع نہم ص ۱۰۳ و ۱۰۵، احوال ضاحک ۲؎ ص ۱۴۳ ۳؎ تذکرۂ بیجگر سلیمان شکوہ کے رفقا کا حال معلوم کرنے کے لیے مجالس رنگین کا مطالعہ بھی ضروری ہے ۴؎ ص ۱۱۶ اور ۱۱۷، مصحفی اور حسن اگر کسی شاعر سے دہلی کی ملاقات ہو تو ضرور بیان کرتے ہیں، اودھ میں اگر ملاقات ہوئی ہے تو اس کا ذکر کبھی کرتے ہیں کبھی نہیں ۵؎ جلد سوم ص ۲۴۹ و ۲۵۰ ۶؎ مصرع اول آب حیات اور جلوۂ خضر میں ایک طرح ہے، لیکن کلیات کے قلمی نسخوں میں دوسری طرح ہے۔ نسخہ کتبخانۂ مشرقیہ بانکی پور، الف نسخہ کتبخانۂ جناب مجاز حسن صاحب و جناب یامین حسن خان صاحب۔ خیال رہے ب اسی مخمس اور اسکے بعد والے مخمس میں جہاں جہاں نقطے ہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ الفاظ سمجھ میں نہ آئے، فحش کی وجہ سے خارج کیے گئے ہیں ۷؎ ب روٹی تو کھا کے کسو طرح پیٹ یہ نیپ کا مصرع ہر بند کے آخر میں آتا ہے ۸؎ یہ بند ب میں نہیں، جلوۂ خضر اور الف میں ہے ۹؎ الف اور ج میں تیسرے مصرع کی جگہ یہ ہے گر والا گھنڈ گھنڈری کی اک جھول سالا دوں ۱۰؎ ب اس سے کچھ ایسی بن آئے ۱۱؎ ب اک بات بتا دوں ۱۲؎ ب اور ج میں تیسرا مصرع یہ ہے جہاں گھنڈی کا ہو لالا ۱۳؎ ب چپاں لالی؟ ۱۴؎ دوسرا اور بارہواں بند ب میں نہیں ۱۵؎ ص ۱۰۲ ۱۶؎ ص ۱۱۹ ۱۷؎ تل چاول؟

اندر سبھا کے متعلق چند غلط فہمیاں

از آرزو جلیلی

ہمارے ملک میں قیاس کو تحقیق پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور سنی سنائی باتوں پر حد سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا یا لکھ دیا تو وہ لوہے کی لکیر ہو جاتی ہے اور مٹائے نہیں مٹتی۔ کسی روایت کا ایجاد ہونا شرط ہے، پھر تو نسلاً بعد نسلٍ وہ سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہتی ہے اور اعتقادیات میں اس طرح داخل ہو جاتی ہے کہ اس کی صداقت میں شک کرنا بھی کفر سمجھا جاتا ہے۔ نور الٰہی مرحوم اور محمد عمر صاحب نے ۱۹۲۱ء کے رسالہ اردو میں ایک مضمون بالاشتراک لکھا، اور اس میں اندر سبھا کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کا خیال فرانسیسیوں نے پیدا کیا اور انھیں کی ہدایت کے مطابق قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہوا۔ اس کی تصنیف واجد علی شاہ کی فرمائش سے ہوئی اور خود بادشاہ نے اندر کا پارٹ کیا۔ صاحبانِ مضمون کے پاس کوئی تحریری ثبوت نہ تھا، اور اتنا بڑا دعویٰ محض زمانۂ حال کے ایک پارسی ایکٹر کے قول کی بنا پر کر دیا تھا۔ تو روایت پرستی کی یہ مثال تاریخ ادب اردو میں یادگار رہے گی۔ تمر نے لکھا، (جنوری ۱۹۲۲ء) میں اس مضمون کی تردید کی اور یہ لکھا کہ واجد علی شاہ کا مقرب بارگاہ کوئی فرانسیسی نہ تھا۔ صاحبانِ مضمون نے اس کا جواب رسالہ ہزار داستان لاہور میں شائع کرایا جس کا خلاصہ ان دونوں کی مشترک تالیف ناٹک ساگر میں درج ہے۔ ان صاحبوں نے اپنے دعووں کی تائید میں جو کچھ لکھا ہے وہ ملخصاً یہ ہے:۔

الف ناٹک ساگر ص ۳۵۵، "جتنے اہل کار تھے سب اسی دُھن میں لگے رہتے تھے کہ رنگیلے پیا کے لیے کوئی نیا سامانِ تفریح پیدا کریں . اسی سلسلے میں ایک فرانسیسی مقرب بارگاہ نے مغربی تھیٹروں کا نقشہ پیش کیا .. . یہ وہ وقت تھا کہ بمصداق **کل جدیدٌ لذیذ فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا (یعنی وہ ڈراما جو سر بسر رقص و سرود کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے) کا گرویدہ ہو رہا تھا۔** اس لیے **واجد علی شاہ کے حضور میں جس فرانسیسی ڈرامے کا ذکر آیا وہ اوپیرا تھا۔** ناچ گانا پہلے ہی ایک دل پسند خاطر چیز تھی۔ اس لیے ایسا ہوا کہ ہندوستانی مذاق کا اوپیرا تیار ہو۔ قرعہ فال امانت کے نام پڑا، جنھوں نے ۱۲۶۰ھ میں اس غرض کو بوجہ احسن ادا کیا"۔

ص ۳۵۹، "رہس تو خیر ہندوستان میں عام چیز ہے، لیکن پردے **جو بالکل مغربی چیز ہیں** اور رہس کی نمائش اُن کی دست نگر نہیں ان کا قیصر باغ میں کیسے دخل ہوا؟"

ص ۳۶۲۔ "اندر سبھا کا تیار ہونا تھا کہ قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہو گیا، جس میں فرانسیسی ہدایت کے مطابق ہندوستانی حرفت نے اپنے کمال دکھائے۔ مہ جبینان قیصر باغ پریوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں۔

واجد علی شاہ اندر کے تخت پر براجمان ہوے۔ باقی پارٹ باخداق اہل دربار کو ملے۔ عوام کو اس مجلس میں بار نہ مل سکتا اس لیے ان لوگوں کے لیے چھوٹے پیمانے پر اس کی نمائش شروع ہوئی اور اندر سبھا کو قبول عام کا خلعت ملا۔"

مولیفین ناٹک ساگر کے دعووں کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) واجد علی شاہ کا ایک فرانسیسی درباری تھا۔

(۲) اس فرانسیسی درباری نے فرانسیسی اوپیرا کا نقشہ پیش کیا، کیونکہ اس زمانے میں فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا کا گرویدہ ہو رہا تھا اس لیے واجد علی شاہ کے دربار میں جس فرانسیسی ڈرامے کا ذکر آیا وہ اوپیرا تھا۔

(۳) پردے بالکل مغربی چیز ہیں اور رہس کی نمائش اُن کی دست نگر نہیں۔

(۴) امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی اور واجد علی شاہ نے اندر کا پارٹ کیا۔

یہ چاروں دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔ میں ہر دعوے کے خلاف فرداً فرداً تاریخی ثبوت پیش کروں گا۔

(۱) ہمارے موجودہ علم کے مطابق واجد علی شاہ کے دربار میں کوئی فرانسیسی نہ تھا۔ تاریخ کے اوراق سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ یہ بات خلاف قیاس ہے۔ نواب اودھ اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں نواب سعادت علی نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی ملازمت میں کسی یورپی کو نہ رکھے گا۔ اس معاہدے کی حقیقت میں ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۷۹۷ء میں جب نواب آصف الدولہ کا انتقال ہوا تو اس کی جانشینی کے لیے مرزا وزیر علی اور سعادت علی میں جھگڑا ہونے لگا۔ مرزا وزیر علی آصف الدولہ کا متبنّیٰ تھا۔ آصف الدولہ نے اس کو اپنا وارث نامزد کر دیا تھا۔ سعادت علی آصف الدولہ کا سوتیلا بھائی تھا۔ سعادت علی فساد کے خوف سے بنارس میں مقیم ہو گیا۔ سر جون شور کی مدد سے سعادت علی ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو مسند پر بیٹھا۔ اور اس کے عوض اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا۔ جس کے دفعات یہ ہیں :-

(۱) نواب چھہتر لاکھ روپے کا سالانہ خراج ادا کرے گا۔

(۲) الہ آباد انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

(۳) اودھ میں انگریزی فوج کی تعداد دس ہزار ہو گی۔

(۴) (الف) نواب انگریزوں کو ۱۲ لاکھ روپے معاوضہ دے گا۔ کیونکہ وہ انگریزوں کی مدد سے مسند پر بیٹھا تھا۔ (ب) بغیر انگریزوں کی اجازت کے وہ کسی بیرونی ریاست سے راہ و رسم نہیں پیدا کرے گا۔ (ج) اپنی ملازمت میں کسی فرنگی کو نہ رکھے گا اور نہ کسی فرنگی کو اپنے علاقے میں سکونت اختیار کرنے دے گا[۱]

انگریز ہرگز نہ چاہتے تھے کہ کوئی فرنگی دربار اودھ میں آئے۔ اس پر وہ بڑی سختی سے عمل کراتے تھے۔ ۲۳ اکتوبر ۱۷۹۸ء کو

[۱] تاریخ ہند مصنفہ ( ) جلد ششم صفحہ ۵۵۔

ولیسلی نے اودھ کے ریزیڈنٹ کو ایک خط لکھا تھا:

"..... میری خواہش ہے کہ کمپنی کے ملازمین کے سوا ہر یورپی نکال دیا جائے۔" [1]

۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء کو ولیسلی نے نواب وزیر سے ایک معاہدہ کیا جس کے ذریعہ اودھ پر کمپنی کو پورا اختیار حاصل ہوگیا ان تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ سے بہت پہلے اودھ کا دربار فرنگی ملازمین سے خالی کر دیا گیا تھا۔ نواب اودھ ادنیٰ سے ادنیٰ بات بھی انگریزوں کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ کسی فرنگی کو اودھ میں رہنے کی اجازت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں کوئی فرانسیسی تھا۔ جناب محمد عمر صاحب سے گزارش ہے کہ فرانسیسی درباری کے متعلق مستند کتب تاریخ کے حوالے پیش کریں۔

(۳) **اوپیرا کی تاریخ**:— مولفین ناٹک ساگر کا قول ہے کہ عہد واجد علی شاہ یعنی انیسویں صدی عیسوی میں فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ ان صاحبوں نے اوپیرا کو فرانسیسی ڈرامے کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ اوپیرا کی پیدائش اٹلی میں سترھویں صدی عیسوی ہوئی۔ 'اوپیرا' اطالوی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی کام کے ہیں۔ اوپیرا کی بنیاد سولھویں صدی عیسوی میں پڑ چکی تھی۔ مگر اس نے اپنی موجودہ شکل سترھویں صدی عیسوی میں اختیار کی۔ اٹلی کے مشہور ماہر طبیعیات گلیلیو کا باپ ونسنزو گالیلی اوپیرا کے اولیں بانیوں میں تھا۔ اس نے ایک مشہور قصے کو منظوم قطعے کی شکل میں اس طرح پیش کیا کہ اٹلی کے ماہرین موسیقی دنگ رہ گئے۔ ۱۶۰۰ء میں جیکوپو پیری کا اوپیرا 'یوریڈیس' پبلک کے سامنے پیش کیا گیا۔ اب اٹلی میں اوپیرا کا رواج عام ہوگیا۔ اس کے بعد جب یورپ میں اوپیرا کی شہرت ہوئی تو جرمنی اور فرانس میں بھی اوپیرا نے رواج پایا۔ اوپیرا کے متعلق انیسویں صدی میں 'کل جدید لذیذ' کی مثل صادق نہیں آتی۔

یہ مان بھی لیا جائے کہ اندر سبھا ہندوستانی مذاق کا اوپیرا ہے، جب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی تیاری میں فرانسیسی روایت کو دخل تھا۔ اگر زبانی دعویٰ کرنا ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اندر سبھا کی تیاری میں اطالوی، جرمنی، روسی اور ہسپانوی کاشیروں کی روایت کو دخل تھا۔

(۴) **ہندوستانی تھیٹر میں پردے کا استعمال**:— مولفین ناٹک ساگر نے پردے کو خالص مغربی چیز قرار دیا ہے۔ یہ دعویٰ ان صاحبوں کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کا استعمال ابتدا ہی سے تھا۔ مسٹر ہوریس ہیمین ولسن نے اپنی مشہور تصنیف "تھیٹر آف دی ہندوز" میں سنسکرت کے بعض ڈراموں کا ذکر کیا ہے جن میں پردے کے استعمال کے متعلق ہدایات ہیں۔ ڈراما سنگیت رتناکر میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں اور اشلوک گاتے ہوئے داخل ہوں اور رقاصہ پردے کے پیچھے سے آگے بڑھے۔" سنسکرت کے

[1] تاریخ ہند مصنفہ مل جلد ششم، ص ۱۷۶

ڈراموں میں جب ممثل اسٹیج پر آتے ہیں تو "پردہ اٹھاکر" یا "پردہ کھینچ کر" آتے ہیں۔ اس کے لیے سنسکرت میں ایک لفظ ہے "اپاٹکشے پے نا" جس کے معنی ہیں "پردہ اٹھاکر" یا "پردہ کھینچ کر"۔ مُدرا راکشس سنسکرت زبان کا ایک مشہور ڈراما ہے، جس کا مصنف وِیشاکھ دت ہے۔ یہ ڈراما آٹھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا، اور بمبئی "سنسکرت سیریز" میں چھپ چکا ہے۔ اس کی چوتھی اشاعت میں صفحہ ۲۰۸ پر یہ عبارت ہے:

(پردہ ہٹا کر وہ آگے بڑھتا ہے) "آ راکشس! میں بشنو گپتا تجھے سلام کرتا ہوں۔"

یعنی بشنو گپتا جب اسٹیج پر آتا ہے تو پردہ ہٹا کر آگے بڑھتا ہے اور راکشس سے گفتگو کرتا ہے سنسکرت کی اصل عبارت میں لفظ جبنیکا (   ) استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے معنی پردے کے ہیں اور سنسکرت زبان میں پہلی صدی عیسوی سے پایا جاتا ہے۔ سنسکرت ادب کے محققین کا متفقہ خیال ہے کہ سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کا استعمال ابتدا ہی سے ہے۔ جب سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کے استعمال کے متعلق ہدایتیں موجود ہیں تو پھر بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ ہمیں تسلیم کر لینا پڑیگا کہ پردے بالکل مغربی چیز نہیں بلکہ ان کا وجود ہندوستان میں کم سے کم پہلی صدی عیسوی سے ہے۔

(۴) **اندر سبھا کی تصنیف کا سبب**: مؤلفین ناٹک ساگر کا قیاسی دعویٰ یہ ہے کہ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔ ان صاحبوں کے دوسرے دعووں کی طرح یہ دعویٰ بھی سراسر بے بنیاد ہے۔ انھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا۔ واجد علی شاہ کے اندر بننے کا ثبوت وہ لالا کنور سین کے قول سے دیتے ہیں[1] اور لکھتے ہیں کہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے ہماری مزید تشفی کر دی۔ کنور سین جیسا یا کیفی صاحب امانت کا زمانہ نہیں دیکھا کہ ہم ان کے قول کو آنکھیں بند کر کے مان لیں۔ خود واجد علی شاہ کی تصانیف میں کہیں امانت کی اندر سبھا کا ذکر نہیں۔ اس موضوع پر جناب جناب مسعود حسن رضوی صاحب کا ایک مضمون رسالہ اردو (اپریل ۱۹۲۶ء) میں شائع ہوا ہے۔ جس میں صاحب مضمون نے شرح اندر سبھا کے حوالے، اور دیگر دلائل سے مؤلفین ناٹک ساگر کے دعووں کی تردید کی ہے[2] شرح اندر سبھا کی مکمل عبارت اس مضمون کے ساتھ درج ہے اس میں خود امانت نے اندر سبھا کی تالیف کا سبب بیان کیا ہے۔ امانت کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے شاگرد عبادت کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی شرح اندر سبھا کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:-

"...... ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی . ... شاگرد اول موزوں طبیعت تخلص عبادت عاشق کلام امانت نے از راہ محبت کہا کہ بیکار، بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسے کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں شہرت ہووے۔ آخر الامر موافق اس کی فرمائش کے بندہ کہنے پر آمادہ ہوا۔"

امانت کے اس بیان کو پڑھ کر بھی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔؟ اس کے متعلق رضوی صاحب[3] مفصل بحث کر چکے ہیں۔ شرح اندر سبھا کے مطالعے سے مجھے ایک نئی بات

[1] ناٹک ساگر ص ۳۳ و ۳۴ [2] اردو - اپریل ۱۹۲۶ء ص ۳۱۹ -

معلوم ہوئی کہ اندر سبھا کی تیاری بڑی مشکل سے ہوئی تھی۔ امانت کا بیان ہے:-

"وہ شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے، ہجوم حد سے زیادہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ بعد ہزاراں شور و فساد کے اور حجت تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا۔"

اگر امانت کو واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل ہوتی تو ڈیڑھ برس کی حجت و تکرار کے بعد کیوں جلسہ تیار ہوتا؟ وہ شخص جن کا ذکر شرح اندر سبھا میں ہے، غالباً امانت کے دوست ہوں گے۔ کیونکہ اگر وہ واجد علی شاہ کے درباری ہوتے، اور واجد علی شاہ کے ایما سے اندر سبھا کی تیاری پر آمادہ ہوئے ہوتے، تو امانت اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس کے علاوہ اندر سبھا کا جلسہ ہنگامہ و فساد کے بعد تیار نہ ہوتا۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑیگا کہ امانت کو واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات قابل غور ہے۔ امانت کو لکنت کا مرض تھا، اور کسی زمانے میں ان کی قوت گویائی بھی سلب ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے گوشہ نشیں رہا کرتے تھے۔ شرح اندر سبھا میں امانت لکھتے ہیں:

"۔۔۔ شب کو شام سے دو پہر رات گئے رنگ صحبت میں شاگردوں اور احباب کا مجمع رہتا تھا۔ مگر دل میں در پردہ عشق کی آگ تھی، طبیعت کو حسن سے لاگ تھی۔ وضع کے خیال سے نہ کہیں آتا تھا نہ جاتا تھا۔ زبان کی وابستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی۔۔۔"

شرح اندر سبھا کے مندرجۂ بالا اقتباسات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ امانت کہیں آتے جاتے نہ تھے، اور جب تنہائی کی زندگی سے جی گھبرانے لگا تو انہوں نے اپنے شاگرد عبادت کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔ امانت حسن پرست تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسا ڈراما لکھا جس میں ناچ گانا زیادہ ہو۔ ان کی طبیعت کا رجحان ہی کچھ ایسا تھا کہ انہوں نے جو ڈراما لکھا وہ رقص و سرود پر مشتمل تھا۔

یہ وہ شخص کون تھے، جن کا اندر سبھا کی تیاری میں حصہ تھا؟ اس کی تحقیق کے لیے میں نے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا مصنفہ ناصر لکھنوی کا مطالعہ کیا، اس تذکرے کی کتابت ۱۲۶۲ھ میں ہوئی، لیکن اس کے بعد ناصر وقتاً فوقتاً حاشیے میں اضافات کرتے رہے۔ امانت کے حالات حاشیے میں درج ہیں اور ناصر نے اندر سبھا کی تیاری کے متعلق چشم دید حالات لکھے ہیں۔ خوش معرکہ ایک نایاب تذکرہ ہے۔ اس لیے میں امانت کے متعلق ناصر کا مکمل بیان نقل کرتا ہوں جسے پڑھ کر ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے کہ امانت نے اندر سبھا کیوں لکھی اور اس کی نمائش کس طرح ہوتی:-

"صاحب دیانت و متانت سید آغا حسن تخلص امانت ابن میر آغا علی عرف میر آغا برادر زادۂ میر طالب علی اچھی والے مشہور، اوائل میں میاں امانت نے برائے چندے میاں دلگیر صاحب اصلاح لی تھی پھر خود استاد بن بیٹھے۔ صاحب دیوان وخمسہ ومسدس وواسوخت وغزل اور مرثیہ وسلام بھی اپنی دانست میں خوب کہا اور ان کے کلام میں جگت وضلع ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ مرثیے بھی ان کے جگت سے خالی نہیں ہیں۔ ان کے مرثیے کا ایک مصرع یہ ہے:-

"شامی کباب ہو کے پسند قضا ہوئے"۔ اور میاں امانت نے ہرچند چاہا کہ میرے آگے رنگ میرانیسؔ صاحب اور میرزا دبیرؔ صاحب مٹ جائے، لیکن کہیں خواجہ صاحب اور شیخ صاحب کے روبرو کوئی اور شاعر چمکا کہ میاں امانت اور میاں عشقؔ صاحب آگے ان دونوں کے چمکتے۔ بہ قولِ شاعر۔

چراغے راکہ ایزد برفروزد ہر آں کس پف کند ریشش بسوزد

آمدم بر سرِ مطلب۔ میر امانت صاحب کی زبان میں لکنت بھی تھی اور یہ مرض ان کا آبائی ہے، بلکہ ان کی اولاد تک کی زبان میں لکنت موجود ہے۔ لہٰذا مرثیہ تصنیف ان کا ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے اور ان کے شاگردوں میں جو ہے اس کے تخلص کے اخیر میں تے ہوتی ہے، مثل جنت و عبادت و میاں فرحت وغیرہ کے، میاں امانت نے ایک میرانیس کی طرح مثنوی اندرسبھا تصنیف کی تھی۔ اس میں بجائے امانت، تخلص استاد اپنا قرار دیا تھا، اور اس مثنوی میں غزل اور ہولی، ٹھمری اور چھند ریاں بھاکھا میں کہی تھی۔ چنانچہ جس کو شنکر پنڈت کشمیری اور بہاری کہار اور میر حافظ نے چند طفلانِ حسین اور امردانِ ماہ جبین خوبصورت جمع کر کے اور لڑکوں کو مثنوی یاد کرا کے، اور تعلیمِ راگ اور ناچ دلوا کر ایک رہس کھڑا کیا تھا، اور وہ پندرہ روپے فی دینے پر مجرے کے لیے بھی جاتے تھے، چنانچہ خلائق نے یہ جلسۂ جدید دیکھ کر بہت پسند کیا، اور ہزارہا لوگ بازاری جمع ہونے لگے۔ ایک روز مؤلف بھی اس جلسۂ رہس اندرسبھا میں گیا، دیکھا میں نے کہ ہزارہا لوگ ان امردانِ حسین پر مفتوں و شیفتہ (ہیں) بہ قول راحت خان :۔

ہجومِ ماہ رویاں اس قدر تھا کہ مجھ کو دل کے لٹ جانے کا ڈر تھا

اور میاں امانت مسند پر بیٹھے تھے اور ایک رنڈا امرپارہ آگے گاتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر چندے توقف کے بعد اپنے مکان پر چلا آیا۔ غرض کہ یہ اندرسبھا خوب چمکی اور مشہورِ خلائق ہوئی۔ جیسے کہ میر حسن کی مثنوی سے ہزارہا عورات فاحشہ ہو گئیں ویسے ہی اس مثنوی اندرسبھا سے ہزارہا امرد لوطی و مغلم ہو گئے اور اطلاع نے خوب رواج پایا، اور مرثیہ میاں امانت صاحب کا اچھوتیوں والے امام باڑے واقع منصور نگر لکھنؤ میں پڑھا جاتا ہے، قابلِ شنیدنی ہے (۹) یہ چند اشعار اچھوتے میاں امانت صاحب کی غزل کے، واسطے یادگار کے لکھے جاتے ہیں۔ وہو ہذا :۔

خیال آتا ہے دل کو ستمگر بیداد کیا کیجیے خدا سے لے بت کافر تری فریاد کیا کیجیے

امانت کو وہ پرپہنچی تو یوں فرہاد چلایا لبوں پر جانِ شیریں ہے اب اُستاد کیا کیجیے

نامہ کے مندرجۂ بالا بیان سے ہم حسب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں :۔

(۱) شنکر پنڈت کشمیری، بہاری کہار اور میر حافظ نے اندرسبھا کے لیے اسٹیج تیار کیا۔

(۲) کم سن لڑکوں کو ناچ کی تعلیم دی گئی اور انہوں نے اندرسبھا میں پاٹ کیا۔

(۳) امانت کی زبان میں لکنت تھی، اس لیے ان کے مرثیے ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے۔

امانت نے شرح اندرسبھا میں جن دو شخصوں کا تذکرہ کیا ہے، وہ شنکر پنڈت کشمیری، بہاری کہار اور میر حافظ میں سے کوئی دو شخص ہونگے، جن کا تیسرے کے مقابلے میں اندرسبھا کی تیاری میں زیادہ نمایاں حصہ ہوگا۔ اندرسبھا کی تیاری کی جو کچھ حقیقت ہے وہ یہی ہے۔ اس شہادت کی موجودگی میں لالا کنورسین یا مؤلفین ناٹک ساگر کے قیاسی دعووں کی کچھ بھی وقعت نہیں۔

ناتر کے بیان سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کن لوگوں نے اندرسبھا میں پارٹ کیا۔ واجد علی شاہ یا ان کے درباریوں نے اس میں کوئی پارٹ نہیں کیا۔ میں اس کے قبل یہ لکھ چکا ہوں کہ امانت کو لکنت کا مرض تھا۔ اور جب ان کی قوت گویائی سلب ہوگئی تھی تو وہ کہیں آیا جایا نہ کرتے تھے۔ ناتر کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امانت کے مرثیے ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے۔ ایسے شاعر کا واجد علی شاہ کے دربار میں کیونکر گزر ہوا ہوگا جو اپنے اشعار خود نہ پڑھ سکتا ہو؟ لکھنؤ میں اچھے اچھے شعرا موجود تھے۔ امانت میں کوئی خاص خوبی نہ تھی کہ واجد علی شاہ انہیں اپنے دربار میں بلالیتے۔ امانت کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہیں واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ ناتر کے بیان سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ ناتر نے خود اپنی آنکھوں سے اندرسبھا کا تماشا دیکھا تھا۔ عہد حاضر کے کسی ادیب کے مقابلے میں ناتر کا بیان زیادہ قابل وثوق ہے، اس کے بیان سے خود مصنف اندرسبھا کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ اس لیے مؤلفین ناٹک ساگر کے دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔

سلہ "سعادت خان نام ولد رسالت خان باشندہ نگینہ مقیم لکھنؤ۔ پانچ دیوان ایک تذکرہ ان کا ہے۔ مشورہ چھوٹے مرزا مذنب سے ان کو تھا"۔ سراپا سخن مصنفہ محسن لکھنوی۔
محسن نے جس تذکرے کا ذکر کیا ہے وہ خوش معرکہ ہے، جس کا میں نے حوالہ دیا ہے۔

سلہ امانت کی پوری غزل میں نے اس لیے نقل نہ کی کہ میرے مضمون سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ یہ غزل اندرسبھا میں موجود ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

ہمایوں لاہور جولائی "انیس" از جناب وصی رضا ایم۔ اے۔ ص ۳۰۹ تا ۳۲۵ "میر" جناب صفی حیدر فائق بی۔ اے ص ۲۲۰ تا ۲۳۴، "غالب" از حضرت طالب عنوی ص ۴۴۱ تا ۴۵۰

(ہمایوں نے اس سوال کے بہترین جواب کے لیے انعام مقرر کیا تھا کہ اردو کا بہترین شاعر کون تھا؟ انیس ومیر وغالب کے علاوہ حالی واقبال کو بھی لوگوں نے اردو کا بہترین شاعر قرار دیا ہے۔ معیار)

الناظر لکھنؤ مرتبہ جناب ظفر الملک علوی پدملت (عشرت وعبرت) از جناب حاجی امیر احمد علوی صاحب جون ص ۱ تا ۱۷۔ (۱) عبرت وعشرت کی پہلی اشاعت ۱۲۹۵ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے شائع کی تھی (اس کے دیباچے میں عشرت نے میرزا علی لطف کو سودا کا شاگرد رشید لکھا ہے۔ معیار)

سالک از جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا ص ۳۱ تا ۴۰ (۱) قربان علی بیگ، سالک کے حالات زندگی۔ سوا اس کے کہ پہلا تخلص قربان تھا، غالب کی ہدایت سے بدل کر سالک رکھا، کل حالات خمخانۂ جاوید سے ماخوذ ہیں۔ خمخانۂ جاوید میں سالک کے چچا کا نام رن بہادر خان رکھا ہے۔ مضمون نگار نے اسے بہادر خان بنا دیا ہے، نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مرد سے سن وفات نکلتا ہے، م کے نزدیک اس سے ۱۲۹۱ اور صاحب خمخانہ کی رائے میں ۱۲۹۲ نکلتا ہے۔ دونوں غلطی پر ہیں، یہ تاریخ اگر بغیر تخرجہ کے ہے تو اس سے ۱۲۹۰ نکلتا ہے۔ سن عیسوی دونوں نے ۱۸۷۹ دیا ہے، یہ ۱۲۹۰ کے مطابق ہے۔ معیار) (۲) دیوان مطبوعہ کا نام ہنجار سالک ہے، سال اشاعت ۱۸۷۱ء ابتدا میں حالی کی تقریظ اور سالک کا دیباچہ ہے۔ ہر دو فارسی (سالک کے کلام پر ناقدانہ رائے بھی ظاہر کی ہے۔ معیار)

ندیم گیا جون، "بیدل عظیم آبادی" از حکیم سید احمد اللہ صاحب ص ۱ تا ۱۲

سر او پر جب کوئی نہیل تو دشمن آپن کیس چھٹ نگری بہار من اب بیدل چلے بدیس

(م نے اس شعر کو بیدل کی طرف منسوب کر کے بہت سے نتائج نکالے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے پاس کیا ثبوت اس امر کا ہے کہ یہ شعر بیدل کا ہے۔ معیار) (۲) (م نے حسب ذیل تذکروں سے بیدل کے حالات نقل کیے ہیں۔ تذکرہ تمنا اورنگ آبادی، تذکرہ مخزن الغرائب مصنفہ ناصر علی سرہندی، تذکرہ قدرت اللہ شوق، تذکرہ بے نظیر، تذکرہ چمنستان شعرا، مخزن الغرائب ایک ضخیم تذکرہ ہے جس کا مصنف احمد علی سندیلوی ہے، جہاں تک ہمیں علم ہے ناصر علی نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا۔ اگر اس نام کا کوئی دوسرا تذکرہ ناصر علی نے لکھا ہے تو اس کا ثبوت دینا چاہیے۔ معیار) (۳) بہارستان سخن مصنفہ عبد الرزاق خان خوافی مخاطب بہ شاہنواز کے حوالے سے م نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ناصر علی نے ایک غزل لکھی:-

"تو چوں مہ جلوہ آئی منو جاں سیماب می گردد تجلی می کند بستے کہ آتش آب می گردد"

ناصر علی نے یہ اعلان کیا کہ اگر کوئی اس کا جواب لکھ کر ملک سخن میں خدائی کا دعوی کرے تو میں اس پر ایمان لاؤں گا، بیدل کے اشارہ سے ان کے شاگرد شیخ عبرت نے جواب لکھا۔ ناصر علی سن کر خاموش ہو رہے۔ کسی دوسرے شاعر نے ناصر علی کی غزل کا جواب نہ دیا۔ (۳) (بیدل کے عظیم آبادی ہونے کے متعلق جو شہادتیں ہیں ان کے باب میں مئی کے معیار میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم نے بیدل کے استاد کمال کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ عبد العزیز عزت کو بھول گئے۔ معیار)

اردو نثر کی ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ، جناب سید محمد ظہ اشرف صاحب ص ۳۹ تا ۴۲ (۱) حضرت شاہ احمد حسین، وطن اتھرا ضلع گیا، سنہ ولادت نامعلوم، وفات ۱۳۰۲ھ عمر ۵۰ سے زیادہ پائی۔ اردو میں آپ کی تصانیف موجود ہیں (ہم نے اور حالات بھی دیے ہیں۔ معیار) (۲) القول المحمود فی بیان محفل المولود، سال تصنیف ۱۲۸۰ھ مطبوعہ مطبع محمدی خواجہ کلاں، پٹنہ ۱۲۹۵ھ ص ۱۹۹ کے بعد عبد الاحد الہ آبادی طبیب تخلص کی تقریظ ہے جو ایک صفحے کے بعد ضائع ہو گئی ہے (۳) ترتیب المدارج مصنفہ ۱۲۹۱ھ، مطبوعہ مطبع محمدی ۱۲۹۵ھ موضوع "مسئلہ ترتیب فضائل خلفائے راشدین (۴) رسالہ قلمی مصنفہ ۱۲۹۹ھ موضوع وجوب تقلید شخصی (۵) حضرت سید شاہ ظہور الحسن قادری برادر مصنف رسائل مذکورہ کے بھائی تھے۔ ان کی تصانیف زیادہ تر عربی فارسی میں ہیں، اردو میں صرف ایک رسالہ ازالۃ الخفا عن نسبۃ اشرف الشرفا ملا ہے، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، موضوع حضرت غوث پاک کی سیادت کا اثبات،

اظہار حقیقت، پہلی قسط، معرکۂ شاد و صفیر، از جناب حمید عظیم آبادی ص ۴۴ تا ۵۲ (۱) کنور سکھ راج بہادر رحمی نے ۲۴ اگست ۱۸۸۲ء کو ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا جو لوگ اس کے مدعی ہیں کہ جناب شاد جناب صفیر کے شاگرد تھے ان کے قول کے مطابق اس سے ۸ برس قبل ہی اصلاح کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس مشاعرے کا گلدستہ عبد الحق انجم شرر مرزا بیگ سرمد نے مرتب کیا تھا، اس میں شاد کو فرہاد کاش لکھا ہے (۲) اس گلدستے میں انجم نے گیارہ ممیز شعرا اور استادوں کے نام ترتیب وار بحیثیت تفوق شاعرانہ درج فرمائے ہیں۔ ساقل دہلوی، سید شاہ حکیم احمد صوفی، محمد وحید الدین وحید الہ آبادی، حکیم عبد الحمید پریشاں، محمد علی خاں حیرتی، سید علی محمد شاد، سید فرزند احمد صفیر، ایک غیر جانب دار شخص نے شاد کو صفیر پر ترجیح دی ہے (جناب حمید کو چاہیے تھا کہ انجم کی عبارت نقل کر دیتے۔ جس سے یہ پتا چلتا کہ انجم نے ترتیب میں کمالات کو مد نظر رکھا ہے محض اس امر سے کہ ایک خاص ترتیب سے نام لکھے گئے ہیں، کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ اس بنا پر تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انجم صوفی کو وحید سے بہتر سمجھتے تھے اور حیرتی کو شاد و صفیر دونوں پر ترجیح دیتے تھے معیار) (۳) اس گلدستے میں شاد کی تعریف میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ یکہ تاز میدان فصاحت، غواص دریائے بلاغت موجد طرز رنگیں بیانی عدیم المثال لاثانی سخن آور مقام شناس، نگین ادائے بدیع اساس محسود حساد جناب سید علی محمد شاد اور صفیر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ سرو تر منشیان جہان، سر حلقۂ فصحائے زماں، واقف و ماہر ہر فن سحر بیان

شیریں سخن، دیباچۂ دیوان علم، شیرازۂ مجموعۂ حلم، رشک انوری وجامی جناب مولوی سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی[1] (مسعود حساد سے بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا، انجم کی غرض صرف مقفیٰ نثر لکھنی تھی اور بس، ورنہ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ وہ واقعی صفیر کو انوری اور جامی پر ترجیح دیتے تھے۔ معیار) (۴) اسی مشاعرے میں جناب شاد نے ایک قطعہ پڑھا۔

فلک روئے نہ اب کیونکر عظیم آباد کے اوپر | نہ اب باقی بلاغت ہے نہ یاں شورِ فصاحت ہے

اس میں معاصرین کا بھی ذکر کیا ہے۔

عطا با وصف عمر ہنگامہ آرائے معانی ہے | مشامِ جاں معطر کرنے میں معروف نکہت ہے
صفیر خوش نوا کی شکر افشانی کے چرچے ہیں | وحید بے بدل کے شعر سے عالم کو رغبت ہے

(م نے، اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاد نے صفیر کا ذکر استاد کی حیثیت سے نہیں کیا ہے، یہ نتیجہ صحیح ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۸۸۴ء میں حضرتِ شاد، حضرت صفیر کو اپنا اُستاد نہیں مانتے تھے۔ معیار) (۵) (م نے شاد و صفیر کی دو ایک غزلیں نقل کرکے شاد کے تفوق کا دعویٰ کیا ہے۔ معیار)

جولائی، اظہارِ حقیقت، از جناب حمید ص ۵۰ تا ۵۸ (جناب شاد مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیف فکرِ بلیغ اور مرحوم دیدہ کے اقتباسات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاد بغیر صفیر کی وساطت کے دبیر کے پاس اصلاح کے لیے گئے تھے، ایک مرثیے اور ایک فارسی مثنوی کے علاوہ کسی چیز پر دبیر سے اصلاح لینے کا موقع نہ ملا۔ معیار)

تنویر کراچی جولائی **آثار ادب** ص ۴۰ (۱) ثابت تخلص سید محمد تقی ش مظفر علی اسیر شعر ذیل کے علاوہ شعراء، عروجِ بہار نومبر ۱۸۹۳ء سے نقل کیے گئے ہیں:-

شاید آغاز میں انجام کی ہے فکر اسے | شمع روتی ہوئی محفل میں مری آئی ہے

(۲) مفتون تخلص، سلیمان مرزا لکھنوی ش علی اوسط رشک، ترک وطن کرکے بمبئی میں مقیم تھے، عروجِ بہار بمبئی اپریل ۱۸۹۵ء سے ۳ شعر نقل کیے گئے ہیں ازاں جملہ:-

رنج و الم ملے ہمیں جور و جفا ملے | ملنے سے اور تجھ سے ستمگر سے کیا ملے

(۳) وسیم تخلص منشی بشیشر سہائے پانڈے رئیس گورکھپور ش ناسخ، ۵ شعر ماخوذ از گلدستۂ شعراء۔

اس کا کیا شکوہ کہ وہ جور و جفا کرتے ہیں | اپنی تقدیر کا البتہ گلہ کرتے ہیں
ملے فردوس بریں حضرتِ ناسخ کو وسیم | ہم شب و روز خدا سے یہ دعا کرتے ہیں

---

[1] مئی ۱۹۳۶ء کے معارف میں بھی ان دونوں کے حالات ہیں ص ۳۶۶ تا ۳۶۲

محاکمہ

(۱) دیوان معروف از جناب ریاض حسن خان صاحب خیال (۲) تبصرۂ سہیل از ؟ (۳ و ۴ و ۵)

دریائے لطافت،
ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد،
شرف جہاں کا ایک شعر از ق ع ہ

(۱) دیوان معروف میں ابھی بہت سے اشعار باقی ہیں جو تصحیح کے محتاج ہیں، بعض کی تصحیح جو معیار میں کی گئی ہے اس سے مجھے اختلاف ہے، اس قسم کے چند اشعار اس وقت لکھے جاتے ہیں۔ باقی آئندہ:-

ص ۱۱۹ دل جو جس کا فقیر کہو اس کو ۔۔۔ نہیں اِنج فنا فقیری کی = فنا

ص ۱۲۴ گر کلاہ و بوریا مانگے کوئی مجھ سے فقیر = کلاہ و بوریا

ص ۱۲۶ ذوق سماع مجھ کو کہو آج سے بنے ۔۔۔ سوزیدہ ازل سے ہوں ڈھب ہے مجھے صدا کی

اس شعر کی تصحیح پہلے ہو چکی ہے "سوزیدہ" کی جگہ "شوریدہ"، اور "صدا" کی جگہ "صدا" صحیح ہے، لیکن "ڈھب" اپنی جگہ پر رہنے دینا چاہیے، یہ میری رائے میں درست ہے۔

ص ۱۳۰ جس کو چوری کا پڑ گیا لپکا ۔۔۔ شاہ کی قدر کب وہ جانے ہے

ساہ سین مہملہ سے بمعنی تاجر، بیوپاری، سنار

ص ۱۳۹ بوسۂ پا پہ لیکے دل سے کہا ۔۔۔ دل اتنا چڑھا دیا کس نے = پہ ایہ

ص ۱۴۰ میں گنہگار لیکن اے رحمت ۔۔۔ ہم کو تقویٰ بندھا دیا کس نے = ہیں

ص ۱۴۱ برائے قیس شہر کے ماریں گے ۔۔۔ اگر ہاتھ سے اپنے اوسان دوگے

جنون آ چکا تھا کہ صحرا کو قیس ۔۔۔ جبھی در پڑوگے جو میدان دوگے

مصرع سوم یوں ہونا چاہیے:- جنوں آ چکا بھاگ صحرا کو قیس اب

۱۳۵ جب جو معروف کو حاکم نے کیا ہے یہ حکم ۔۔۔ کوئی اس شہر میں اِن شعر تو کہنے پائے = چپ

۱۳۹ سہل ہو کیسی ہی گو کیسی ہی مشکل آئے ۔۔۔ پر یہ آفت تو نہ ہووے کہ کہیں دل آئے = کٹتی ہی

۱۲۰ بخشے نہ کیونکر تو گو برابر مقصد وہ زر قیمتی ۔۔۔ بیٹھی ہے دونوں ہاتھ صدف اب پسار کے = مقصود ابر؟

۱۴۰ دوست دشمن سب چلے آتے ہیں لینے کو خبر ۔۔۔ تو بھی گھر تک وان چلا کیا [illegible] = ملک

۱۸۸ اب اٹھایا تو بھی ہم نے عقل سے کم ۔۔۔ ہے بت حسن کا ابھار حد آ [illegible] = گرانبار

۱۴۴ وہ پاچھ مجھ سے غم درد وصدمہ ہائے فراق ۔۔۔ اس کی تصحیح ہوئی ہے "غم درد وصدمہ ہائے فراق"۔

میری رائے میں غم درد وصدمہ ہائے فراق ہونا چاہیے۔

(۲) تبصرہ سہیل: سہیل کے ایک مضمون پر اعتراض کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا۔ ص ۲۴۲ :- "امین الدین امین کے متعلق یہ لکھنا کہ ۱۲۵۰ھ میں بہ عالم ضعیفی زندہ تھے، فاحش غلطی ہے۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ امین کے زمانۂ حیات و ممات کے متعلق مضمون نگار سری رام کے بیان کو مرزا علی لطف علی کے بیان پر ترجیح دیتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ امین کا انتقال ۱۲۰۰ھ سے بھی قبل ہو چکا تھا، جیسا کہ ایک قدیم بیاض سے ثابت ہوتا ہے، جو ہمارے پاس موجود ہے۔"

سہیل اس وقت ہمارے سامنے نہیں، اور ہمیں یہ یاد نہیں کہ مضمون نگار نے مرزا علی لطف کے تذکرے کا ذکر کیا تھا یا نہیں، بہر حال، اس تذکرے میں امین کی وفات کا ذکر نہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ امین ۱۲۱۵ھ (سالِ تالیف تذکرہ) میں زندہ تھے۔ اس بیاض کے علاوہ جس کا حوالہ ہم نے دیا ہے، علی ابراہیم خان کا ایک خط ریاض المنشآت میں موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علی ابراہیم خان زندہ ہی تھے کہ امین کا انتقال ہو چکا تھا علی ابراہیم خان کا سال وفات ۱۲۰۸ھ ہے۔

(۳) دریائے لطافت: نسخۂ مرشد آباد کے مصحح نے ایک تمہید لکھی تھی، اس کے اقتباسات معیار ص ۵۰ پر شائع ہوئے تھے، ہمارے ایک فاضل دوست نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اس میں تین غلطیاں رہ گئی ہیں۔ سطر ۲ میں انضباط کی جگہ التقاط ہونا چاہیے۔ س ۹ میں جدید الوجود کی جگہ جدید الورود، اور اسی سطر میں بکار آمد کی جگہ کار آمد صحیح ہے۔

(۴) ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد: اس مضمون میں یہ آیت نقل کی گئی تھی " اِنَّ المَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا "۔ حاشیے میں لکھا گیا تھا کہ اس سے ۱۰۳۰ نکلتا ہے ص ۱۰۴ مرآۃ الاحوال کے دو نسخے پٹنہ میں ہیں اور دونوں میں یہ آیت اسی طرح ہے لیکن آیت دراصل یوں ہے: " اِنَّ المَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا " ، اس صورت میں ۱۰۳۰ کی جگہ ۱۰۲۰ نکلے گا۔ ص ۱۰۵ س ۳ حاجی محمد ناصر قزوینی۔ ناصر غالباً ناجی ہے۔ ص ۱۰۵ س ۱۱ آقا محمد کنزانی۔ ایک نسخے میں اسی طرح ہے، لیکن دوسرے میں آقا محمد خراسانی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۵) شرف جہاں کا ایک شعر: معیار ص ۱۱۶ پر اس طرح نقل ہوا ہے۔

زبیداد تو کے خواہم جدائی برگرفتم من ، کہ از زحمت بیک حرف عتاب آلودہ برخیزم

شعر العجم میں برگرفتم کی بجائے رقیبم ہے، کلیاتِ حسن میں برگرفتم ہی ہے لیکن یہ صحیح نہیں، شرف جہاں کا دیوان یہاں موجود نہیں کہ قطعی طور پر یہ کہا جاسکے کہ برگرفتم کی جگہ شرف جہاں نے کیا لکھا تھا۔

ہماری زبان

(۱) جزؔ اور جزوؔ کی بحث۔ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ صدر شعبہ عربی و فارسی، الٰہ آباد یونیورسٹی۔

(۲ و ۳ و ۴) ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں کو کا استعمال۔ از ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم اے پی ایچ ڈی استاذ فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی و ڈاکٹر عبدالستار صدیقی و جناب ریاض حسن خاں صاحب خیالؔ۔

'جزؔ' اور 'جزو' کی بحث

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی

اُردو میں اس لفظ کا فصیح تلفظ "جُز" ہی ہے اور اتنی ہی دلیل اِس کی صحت کے لیے کافی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ آپ فارسی عربی کی سند مانگیں گے، اس لیے اُدھر رجوع کرنا ضروری ہے۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ "جُزء" (ٹکڑے کے معنوں میں) عربی لفظ ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ج ز ء) ہے، (ج ز و) ہرگز نہیں، بلکہ عربی میں (ج ز و) سرے سے کوئی مادہ (کسی اور معنی میں بھی) ہے ہی نہیں، آپ فرمائیں کہ "جزو" صحیح ہے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے مانے لیتا ہوں کہ اس لفظ میں واو ہے؛ مگر یہ واو اصلی نہیں ہو سکتا، جب اصلی نہیں تو آپ فرمائیں گے کہ زائد ہوگا، مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ واو یہاں لام کلمے کی جگہ پر ہے اور نے کلمہ، عین کلمہ یا لام کلمہ زائد نہیں ہوتا۔ اصلی ہوتا ہے۔ جب وہ نہ اصلی ہے نہ زائد، تو اس کی ہستی موہوم ہے۔

اس موہوم ہستی کے متعلق آگے چل کے کسی قدر تفصیل سے عرض کرونگا، پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ فارسی لغت نویسوں نے کیا فرمایا ہے۔ فارسی لغت کی زیادہ میسر حاصل کتابیں متاخرین نے تالیف کیں اس لیے پہلے اُنہیں کو دیکھنا چاہیے۔

فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع میں نہ "جزؤ" ملتا ہے، نہ "جُز" اور نہ "جزو" اور یہ ٹھیک بھی ہے اس لیے کہ ان کتابوں میں ٹھیٹ فارسی لفظ درج کیے گئے ہیں، عربی لفظوں سے مطلق بحث نہیں، مگر تعجب تو یہ ہے کہ فارسی لفظ "جُز" (جس کے معنی "سوا"، "علاوہ" وغیرہ ہیں) اس کو بھی نہیں لکھا ہے۔ اس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے فارسی لفظ "جُز" کو بھی عربی سمجھ رکھا تھا۔ بہار عجم میں عربی لفظوں کو بھی جگہ دی گئی ہے، چنانچہ اس لفظ کے متعلق یہ تفصیل ملتی ہے:-

"جُزْو، بالضم، در لغت عرب بمعنی پارہ است۔ و در فارسی جُز، بدون ہمزہ تلفظ کنند بہاں عربیست۔ و چوں آن را مضاف نمایند بہ چیزے، بجاے ہمزہ واو نویسند۔ و گویند جُزو طلا ہم طلا است، و ہمچنیں 'جزو بدن' و 'جز آن'۔ بہر تقدیر اسم است و بمعنی غیر نیز اسم"،

لیکن بہ اضافت مستعمل نیست ۔ وبمعنی مگر حرفست، چنانچہ گوئی "آمدند ہمہ مردم بجز زید"......"

اس فارسی عبارت کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) عربی لفظ "جُزْءٌ" ہے [ہمزہ کے ساتھ] (۲) فارسی میں یہ لفظ "جُز" (بلا ہمزہ) ہوگیا۔

(۳) یہ فارسی "جُز" عربی لفظ کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔

(۴) فارسی میں اضافت کی صورت میں ہمزہ کی جگہ واؤ لکھتے اور بولتے ہیں یعنی "جُزوِ"۔

(۵) بہرحال یہ لفظ اسم ہے۔

(۶) اس لفظ کے ایک معنی ہیں "غیر" اور اس معنی میں بھی اسم ہے، لیکن اضافت کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔

(۷) اس لفظ کے ایک معنی ہیں "مگر" اور اس معنی میں یہ لفظ حرف ہے۔

ان سات باتوں میں سے پہلی، دوسری اور پانچویں میں کوئی شبہ نہیں، تیسری بات میں کچھ تامل ہوتا ہے، اس لیے کہ "مخفف" کے اصطلاحی معنی اور ہیں ۔ اس لفظ میں سے ہمزہ اسی طرح گرا ہے جیسے دعاء، اشیاء، حکماء وغیرہ میں سے، فارسی زبان میں لفظ کے آخر میں ہمزہ نہیں ہوتا (سوا اضافت کے کسرے کے جب وہ مختفی ہے کے بعد آئے جیسے "بندۂ درگاہ") اس لیے جن عربی لفظوں کے آخر میں ہمزہ تھا وہ فارسی میں بغیر ہمزہ کے بولے جانے لگے۔ پس "جُز" کو عربی لفظ "جزء" کا مُعَرّب کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مخفف نہیں کہہ سکتے ۔ (۴) کے متعلق آگے چل کے عرض کروں گا (۶) اور (۷) کو عربی لفظ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان معنوں میں "جز" ایک ٹھیٹ فارسی لفظ ہے۔ عربی لفظ "جزء" کا کوئی اثر کم از کم اس پر نہیں پڑا ہے (۴) کے متعلق یہ دریافت کرنا ہے کہ ہمزہ اور لفظوں میں بھی واؤ سے بدلا گیا ہے یا نہیں؟ "ضوء" ایک عربی لفظ ہے فارسی میں اکیلا نہیں بولا جاتا۔ اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، جیسے ضوءِ آب، ضوءِ مزاج، ضوءِ دماغ وغیرہ یہاں ہمزہ واؤ سے نہیں بدلا "ضوء" میں بھی نہیں بدلا یعنی "ضوءِ آفتاب" کہیں گے، نہ کہ "ضوِ آفتاب"۔ عربی لفظ "شیٔ" کا ہمزہ بھی فارسی زبان میں نہ آیا بلکہ "شیٔ" کو بھی "لاشی" بولنے لگے۔ واؤ اس میں بھی کہیں نہ آیا۔

صاحب غیاث اللغات نے بھی وہی لکھا ہے جو بہار عجم میں ہے، صرف دو باتیں زیادہ کی ہیں ایک یہ تشریح کہ :-

"لفظ "جز" بدون واؤ کلمۂ فارسی است وہر جا بمعنی "غیر" آید ہرچند کہ مرادف لفظ "غیر" است مگر بخلاف لفظ "غیر" مقطوع الاضافہ باشد یعنی بکسرۂ علامت اضافت است مستعمل نمی شود"

دوسری بات یہ لکھی کہ :-

"در عبارت عربی ایں ہمزہ اگر مضموم باشد بصورت واؤ نویسند چنانکہ "ھٰذا جُزْؤُہٗ" واگر

کسور باشد بصورت یا نویسند چنانکہ "مُوْزِتُ اِلٰی جُزْئِکَ"[1] واگر مفتوح باشد،
بصورت الف نویسند چنانکہ "رَأَیْتُ جُزْأَکَ" [یہ ڈھنگ عربی کے غلط نویسی کا توں
کا ہے اور اسی سے فارسی والوں کو دھوکا ہوا اور وہ "جُزو" بولنے لگے۔]

عربی میں ہمزہ کی کتابت کے کچھ قاعدے مقرر ہیں۔ ان میں سے یہاں صرف دو کا بیان کر دینا کافی ہے:۔

(۱) اگر ہمزہ، لفظ کے آخر میں واقع ہو اور اس کا ماقبل متحرک ہو تو ماقبل کی حرکت کا ہم جنس حرف لکھ کر اس کے اوپر ہمزہ بنا دیا جائے گا، جیسے قَرَأَ، جَرُؤَ، صَدِئَ،

[قرأ کی "ر" پر فتحہ تھا۔ اس لیے فتحے کا ہم جنس یا موافق حرف (الف) لکھا گیا۔ اسی طرح ضمے کا ہم جنس واو اور کسرے کی ہم جنس "ی" کام میں لائی گئی۔ یہ حرف گویا ہمزہ کی کرسی قرار دیے گئے ہیں۔ لکھے جاتے ہیں، پڑھے نہیں جاتے۔ آواز تینوں لفظوں میں ہمزہ ہی کی نکلتی ہے۔]

(۲) اگر ہمزہ، لفظ کے آخر میں واقع ہو اور اس کا ماقبل ساکن ہو، تو کوئی حرف (سوا ہمزہ کے) نہ لکھا جائے گا، جیسے جُزْءٌ، بِجُزْءٍ، اَلْجُزْءُ الْاَوَّلُ، فِی الْجُزْءِ الْاَوَّلِ، خَبْءٌ، مِلْءٌ، اَلشَّیْءُ، بِالشَّیْءِ وغیرہ،

"جزء" کا لفظ، اس دوسرے قاعدے کے تحت میں آتا ہے، اس لیے کہ اس میں ہمزہ کا ماقبل (یعنی ز) ساکن ہے جتنی عربی کتابوں میں (چاہے وہ نئی ہوں یا پرانی) یہ قاعدہ بیان ہوا ہے، مثالوں میں "جُزْءٌ" ضرور موجود ہے۔

پرانے ہی زمانے میں بعضے کاتبوں نے یہ غلطی کی کہ صحیح لفظ "جزء" کی جگہ "جزو" لکھنے لگے، اور ایران اور ہندوستان کے کاتبوں نے اسی غلط املا کو اختیار کیا، چنانچہ کلام مجید کے اکثر ہندوستانی نسخوں میں ہر سیپارے کے شروع میں حاشیہ پر "الجزو" لکھا ہوا دیکھیے گا۔ عرب بیچارے نے اس املا کو اگر واو سے لکھ بھی دیا تھا تو تلفظ صرف ہمزہ ہی کا کرتا تھا، واو کو ادا نہ کرتا تھا۔ ایرانیوں اور ہندیوں نے واو کو اسی طرح ادا کرنا ضروری جانا جیسے عربی لفظوں "شُہُوْ"، "لَغْوٌ"، "نَحْوٌ" میں جن میں واو اصلی ہے، اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "جزو دماغ" اور "جزو بدن" اور "جزوی" اور "جزو لاینفک" فارسی زبان میں جاری ہو گئے۔

صاحب بہار عجم نے "جزو" کو اضافت کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر آگے چل کے خود ہی "جزودان"، "جزو کشیدن" اور "جزوکشی" کو اپنی کتاب میں داخل کیا ہے اور سند میں ملا سعید اشرف اور ملا طاہر غنی کے شعر نقل کیے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب انہیں کے قول کے مطابق فارسی میں "جزو" کے لیے "جز" بھی بولا جاتا ہے۔ تو "جزدان" اور "جزکشی" وغیرہ بھی صحیح ہیں۔ "جزوکل" میں تو "جز" کا لفظ ہمیشہ بغیر واو کے استعمال ہوتا ہے۔ "فرہنگ شعوری" بھی ایک مستند لغت ہے۔ افسوس کہ میں اس سے

---

[1] عربی کا فقرہ کچھ بے جا سا ہے۔ لفظ "اِلٰی" بھی یہاں صحیح نہیں!!

براہِ راست مستند نہیں ہو سکتا۔ مگر فُلرس کے فارسی لاطینی لغت میں شعوری کی عبارت کے ٹکڑے نقل ہوئے ہیں۔ شعوری نے "بُزدان" ہی لکھا ہے اور سند میں کسی شاعر کا یہ شعر دیا ہے:۔

کہ اوراقِ پریشاں ہر چہ دارم ۔۔۔ زجزدان بود مشائخ بیتر اہم

خلاصہ اس سب کا یہ ہے کہ فارسی میں اضافت کی حالت میں "جزوِ بدن" وغیرہ فصیح ہیں اور "جزِ بدن" وغیرہ بھی صحیح ہیں: "جزدان" اور "جزودان" "جزکشی" اور "جزوکشی" وغیرہ کی دونوں صورتیں صحیح۔ اس لیے کہ دونوں صورتیں اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اُردو میں، جیسا کہ شروع میں لکھ چکا ہوں، "جز" فصیح ہے اگرچہ "جزو" پر ترجیح ہے: "جزوِ بدن" "جزوِ دماغ" وغیرہ بھی فارسی کے تتبع میں صحیح، مگر جہاں اضافت نہیں ہے، جیسے "جزدان"، "جزرسی" وغیرہ "جز" (بلا واو) کو ترجیح ہے، بلکہ "جزودان" اور "جزورسی" میں سراسر تکلف ہے۔ "جز" کو کاٹ کر "جزو" بنانا ہرگز درست نہیں۔

"جزو" اور اس کے مفرّس "جز" اور "جزو" کی بحث تو ختم ہوئی، اب اس "بز" کے متعلق بھی کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں جو "بزدان" (بہ بُز) میں ہے اور ٹھیٹ فارسی ہے۔ یہ تو اوپر آ چکا ہے کہ اس لفظ کو عربی سے کوئی کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔

اس کے فارسی الاصل ہونے کے بارے میں متاخرین کی فرہنگوں میں (سوا "غیاث" کے) کہیں کچھ ملتا نہیں۔ متقدمین کی مختصر فرہنگوں میں سے اکثر فرہنگِ جہانگیری کا ماخذ تھیں، ان میں سب سے پرانی تین ہیں۔ (۱) فرہنگ ابوالحفص سُغدی (۲) فرہنگ اسدی طوسی (یعنی "لغتِ فرس") (۳) فرہنگ حکیم قطران۔ پہلی اور تیسری کا پتا نہیں، دوسری کو جرمانی مستشرق پاؤل ہورن نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا۔ یہ ایک بہت چھوٹی سی کتاب ہے جس میں کچھ کم بارہ سو لغات درج ہیں، اور حجم جو سو صفحے بھی ہو گیا سو سند کے شعروں کی بدولت۔ اس کتاب میں بھی "بز" کا لفظ نہیں ملتا۔ اور کتاب کے حجم کو دیکھتے ہوئے اچنبھے کی بات نہیں، سُغدی اور قطران نے بھی اپنے رسالوں میں غالباً اس کو درج نہ کیا ہوگا، ورنہ صاحبِ جہانگیری اور فرہنگ نگار ضرور اسے نقل کرتے۔

پرانی کتابوں میں ایک اور چیز ہے جس سے فارسی کے فرہنگ نگار بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہے زمخشری کی قابلِ قدر عربی فرہنگ "مقدمۃ الادب" جو ایرانیوں کے فائدے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کی تالیف کا زمانہ اسدی کی لغتِ فرس کی تالیف سے کوئی پچاس برس بعد کا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس مصنف کی "المفصل فی النحو" اور "تفسیر کشاف" نے یہ شہرت پائی، اس کی "مقدمۃ الادب" کو، اور تو اور لغت نویسوں تک نے آنکھ بھر کے نہ دیکھا۔ زمخشری کی کتاب کو بھی ایک جرمانی مستشرق (ویتسشٹائن) نے ۱۸۴۳-۴۴ء میں شائع کیا۔ اس کتاب میں عربی لفظوں کے معنی فارسی زبان میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ عربی لفظ "جُزْء" کے معنی "پارہ چیزے" لکھے ہیں اور جمع "اجزاء"۔ اور عربی لفظوں [illegible]

معنی یوں لکھے ہیں: "دیگر، جز، چیزے دیگر"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "دیگر، چیزے دیگر" کا مرادف "جز" ایک فارسی لفظ ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ لفظ فارسی نظم و نثر کی کتابوں میں کثرت سے آیا ہے۔

لفظ کے اشتقاق کے متعلق مختصر عرض کر دوں کہ پہلوی میں "جتاک" اور "جُت" کے معنی ہیں: الگ کیا ہوا۔ اور "الگ"۔ "جتاک" کا کاف فارسی میں آکر گر گیا اور ت، ذال سے بدل گئی۔ اس طرح وہ "جذا" اور آگے چل کر "جُدا" ہو گیا۔ "جت" کی ت بدل کر ذال ہوئی تو "جُذ" ہوا۔ اس کے ساتھ "از" الگ آتا تھا "جذاز"۔ ان دونوں لفظوں کے ایک ساتھ بولے جانے سے "جُذز" ہوا اور بالآخر "جز"۔ اسی چھپے ہوئے "از" کے باعث اس پر اضافت نہیں آتی اور اسی لیے اسے اسم کہنا بھی درست نہیں۔ معنوں کے لحاظ سے بھی متعلقات میں ہے، اسم نہیں۔

ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں "کو" کا استعمال

(۱) آپ نے ص ۲۱۲ پر لکھا ہے کہ ریاض و جلیل کے کلام سے مفعولی حالت میں ضمیر کے ساتھ "کو" کے استعمال کی سند دکھا سکتی ہے اور سند میں داغ کا شعر نقل کیا ہے، گزارش یہ ہے کہ میرے نزدیک نثر میں کسی لفظ یا کلمے یا اصطلاح یا محاورے کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق نظم سے استشہاد کرنا ہمیشہ صحیح نہیں کیونکہ نظم میں وزن اور ردیف و قافیہ کی مجبوریاں لکھنے والے سے کچھ کا کچھ لکھوا دیتی ہیں چنانچہ کل داغ کا ایک شعر نظر سے گزرا:- ہاتھ جوڑے پاؤں پر ان کے گرے ۔ پھر بھی وہ ہم ہی سے برہم رہے ، ظاہر ہے کہ "برہم" کے بجائے "برہم ہی رہے" ہونا چاہیے تھا۔ مگر قافیے کی مجبوری نے کچھ کا کچھ کر دیا۔

(۲) ص ۱۵ کی آپ نے جو تصحیح فرمائی ہے اس سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے "مجھ کو" "اس کو" "تجھ کو" وغیرہ کو زبان سے خارج فرما دیا، یہ تو ناسخ کو بھی نہ سوجھی تھی۔ مجھ کو اور مجھے وغیرہ بالکل مترادف ہیں، جس مقام پر جو صورت دونوں میں سے پسند آئے بولیے لکھیے، البتہ بعض صورتوں میں "کو" کہنے سے زیادہ وضاحت یا تاکید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، مگر فرق اگر ہے تو ایسا خفیف کہ قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(۳) میرے نزدیک حالت مفعولی میں "کو" کا استعمال صحیح ہے، بلکہ بعض صورتوں میں "مجھ کو" "تجھ کو" "مجھے" "تجھے" سے قابل ترجیح ہو، مثالیں مستند شاعروں کے یہاں بے شمار ملیں گی، ان میں سے چند ملاحظہ ہوں:-

مقدمۂ حالی ص ۲۴ "سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو" ص ۱۳۹ "پھر اس کو درست کہنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے"۔ اردوئے معلی ص ۱۲ "تم کو یاد ہے" ص ۱۵ "میاں سیاح کہاں ہیں اور مجھ کو کیوں بھول گئے"۔ آب بقا خواجہ عبدالرؤف عشرت ص ۱۲ "ان کو اگلے بچے جوان لکھ سکتے" ص ۲۲ "مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا حکم دیا"، نظم لکھنوی رسالہ اردوئے معلی جنوری ۱۹۱۲ء "اس کو استعمال کرنا دہ ہو" ص ۱۱ "شعر میں بھی ان کو ممنوع کہہ دینا مشکل ہے"۔ (امیر مینائی، جعفر بلگرامی، شبلی، آزاد کی بھی سندیں دکھا سکتی ہیں، دہلی کو ابھی سلام: وہ شاعر ہی)

عالمِ ادب

(۱) بابو راجندر پرشاد نے ہندی ساہتیا سمیلن ناگپور کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا، اس کے چند اقتباسات جون کے پرچے میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس بار ہم مزید اقتباسات پیش کرتے ہیں:۔

ہندی کو دوسری زبانوں سے الفاظ لیکر اپنے ذخیرہ کو بڑھانا چاہیے، ہندی میں عربی فارسی کے جو الفاظ رائج ہیں ان کے نکالنے کی کوشش فضول ہے، ایک دوست نے زوال کے لیے "کرا رجن دست گھنڈ" کا استعمال مناسب سمجھا تھا۔ یہ ہندی کے ساتھ ظلم ہے، ہندی کے الفاظ کے ذخیرے کی تکمیل سنسکرت سے ہو، لیکن دوسری زبانوں کے سلیس اور چھوٹے لفظوں سے ہمارا مطلب ٹھیک ٹھیک نکل سکتا ہو لینے میں ہچکچانا نہیں چاہیے، آج سے ۹۰ برس پہلے راجا شیو پرشاد نے ہندوستانی کی نیو ڈالی تھی، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: "پنڈت لوگ سوچتے ہیں کہ جتنے اصلی سنسکرت شبد (چاہے وہ سمجھ میں آئیں چاہے نہیں) لکھے جائیں اتنی ہی ان کی ناموری کا سبب ہے، اور اسی طرح مولوی لوگ فارسی اور عربی شبدوں کے لیے، غرض پل بنانے کے بدلے دونوں خندق کو گہرا اور چوڑا کرتے جاتے ہیں"۔ ہم ابھی تک اس خرابی کو جانتے ہوئے بھی اس خندق کو گہرا ہی کرتے جاتے ہیں، ہندی کے ایک مصنف اجودھیا سنگھ جی اپادھیائے نے لکھا ہے:۔

روپ ودیاں پر پھلا پر ایکا لیکا روکند ودھیامتا + شنو گی کلبھاسنی سرسکا کریڈا کلا تپلی + شوبھا واری دھی کی امولیا منی سی لاونیہ لیلا میابی + شری رادھا مرد ودبھا شنی مرگ دگی مادھوریہ سمنو رتی تھیں + کنا ودیا دنتا دو نامرہ گگن ملینا + آسنا تھی نکٹ پتی کے مبوتیتر الیشو دھا۔ اسی مصنف نے یہ بھی لکھا ہے:۔ ایک دنیا سے اٹھا ہے چاہتا + اوجھے اٹھتی جوانی ایک کی + چاند اور سورج گگن میں گھومتے ہیں رات دن + اُردو والوں میں سر محمد اقبال، جو سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا، دنیا کی محفلوں سے گھبرا گیا ہوں یارب اور نیا شوالا کی سی نظموں کے مصنف تھے، خیالات کی تغیر کے بعد ایسی مشکل نظم لکھنے لگے جیسے "اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے، جم اور + ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور"۔

ہمیں جہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ فارسی عربی لفظوں کے بائیکاٹ سے ہم مسلمانوں کے لیے ہندی کو بہت مشکل تو نہیں بنا رہے ہیں، وہیں یہ لحاظ بھی رکھنا چاہیے کہ صرف فارسی عربی کے لفظوں کو لے کر اور سنسکرت کا بائیکاٹ کرکے گجراتی، مرہٹی، آسامی، تامل، ملیالم وغیرہ کے بولنے والوں کے لیے ہندی کا سمجھنا دشوار نہ ہو جائے، ہم نہ گجرات، مہاراشٹر، آسام وغیرہ کو چھوڑ سکتے ہیں نہ شمالی ہند کے مسلمانوں سے الگ ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کے متعلق ہماری روش یہ ہونی چاہیے کہ (۱) جو لفظ عربی فارسی کے ہندی میں رائج ہیں انہیں خارج نہ کیا جائے (۲) عربی فارسی کے جو الفاظ گجراتی، مرہٹی، بنگالی، پنجابی اور دکن کی زبانوں میں آ گئے ہیں اور ان کے ٹھیک ہم معنی لفظ ہندی میں نہیں ملتے انہیں بھی لے لیا جائے (۳) ان کے علاوہ وہ ایسے نئے لفظ جو نئے مطلب کو ادا کرتے ہیں ان کو لینے میں بھی تامل کرنا نہیں چاہیے، ایک بہت چھوٹا لفظ "تنخواہ" ہے جسے سب سمجھتے ہیں کوئی دوسرا...

اس کی جگہ سنسکرت کا کوئی لفظ کھوج کر نکالا جائے۔ کچہریوں میں محکمۂ مال اور حکومت سے متعلق بہتیرے لفظ ہندوستان کی سب زبانوں میں رائج ہیں اگر ان کے ہم معنی لفظ ہندی میں رائج نہیں تو سنسکرت کے لفظ دھرم شاستر سے نکال کر ان کی جگہ استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں (۴) انگریزی کے بہت سے لفظ رائج ہیں۔ انہیں رہنے دینا چاہیے۔ ٹرین کی جگہ "لوہ پتھ چلت داشپ یان" اور پلیٹ فارم کی جگہ "لوہ پتھ چلت داشپ یان ستھان ستھل" ٹکٹ کی جگہ "مولیا پتر" کا لکھنے کی ضرورت نہیں (۵) صوبے کی زبانوں میں ایسے بہت سے لفظ ہیں۔ جو آج کل ہندی میں رائج نہیں ہیں۔ انہیں "لاگو" "چالو" "بازو" کی طرح ہندی میں داخل کرنا چاہیے (۶) علمی اصطلاحات ہندوستان کی کل زبانوں کے لیے ایک ہوں تو بہتر ہے۔ جیسے کونسل کے لیے "دھارا سبھا" "دیوستھا پکا سبھا" (۷) گاؤں کی بولی میں بہت سے الفاظ ملیں گے جن کے ٹھیک ہم معنی الفاظ ہندی اور سنسکرت میں نہیں ملتے۔ گریرسن نے اپنی کتاب بہار ریورل لائف میں چرخے کے ہر ایک حصے کا نام دیا ہے۔ گاؤں کی زبان میں نئے لفظ گڑھنے کی اچھی طاقت ہے۔ موٹر کار کے لیے ہوا گاڑی۔ بائیسکل کے لیے پیر گاڑی، ماچس کے لیے دیاسلائی، ریلوے سگنل کے لیے سکندر۔ لوف کے لیے پاؤ روٹی۔ کتنے اچھے لفظ ہیں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی طاقت جو گاؤں کی بولی میں ہے، کتابی زبان میں نہیں، لوٹنے سے لٹاس کہنے سے کہاس، صابن سے صبونانا۔ مٹی سے مٹیانا، پانی سے پنیانا، غصہ سے غصانا۔ دھکے سے دھکیانا نرم سے نرمانا، گھن سے گھنانا، ایسے ہی الفاظ ہیں۔ ہمارے یہاں کے بھی کچھ استادوں سے ایسی کوشش کی ہے "اور جو ہاری سواری کی نیندتی ہے" اپنے سدل مصر) "عرب کا اونٹ کس طرح جگالتا ہے" (پنڈت پدم سنگھ شرما) نند سے نیندتی جگالی سے جگالتا بنایا ہے لیکن ایسی کوشش بہت کم ہوئی ہے۔

جو لوگ ہندی نہیں جانتے، انہیں تین چار باتوں کی وجہ سے بڑی مشکل پڑتی ہے (۱) ایک تو تانیث و تذکیر، اس میں بڑا جھگڑا ہے، بڑے بڑے لکھنے والے بھی دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسے لفظ "ادد" عام طور پر مؤنث مانا جاتا ہے لیکن ہندی کے ایک بڑے مصنف نے اسے مذکر لکھا ہے، نئے لفظوں کے لیے کوئی قاعدہ مقرر نہیں، کونین، لالٹین، موٹر، کانگریس اور کانفرنس کیوں مؤنث بنا دیے گئے ہیں۔ اردو کے لفظ قلم اور چرچا ہندی میں کیوں مؤنث ہو گئے۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ ان کے ہم معنی لفظ سبھا، کمیٹی، اور لیکھنی وغیرہ مؤنث ہیں۔ اور نہ سنسکرت کی سند پر ان لفظوں کی تذکیر و تانیث مقرر کی جا سکتی ہے۔ اگنی، آتما اور پستک سنسکرت میں مذکر ہیں، لیکن یہ ہندی میں مؤنث ہیں، بے جان لفظوں کے لیے موزوں اور سہل قاعدے بنانے کی ضرورت ہے (۲) نے کے استعمال میں بھی بڑی مشکل پڑتی ہے، پنجاب میں نے کا استعمال الگ ہے اور ہندی لکھنے والے کچھ اور جانتے ہیں (۳) بڑی مشکل اس میں بھی ہے کہ کب فعل کی تمیز کام کے مطابق ہو اور کب کام کرنے والے کے مطابق پنڈت جواہر پرشاد جی شرما کا ایک جملہ ہے "انہوں نے پہلے تو ہاں ہوں کی، اس میں نون فعل کے لیے کون سا مؤنث کام ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا (۴) ایک ہی لفظ کئی طرح سے لکھا جاتا ہے۔ اس میں بھی بڑی دشواری پیدا ہوتی

مطبوعاتِ جدیدہ

(۱) دیوانِ تاباں، از ق ع و

(۲) کلیم عجم از ؟

(۱) دیوانِ تاباں، مصنفہ میر عبدالحی تاباں، مرتبہ عبدالحق صاحب، سلسلۂ انجمن ترقی اردو، ص ۲+۶۰+۲، قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible]۔

انجمن کی اکثر مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی حسنِ ظاہر سے بہرہ وافر رکھتی ہے، اس کے محاسنِ معنوی کے متعلق ہم اپنی مفصل رائے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) دیوانِ تاباں کے قلمی اور مطبوعہ نسخے جو اس وقت موجود ہیں حسب ذیل ہیں: قلمی نسخے (۱) مملوکہ رسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی (۲) مملوکہ انجمن (۳) مملوکہ جناب کیفی (۴) مملوکہ سری رام (۵) مملوکہ وزیر علی صاحب حیدرآباد (۶) مملوکہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد (۷) مملوکہ کتب خانۂ مدرسہ حیدرآباد (۸) مملوکہ نواب سالار جنگ، انتخابِ دیوان از نواب عماد الملک مطبوعہ ۱۸۹۶ء، نسخہ مطبوعہ حیدرآباد دکن (رح)۔ یہ نسخہ پانچویں چھٹے اور نویں نسخوں پر مبنی ہے۔ انجمن کا شائع کردہ نسخہ پہلے دوسرے تیسرے نسخوں پر مبنی ہے۔

دیباچے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ متن کی درستی کس اصول کی بنا پر کی گئی ہے۔ بظاہر کسی ایک نسخے کو اصل قرار دیا ہے، زائد شعر جو دوسرے نسخوں میں ملے ہیں، انہیں بھی متن میں شامل کر لیا ہے۔ الفاظ کا اختلاف حواشی میں دکھایا ہے، لیکن اس کی تفصیل سے احتراز کیا ہے کہ کون سے الفاظ کس نسخے میں ہیں۔ قلمی نسخوں کے سنین کتابت بھی نہیں دیے۔ اس قسم کی کتابیں آئندہ جو شائع ہوں گی ان میں ان دو باتوں کا خیال رکھا جائے تو بہتر ہے، ایک تو یہ ہے کہ ان قلمی نسخوں کے متعلق جن پر کتاب کا متن مبنی ہے مفصل اطلاعات فراہم کی جائیں، دوسرے یہ کہ اختلافات یا تو دکھائے نہ جائیں یا اگر دکھائے جائیں تو یہ ضرور بتایا جائے کہ کس نسخہ میں کس طرح ہے۔

(۲) یہ نسخہ جتنا چاہیے، اتنا صحیح نہیں، لیکن دوسرے اداروں سے جو کتابیں نکلتی رہتی ہیں، ان کے مقابلے میں زیادہ غلط بھی نہیں، تاہم انجمن کو آئندہ صحت کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

(۳) دیوان کی جامعیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ رح میں (جس کے متعلق اس کے مرتب کا دعویٰ ہے کہ کل کلام پر حاوی ہے) کل ۹۵۵ اشعار ہیں، اور اس کے نسخے میں ۱۲۹۲۔ بڑی تلاش سے ہمیں چند اشعار ایسے ملے ہیں جو اس میں موجود نہیں۔ یہ اشعار ص ۲۰۵ پر درج ہیں۔

(۴) الحاقی کلام اس میں بہت کم داخل ہے۔ اس قسم کے کل اشعار ہم نے تبصرے کے آخر میں نقل کر دیے ہیں۔

(۵) مصنف کے حالات دیباچے میں موجود ہیں، لیکن زیادہ تفصیل سے گریز کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں بھی ان کا بیان ہے کہ عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ ہماری رائے میں موت کے وقت ۴۰ برس سے کم کی عمر نہ تھی۔ فاضل مرتب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ جو مثنوی دیوان کے ص ۲۰۵ پر شروع ہوتی ہے "عمدۃ الملک امیر خان کی مدح میں ہے"، یہ مثنوی عمدۃ الملک کے قتل کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عمدۃ الملک کے باغ اور جشن ہولی کا ذکر اس میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن تاباں کا اصلی ممدوح عنایت اللہ کشمیری ہے جس کے یہ رفیق تھے۔

تصحیح اغلاط

اس قسم کی غلطیاں اور بھی ہیں، جن میں سے اکثر نظر انداز کر دی گئیں (۱۳) کوہ بیاباں = کوہ و بیاباں، ۲۳ آتا = پر آتا، ۲۴ ہے تس پہ = ہے تس پر، ۲۵ تمہارے لال = تمہارے لعل، ۲۶ حرم کو چھوڑ رہوں کیوں نہ میکدے میں شیخ = بتکدے، اس کے علاوہ تذکروں میں بھی بتکدے ہی ہے، میکدے صریحاً غلط ہے، ۲۷ یاقوت لب ترا ہوا کیوں حا سے جرم وار = دار؟ ۲۸ آرزو ہے کہ ترے غم سے بیاباں میں پھروں اور ہوا بر پا کر ترے خار نصیب = مرے ۲۹ سخن کے بحر میں آ کے مری کشتی تباہی تھی کنارے آ لگی جب سے ہوا تو ناخدا حشمت = آ گئے اس کے علاوہ اور جگہ بھی اسی طرح ہے، آ کے سے کوئی مطلب نہیں نکلتا، ۳۰ مثل لیس و احد عزا = غیرا، ۳۱ شمع رو کے گرد پھرتی ہیں سدا قربان ہو + چشم میری پر نگاہ مژگاں کے پروانے کی طرح = پھرتے، میرے تاباں کی زبان پر لفظ چشم مذکر، مونث دونوں ہے۔ فعل جمع کی رعایت سے اس شعر میں مذکر پڑھنا بہتر ہوگا، ۳۲ تسیں = تس میں ۳۳ جاں لب ہی غم میں ترے ساغر صہبا کی طرح = ساغر صہباح، ۳۴ ملو ہوں = ملوں ہوں، ۳۵ ہے سبب نہیں تندی بو گل میں اکثر باغ میں پرسے کی دھکوں سے ہے گرد = اگر ۳۶ جبل کر = جھل کر، ۳۷ مت رکھ امید یہ کر دنگا جہاں کی سیر + لے پھر مجھ آ ضیافت جہاں کی سیر = جہاں دونوں مصرعوں کا قافیہ نہیں ہو سکتا، دوسرے میں اگر جہاں پڑھا جائے تو یہ قباحت دور ہو جاتی ہے، ۳۸ گر شاعر آسماں ہیں زمین غزل کے سب تاباں کو فکر شعر میں ہے آسماں کی سیر = گاہ ۳۹ جو دریا دل کے تئیں اور پھر نہ دل داری کرے رہتا ہوں بیدل اسی سے میں اس دلربا سے کیا غرض = جو دل بادل کے تئیں ۴۰ ہے کس کے شک حسن سے یوں سوگوار شمع کیوں اس طرح سے روتی ہے بے اختیار شمع ۴۱ روتی ہے جس کر قہر میں ترے زار زار شمع = مرے، کس کا غم، معشوق کا یا عاشق کا؟ ۴۲ جیسا کہ چھپ = طرح، ۴۳ اے دیوانے مرے شور سے چھپ جا دیں گے مجھ سے مجنوں کوہ نہ لیلیٰ پر زور اہلک ورت = چھپ، مخفی چھپ بھی شرما جائیں گے، چھپ جانے کی تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ۴۴ ایسا کیا

جاب کوئی چشم ترکیے ہم ۔ کہ ۹۲ ایسا نہیں غریب کوئی گھر گھر کریم + ایسا نہیں خراب کوئی تیرے در کہ ہم ۔ متن،
نم، ح کے علاوہ کسی تذکرے میں بھی اسی طرح ہے ۔ ۹۴ قدر اس کر دیا اپنا سلامی کے تئیں ۔۔۔ کو ۔۔۔ پہنچی چشم
نعل کا مینا بنایا ہے گل جل نہیں، جبیۂ جمل، حاشیے میں مینا کی جگہ جینا اور جمل کی جگہ تحمل لکھا ہے، مینا اور جینا دونوں غلط
ہیں، اور جمل حقیقی اختلاف نہیں بلکہ کاتب کا پیدا کردہ ہے، ۹۸ آرزو ہے مرے تاباں کو یہی لے قاتل صاحب بھلا تیری
آنکھیں بری ہی پیاری ہیں ۔ ح میں بڑی ہے، جو بری اور ری سے صحیح تر معلوم ہوتا ہے، ۱۰۰ اس
ہوائی ابر میں ہے خاک جینا بغیر ۔ ہوا و ابر، ۱۰۱ اپنے لب سے ایک بوسہ دے تو میں جیتا ہو جاؤں ۔ ہوں جہاں
۱۰۲ ساغر و صہبا ۔ ساغر صہبا، ۱۰۳ خط ہے یا یہ مصحف رُخ کی تر سے تفسیر ہے، تفسیر ۱۰۴ خندہ سے
منہ کے مسیحا ساقی ۔ مسیحا، ۱۰۶ کرے تو کس طرح تاباں علط الفاظ معنی میں ۔ ۔ مصرع جہاں دیکھا گیا اسی طرح
پایا گیا لیکن، الفاظ اور معنی کے درمیان واو عطف ضروری معلوم ہوتا ہے، ۱۰۸ جس طرح ترے غم میں دن
کاٹتے ہیں بھاری، روتے ہی گزرتی ہے یہ رات مجھے بھاری ۔ ساری، ۱۰۹ جو لیلیٰ گئی اب کے تاباں چمن میں تو حق
اپنے ہیں کا نٹے پھر ہوئیگی ۔ میں فاضل ہے ۔ ۱۱۲ ظالم وفا مری کو تو لیتا ہے کیا حساب اپنی جفا و ظلم کا بھی نرخ
شمار ہے ۔ یہ شعر سوا نسخۂ انجمن کے جہاں دیکھا گیا، اسی طرح دیکھا گیا، ظالم مری وفا کا الخ اپنی جفا و ظلم کا بھی نرخ
۱۱۵ ابرو کا اس کے وصف تکلف سے گر کروں تاباں تو دیکھیو نہ کوئی تیغ میں مجھے ۔ جب تاباں کے سامنے تیغ
کا ذکر ہے ۔ جو دیا میں نہ دے اس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل بہت کی تو نے اس تیغے کی خدمت کو کمر بس کر
۱۱۸ نام فردوس کا سنتے ہوئے سب ہاتھ ملا ۔ ہو یہ سب ۱۱۹ ہی گرتے ہیں کرتی ہے پیدا جینی یہ معشوقی ۔ سد
۱۲۱ بھر بھر پیالوں کے نے زور وہ پڑے ۔ زور؟ ۱۲۲ کیا کروں یا جو ادا کے ہیں اس کا قاتل اب تو تاباں
مرے رنج کے اہر آن نئی ۔ کے میں اس قاتل کا ۱۲۴ ہم مان لیتے ہیں پر ان کی منتیں ساجن اگر لے تو بنا زاں
چڑھائیے ۔ پہراں، ۱۲۵ لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا نہیں ۔ ۔ کیا قدرت تذکرہ میں ۔ ۱۲۷ حسن کی گرمی سے
اپنی آپ تپ کرتا ہے وہ ۔ آپ ۱۲۸ قہر ہے مدام اس کو ہے شوق عرس ہے کہ تاباں ہو کوئی بیگا اس در میں
بناؤں ۔ بنیاد ول؟ اس شعر میں اگر کوئی تلمیح نہیں تو بنیاد ول صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ بنیادی سے کوئی مطلب نہیں
نکلتا، ۱۳۰ کیوں نہ لڑکے اس کے تئیں پیر کہیں شیخ تو رکھتا ہے ڈاڑھی گز بڑی ۔ لیکن تو ڈاڑھی صحیح املا نہیں،
دوسرے لفظ گز بڑی نہیں گز بڑی ہے (سرمایۂ اردو جلال) ص ۲۱۱ ص ۱۰۱ اب تو کی جاتی نہیں اہل دل
کی منتیں، متن، ۲۱ سطر ۶ ہوتی نہیں مجھ کو اس رنج سے کل فرصت، جو تی ہی نہیں ۲۲۲ ص ۲ و ۴ اسی آئینہ میں ہے
مجھے اس طرح بے تابی کر جو سیماب ملی آب ہو مرے عدم آبی ۔ جوں سیماب بے آب ۲۲۵ ص آنزو نیک اپنے تو جیتی
سے خود گم کروں ۔ لے ۔ ۔ تیر تن زر کے ۔ ریا مرا لکھتا ہے ۔ مرا ۲۲۶ ص ۱۰ جیتا ہوں سے ۔ دیکھ کے

کے ہمراہ = پیتے ہیں مے ہم ؟ ۲۹۰ س ۱۲ یوں سے ہی دیتا ہے ہر لحظہ وہ ماہ = دے ہے یاد دیتا ہے ہوس س ۹ بھڑکی اس وقت الفت کی آتش = بھڑکی ہے، ۲۳۰ س ۲ ناصح کی یہ جو ہم کو عالی نہ تھی پسند = جو فاضل ۲۳۰ س ۵ کہتا تھا وہ ہم کو سمجھا کے ہر چند = وہ فاضل، ۲۳۰ س ۶ تھے میکدے سے بھی ہم بس کہ خورسند = ہم فاضل س ۹ کب جانے آئی ہے کیسی یہ آفت = یہ فاضل ص، ۲۲۹ س ۱۱ نہیں ہم سے یک لحظہ ہم کو فراغت = دم، س ۱۵، آپ ہے گلشن میں تو ہوکے یہ مست = آئے جو گلشن میں ہوکے، ۲۳۸ س ۱ اور ۲ ہم ے کدہ کے ہیں مدت سے ساجد ہم شیشہ ے کو ملکتے ہیں مدت سے ساجد ہم شیشۂ مے کو تکتے ہیں سے شام = ہیں مے کدے کے کر فاضل س ۰ زماں کے لئے کو تاباں تو کر کم = خوباں کا ملنا اس ۲۳۶ تا ۲۳۸ تک حافظ کی ایک غزل کی تضمین ہے۔ یہ کثرت مصرعے بحر سے خارج ہیں اگر کاتب کی غلطی نہیں تو مصنف کی غلطی ہے۔ لیکن ایک مشاق شاعر سے ایسی غلطی کا ارتکاب قرین قیاس نہیں) ۲۴۹ س ۵ جنوں کا دست ہوا دشمنی شور ہوا = دشمن ۲۶۰ س ۴ وہ اہل سخن نہیں ہے بادشاہ = بادشا، ۲۶۶ س ۸ کوئی مشل نوارہ کرتا حسرت = کرتا تھا، ۲۶۰ بروے یہ پورچ کھاتے تھے واں = ہوا ۲۷ س ۱۱ یہ ساقی ہو اور مے ہو ابر بہار = ہو ۲۸۰ س ۸ قطع برابر کی محبت کی = یار ہے یاں پلک بھی نہ ہم سکیں جھپکا = جھپکا ج ^{۱۹}⁄_۵ اپنی کیوں کسی کے ساتھ دل اپنا لگائے ہر ہو جائے کا ہے کو عاشق کہائے = کیوں ہر کسی، کے حذف ناں سے مراس ۲۹۲ ص ۲۶۶ بچاتا تھا جب وہ گزے ہولی کی دھوم = کر

یہ اشعار دیوان میں ناکمل درج ہیں۔

۵/۵ پڑھتا ہے دیکھ آیت فاتوبسورۃ (دوسرا مصرع نہیں ہے ہوا تراق نیہ گھنڈر دلف) ۵/۲ غلط سادہ اُبلا ... ہو کیونکر کہ ہو جاتا ہے آخر کے تمیں ، دمی لگا کا عد ۹/۲ مدام ہی مشبک مژگان یار ہے لیکن راس تعدے جسۃ جگر کہ ہم بچا دل لگا جب مارے سب غیر اور طاقت کہاں (دوسرا مصرع نہیں ۔ بھلائے جائے قاتم ۱۹۲ نار تو شعلہ کو لگر ترے اڑے پر جل اٹھے جو اس کی گلی کی طرف مڑے کو ۱۹۵ اس سے مل خواب میں جب میں نے کہا ... کم اس عیش کا اسباب کہیں ہوتا ہے خونی کے کئی شعر ناکمل ہیں۔ ص ۲۶۵ زمیں سے فلک تک ص ۲۶۶ کوئی آباد رہتا تھا کوئی خرچا کرتا تھا نت مرا (۱. کی جگہ یاد ہوگا) ۲۶۷ ممنی خوشتیاب

مشکوک اشعار یا مصرعے

(حاشیہ: ... بجائے ہوا)

۵/۱۲ دیوان ہمارا فوسے تاباں تو دیکھ تو (دیکھ تو کی جگہ دیکھیو ہو سکتا ہے ۔)

۵/۶ پھیلا دیکھ سب کے ذہب کو (حاشیے میں مصلح ہے اور متن میں بھی بھیلا کاتب کی غلطی تو نہیں ؟) ۵/۲۰ بچا ہیں ہمارا یہ ڈاوہ مار رونا (حاشیہ دھاڑ ماح داڑ ڈاہ کہیں کاتب کی غلطی تو نہیں ؟) ۲۶ جو یار آیا ادمیں دو تکا رکھائی

تم اے آنکھیو مری مت پھوٹ بہنا

۳۸/۴ نگہ کی تیغ کی کس کو جراُت ہے کہ ٹھہرا دے ترے سنگ جو عاشق ہی بچا سکتا ہے کیا قدرت ۴۴/۹
شرم سے سر دشکست ہو کے زمین میں گڑ جائے (حاشیے اور ح میں خجل ہے، شکست کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔
۴۵/۴ آتا ہے جی میں کہ کردوں اب وفا کو ترک ۔ ۴۶/۱ دست عدم میں پارۂ دیوانگی ہے اے بجھو بن مجھے تا کہ
کروں میں کہاں کی سیر ۴۹/۴ کوئی پیدا نہ ہوا قاتل و کفار ہنوز ہر سر دہی میں الا سی ہے زنار ہنوز (قاتل کفار
قاتل و کفار کی جگہ، دوسرا مصرع غیر موزوں ہے گو مطلب ظاہر ہے) ۷۴/۱ چاک کرتا ہوں گریباں کو میں ہر بار
ہنوز (گویا کیا؟) ۷۶/۴ کہنے کو مرے دل کے سن اے گلشن خوبی گر ہے تو ترے کو چے یہ فردوس بروں میں ۸۵/۱
براءت ہے عاشق کو ترے روز قیامت ہر روز جدائی میں اسے ہو ہے غنیمت ۸۶/۱ جہاں ہو عاشق و معشوق
مثل حسن اور عشق زیادہ چاہیے باہم ہو دم بدم اخلاص ۹۰/۱ من خبر صیاد کی جس وقت گھبراتی ہیں ریں دیکھ کر
سنتا ہے گل تب عندلیباں کی طرف (ح میں دیں کی جگہ وہ ہے، سوال یہ ہے کہ کیا دیں کوئی لفظ بھی ہے ۹۳/۴
دیکھیے کیا کیا کریگا اب مرا اتمام عشق (حاشیے انجام ح، انجام اتمام غالباً غلط کاتب) ۱۰۰/۹ جو تری آنکھوں
بن ہے کیفیت لے ساقی بہار ایسی کم ہوتی ہے کیفیت شراب ناب میں (شعر موزوں ہے، لیکن یا تو مصرع اول
میں لفظ بہار یا مصرع دوم میں لفظ کیفیت داخل ہے) ۱۰۲/۴ زعفران کی ناگی سے جامن کے تئیں ڈساؤں الٹی ہے
لہرتا باں اگر یہ مرے تن میں ۱۱/۱۰۶ یا پھرے اگلے اس سے دل میرا عشق کا نام مرنا ہاں (یاں کی جگہ گر بہتر ہوگا)
۱۱۰/۴ ہولی جلی قفس میں دعوائے عشق کرکے کس منھ سے ہم چمن میں پھر ان کو دکھائیں گے (ہولی جلی کا مطلب سمجھ
میں نہیں آتا۔ ہولی بولی کی کوئی شکل تو نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ہولے ہولے کی جگہ ہولے ہو) ۱۸۳/۴ چمن میں ہے دل
ہر میوہ دیکھ لو پر خوں مگر خراش یقین بلبلوں کا شیون ہے (لفظ یقین محل نظر ہے، دیوان یقین میں بھی یہ مصرع
نہیں ہے) ۱۹۴/۱۱ مردمی کی جو کچھ قدر اسے ہی نہ رہی پھر نواب بہادر سا جو سردار، ہو وے (نواب بہادر جاوید خاں
خواجہ سرا، ہتیر خاص احمد شاہ کا خطاب تھا۔ مطلب واضح نہیں) ۱۹۶/۴ بید مجنوں جس طرح ہے غم میں مجنوں کے دوتا
سرنگوں اس طرح بھی ہے تیشہ فرہاد بھی (ایک بھی داخل پہلے بھی کی جگہ سے پڑھا جائے تو بہتر ہوگا) ۱۹۸/۴ لگاتا ہے نگہ
کا تیر دل میں جس طرح پیری + ۲۰۱ نمک اک تو دیکھو اس طرح اے ابرو کماں پیری + لطایا خاک میں جن نے مجھ
ہم کو دکھلا کر + کبھی اس راہ ہو آ نکلا وہ سرو رواں پیری۔ ۲۰۵/۴
ر دیکھ نہیں کہ جو ہو لالہ سیتوں گردش نے فلک کی ہائے کیا بیگانہ۔ ۲۲۵ آخری سطر میں شکوہ ترا اگرچہ قیامت
تلک کرسکا + نزدیک اپنے تو بھی میں لے پرخ کم کردوں + جور وجفائے تیرے مرا دل ہوا ہے خوں (مسدس مصرعے
ہیں پہلے اور دوسرے دونوں میں لفظ کردوں قافیہ ہے) ۲۲۱ سطر ۱۲، ۱۳ ایک معشوقوں کو ہے شوق اپنی ...

نگل جائے کہ من یہ کے کبھی دستار + جو کبھی پاؤں میں گرداب کی پھڑکا کے ازار + سب کے تئیں جا کے تراتے ہیں دکھاتے ہیں بہار + ۵۱ پی ایسے کہ جس پاس تھے زر کی بو + جا کٹریں پہلے تو پیچھے جو جو کچھ ان پہ سو ہو ۲۶۱ عجائب خراب کو جانے بے عیب + کہ بے شک ہے اس کے تئیں دست غیب ۲۶۳ وہ دیوان خانے میں جب بیٹھتا + تو دو پیچ منہ دے دے بلا ۲۶۵ کوئی کر کے آغاز ساقی کرام ۲۶۶ سکتا تھا ان میں جو شل حباب ۲۶۷ زمیں تنگ ہے بس کہ ہوتی تھی لال + کبھی صحن خالی ہوں پہ بچھتا گلال ۲۶۰ تو کوئی جام دے لیے بے پے بہ پے ۲۶۲ ہو کے تب فلکیں کبھی ہاتف نے یہ کہ مرے ہے ہے میاں مغفوں کیا ۲۷۳ کہتا ہوں اس سے کہ جن نے (میں اس سے کیا؟) اشعار ذیل دوسرے شاعروں کی جانب بھی منسوب ہیں:-

(۱) رخ جو ڑے پہ تیرے بجلی کناری کی جھمک + برق ساں ابر کے ہوتی ہے نثار دامن، یہ شعر انتخاب دیوان بیدار مرتبہ سید فضل الحسن صاحب حسرت میں موجود ہے، ص ۹ محمود نقر قاسم ہیں۔ جلد ایں یہ شعر بیدار کے نام لکھا ہے ص ۱۲۳ اور اسی جلد کے ص ۱۲۷ اس کے متعلق حاشیے میں یہ عبارت درج ہے: "ایں شعر در دیوان شاہ محمدی بیدار دیدہ شد و زبان زد عالم است کہ از آن عبدالحی تاباں است، واللہ اعلم بحقیقت الحال"

(۲) ایسا کیوں ہر کسی کے ساتھ دل اپنا لگائیے ... ہر بے وفا سے کاہے کو عاشق کہائیے

ہم مان مان آئے ہیں ہر اس کی منتیں ... ساجن گر آئے تو نیاز اس پر چڑھائیے

یہ دونوں شعر خفیف اختلاف کے ساتھ شفیق نے صابر لاہوری کی جانب منسوب کیے ہیں۔ ایک شعر اور بھی اس زمین کا دیا ہے، لیکن وہ دیوان مطبوعہ میں نہیں، شفیق لکھتے ہیں: "بعضے اشخاص ایں جا تحقیقاتے میر صابر را در مولود و غیرہ بنام... تاباں می خوانند محض بیجا است، زیرا کہ آں اشعار از زبان اعزۂ معتبرہ کہ بار ملاقات میر صابر یافتہ اند بہ سمع رسیدہ کہ از مناسبت آں تا مین تحریر در دیوان تاباں ہم دارد" اس کے بعد تین شعر نقل کیے ہیں۔ ج

یہ اگلا یہ غزل موجود ہے، بلکہ ایک شعر اور بھی جو ت میں نہیں ہے۔-

کچھ عیب نہیں ہو دیں دکھانا ثواب ہے ... جیسا کسی پیاسے کو پانی پلائیے

شفیق کے قول سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو ان اشعار (علی الخصوص وہ دو شعر جو شفیق نے نقل کیے ہیں) کی زبان تاباں کی زبان نہیں معلوم ہوتی ہے اور یہ بخوبی ممکن ہے کہ دیوان تاباں میں کسی کے [illegible] سے داخل کر دیا ہو۔

(۳) میخانے میں کیا پھرے ہو شیخ شکل + زاہد عابد سے دور بھی بشکل + قاضی سے ڈرے نہ محتسب کا فر + یہ دختر رز ہے جس سے آگئی:۔ یہ بڑی اعلیٰ درجہ کی رباعی ہے، کئی شاعروں کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ مجموعہ نغز جلد اول ص ۹۰ خفیف اختلاف کے ساتھ منسوب بہ انشا۔ کلیات انشا کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں ہماری نظر سے نہیں گزری۔ [illegible] جلد ص ۱۱۴ پر یہ رباعی بیت قلی خان حسرت کے نام اختلاف کے ساتھ لکھی گئی ہے، حسرت کا دیوان موجود ہے

لیکن ہمیں اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(۲) بیاں میں کیا کروں دیوانگی اپنی کا افسانہ: یہ مخمس سری رام نے (خمخانۂ جاوید جلد ۴ ص ۲۰۳) سودا کی طرف منسوب کیا ہے، آخر کے تین مصرعے خمخانۂ جاوید میں اس طرح ہیں: کبھو جو تلملے میرے ساتھ سودا مجھے طفلاں تجلی اس طرح سے دیکھ کر باہم قہقہہ مار کر رواں کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہے دیوانہ۔ ت ہیں "سودا" کی جگہ تاباں اور تجلی کی جگہ مرے "تیں" ہے۔ کلیات سودا کے مطبوعہ نسخے (نولکشوری) میں یہ مخمس نہیں ہے، کلیات کے کئی قلمی نسخے جو ہم نے دیکھے ہیں، ان میں نہ مل سکا۔ خمخانۂ جاوید میں مخمس کا جو آخری شعر ہے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ غزل تجلی کی ہے اور تضمین سودا کی۔ مزید تحقیق کے لیے ہم نے تجلی کا کلیات دیکھا، لیکن یہ غزل نظر نہ آئی۔ مخمس کے دیکھنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ ایک مستقل مسلسل نظم ہے، جس کسی نے بھی اسے لکھا ہو، ایک بار لکھا ہے، یہ نہیں کہ غزل پہلے لکھی ہو بعد میں اس کو مخمس کیا ہو۔ ہمیں سودا کی جانب اسے منسوب کرنے اور تاباں کو اس سے محروم کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ اشعار دیوان میں نہیں لیکن دوسری جگہ پائے جاتے ہیں:۔

(۱) اے نا انصاف شیریں حیف تو کیا کام فرمائے — بھر کر کوہ کن اپنا عاشق زار و دل ستدار اپنا (ع)

(۲) مضرت ہے تجھے عاشق کے مارے سیتی اے ظالم — کہ ہم تلخی کشتوں کا خون بے شک زہر قاتل ہے (گلشن گفتار)

(۳) کچھ عیب نہیں ہے ورس دکھانا الخ (ع، اوپر لکھا جا چکا ہے)

(۴) سرسبز حنا سے دونا ہوا حسن یار کا + آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا

مرزا علی لطف نے تاباں کے نام سے لکھا ہے، لیکن قایم و میر کے تذکروں میں عشاق کی طرف منسوب ہے۔

دیوان تاباں کا یہ نسخہ ہر صاحب ذوق کے کتب خانے میں رہنا چاہیے۔

کلیم عجم، مصنفہ جناب سیماب اکبرآبادی (مئی کا معیار ملاحظہ ہو)

جناب سیماب نے اپنے خطبات میں غزل کا معیار خود ہی قائم کیا ہے، بہتر ہوگا کہ ان کا کلام انہیں کے معیار سے جانچا جائے، ذیل میں ہم چند ہی اقتباسات درج کرتے ہیں:۔

(۱) ص ۲۳ "اس قسم کی شاعری جس میں تقلید اور غیر فطری جذبات کے زیادہ سے زیادہ جراثیم پائے جاتے ہیں، ایک روحی ذلت، ایک بے اصولی، اور ایک غلط ذہنی تربیت کے ماتحت مروج ہے جس میں عام اور پست نیز قدیم ترین معاشرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں، وصل و وصال، ہم خوابی اور ہم آغوشی، بوس و کنار اور ایسے ہی مخرب اخلاق اور تہذیب سوز مناظر دکھائے جاتے ہیں، پھر رونا یہ ہے کہ یہ موضوعات بھی اس صادق جذباتی کیفیت سے خالی لیے ہیں ظاہر کیے جاتے ہیں جس سے تقلید اور نقالی تو ظاہر ہو جاتی ہے، لیکن حقیقت کا کہیں پتا نہیں چلتا۔"

(۲) ص ۲۵ "غزل کی تعریف میں معاملہ بندی کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے۔ تغزل کا صحیح [illegible]

سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہیے۔ حقیقی تغزل وہ ہے جس کی بنیادیں جذبات لطیفہ پر قائم ہوں اور جس میں رکاکت اور ابتذال کا شائبہ تک نہ ہو۔"

(۳) ص ۲۶ "جب شعر مطلق روحانیت اور ایک زائیدہ الہام چیز ہے تو کیا اس کے حکم کو مادی دنیا میں تمام عالم اور تمام کائنات پر جاری نہ ہونا چاہیے؟"

(۴) ص ۲۰ "ہماری شاعری ماحولی خصوصیات کی حامل ہونا چاہیے، اور زیادہ سے زیادہ فطری۔ ہمارا ہر شعر اپنی جامعیت، اکملیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہونا چاہیے۔ ہماری ہر نظم ضروریات زمانہ کے مطابق، اہل ملک اور فرزندان وطن کے لیے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہیے اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذبات عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں ہمارے نوجوان ماضی حال اور مستقبل کا صحیح ادراک کر سکیں، جو ہمیں تدبیر منزل اور شاہراہ ترقی بتا سکے، اور بلند و لطیف محاکات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کرے۔"

(۵) ص ۳۰ "اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت نہیں رہا، مجازی جذبات وصل و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا، حقیقی موضوعات اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت بھی نہ ملنی چاہیے۔"

(۶) ص ۴۴ "اگر یہ فکری تصویریں ہماری معاشرت اور ہمارے حالات و واقعات کی اصلی تصویریں ہوں تو کیا ہماری شاعری حقیقی شاعری نہیں کہی جا سکتی اور کیا اس میں بلحاظ واقعیت زیادہ اثر و قوت پیدا ہو جانے کا امکان نہیں؟"

(۷) ص ۴۴ "جب تک ہم اپنی شاعری کو مفید، متین، مہذب و با اثر نہ بنائیں گے، جب تک اپنے تغزل میں رفعت، اپنی نظم میں شوکت، اپنے خیالات میں بلندی اور اپنے اورا کات میں ترفع پیدا نہ کریں گے، ہمیں دنیا میں زندہ رہنے ..... میں کبھی کامیابی نہ ہوگی۔"

(۸) ص ۵۵ "اردو شاعری کا بیشتر حصہ ایسے پست خیالات و جذبات کا حامل ہوتا ہے کہ ایک شاعر بیٹا ایک بزرگ باپ اور اپنی محترم ماں کے سامنے اپنے اشعار آزادی سے نہیں سنا سکتا۔"

(۹) ص ۵۶ "مبتدی شعرا غلط محاورے، غلط بندشیں، غلط ترکیبیں استعمال کر جاتے ہیں۔"

(۱۰) ص ۶۰ "ٹکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا ہے کہ زبان کی سالمیت پر حرف نہ آئے گو کہ یہ حقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہش مند ہے، نئے الفاظ، نئے معنی اور نئے اسالیب بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زندہ زبان کے لیے ... مہلک ہے۔"

(۱۱) "بعض لوگ صرف روزمرہ کی ترویج کے حامی ہیں اور متانت خیال و الفاظ کے مخالف۔ وہ ... نہیں چاہتے کہ غزل ... تغزل محض سے تجاوز کرے یا اس کے اسالیب و موضوعات میں فلسفہ و تصوف کی گنجائش ہو۔"

(۱۲) ص ۷۱-۷۲ "میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں فضول خیال کرتا

ہوں، غزل کی ۔۔ زبان گلی، الفاظ منتخب و لطیف، پُرشوکت اور منترنم رہیں، اور خیالات وجذبات بلند پایہ و پاکیزہ ہوں، سادگی کے ساتھ متناسب فارسی تراکیب اگر بے تکلف استعمال کی جائیں تو یقیناً غزل میں بلندی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱۳) ص ۸۰ "جب تک ہم اپنی شاعری کی زبان کو جہلا اور عوام کی زبان سے ممیز نہ کر دیں، ہمیں کوئی تفوق اور امتیاز حاصل نہیں ہو سکتا"

(۱۴) ص ۱۰۱ "اب موضوعات غزل میں فلسفۂ حسن وعشق، عرفان وحقیقت شناسی، اسرار کشائی، درس وپیغام، واردات وجذبات اور محاکات کے علاوہ دوسرے موضوعات کی بہت کم گنجائش ہے ۔۔۔۔ جو کیفیت حقیقتہً ہم پر طاری ہو جو واقعات ہمارے مشاہدے اور مطالعے میں آئیں وہی ہماری غزل کا اصل موضوع ہیں، یہ لازمی نہیں کہ اگر ایک شاعر کسی کے فراق میں مضطرب الحال نہیں ہے، تو وہ فراقیہ اشعار ضرور ہی لکھے ۔۔۔ اس قسم کی ۔۔غزل گوئی نقالی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اور اگر قائل کی حالت اس کے قول کی تکذیب بھی کر دے تو سمجھیے کہ نقل میں بھی نقص ہے"

(۱۵) ص ۱۰۵ "یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگ تغزل کے امتزاج سے بقدر معتدل پیدا ہوا تھا، آگرہ اسکول بھی آج اسی رنگ کا متبع و موید ہے"۔

(۱۶) ص ۱۷۰ "میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو، میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام مناظر کا مرکز وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکز محبت ہو ۔۔ میں خیالات میں تصنع ۔۔ کا حامی نہیں، میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں"۔

غزل کی زبان کے متعلق جناب سیماب کے عمل اور ان کے نظریے میں بہت زیادہ فرق نہیں، ان کی شاعری محاورے اور روزمرے کی شاعری نہیں ہے، جناب سیماب کا دعویٰ ہے کہ آگرہ اسکول میرزا داغ اور میرزا غالب کے رنگ تغزل کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے، لیکن کیا زبان، کیا طرز بیان اور کیا معانی کہیں بھی تتبع داغ کا پتا نہیں چلتا، جناب سیماب کے کلام میں پرشوکت فارسی الفاظ اور تراکیب کی بہتات ہے، اور ہندیت نہ ہونے کے برابر ہے، انھوں نے اپنی زبان کو صرف جہلا اور عوام ہی کی زبان سے ممیز نہیں کیا ہے، بلکہ عام بول چال کی زبان سے بھی علاحدہ رکھا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو صرف جناب سیماب ہی اس کے مرتکب نہیں، آج کل اکثر مشہور غزل گو فارسیت کو ہندیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ غالب دبستان کے جو داغ نے دلی میں اور شاگردان آتش و ناسخ نے لکھنؤ میں فارسیت کے سیلاب کو روک چاہا تھا۔ طرز جدید کے شعرا میں حالی بھی ان لوگوں کے ہم خیال تھے، لیکن بیسویں صدی میں کلام غالب کو وہ مقبولیت نصیب ہوئی کہ فارسیت کا بول بالا رہا اور اس کے آگے ہندیت کا چراغ نہ جل سکا۔

فارسیت کے غلبے سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو ان کی زبان میں دو باتیں قابل اعتراض پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ معتدل فارسی تراکیب کے ساتھ غیر معتدل فارسی تراکیب بھی ہیں، غیر معتدل سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ یا تو فارسی تراکیب

کے قدے جائز نہیں، یا اُردو میں ان کا ورود مناسب نہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ حدوث کی فتنہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا۔

۲۔ انہیں تر تیوں کی قسمیں قسم، یہیں شعوری کا دور قدم قدم۔ کو صد آمیز زدہ کرم، ابھی اور ایک مزار ہے

۳۔ کوئی دیکھے میری وحشت سرکاری ۔۔۔ انہیں کو مانگتا ہوں میں انہیں سے

۴۔ تا کجا ہم انتشار گرد راہ کارواں ۔۔۔ دو قدم بڑھ کر امیر کارواں ہو جائیے

۵۔ آئینہ تحسین نظر گلکاریوں کی راتیں ۔۔۔ کتنی رنگین و مبارک تھیں تعیش کی راتیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ غزلوں میں کثرت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو اخبار نویس بے تامل برت سکتے ہیں لیکن غزل کی نزاکت ان کی متحمل نہیں ہو سکتی آج سے نہیں سیکڑوں برس سے ہمارے یہاں یہ بات شعرا کے مسلمات میں سمجھی جاتی ہے کہ ہزاروں الفاظ جو بجائے خود صحیح ہیں، اور نثر تو نثر قصیدہ و مثنوی میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں، غزل میں نہیں کھپ سکتے، اور ہماری رائے میں کوئی وجہ اس کی نظر نہیں آتی کہ ہم غزل کو اس کی خصوصیت سے محروم کر دیں۔

جناب سیماب ان لوگوں میں بھی نہیں جو غزل کے دائرے کو مثنوی حیثیت سے وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے یہ عذر بھی نہیں پیش کیا جا سکتا کہ نئے معانی کے لیے نئے الفاظ کی ضرورت ہے، مثالیں بکثرت ملیں گی۔ چند ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ یہ نکماپن مجوو دل کا اک انجام ہے ۔۔۔ ۲۔ گر میں تجزیۂ ہر نگاہ کر نہ سکا

۳۔ واقعات عشق کا تھا ایک لمحہ اک صدی ۔۔۔ ہر نفس میں میں نے اک رومان پیدا کر دیا

۴۔ سب مرے انجام پر آمادۂ تنقید ہیں ۔۔۔ ۵۔ انتظام تمنا خراب ہو نہ سکا

۶۔ محبت اک بڑا احسان ہے تاریخ انساں پر ۔۔۔ ۷۔ دل کی تنقید مناسب ہے نہ یوں تیور بدل

۸۔ روایات محبت میں نہ تبدیلی ہوئی اب تک ۔۔۔ ہزاروں انقلاب آتے رہے تاریخ انسانی میں

۹۔ تم نے تو اپنے من کو محفوظ کر لیا ۔۔۔ ہم کس کے ساتھ عمر محبت بسر کریں۔

۱۰۔ دو حقیقی اور فطری نعمتیں ہیں حسن و عشق ۔۔۔ مادیت سے انہیں کیوں کثافت آلودہ کریں

۱۱۔ محسوس میرا ذوق نظر تھا ترے لیے ۔۔۔ تائید عام نے جسے دستور کر دیا

۱۲۔ یہ مطلب ہے کہ تنظیم چمن دشوار ہو جائے ۔۔۔ ۱۳۔ پوچھ اس پاکباز آرزو کا مبلغ الفت

۱۴۔ ایک ہی سا ہے نظام عشق کا ماضی و حال ۔۔۔ میری تجویز وفا ناکام تھی ناکام ہے

یہ عشق کا ذکر ہے یا کسی انجمن میں کسی تحریک کے نامنظور ہونے کا؟

۱۵۔ میری حیرت پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں ۔۔۔ ۱۶۔ ابھی تبلیغ کو کیا تم میخانہ نہیں اُٹھی

۱۷۔ کیجیے اقدام کو نے دوست مٹ کر ہی سہی۔

جناب سیماب نے مجبوراً ، حقیقتہً ، انسبتہً ، رشا ، غلطتہً وغیرہ کو بڑی کثرت کے ساتھ غزل میں استعمال کیا ہے ، ہماری رائے میں غزل میں ان سے احتراز لازم ہے۔

جناب سیماب کی شاعری کا موضوع "عورت یا اس کے متعلقات" نہیں اور نہ ان کی شاعری کا محور ہوس کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ اس کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام مظاہر کائنات وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکز محبت ہو۔ ایک جگہ انہوں نے یہی لکھا ہے کہ "تغزل کو قدرتی طور پر نفسانیت سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہیے" حسن محض اور عشق محض سے جناب سیماب کی کیا مراد ہے؟ اسے انہوں نے سمجھا ہے اور نہ ان کی مدد کے بغیر ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں ، ممکن ہے کہ ان کے اشعار میں شاہد حقیقی سے خطاب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسانوں کا عالم امثال ان کے ذہن میں ہو ، ہماری غرض ان کے نصب العین پر اعتراض نہیں (اگرچہ ہمارے خیال میں مادیت کو غزل سے بالکل خارج کرنے میں وہ غالب کے اس قول کو بھول گئے ہیں۔

" لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا ")

ہمارا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ جناب سیماب کا عمل کہاں تک ان کے نظریے سے مطابق ہے ، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اشعار ذیل میں مخاطبت کس سے ہے؟ یا ان کا موضوع کیا ہے :-

۱- وہ خود لیے بیٹھے ہیں آغوش تو بہ میں   بے ہوش ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا

۲- عشق ہے اک جوش سیلاب جوانی تند و تیز   حسن ہے اک موجۂ رنگین طوفانِ شباب

اس شعر میں حسن عشق کی تعریف کی گئی ہے ، کیا وہی عشق محض ہے ؟

۳- ہو چکا ہوں بارہا عقدہ نزاکت کا شہید   کر چکا ہوں امتحان قوت بازوے دوست

۴- بے ہوس کو ہم کناری و ہم آغوشی نشاط   یعنی اک ہنگامہ ہے اندیشۂ پہلوے دوست

۵- نیند آ آ کر اچٹ جاتی ہے تیری یاد میں   تا و بستر نشتر آغوش ہے تیرے بغیر

(اس غزل کا مخاطب کوئی "غیر محسوس" ہستی نہیں ہو سکتا)

۶- سیماب آدھی رات کو آئیں وہ بے قرار   تیری دعا سے نیم شبی میں اثر تو ہو

۷- یہ آنکھیں ساغر ہے یہ جوانی نشۂ صہبا   خدا رکھے تمہیں تم بھی تو ہو تصویر میخانہ

۸- وہ چاندنی میں نظریں بچا کر ان کے مکان کا طواف مسلسل سب سے چھپا نا راز نہانی ، اے محبت اسے جوانی

۹- وہ ان کا جانا وہ ان کی جھلک کہ وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر وہ ان کا آنا وہ مشکل آنی ، اے محبت اسے جوانی

جناب سیماب کی رائے میں غزل کو رکاکت و ابتذال سے پاک ہونا چاہیے اور اشعار ایسے ہونے چاہئیں جو بہ حیثیت مجموعی ہاں پڑھے جا سکیں ، ہم بلا خوف تردید یہ اعلان کرتے ہیں کہ جناب سیماب کی غزلیں رکیک اور مبتذل مضامین سے یکسر خالی ہیں ، ان کے اشعار میں چند ہی ایسے ہیں جو ایک حیادار نوجوان اپنے والدین کے سامنے نہ پڑھ سکتا ہو یا ترجمہ میں صحیح کا لحاظ

اپنی دوشیزہ لڑکی کے سامنے نہ سُنا سکتا ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ اشعار کا یہ معیار کہاں تک صحیح ہے ؟ اگر ہم اسے صحیح تسلیم کرلیں تو قدیم شعراء میں خواہ وہ کسی زبان کے ہوں دس پانچ کے سوا کسی کا کلیات معتدبہ اشعار کو خارج کیے بغیر نہیں شائع کیا جا سکتا، اور نثر کی ہزاروں کتابوں کا چھپنا بالکل بند کر دینا پڑیگا، کہنا یہ ہے کہ اس معیار کے ساتھ ساتھ جناب سیماب غزل میں "فطرت" اور "واقعیت" کے بھی خواہاں ہیں، اس کی بحث آگے آئیگی

جناب سیماب غزل میں بجا طور پر تقلید اور نقالی سے متنفر ہیں، ان کے نزدیک شاعری واردات قلبی پر مبنی ہونی چاہیے۔ کسی مضمون کو محض اس لیے باندھنا کہ شعرا باندھتے چلے آتے ہیں، محض لغو اصول ہے، ہم جناب سیماب کی توجہ اشعار ذیل کی طرف مبذول کراتے ہیں، اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی انہوں نے "آپ بیتی" بیان کی ہے:-

۱- "مجھ سے پہلے کوئی جلوہ [illegible] گرد دل نہ ہوا ... یہ وہ منصب ہے جو موسیٰ کو بھی حاصل نہ ہوا"

کیا واقعی وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقام حضرت موسیٰ کے مقام سے آگے ہے ؟ اگر نہیں تو یہ شعر محض قدما کی تقلید میں کہا گیا ہے۔

۲- "آئے ہو دینے دعوتِ دار و رسن ہمیں ... جب ہم نے ترک شیوۂ منصور کر دیا"

ہمنے تو نہیں سُنا کہ جناب سیماب نے کبھی انا الحق کا دعویٰ کیا ہو، بہ کثرت اشعار اس قسم کے ہیں، بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ جدید خیالات ان کے یہاں بہت کم ہیں، اور انہیں ان کے ادا کرنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ذیل میں ہم پرانی طرز کے چند کامیاب اشعار درج کرتے ہیں، اس کے بعد چند ایسے اشعار نقل کریں گے جن میں شاعر نے جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

طرز قدیم:- دل کھینچا جتنا قفس میں آشیانے کی طرف ... دور اتنا ہی قفس سے آشیانہ ہو گیا

تو تھے ترے فضل و کرم کو بیشتر دیکھا ... مجھے شرم آ گئی جب اپنا دامن مختصر دیکھا

نیاز عشق کو آزاد قید رنگ و بو پایا ... جنوں کو بے نیاز بندش دیوار و در دیکھا

ترک مدعا کر کے کیا بتائیں کیا پایا ... ہم نے ساری دنیا کو حسب مدعا پایا

کہے کم فرشتوں کو چین تو ملا دل کا ... آپ کی محبت میں آدمی نے کیا پایا

شکستہ پا ہوں شریک اپنے کارواں میں نہیں ... مرے نصیب کی گردش بھی آسماں میں نہیں

جنوں کی نذر سالانہ کا ساماں دیکھ لیتا ہوں ... بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہوں

۱۹۱۹ء سے قبل کا کلام:- میں تمہارا نہیں تو کس کا ہوں ... دل تمہارا نہیں تو میرا ہے ؟

ستم زدوں پہ گراں تھی ہوا زمانے کی ... جھکی تو ہیر نہ اٹھی شاخ آشیانے کی

بنکویں دل میں پیکاں آپ کا کیا بن کے رہتا ہے ... محبت بن کے آتا ہے تمنا بن کے رہتا ہے

شرم بسمل کی ہے قاتل ترے اوسان کے ہاتھ ... ہاں ذرا تول کے تلوار ذرا تان کے ہاتھ

وضو کرتے ہیں مے سے خشت خم پر سر جھکاتے ہیں ... یہ رند اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناتے ہیں

خلوصِ دل سے سجدہ ہو تو اُس سجدے کا کیا کہنا وہیں کعبہ سرک آیا جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

جدت کا نمونہ :- وہ زور نظر بن کر برسات میں آتے ہیں منظور ہے بوندوں کو پروانہ بنا دینا

مات کا جانا وداعِ شیشہ و پیمانہ تھا صبح کا آنا زِ تھا قفلِ درِ میخانہ تھا

دو ہی انگارے تھے ہاتھوں میں خدائے عشق کے ایک کو دل ایک کو میرا کلیجا کر دیا

ہیں تبسم میرا تارے کہکشاں انگڑائی ہے ہر شب ہستی میں ہے میرا ہی سامانِ شباب

جناب سیماب کی رائے میں شعر "زیادہ سے زیادہ فطری" اور "موضوع کے لحاظ سے مکمل" ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک "شعر میں جب تک واقعیت نہ ہو، اس میں اثر و قوت پیدا ہونے کا امکان نہیں"۔ شاعر کو "ہمارے حالات و واقعات کی اصلی تصویریں کھینچنی چاہییے"۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مقدمۂ حالی کی صدائے بازگشت ہے، یا جناب سیماب اردو والوں کے سامنے نیا پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ شعر کی خالص روحانیت کے متعلق جناب سیماب کے اقوال دیکھ کر ہماری حیرت اور بڑھ جاتی ہے کیا کوئی شاعر سوسائٹی کی مکمل تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے جو مادیات کے وجود کا قائل ہی نہیں، یا کم از کم اشعار میں انہیں کسی وجہ سے یک قلم نظرانداز کر دینا چاہتا ہے؟ جناب سیماب بظاہر اُن لوگوں میں ہیں جو "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" کے مصداق ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں زمانہ مدارس کی استانیوں اور اہل فن دونوں کو بہ یک وقت خوش رکھنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ اگر ان اشعار کی مدد سے جو ہم نے اس تبصرے میں نقل کیے ہیں نہ ہو سکے، تو ناظرین "کلیم عجم" کا خود مطالعہ کریں۔

جناب سیماب کے خیال میں "شاعری کو ماحولی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے"۔ دوسرے لفظوں میں شاعری میں مقامی رنگ گہرا ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں ان کا تغزل ان کے قول سے بالکل مختلف ہے۔ قیس و لیلیٰ، فرہاد و شیریں، طور و کلیم تلمیحات سے دیوان بھرا پڑا ہے :-

جہاں میں قابلِ تعقید تھی طرزِ فغاں میری پپیہے نے بالآخر یاد کر لی "پی کہاں" میری

اس قسم کے اشعار دیوان بھر میں دو تین سے زیادہ نہ ہونگے۔ اگر یہ اشعار نکال دیے جائیں، اور دیوان کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے تو آسانی سے اسے کسی ایرانی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے :-

وہ جبا قیس کی فرہاد کا وہ جادۂ تنگ دشت و کہسار نے دیکھے ہیں گریباں کیا کیا

نجد کے ہرنوں سے اعجازِ محبت پوچھیے پڑ گئی جس پر نگاہِ قیس لیلیٰ ہو گیا

کبھی برقِ تجلی کوند کر موسیٰ تو شکوہ کیا تماشا تھا یہ اندازِ تمنا رہ گیا ہو کر

جناب سیماب نے شعر کی افادی حیثیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ شاعر اگر وہ حقیقی شاعر ہے تو کل مشکلوں کو حل کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کے لیے محض متنبی یا مصور ہونا کافی نہیں، اسے صاحب فکر بھی ہونا چاہیے۔ اس مسئلے کی مجموعی حیثیت سے قطع نظر کر کے کہ شاعر کے لیے صاحب فکر ہونا ضروری ہے یا نہیں ہم اس مسئلے پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ جناب سیماب کس حد تک

فلسفی یا صاحب فکر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے چند اشعار منتخب کرتے ہیں جن میں ان کے مختلف خیالات اور فلسفیانہ معتقدات منظوم ہوئے ہیں۔

۱۔ "تھا وہ بعید کہ دنیا مجھے بھی پرستی | میں تو بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا"

۲۔ "اس کی ہستی وہم ہستی وہم اور پستی بھی وہم | نام ہے انسان ایک مجبور اوہام کا"

۳۔ "میرا ہی ایک جلوہ نادیدہ حسن تھا | اپنی ہی اک ادا پہ رہا میں مٹا ہوا"

۴۔ "ہم نے خاک میں مل کر منصب فنا پایا | اے اجل بتا تو نے ہم کو کھو کے کیا پایا"

۵۔ "جسم بکھرتے ہیں صرف خاک ان ہونے کے بعد | جمع پھر ہوتے ہیں ذرے رائگاں ہونے کے بعد"

۶۔ "تھی آشکار سے خیال سے کوئی آنکھ بزم مجاز میں | ہوں وہ آئینہ جو ہے نا تمام ابھی ذہن آئینہ ساز میں"

۷۔ "مکمل جانی ہوئی حدوں سے نگاہ کو وسعتیں عطا کر | تمام عالم وطن ہے تیرا اگرچہ تیرا وطن نہیں ہے"

۸۔ "خرابِ فرو عمل ہو نہ جائے اے سیماب | اے جناب رسالت مآب دیکھیں گے"

۹۔ "اے خاک کے پتلے تجھے ادراک نہیں ہے | کچھ اور بھی ہے تجھ میں فقط خاک نہیں ہے"

۱۰۔ "انجام ہر اک شے کا بجز خاک نہیں ہے | کیا ہے جو یہ عالم خس و خاشاک نہیں ہے"

۱۱۔ "تیری دنیا ہی دنیا ابھی گر مطمئن ذہن دنیا نہیں ہے | کاوش زندگی، کاہش مرگ کا کچھ نتیجہ بھی ہے یا نہیں ہے"

۱۲۔ "پھول کا گلزار کا، باغ و گلبدار کا، علم انساں کو کسی کا نہیں ہے، پھر بھی اس جلوہ گاہ پر اسرار کا کوئی راز آشکارا نہیں ہے"

۱۳۔ "سب یہ جلوے ہی جلوے تو ہیں ہر طرف ہیں حجابات اوہام بالائے جتنے پڑے ہیں ان میں سر پردہ کوئی حائل چشم بینا نہیں ہے"

۱۴۔ "زندگی کو ہے ادراک مقصود اگر قید ہستی سے آگے گزر جا | زندگی کے ظواہر پہ نقد و نظر فلسفہ زندگی کا نہیں ہے"

اگر کوئی شخص کوئی ایسا نظام فلسفہ جس کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے غیر مربوط نہ ہوں، ان اشعار سے نکال سکتا تو ہم اس کی طباعی پر اسے مبارک باد دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ فکر کی گہرائی سے جو فلسفی کے لیے ضروری ہے جناب سیماب قطعاً محروم ہیں۔ انسان کی حقیقت، فطرت سے اس کے تعلق، انجام حیات انسانی، علم انسانی وغیرہ کے متعلق جن خیالات کا انہوں نے اظہار فرمایا ہے وہ محض دوسرے شعرا کی تقلید میں ہے، اور ان مسائل پر انہوں نے کافی غور نہیں کیا۔ شعر کیا ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے قلم سے نکل سکتا ہے؟ اور شعر کیا ایک وطن پرست کا نتیجۂ فکر ہو سکتا ہے؟

جناب سیماب کے بعض اشعار یا تو واقعی قابل اعتراض ہیں یا ہماری سمجھ میں اچھی طرح نہ آئے، ہم انہیں درج ذیل کرتے ہیں۔ جناب سیماب یا کوئی اور صاحب ہمارے شبہات کو دور فرمائیں تو بڑی عنایت ہو گی۔

(۱) "یہ ضابطہ ثواب کیسا یہ دونوں تیری ہی نفیس ہیں | اختیاری کرم ہے تیرا اضطراری عتاب تیرا"

یہ شعر سب سے پہلی غزل کا ہے جس میں اول سے آخر تک خود ان فطرت سے خطاب ہے۔ اسی پہلے اور دوسرے مصرعے میں

نظر نہیں آتا۔ دوسرے مصرعے کا مطلب غالباً یہ ہے کہ تیرے کرم اور عتاب پر میرا اختیار نہیں، اگر عذاب و ثواب، دونوں شاعر کی نظر میں نعمتیں ہی ہیں، تو پھر اختیار نہ ہونے کی شکایت کیسی؟ البتہ ربطی سے قطع نظر کر کے بھی دونوں نعمتوں کو ان الفاظ میں مخاطب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) " یہ جو کہتا ہے المدد شیخ بول اٹھا احمد — نکتہ رس دو زن تھے آپس میں جھگڑا ہو گیا "

(۳) طور موسیٰ، دل طائف، چمنستان خلیل — یادگاریں ہیں تری جلوۂ جاناں کیا کیا

(۴) کہیں راز جذبات الہام ہو تم

' المدد' کس زبان کا لفظ ہے؟ 'دل طائف' سے کیا مراد ہے؟ الہام کا جذبہ کیسا ہوتا ہے؟

(۵) قفس سے چھٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانا ملا — خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ ملا

'ٹھکانا' صحیح املا ہے، اسے ہائے مختفی سے لکھ کر 'آشیانہ' کا قافیہ نہیں بنا سکتے۔

(۶) " خلاف رسم دنیا جو شمار عشق ہوتی ہے — وہی اک بات رہ جاتی ہے قانون وفا ہو کر

شمار مذکر نہیں، مونث ہے۔ اگر 'بات' کو 'ہوتی ہے' کا فاعل مانا جائے تو الفاظ کی نحوی ترتیب قابل اعتراض ہے۔

(۷) " نہ ابتداؤں کسی کی نہ انتہاؤں میں — بس ایک خواب سحر ناتمام ساہوں میں

دونوں مصرعوں میں ربط نہیں معلوم ہوتا، شعر کا مفہوم واضح نہیں۔ شاعر کا یہ قول کہ 'وہ نہ کسی کی ابتدا ہے نہ انتہا' بے معنی سا ہے اور اگر اس کا کوئی مفہوم ہو تو اسے دوسرے مصرعے سے کیوں کر تقویت مل سکتی ہے؟

(۸) " تنہ و تنگل کا جگل قابل تصویر ہے" قابل تصویر یا تصویر کھینچنے کے قابل؟

(۹) انہیں ترتیبوں کی تھیں قسم، یونہیں تھوڑی دیر قدم قدم، کہ صد آرزو زدہ کرم، ابھی اور ایک مزار ہے"

اس شعر میں 'قدم قدم' محل نظر ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ 'چند قدموں' پر لیکن یہ مطلب 'قدم قدم' سے حاصل نہیں ہوتا۔

(۱۰) " جتنے پروانے جلے فنا ہو چکے، کرا انہیں زندہ اور پوچھ ان سے، دیر میں جس کے پرتو کی ہے روشنی کیا وہ شمع کلیسا نہیں ہے"

دیر و حرم، کعبہ و کلیسا میں تقابل ہے، دیر و کلیسا کو شعرا نے قریب قریب ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مضحفی کا مصرع ہے

" فائدہ کیا ہو جو سے شیخ حرم، راہب دیر"

(۱۱) " سکوں نہ پر مجنوں نہ شاب ہو نہ سکا — شگفت دو سر گل کامیاب ہو نہ سکا"

شگفت کو مذکر کی جگہ استعمال کیا ہے، اس کی سند مطلوب ہے۔

(۱۲) " چمک جگنو کی برق بے اماں معلوم ہوتی ہے — قفس میں رہ کے قدر آشیاں معلوم ہوتی ہے"

خیالی خطروں سے ڈرنا، اور قفس میں رہ کے آشیاں کی قدر معلوم ہونا، ان دونوں میں کوئی ایسی عجیب انگیز نہیں، دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ دونوں میں ربط کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

شاعر نے بتلایا ہے ایک طائر کی نفسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جو اسیری کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک طائر اپنے آشیانہ میں تھا، اُسے آشیانے سے کسی خاص محبت کا احساس نہ تھا، اسیر ہونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ آشیانہ کس قدر عزیز تھا، اب اس کی زندگی قفس میں گزرتی ہے، اور اپنی جان کا بالکل ڈر نہیں، لیکن بجلی تو بڑی چیز ہے، جگنو بھی چمکتا ہے تو وہ خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ کہیں آشیانے کو جلا کر خاکستر نہ کر دے۔ اگر شاعر کے ذہن میں یہ مطلب تھا، تو ہماری رائے میں الفاظ سے ادا نہیں ہوا۔

(۱۳) "چمن کے حادثے کو دن گزر گئے اب بھی — چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے"

آشیانے کو جلا ڈالنے والی بجلی اور آشیانہ طائر کے ذہن میں ایک ہو گئے ہیں، یہ خیال الفاظ سے اچھی طرح ادا نہیں ہوا۔

(۱۴) "ترقی پر ہے روز افزوں خلش درد محبت کی — جہاں محسوس ہوتی ہے وہاں معلوم ہوتی ہے"

"معلوم ہونا" نمایاں ہونے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، ورنہ شاعر کو نفسی حیثیت سے محسوس و معلوم میں فرق بتانا پڑیگا۔ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ درد محبت کی خلش ایسی چیز ہی نہیں جو نظر آئے، اور اگر بالفرض ایسا ہو تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ خلش ترقی پر ہے۔

استفسارات

(۱) میرزا غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں کتب ذیل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں اگر کسی صاحب کے علم میں یہ کتابیں کہیں موجود ہوں تو براہ کرم براہ راست یا معیار کے ذریعے سے مجھے مطلع فرمائیں۔ جن کتابوں کے سال طباعت دیے ہوئے ہیں وہ کتابیں نظر سے گزر چکی ہیں، ان کے خاص نسخے مطلوب ہیں:-

۱- دستنبو، مطبوعہ مفید خلائق آگرہ ۱۸۵۸ء
۲- دیوان اردو مطبوعہ مطبع احمدی جان دہلی ۱۸۶۱ء (۱۲۷۰ھ)
۳- نامۂ غالب مطبوعہ دہلی ۱۸۶۵ء
۴- سبد چین مطبوعہ دہلی (۱۲۶۳ھ ؟)
۵- دیوان اردو مطبوعہ مفید خلائق آگرہ ۱۸۶۳ء
۶- محارقۃ النثر از سید مقصود عالم پھلواروی نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۶۶ء
۷- مثنوی دیغ الباطل
۸- مثنوی خطاب فاضل
۹- پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۴۹ء

بیتی پرشاد، ڈاکخانہ لنکا، بنارس

(۲) "دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار — گلچیں نگاہ تو ز داماں گلہ دارد"
"در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا — نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد"

یہ اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کیے ہیں۔ کلیات قدسی کے دو قلمی نسخے دیکھے، نہ یہ اشعار ملتے ہیں۔ نہ اس زمین کی کوئی غزل۔ فارسی اشعار کے ایک مطبوعہ مجموعے میں یہ اشعار مشرقی کے نام نظر آئے، مقطع کا ایک مصرع یاد ہے: "اے مشرقی از وضع تو جاناں گلہ دارد"

اگر کسی صاحب کو اس کا تحقیقی علم ہو کہ یہ غزل کس کی ہے، تو مجھے مطلع فرمائیں۔ ممنون ہونگا۔

عبدالودود

اشاریہ

قاضی صاحب کی تحریریں

تحقیقات : میر تقی میر ۱۴۹/۱۸۸ • سکندر اور ضاحک ۳۴۳/۳۴۴ • تاریخ وفات بھمن خاں، ۲۶۲ • سال وفات حاتم ۱۸۱/۱۸۲ • سال وفات آبرو، ۴۳/۴۴ • دیوان راغب (نسخۂ خدا بخش) ۳۱۷/۳۳ • سال آغاز تذکرہ ہندی ۳۴۳/۳۴۴ • دریائے لطافت کا سال تصنیف ۲۱۰ • دریائے لطافت ۷، ۵۳/۵۸، ۳۶۱ • حصۂ عروض مصنفۂ قتیل ۱۹۸، ۳۱۶، ۳۶۱

تبصرے : • ندیم (بہار نمبر) ۸۶/۸۸ - • نیرنگ خیال (سالنامہ) ۱۲۱/۱۴۴ • ادبی دنیا (سالنامہ) ۱۲۵/۱۲۶ • زمانہ (حالی نمبر) ۱۲۳/۱۴۴ • ساقی (جاپان نمبر) ۱۱۳، ۱۱۴ • ہمایوں (سالگرہ نمبر) ۱۳۳/۱۳۵ • شاہکار (سالنامہ) [illegible] • مساوات (سالنامہ) ۲۷۱ • ادب لطیف (افسانہ نمبر) ۲۲/۲۳ • دیدۂ حیرت (ڈھاکے کا ایک گلدستہ) ۲۷۲ • (سالنامہ) سہیل ۳۳۵/۳۴۴ ۳۶۱

= دیوان تاباں ۳۶۹/[illegible] = کلیم مجسم ۲۴۳/۲۴۸، ۳۷۵/۳۸۴ = خطبات گارساں دی تاسی (مترجمہ داس مسعود وغیرہ، مرتبہ عبدالحق) : دی تاسی، عبدالحق اور شیخ چاند کے اغلاط ۲۳۳/۲۳۸ = نکات الشعرا (مرتبہ عبدالحق) (توصیفی تبصرہ) ۹۲/۹۴ = دریائے لطافت (مرتبہ عبدالحق و مترجمہ کیفی) ۷۹/۸۲ = دیوان معروف دہلوی (مرتبہ عبدالماجد بدایونی) : تصحیح متن ۶۸، ۱۱۴، ۱۳۴، ۱۹۴، ۲۴۸، ۳۰۷

■ سحر بنگال (طاہرہ دیوی شیرازی) ۸۷/۸۸ ■ افکار عصری (گبسن - مترجمہ نصیر عثمانی) ۹۰/۹۱

■ حبش اور اطالیہ (مرتبۂ اختر حسین رائپوری) ۹۱

▲ یوسف الدین بلخی کا مضمون، "ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد" : تعارف ۱۳۹ ▲ معین الدین دردائی کا مضمون "حیدرآباد کے کتب خانوں میں اردو کی بعض قلمی مثنویاں" : تصحیح ۳۶۱

مختلف مباحث : ترتیب متن : اس روش پر تنقید کہ "قلمی نسخہ صحیح ہو یا غلط مکمل ہو یا ناقص، کاتب کے حوالے ... اب کاتب جانے اور کتاب ... ؛ اس سے تو دیوان کا پردۂ گمنامی میں پڑا رہنا بہتر ہے" ۹۹، ۱۷۱ • "ترتیب متن میں اغلاط پائے جائیں، تو ان کی درستی کی فہرست [illegible]

• 'اغلاط طباعت و کتابت کی تصحیح کے لیے غلط نامہ چھاپنے کی روش' ۲۸ • 'عرفی و غالب' سے متعلق بعض غیر ضروری مباحث پر لکھنا ناممکن ہے' ۲۷۵ • اُردو کے بہترین شاعر: انیس، میر اسد غالب کے علاوہ حالی اور اقبال بھی' ۲۵۲ • بعض الفاظ کے بارے میں عندلیب شادانی سے اختلاف یا اتفاق: نوشتہ (اتفاق ہے تو یادداشت)، کراہیت (اختلاف ہے)، ترجمہ (اعتراض نہیں)، تبادلہ (مبادلہ ایکسچینج - تبادلۂ ٹرانسفر کے لیے)، سوچنا، اکیلے (اتفاق ہے)، قبلہ گاہ (اختلاف ہے)' ۲۴۲ • نصیر احمد عثمانی کے ایک ترجمہ برقاطیسی (= الیکٹرو میگنیٹک) کا تعریف' ۹۱ • قلمی کتابوں کے تحفظ اور فہرست سازی کے بارے میں چند سطریں' ۲۵۷ • ایک فروگذاشت: 'سالنامہ سہیل' کا حسن ترتیب اور اس کی قدوقامت اسے دوسرے سالناموں سے ممتاز کرتی ہیں 'معیار' کا تبصرہ ان خصوصیات کو اچھی طرح نمایاں نہ کر سکا جس کی اس فروگذاشت کا افسوس ہے' ۱۳۹ • یہ بیدل کا شعر ہے اس کا کیا ثبوت ہے کہ

سر اوپر حب کوئی نہیں تو دشمن آپن کیس ÷ پٹنہ نگری چھاڑو ہن اب بیدل چلے بدیس' ۳۵۷

— بیدل کا عظیم آبادی ہونا' ۲۴۱، ۳۵۸ — بیدل کے استاد ۳۵۸ • سلیمان شکوہ کے بارے میں چند سطریں (ذیل 'ادبی مضامین') ۲۶۱ • امیر مینائی کے بارے میں (۹ سطریں) ۱۴۲ • غالب و ذوق کی 'فردوں کے کتبے' (ذیل 'ادبی مضامین') ۱۵۶، ۱۵۷

• مصنف اور مترجم: 'مصنف بے چارے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے اور ان کی دماغ سوزی کی داد اس طرح دی جاتی ہے کہ بعض تراجم کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا' ۱۲۵ • اسلام اور عورت: نجم الدین جعفری کے مضمون مطبوعہ نیرنگ خیال پر تبصرے کے ذیل میں) ۲۶۲ • آل انڈیا اورینٹل کانفرنس: کیا یہ صرف ہندو تہذیب سے متعلق و مخصوص ہوگی' ۱۰۷ • ہندو سوسائٹی کے تقاضوں کی طرف صدر اورینٹل کانفرنس کا رویہ' ۱۰۷

معیار میں مندرجہ ذیل رسالوں کے مضامین کا ذکر اقتباس یا ان پر تبصرہ چھپا:
شاہکار، شاعر، الناظر (لکھنؤ)، ہمایوں (لاہور)، ندیم (گیا)، تنویر (کراچی)، العصر (اورنگ آباد)، نیرنگ خیال (لاہور)، ادبی دنیا (لاہور)، ادب لطیف (لاہور)، نگار، الحمد، سہیل (علی گڑھ)، جامعہ (دہلی)، الیم (دہلی) کنول [illegible]

زبان و ادب: • دریائے لطافت: کیفی کے ترجمہ پر تنقید ۴۸/۴۹ • دیباچہ لطافت حصہ منطق، مصنفہ قتیل ۱۹۸/۱۹۷ • استفسارات: مصنف مغل اور انشاء کے نیر حسین خیال کے چند اعتراضات بشکل استفسارات ۲۰۷ • اردو کے بعض تاریخی ماخذ: ابواللیث صدیقی کے مضمون مطبوعہ سہیل، پر تنقید ۲۲۶/۲۲۸ • 'پنجاب میں اُردو': انتظام اللہ صدیقی کے مضمون (مطبوعہ 'کنول' اکبر آباد) کے اغلاط ۱۳۲/۱۳۴ • بہار در اردو شاعری: معین الدین دردائی کے مضمون (مطبوعہ سہیل علی گڑھ) کے اغلاط، ۲۳۹-۲۴۴ • میر بلگرامی اور دریائے لطافت ۵۳/۵۵ • ملا نخشبی دعا کے بارے میں (آرزو جلیلی کے مضمون مطبوعہ 'ادبی دنیا' کا ذکر کرتے ہوئے) ۲۳۱ • دیوان جوشش ۴۶/۴۷، ۲۱۰ — اشتہار: کہ دیوان عنقریب شائع ہو جائے گا ۳۴، ۳۸ کے میر کمال علی کمال کی مثنوی اُردو کے اقتباسات 'ندیم' گیا سے منقول (مع تبصرہ) ۱۲۸ • مکتسباب ملا: ابوظفر ندوی کے مقالہ کے اغلاط (مطبوعہ 'ندیم' بہار نمبر ۳۵ء پر تبصرہ کے ذیل میں) ۸۶/۸۷ • شیخ چاند کے اغلاط خطبات گارساں دتاسی کے حواشی ۲۲۷/۲۲۸ • دتاسی کی تعریف میں ۲۳۳/۲۳۴ • دتاسی کے اغلاط ۲۳۳/۲۳۴ • دیوان دوم معروف (قلمی) ۱۹۷/۱۹۸

عملی تنقید: سیماب اکبر آبادی کی شاعری پر • معروف (الٰہی بخش) کے رنگ کلام پر ۶۸ (پہلا پیراگراف)

مختلف کتابخانوں کی قلمی کتابوں سے حاصل شدہ نوادر:

غالب: • غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں بعض مطلوب کتابیں (استفسارات) ۳۸۴ • غالب نے قدسی کی طرف جو شعر (دگر دارد) منسوب کیا کس کا ہے (استفسار) ۳۸۴ • رباعی شیخ علی حزیں (فارسی) ۱۱۲ • رباعی مہاراجہ رام نرائن موزوں ۲۵۴ • شرف جہاں قزوینی کا ایک شعر (فارسی) ۱۱۲، ۳۶۱ • کلام سلیمان شکوہ ۱۱ (۲۷۶ تعارف) • کلام راقم شاگرد جرأت ۳۱۱ (۲۷۶ تعارف) • کلام طالب رام پوری ۳۱۱، (۲۷۶ تعارف) • مثنوی میر حسن ۱۲ - مشتملات میر حسن 'ترکیب تضمین' ایجاد میر حسن ۱۱۲ - مثنوی میر حسن در تہنیت عید ۲۴۳ (۲۵۶، ۲۷۶ تعارف) • مثنوی در صفت شہر جواہر - از میر حسن ۲۵۱، ۳۰۵ • بیہاقی کے مرآۃ الاحوال کے ایک اور نسخے کی روشنی میں بعض تصحیحات ۳۶۱

مثنوی میر حسن در تہنیت ... غزل آصف الدولہ وجواب شمس النساء بیگم ۱۱، ۱۰۲ • ... ایک غزل ۱۱۳ • کلام دل عظیم آبادی ۱۱۲ • کلام ...

• غزل میرزا غالب دکھوں یا دکہوں، ماخوذ از دیوان مرتب) ۹۰ • غالب کا ایک غیر مطبوعہ ماخذ
از تذکرۂ سرور ۳۳/۱، ۳۳۹ • غالب کے دو لطیفے (پنج آہنگ) ۳۳/۱۲ • پنج آہنگ کا ایک قدیم ایڈیشن کا
تعارف) ۲۲۲/۲۲۳، ۲۷ • تذکرۂ سرور اور غالب ۳۳۵ • سراپا سخن اور غالب ۳۲۴ • پنج آہنگ
۲۷ بعد سرلین • میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار: احسن الاخبار بمبئی ۱۸۴۴ کا اقتباس ۲۹۵

انجمن ترقی اردو: انجمن ترقی اردو کی تنظیم جدید کے سلسلے میں (اداریہ) ۲۵۰
• انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی "اردو" کی خدمات پر ۳۰ • انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار ص ۲۸۴ کے بعد
(ٹائٹل کی پشت پر) • انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار کی ایک شاخ ۲۷۴ • لاہور کی ایک انجمن: انجمن اردو
پنجاب: کیا انجمن ترقی اردو سے اس کا الگ رہنا مناسب ہے؟ (اداریہ) ۱۹۳، ۲۵۰ • اردو کی
جانب گاندھی جی کے معاندانہ رویہ پر تبصرہ (اداریہ): پس چہ باید کرد: اردو کے مسائل سے انجمن
کیسے نبٹے: ایک کانفرنس کے لیے ضروری مسائل کی تفصیل (اداریہ) ۲۵۰ • اردو کا مسئلہ ۱۳۸
متحدہ ہندوستان کا خواب، گاندھی جی کانگریس کی پالیسی اور اردو ۱۳۸۔

زبان کا مسئلہ: اردو ہندی ہندوستانی ۲۵۰ • اردو کا مسئلہ، گاندھی،
عبدالحق ۱۳۸۔

لسانیات: بہار کی اردو شاعری: تبصرہ ۲۳۹/۲۴۴ • اردو کے بعض تاریخی ماخذ
(ابواللیث صدیقی کے ایک مضمون پر تبصرہ) ۲۲۶/۲۲۸ • گیارھویں صدی کی اردو کا نمونہ: بہاء کے
عمادالدین قلندر کی طرف منسوب رسالہ مراۃ المستقیم معروف بہ سید عادستہ کے بارے میں ایک نوٹ
۶۲-۶۳ • یہ رسالہ تمام عمادی کی تحقیق پر مبنی ہے جسے معیار نے شائع کیا ایک شبہ کا ازالہ اعتراضات
• نورچشمی سید رضا قاسم کے جواب میں) ۲۹۴ • چند اعتراضات (عندلیب شادانی ۲۳۳) •
زبان کے بارے میں کے جواب میں ۲۱۳/۲۱۴ • دریائے لطافت، حصہ منطق، نوشتہ قتیل، مصطلحات
علمیہ کو ٹھیٹ ہندی میں ترجمہ کرنے کی پہلی کوشش ۱۹۸/۱۸۱

اشخاص: آغا شاعر کی نظم پر چند سطری تنقید ۲۷۰ • **آرزو جلیلی** ــ کلیات
علی بخش دعا پر آرزو جلیلی نے ادبی دنیا ۱۰ فروری میں لکھا ہے، ۲۲۱ ــ 'ادبی دنیا' جنوری ۳۵ء
میں مطبوعہ جلیلی کے مصطلحاتِ علمیہ کی تعریف' ۹۰ ــ راسخ کے حالات لکھ رہے ہیں، کلیات کا انتخاب بھی
شائع کرنا چاہتے ہیں' ۲۶۶ ــ آرزو جلیلی کے مضمون 'اندر سبھا' کے بارے میں' ۲۵۷ • **ابو بکر**
شیث فاروقی سفیر حسین شاہ حقیقت کی قلمی کتاب 'ہشت بہشت' ترجمۂ ہشت بہشت' دریافت
کی ہے' ۱۸۶ • **اختر حسین رائپوری**: مبلغانہ رنگ پر اعتراض ــ بشیر احمد میاں، ۱۲۵ •
اختر کی نظم پر دو سطری تنقید' ۲۷۰ • **ایم اسلم** کے افسانہ پر تبصرہ' ۲۷۱ - ۲۷۲ • **پریم**
پجاری (عندلیب خادانی) ادر عروض' ۵ • **تمنا عمادی** (سید حارستہ، خلیل خانقاہ عمادیہ
سے ملا' ہم نے اپنے شبہات (خدشے) سے انہیں آگاہ کر دیا ہے • **تمنائی**: "پیلیاس اور
میلسانڈ" میٹرلنک کے ڈرامے کا ترجمہ جناب تمنائی نے کیا جو ان کے مقدمے کے ساتھ 'ادب لطیف'
میں چھپ چکا اور کتابی صورت میں چھپ رہا ہے • **تاجور نجیب آبادی** کی شاہکار کے سالنامہ
پر تبصرہ کے ذیل میں، خاصی تعریف)' ۲۷۰ • **جارج پنجسم** کی وفات' ۱۰۵
جوش ملیح آبادی پر ۱۲۱؛ ۱۲۴/۱۲۵ • **جوش** (سلطان حیدر) ــ افسانے کی تعریف ۲۳۹
حبیب الرحمن (حکیم) ــ "ثلاثۂ غسالہ' کشف الظنون کے طرز پر لکھ رہے ہیں" انجمن
سے شائع ہوگی ــ حکیم صاحب نے بہار میں شعرا کی فہرست بھیجی ہے جن کا کلام 'نتیجۂ سخن'
میں ملا ہے، یہ ستمبر کے 'معیار' میں شائع ہوگا" (ستمبر کا معیار کبھی نہ نکلا!)' ۲۰۰ • **حجاب امتیاز**
علی کے بارے میں' ۱۲۲ • **حسن عسکری** (سید) ــ 'دیوان ہمایوں' دریافت
کیا ہے ۱۸۶ • **خیال** (ریاض حسن خاں) دیوان معروف کی تصحیح میں ان سے مدد ملی ہے۔
حسن کی مثنوی کی قیاسی تصحیح میں جناب اجبال سے مدد ملی" ۲۵۰ • **خیال** (نصیر حسین)
ــ مصنف 'مغل اور اردو' سے چند استفسارات گویا اعتراضات' ۲۷ • **دردائی** (معین الدین)
ــ ان کے مضمون 'حیدرآباد میں قلمی مثنویاں' میں بہت سے اشعار غلط معلوم ہوتے ہیں ۱۱۹ ــ
ــ ذاکر صاحب ('درد سہیل') کی تعریف ــ مطبوعہ سالنامۂ سہیل' پر تبصرہ کے ذیل میں ۲۳۹ • **رشید**
احمد صدیقی (سہیل پر تبصرہ کے ذیل میں) کی تعریف ۲۳۸ ــ (نیرنگ خیال پر تبصرے کے ذیل میں) ۱۲۳

• راجندر پرشاد کے خط کے طویل اقتباسات [illegible] راشد الخیری (مرحوم) ۱۰۶، $\frac{۲۶۶}{۲۶۹}$ •
راموں میر یا دل وال انگاں کی وفات ۱۰۶ • سجاد انصاری کی تعریف (’سہیل‘ پر تبصرہ
کے ذیل میں) ۲۳۸ • سلیمان ندوی (’سید‘) پر ۸۶؛ ۱۳۵ • سیدین
(خواجہ غلام السیدین) — کے مضمون حالی کی مصلحانہ شاعری‘ کا طویل اقتباس، ۱۲۷
”سالنامہ شاہکار کے طبعزاد افسانوں میں خواجہ غلام السیدین کا افسانہ ’قانونی مجرم‘ خصوصیت
کے ساتھ قابلِ داد ہے۔ خواجہ صاحب نے غالباً افسانہ نویسی کے میدان میں حال ہی میں قدم رکھا ہے
لیکن انداز کہنہ مشقوں کا ہے‘ ۲۷۰ • عبدالحق : اولین پرچے میں تصویر (ص ۸ کے مقابل)
نوٹ ۸۰ — اللہ پر تنقید‘ ۲۳۶ — • عبدالحمید (حکیم) ؛ ذوق کی قبر بنوائی ہے ۱۸۶
• عبدالستار صدیقی کے مضمون (ادبی پہیلی) کی تعریف ۲۳۹ • عرش گیاوی، منیر احمد (م جولائی
۳۶) ۲۷۸ • عرشی (امتیاز علی) — نوابان رامپور کے نام‘ غالب کے خطوط کی جمع و ترتیب
میں لگے ہیں، ۸، ۵، ۱۳۸ • فرحت اللہ بیگ : ان کے افسانے کی تعریف ۲۷ • صولت عظیم آبادی
(چند سطریں) $\frac{۱۱۳}{۱۱۴}$ • عندلیب شادانی کے ’چند اعتراضات اور ان کے جوابات‘ $\frac{۲۶۴}{۲۶۵}$؛ $\frac{۲۱۰}{۲۱۴}$؛ $\frac{۲۰۲}{۲۱۴}$ • طاہرہ دیوی
شیرازی : کیا یہ مؤلف کی ذہنی مخلوق ہیں (’سحر بنگال‘ پر تبصرہ کے ذیل میں) $\frac{۸۳}{۸۸}$ • فلک پیما کی
تعریف ۱۲۴ • فیاض محمود کی غیر معمولی تعریف ۱۲۴ • قاضی عبدالودود :
انجمن کے لیے دیوانِ جوشش، مثنویاتِ مصحفی اور تذکرۂ میر حسن ایڈٹ کر رہے ہیں ۱۱۲ • کپلنگ کی وفات‘
۱۰۵ • منصور احمد : ان کی کتاب ’دنیا کے بہترین افسانے‘ دوسری بار آرہی ہے ۱۱۲ • مہیش پرشاد (مولوی)
۲۷۶، میر علی کی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں ۱۱۲، • نظام الدین (ابو الکلم) تصویر؛ مضمون انگریزی
میں لکھا تھا۔ ہم جناب بیگ کے ممنون ہیں انہوں نے ہماری درخواست پر اس کا ترجمہ کر دیا ۲۴۴ • وحید مرزا : خسرو
کی ہندی شاعری (اقتباس : ماخوذ از حالات و تصانیف خسرو مصنفہ وحید مرزا)، $\frac{۲۴۳}{۲۴۴}$ • وصی احمد
بلگرامی کے بارے میں ماہے‘ ۸۷–۸۸۔

مقالات : جن کا خصوصی نوٹس لے کر ان کا خلاصہ‘ ۱۹۳۶ء کے ادبی
مضامین‘ مطبوعاتِ جدیدہ‘ یا ’عالم ادب‘ کے عنوانات کے تحت درج کیا گیا :

• آرزو جلیلی، کلیاتِ دعا، ۲۲۱ • آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میسور کے مقالات کی فہرست

۲۳۵/۲۳۶ • ابوالليث صديقی: اُردو اور اس کے بعض تاریخی ماخذ ۲۲۷/۲۲۸ • احمداللہ (حکیم سید)
میر صاحب کی اصلاحیں ۲۳۱ ؛ بیدل عظیم آبادی ۲۵۰ • اسحاق الم (محمد) : چغتائی صاحب سے
ایک استفسار ۲۳۰ • اعجاز حسین : جدید اردو شاعری کی خصوصیات ۲۵۸ • افسر امروہوی:
مصحفی کا قیام دہلی ۱۰۴ — منور خان غافل لکھنوی، ۲۳۰ • انتظام اللہ صدیقی ؛ یورپ میں اردو کے
• تاجور نجیب آبادی : تاریخ اردو زبان ۱۳۳ • تبسم (صوفی غلام مصطفیٰ) : غالب کے اُردو کلام کی چند
نمایاں خصوصیات ۱۳۳/۱۳۴ ؛ غالب کا تصورِ حسن و عشق ۱۳۳ • تمکین کاظمی : اُردو کا پہلا گلدستہ
جسے ایک خاتون نے جاری کیا • تنہا ، محمد یحییٰ : قربان علی بیگ سالک (خلاصہ) ۲۵۷ • جان
نثار حسین اختر ملیگ ابن مضطر : مضطر خیر آبادی ۲۲۸ • حسن نظامی : مرقد غالب و مرقد ذوق
کے بارے میں ۱۸۶ ، ۲۵۹/۲۶۰ ؛ ذوق کا حلیہ ، غالب کا حلیہ ۲۵۹ • حمید عظیم آبادی : شاد و صفیر
۲۵۸/۲۵۹ • دردائی (معین الدین) : بہار اور اُردو شاعری ۲۲۸/۲۲۹ ؛ ۲۳۹ • ذاکر حسین : حالی
محبِ وطن کی حیثیت سے ۲۲۹ • راشد (ن۔م) : اردو ادبیات پر غالب کا اثر ۹۹/۱۰۰ •
رضا قاسم (سید) : اُردو کے یورپین شعرا ۲۲۱ • زور ، سید محی الدین قادری : اُردو کے
آغاز اور ماخذ کے بارے میں بعض غلط فہمیاں ۲۵۸ • زین العابدین : قصۂ رضوان شاہ ، ۲۶۱
• ساغر جعفری : اُردو شاعری پر ادب انگریزی کا اثر ۲۲۹ • سجاد انصاری : روز جزا
(ڈراما) ۲۲۸/۲۲۹ • سیدین (خواجہ غلام السیدین) : حالی کی مصلحانہ شاعری ، ۱۲۹ • سیماب
اکبر آبادی : سحر معنی - غلام امام گویاموی ، م - ۱۹۴۳ء کی مثنوی ، ۱۳۲ •

• شاغل رہ سید شاہ عطاء الحق شاغل فریدی بہاری) مضطر علیہ الرحمۃ ، ۱۰۱/۱۰۲ • طٰہٰ
اشرف (سید محمد) : اردو نثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصّہ ۲۵۸ • عامر عباس (میر محمد) :
اُردو کی تاریخ اور حالت (: اُردو سے ہندوؤں کی نفرت پر مناظرانہ مقالہ) ۲۲۹ • عظیم بیگ
چغتائی : میر انیس و فردوسی (انیس کے بہت سے اشعار فردوسی کے ہوبہو ترجمہ ہیں) ۲۲۰
• عبدالحق : — سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ بنگلور یونیورسٹی ، ۹۰ — گلدستۂ رنگین و سعادت یار خان
رنگین کا مثنوی ، ۹۰ — ایک ہندی شعر اور اردو شعر پر مولانا حالی کا محاکمہ ، ۹۰ — خطبۂ صدارت خیر پور اُردو
انجمن حمایت اسلام لاہور ، ۱۴۱/۱۴۲ • عبدالرؤف (حافظ سید) ، میر کمال علی شاہ المتخلص بہ کمال

اوران کی مثنوی اردو، ۱۳۰/۱۳۲ ● عزیز احمد : غدر سے پہلے کی اردو شاعری پر ہندستانی تمدن کے زوال کا اثر، ۹۷/۹۸ ● عشرت لکھنوی : جان عالم ۲۶۱ ——— جلیس ماضی ۱۲۷/۱۲۸ — تعلیم اردو ۲۳۲
● غوث (محمد)، کتبخانہ دفتر دیوانی حیدرآباد میں کرناٹک کی تاریخ کے مخطوطات، ۱۲۰ ● قادری (حامد حسن) اُردو شاعری کے ادوار پر، ۱۰۲ ● قاضی عبدالودود : کلام جوشش عظیم آبادی ۲۱۰
● کیفی (دتاتریہ) تاریخ اردو کا مطالعہ، ۹۸/۹۹ — غالب کی شخصیت اور اردو ادب میں اس کا مرتبہ، ۲۶۰ ● مجیب (محمد): ہندستانی ڈراما ● مرتضیٰ حیدر نقّاد (سیّد) : مصنف سیرالمتاخرین کی آل و اولاد، ۲۳۱ ● مسعود حسن رضوی: دیوان افسوس، ۲۵۸ ● نظام الدین، ابوالحلم :
خطبۂ صدارت شعبۂ اسلامیات، آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، ۱۸۷/۱۹۰ ● نیاز احمد ترمذی : لاہور قدیم کا علمی و ادبی حلقہ، ۱۲۸ ——— عہد شاہجہانی کا علمی و ادبی حلقہ ۱۲۹/۱۳۰ ● ہندستانی اکیڈیمی میں جو مضامین پڑھے گئے، ان کی فہرست ۱۱۱/۱۱۲ ● وقار عظیم : شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر، ۱۰۱
● ولی الرحمٰن (شاد) : غالب و اقبال، ۱۰۲/۱۰۳ ● یاس یگانہ چنگیزی : خواجہ آتش، ۹۸
● یوسف حسین خاں : نظام الملک کے آبا و اجداد ۲۵۸۔

شعر/مصرع کا استعمال: اقبال کے شعر/مصرع کا استعمال، ۲۷۵
ع "جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے" ۲۷۵ ● غالب کے شعر/مصرع کا استعمال: ۳
ع "ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے" ● حسرت موہانی کا شعر ۱۲۴ فارسی اشعار کا استعمال ۱
ع سپردم بتو مایۂ خویش را + تو دانی حساب کم و بیش را۔

یوروپی ادب و شخصیات کے حوالے: اناطول فرانس کا ایک قول (دو سطر) :
فائدہ کی بات: ۲۷۵ (کتابوں کے لکھنے سے کرم سکتے' کی کاشت کرنا زیادہ فائدہ مند ہے ۳ ● پیرلوتی ۱۲۲ ● جون میسفیلڈ ۱۰۵ ● فرانک ورانش یو برآئس، ۳۰ ● ارسل پروست، ۳۱ ● جورج ایلیٹ ۸۳
● ڈورژساں ۸۳ ● پیرلوئی ۸۳ ● پیرآزاں ۸۵ ● موپاساں ۸۵ ● دولٹرپیٹر، ۸۰ - فرائڈ ٹیرینگٹ
ادب کے بارے میں : ادب کی وسعت (اسکوپ): اس قدر وسیع جس قدر انسانی زندگی ؛ ادب کہ سکتا ہے انسان جیے، ۳ ● ادب کی اہمیت قومی زندگی میں ۳ ● تخلیق حسن، تبلیغ عقاید سے زیادہ مقدم ● ادب کا دوسرے علوم سے ناگزیر واسطہ : نفسیات، فلسفہ، تاریخ، ۶ ● تخلیقی ادب کی اہمیت ہے، ۶ ● ہم کس قسم کے

ادب کے خوابان ہیں : (i) اجتہاد کو تقلید پر ترجیح ، (ii) قواعدفن منزل من السماء نہیں (iii) غلبہ یافتہ جماعتوں کو ادب کو اپنی اغراض کے تابع بنانے کی کوشش کرنی چاہیے (iv) ، فن کار کی آزادی ۳ • اہم الفاظ صنعت کار (= فنکار)، ۳ • ذوقیات ومعنویات، ۳

ادبی تنقید • تنقید میں توازن کی مثال : دیوان تاباں، مرتبہ عبدالحق پر تبصرہ ۳۶۹/۳۷۰ • پنڈت کیفی کے ترجمہ دریائے لطافت پر، ۹، • سحر بنگال، از طاہرہ دیوی شیرازی پر تبصرہ ۸۳/۸۵ • خالص ادبی تنقید کی مثال از سیماب کے دیوان کلیم عجم پر تبصرہ ۳۷۵/۳۸۴ • قاضی صاحب کی ۱۹۳۶ء کی طرز انشا کے لیے : ضروری گزارش : پہلا پیراگراف (پہلا پرچہ)، الف معروضات، ۳ — ریڈیو ڈیکیلنگ ۱۰۵/۱۰۶ • ہجو ملیح / طنز (سید سلیمان ندوی پر) ۸۶ • روش املا : ہمزہ لکھنا صحیح نہیں (ہوے، ہوی، کیجیے، چاہیے، لیے میں)، پہنچا (نہ کہ 'پہونچا') • ہاے مختفی لکھنا صحیح نہیں (انگریزی یا ہندی لفظ کے اختتام پر) اغلاط مونث نہیں مذکر ہے : ۲ • اعلام کا ترجمہ کرنے کی روش : عجائب خانہ برطانی ۴، • **تحریر پر انگریزی طرز فکر کا اثر** ، راموں کی وفات ۱۰۴ /۱۰۵

افسانے : • ایک ہونہار نوجوان (طبع زاد افسانہ) ۲۷۹ • واپسی (افسانہ، از ولیم گرہارڈی — ترجمہ) ۲۸۴ • عیاریاں (افسانہ، از د- دجیکبس، ترجمہ) ۲۸۸ • کیتھرین یا رد (تمثیل / ڈراما، از مورس برنگ — ترجمہ) ۲۹۸

'معیار' کے بارے میں : • اندرونی ٹائیٹل پیج پر : انجمن ترقی اردو بہار کا رسالہ (= ایک آدھ بار 'شاخ پٹنہ' کا رسالہ بھی لکھا گیا) • قواعد معیار، (جو ہر پرچے میں پابندی سے چھپتے رہے) : اولین پرچے میں : ۱۳۶ کے بعد • ضخامت کی اسکیم یوں تھی کہ چھ ماہ ۱۱۲ صفحات اور چھ ماہ ۴۲ صفحات : ۱۱۳ • مرتب قاضی عبدالودود ، معاون : محمد شرف عالم آرزو جلیلی • جولائی - اگست ۳۶ ء مشترکہ شمارہ کا اداریہ، ۲۷۶ • 'معیار' کی زبان پر دوسروں کی تنقید کا جائزہ ، ۲۷۵ • 'معیار' کے تبصروں پر دوسروں کی تنقید کا جائزہ ، ۲۷۵ • معیار کا تعارف : معیار کی ترتیب کی اسکیم ۷/۸ (۱) مستقل عنوانات : معروضات ؛ اقتباسات ؛ استفسارات ؛ آثار ادبیہ ، غالب ، اوراق پارینہ ؛ ہماری زبان ، مطبوعات جدیدہ ؛ محکمہ (ہمبنی فورم) ؛ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین ، عالم ادب • (۲) افسانے ، طبع زاد یا تراجم ؛ تمثیلیں ؛ نظمیں مختصر ؛ حال کی غزلیں

شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے]؛ مقالات، تصاویر) ۶۴ • رسالہ کی کامیابی کے لیے چار ضروری عناصر۔ (اولین پرچہ میں : 'ضروری گزارش کے عنوان سے) — اوّل : نکالنے والے، جو سرمایہ لگا سکیں۔ دوم : مرتبین — جن میں علم کے ساتھ صحیح قوتِ نقد ہو۔ سوم : قلمی معاونین چہارم : خریدار، جن میں صحیح ذوق پایا جائے۔

• 'معیار' کیوں نکالا گیا (معروضات) ۳ — " 'معیار' کی پہلی جلد مکمل ہو گئی اس میں ۴۸ صفحوں کی کمی ہے، جو اسی سال پوری کر دی جائیگی۔ ہمیں افسوس ہے کہ معیار ابتدائے اشاعت ہی سے وقت پر شائع نہیں ہو رہا ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ ستمبر کا پرچہ ستمبر میں نکل جائے اور ہر ماہ وقت پر شائع ہوا کرے۔ اگست کا پرچہ بجائے ۱۱۲ کے ۱۲۰ صفحات پر شائع ہوگا۔" (لیکن ستمبر کا معیار پھر کبھی نہ نکلا اور آخری پرچہ ثابت ہوا)

• 'معیار' کے غلط نامہ شائع کرنے کی روش پر تنقید کا جائزہ ۶ ۲۷۵ –

اشتہارات : (۱) مطبوعات شاد بکڈپو پٹنہ (۲) دیوان جوشش : عنقریب شائع ہو جائیگا (۳) اصلاحیہ بک ڈپو، پٹنہ

••

دوسرے مضمون نگار

مصنف وار اشاریہ :—

آرزو جلیلی : سکوت (تمثیل، از میتر لنک)، ۳۰ • مثنوی مادرِ ہند، از شاد عظیم آبادی پر تبصرہ ۸۸ • اشعارِ میر، مرتبہ عبدالمنان بیدل پر تفصیلی تبصرہ ۱۱۹ • اشعارِ مومن، مرتبہ عبدالمنان بیدل پر تفصیلی تبصرہ ۱۱۹ • میترلنک کے خاموش ڈرامے، ۷۹ • بدگمانی (مولیئر کے ڈرامے کا ترجمہ) ۱۷۰ • حسن رائگاں (موپاساں کے افسانے کا ترجمہ) ۱۴۸ • میکسم گورکی: تعزیتی نوٹ، ۲۷۸ • اندرسبھا کے متعلق چند غلط فہمیاں، ۳۵۰ • علی بخش دعا (ادبی دنیا میں شائع شدہ مضمون کا خلاصہ) ۱۴۳/۱۴۲ • سیماب اکبرآبادی کے مقدمہ "مادرِ ہند" مصنفۂ شاد پر تنقید ۸۸/۸۹ -

• اعجاز حسن خاں : امیر مینائی اور ان کی یادگار ایک مرقع ۱۴۰ • میرے خاندان سے تعلقات، کی تفصیل مع تذکرہ ۱۴۳/۱۴۲ ● اعجاز بستوی : گوتمی کے پلاٹ یا ترجمہ پر اعتراض (۴ سطریں) ۳۱۶ بیدل (عبدالمنان) : نظام الدین کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ۳۲۴ ● پریم پجاری = عندلیب شادانی ● تماشائی = قاضی عبدالودود ● تمنائی (انور احمد): سانپ (الیبرونڈ پرس کے افسانہ کا ترجمہ) ۹ ● قمر (عبدالحفیظ) : ندیم (بہار نمبر) پر تبصرہ، ۱۱۵ ● دیہات کی جھونپڑی (چخوف کے افسانے کا ترجمہ) ۱۶۸ • محکمۂ تعلیم کی درسی کتاب میں مضحکہ خیز اغلاط، ۱۳۶ • سید سلیمان ندوی کے "ندیم" میں ایک بیان پر اعتراض، ۱۲۵ ● حبیب الرحمٰن (حکیم) : بنگال کا پہلا گلدستہ "نتیجۂ سخن" ایک بہاری کا ادبی کارنامہ، ۳۲۹ ● حسن عسکری (سید)، صوبہ بہار میں قلمی کتابوں کے ذخیرے، ۲۵۵ ● حسن نظامی : مرقدِ غالب اور مرقدِ ذوق (اقتباس)، ۱۸۶ • حمید عظیم آبادی : معرکۂ شاد و صفیر (ندیم میں شائع شدہ مقالہ کا خلاصہ)، ۳۵۸، ۳۵۹ • خیال (ریاض حسن خاں): ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں "کو" کا استعمال، ۳۶۶ — دیوان معروف میں تصحیح مزید، ۳۶۰ • دردائی (معین الدین) : حیدرآباد کے کتبخانوں میں اُردو کی بعض قلمی مثنویاں ۲۰۲ • بہار اور اُردو شاعری "سہیل" میں شائع شدہ مضمون سے بعض کام کی باتیں ۲۲۸/۲۲۹ • راجندر پرشاد (بابو): ہندی ساہتیہ سمّیلن کے خطبۂ صدارت کے طویل اقتباسات، ۲۲۶، ۲۴۷ ● راشد (ن-م) اسعد ادبیات پر غالب کا اثر ("ادبی دنیا" کے مضمون کا خلاصہ) ۹۹/۱۰۱ • رضا قاسم : "نورچشمی" صرف عورت ہی کے لیے یا مرد کو بھی لکھ سکتے ہیں؟ ۳۴۴ • سید حسن : سالنامۂ "ادبِ لطیف" پر تبصرہ ۱۴۶

• سیدین (= خواجہ غلام السیدین): حالی کی مصلحانہ شاعری

(جلوۂ کلیم' دہلی سے طویل اقتباس) ۱۱۹ • سنہا (سچدانند): خطبۂ صدارت ہندستانی اکیڈمی (خلاصہ) ۱۱۱
• شمس الدین احمد: دیوان ہمایون بادشاہ' ۳۱۳/۳۱۵ • ط • اشرف (سید محمد): اردو نثر کے ارتقا
میں ارباب بہار کا حصہ (۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین کے ذیل میں 'نذیم' میں شائع شدہ مقالہ کا خلاصہ) ۳۵۸
• عبدالحق: تصویر، ۸ — خطبۂ صدارت انجمن اسلام (اقتباسات) ۱۹۱/۱۹۲ — بھارتیہ ساہتیہ پریشد
کی حقیقت (اس میں خصوصی زور اردو کی طرف گاندھی جی کے غیر ہمدردانہ رویہ پر ہے)' ۲۱۷/۲۲۵ • عبدالستار
صدیقی: 'جز' اور 'جزو' کی بحث ۳۶۲/۳۶۶ — ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں 'کو' کا استعمال' ۳۶۴/۳۶۶
• عرشی (امتیاز علی): غالب کے تین خطوط (غیر مطبوعہ)' ۱۵ • عروج قادری (سید احمد):
غمکدہ (افسانہ از منفلوطی: ترجمہ)' ۲۵/۲۹ • عزیز احمد: غدر سے پہلے کی اُردو شاعری پر ہندستانی
تمدن کے زوال کا اثر (خلاصہ)' ۹۷/۹۸ • عطارد = قاضی عبدالودود • عندلیب شادانی: خسرو
کی شاعری پر تنقید (وحید مرزا کی کتاب حالات و تصانیف خسرو کے ایک باب پر)' ۲۱۴ —
معیار کی زبان: الفاظ، تراکیب اور طرق استعمال پر تنقید ۲۱۲/۲۱۳ — معیار کے مضمون نگاروں کا
استعمال کردہ تلفظ الفاظ و محاورات (نمونتہً: کراہیت از جہ بمعنی حال۔ تبادل بمعنی مبادلہ، سونچنا
بمعنی سوچنا، اکیلے بجائے اکیلا، قبلہ گاہی)' ۲۶۴ — ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں 'کو' کا استعمال ۳۶۶
— شکست پندار (نظم)' ۴۲ — شملہ کی برکھا (نظم) ۱۴۶ — تیغ ۲۷۴ — انقلاب روزگار (نظم) ۲۴۴
• مخمس مصحفی، غزل آصف الدولہ، مثنوی میر حسن (شائع کردہ قاضی عبدالودود) کے متن کے بارے
میں ۲۱۱/۲۱۲ • ق ۔ و = قاضی عبدالودود • 'مبتدی' = قاضی عبدالودود • 'متعلم' = قاضی
عبدالودود • مجیب (محمد): مکتوب بنام گاندھی جی (جو جواہر لال نہرو نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد
کے ناگپور اجلاس میں پڑھ کر سنایا' اور مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون میں نقل کیا) ۲۲۲/۲۲۴ • 'محرر ادیب' =
قاضی عبدالودود • منصور احمد: گوتی روبنین کے افسانے کا ترجمہ)' ۱۷/۲۴ • نظام الدین (ابوالکلام محمد):
آل انڈیا اورینٹل کانفرنس شعبۂ اسلامیات کا خطبۂ صدارت ۱۸۶/۱۹۰ — ایران جدید کے ادبی اور عرفانی رجحانات'
۳۳۲/۳۴۲ • وحید مرزا: اختر کی شاعری ۱۴۴/۱۵۰ • یوسف الدین احمد بلخی باطن: ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد
(ماخوذ از مرآۃ الاحوال مصنفہ بہبہانی)' ۱۴۳/۱۵۰ • 'ہ' = قاضی عبدالودود۔

معیار کے لکھنے والے

● **آرزو جلیلی** محمد شرف عالم: مجالا (ضلع دربھنگا) کے رہنے والے تھے۔ والد جلیل صاحب وکیل تھے۔ آرزو سائنس کالج کے فزکس کے لکچرر تھے۔ یہ اور وہ دونوں کل ہند اُردو کانفرنس کے موقع پر عبدالحق صاحب کے لئے بہت سی چیزیں بہار شریف سے لائے تھے نمائش کے لئے۔ ڈاکٹر رشید (تاریخ۔ بی، این کالج) اور قاضی مجاہد الاسلام ان کے اعزہ میں ہیں (عسکری صاحب کی زبانی)۔

● **اعجاز حسن خاں**: رسول پور کے زمیندار اور ریاض حسن خاں خیال کے بھائی تھے 'معارف' میں اکثر لکھتے تھے۔ امیر مینائی کے خاندان کی تصویر قاضی صاحب کو انھیں سے ملی تھی۔ ان کے والد امیر کے شاگرد تھے۔ امیر بہار آتے تو انھیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ امیر کے متعدد خطوط ان کے نام سے ہیں۔

● **پریم پجاری** = عندلیب شادانی۔

● **تمنائی** (زبیر احمد): "زندہ چین" کے مصنف "تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے' وہاں چندے انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے۔ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں اور اب ٹائپ رائٹر کی تجارت میں لگے ہوئے ہیں۔

● **حکیم حبیب الرحمٰن** (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۴۷ء) ڈھاکہ کے معروف ادیب' طبیہ کالج ڈھاکہ کے بانی' حکومت سے شفاءالملک کے خطاب یافتہ، قومی تحریک میں شمول کے بعد خطاب واپس کر دیا۔ مساجد ڈھاکہ، ڈھاکہ اب سے ۵۰ برس پہلے، شعرائے ڈھاکہ، آسودگانِ ڈھاکہ کے مصنف؛ بنگال کے مصنفوں پر 'ثلاثہ غسالہ' مرتب کی تھی، معلوم نہیں چھپی کہ نہیں۔ ہفتہ وار 'المشرق' اور ماہنامہ جادو (ڈھاکہ) کے ایڈیٹر رہے۔

● **عبدالحق**: (م ۱۹۶۱ء) اُردو کے معروف ادیب اور انتھک مجاہد، متحدہ ہندوستان میں اور اس کے بعد پاکستان میں انجمن ترقی اُردو کے ناظم اعلیٰ۔

● **عبدالستار صدیقی** (۱۸۸۵ء۔۱۹۷۲ء) الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر تھے۔ عربی فارسی اور اُردو کے مسلم الثبوت عالم تھے، اُردو کے تین چار مستند محققوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ زبان اور املا کے مسائل پر انہیں استناد کا درجہ حاصل تھا، ہندوستانی اکیڈیمی کا رسالہ 'ہندستانی' بھی عرصہ تک ان کی نگرانی میں نکلا۔ مسلم صدیقی، ان کے صاحبزادے ان کی یادگار ہیں۔

• عبدالحفیظ ثمر: چھپرہ کے وکیل عبدالماجد صاحب کے بیٹے، عسکری صاحب کے شاگرد تھے۔ ہائیکورٹ کی مسجد کے متولی تھے۔ (عسکری صاحب کی زبانی)

• عندلیب شادانی (وجاہت حسین) (م ۱۹۶۹ء): رام پور میں پیدا ہوئے، فارسی کی اعلیٰ تعلیم اورینٹل کالج لاہور میں پائی اور لندن یونیورسٹی سے پی ایچ، ڈی کیا۔ تقریباً نصف صدی ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے جہاں وہ صدر شعبۂ فارسی و اُردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے منصب پہ فائز تھے اور استاذ الاساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔ پُرگو اور خوش گو شاعر تھے، ناقد اور محقق تھے۔ فارسی اور اُردو پر یکساں عبور تھا۔ 'تحقیقات' 'دورِ حاضرہ اور اُردو غزل گوئی' اور 'نشاطِ رفتہ' (کلام) ان کی چند کتابوں کے نام ہیں۔

• عروج قادری (سید احمد): آجکل جماعت اسلامی کے ماہنامہ 'زندگی' کے ایڈیٹر ہیں۔

• سید حسن عسکری: (پ ۱۹۰۱ء) تاریخ ازمنۂ وسطیٰ کے معروف مورخ۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے منسلک رہے۔ رٹائرمنٹ کے بعد پٹنہ میں قیام ہے۔

• سید رضا قاسم: مختار تھے، عسکری صاحب کے ہم محلہ تھے۔ یعنی گولکپور میں رہتے تھے، ادب کا اچھا ذوق تھا۔ (عسکری صاحب کی زبانی)

• سید حسن ایم اے: سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، اب پٹنہ ہی میں قیام ہے۔

• حافظ شمس الدین منیری (۱۸۹۶ء ۱۹۷۵ء): پٹنہ یونیورسٹی سے ام، اے بی، ایل۔ مظفرپور میں اُردو فارسی کے اور کٹک میں قانون کے استاد رہے۔ ۱۹۲۷ء میں اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے پٹنہ کالج آئے اور صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے ۱۹۵۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ فروری ۱۹۷۵ء میں انتقال کیا کلام کا مجموعہ 'گلبانگ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے

• ریاض حسن خاں خیال (۱۸۷۸ء-۱۹۵۳ء): اعجاز حسن خاں کے بھائی۔ موضع رسول پور ضلع مظفرپور کے رہنے والے تھے اور داغ کے شاگرد تھے۔

• معین الدین دردائی: علیگڑھ یونیورسٹی کے ریٹائرڈ، بہار شریف کے رہنے والے، علیگڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کی تصانیف میں 'جلوے' اور 'تاریخ تصلیف فرقہ دسیہ' قابل ذکر ہیں۔ ماہ اپریل ۱۹۷۹ء کو انتقال ہوا۔

• منصور احمد : پنجاب کے مشہور ایڈیٹر اور ادیب۔ اُس وقت ادبی دنیا کے ایڈیٹر تھے۔ 'ہمایوں'، 'شاہکار'، وغیرہ کی ترتیب میں شامل ہے۔ کلکتہ طبیعی سے قریبی تعلق تھا۔

• مہیش پرشاد : صدر شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، خطوطِ غالب کے مرتب۔

• عبدالمنان بیدل : سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، حال مقیم پٹنہ

• ڈاکٹر نظام الدین (حیدرآباد) : عربی و اسلامیات کے فاضل عثمانیہ یونیورسٹی اور دائرۃ المعارف سے ملازمت تک وابستہ رہے۔ قاضی صاحب کے کیمرج کے ساتھیوں میں تھے دسمبر ۱۹۶۸ میں انتقال کیا۔

• وحید مرزا : سابق صدر شعبۂ تہذیب اسلامی لکھنؤ یونیورسٹی، بعدہٗ دائرہ المعارف اسلامیہ لیے پاک، حکومت کے پروجیکٹ ڈائرکٹر (دراہور) اکتوبر ۱۹۷۶ء میں وفات پائی۔

• محمد ادیب ایم، اے = عطارد = تماشائی = متعلم = '؟' = قاضی عبدالودود

• یوسف الدین احمد بلخی : فصیح الدین بلخی کے بھتیجے تھے۔ رانچی کالج میں فارسی کے لکچرر تھے، اچھے شاعر بھی تھے۔ قاضی صاحب کے رشتہ دار تھے۔ ۱۹۷۱ء کے آس پاس فاتحہ

قاضی عبدالودود (پ : ۱۸۹۵ء) والد کا نام قاضی عبدالوحید، جو احمد رضاخانی تھے، رسالہ 'تحفۂ حنفیہ' کے مالک و ایڈیٹر تھے، اور ۱۳۲۶ھ میں فوت ہوئے ('معفوز')۔

ابتدائی تعلیم اینگلو محمڈن اسکول (پٹنہ سیٹی) اور اینگلو محمڈن اورینٹل کالج (علیگڑھ) سے منسلک اسکول (ہوسٹل : موریسن کورٹ و میکڈانل ہاؤس) بلگرامی نولوریل کالج (علیگڑھ) میں بانی میجر سید حسن بلگرامی کے انتقال کے بعد پٹنہ آکر پرائیوٹ میٹرک کا امتحان دیا، انٹر کیا اور بی اے کیا، پھر تحریک ترک موالات میں شامل ہوگئے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں تکمیل تعلیم کے لیے انگلستان گئے، جہاں کیمرج سے اکونمکس میں ٹرائی پوس لیا اور لندن سے بیرسٹری کی سند لی۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں واپس آ گئے۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں 'معیار' نکالا۔